سبل السلام

اردو ترجمہ

جلد دوم

www.KitaboSunnat.com

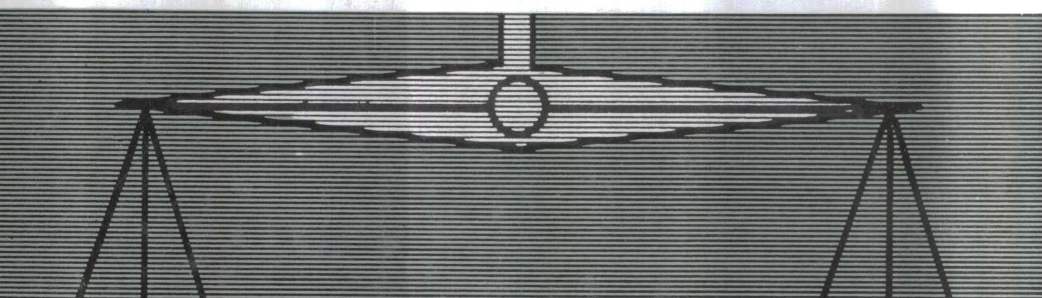

واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

اردو ترجمہ

سبل السلام

(حصہ دوم)

شرح بلوغ المرام

از علامہ سید محمد بن اسمٰعیل الصنعانی (متوفی ۱۱۸۲ھ)

مترجم

عبد الرحمٰن کیلانی

شریعۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق طباعت محفوظ ہیں

نام کتاب	سبل السلام
مصنف	علامہ سید محمد بن اسمٰعیل الصنعانی (متوفی ۱۱۸۲ھ)
مترجم	عبدالرحمٰن کیلانی
تصحیح و نظر ثانی	سید معروف شاہ شیرازی
	حبیب الرحمٰن
طابع	شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
مطبع	حتف آرٹ پریس لاہور
تعداد	۱۵۰۰
اشاعت اول	دسمبر ۱۹۹۸ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست مضامین	نمبر شمار

پیش لفظ	--
نفلی نماز کا بیان	۱
نماز باجماعت اور امامت کا بیان	۳۱
مسافر اور مریض کی نماز کا بیان	۶۷
جمعہ کی نماز کا بیان	۸۲
نماز خوف کا بیان	۱۱۱
عیدین کی نماز کا بیان	۱۱۹
سورج گرہن کی نماز کا بیان	۱۳۶
استسقاء کی نماز کا بیان	۱۴۵
لباس کا بیان	۱۵۷
جنازوں کا بیان	۱۹۷
زکوۃ کا بیان	۲۲۷
فطرانہ کا بیان	۲۵۸
نفلی صدقہ کا بیان	۲۶۳
زکواۃ کی تقسیم کا بیان	۲۷۳
روزوں کا بیان	۲۸۲
نفلی روزے کا بیان اور جن دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے	۳۱۳
اعتکاف اور نماز تراویح کا بیان	۳۲۷
حج کا بیان	۳۳۶
میقات کا بیان	۳۵۱
احرام کی اقسام اور اسکی کیفیت	۳۵۶
احرام اور اس کے متعلقات کا بیان	۳۵۷
حج کی کیفیت اور مکہ میں داخلہ	۳۷۹
حج کے فوت ہونے اور اس سے روک دیئے جانے کا بیان	۴۱۳

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

شریعہ اکیڈمی نے وکلاء ' ججوں اور عام اردو دان تعلیم یافتہ طبقہ کی ضرورت کے پیش نظر اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر آسان اور دور حاضر کی زبان میں تصنیف و تالیف اور اسلامی قوانین سے متعلق لٹریچر کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا ہے - اس مقصد کے لئے اکیڈمی نے مشہور محقق ابن حجرؒ کی شہرہ آفاق کتاب " بلوغ المرام من ادلہ الاحکام " کی مقبول اور معروف شرح سبل السلام کے ترجمہ کو بھی اپنے اشاعتی منصوبہ میں شامل کیا ہے - سبل السلام یمن کے مشہور محدث اور فقیہ علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی (۱۱۸۲ھ) کی تالیف ہے-

اس منصوبہ کے تحت سبل السلام جلد اول کا ترجمہ فروری ۹۸ء میں شائع ہو چکا ہے - پہلا حصہ ۳۴۵ احادیث کی تشریح و توضیح اور عملی تطبیق پر مشتمل ہے ' اس میں طہارت اور نماز سے متعلق اہم اور بنیادی امور کی وضاحت ہے - جلد اول کے آغاز میں بلوغ المرام اور اس کی شرح سبل السلام کا تعارف ' مولف بلوغ المرام حافظ ابن حجر اور شارح بلوغ المرام محمد بن اسماعیل الصنعانیؒ کی سوانح حیات شائع ہو چکی ہے - ہمیں خوشی ہے کہ اب ہم سبل السلام جلد دوم کا ترجمہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں - ان دونوں جلدوں کا ترجمہ نامور عالم دین مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے کیا ہے جو کتاب کی تکمیل سے پہلے ہی اس دار فانی سے کوچ فرما گئے- اللہ انہیں اجر جزیل سے نوازے - آمین

جلد دوم میں نماز ' روزہ ' زکوۃ اور حج سے متعلق ۴۳۴ احکامی احادیث ہیں ' احکامی احادیث سے مراد وہ احادیث ہیں جن سے فقہی احکام اور مسائل کا استنباط ہوتا ہے- جیسا کہ جلد اول کے مطالعہ سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کتاب کا اسلوب عام فہم اور سادہ ہے- شارح نے نہایت خوبی سے اختلافی مسائل میں مختلف آراء کا محاکمہ کیا ہے ' اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے راویوں کے حالات زندگی اور ان کی ثقاہت پر بھی بحث کی ہے - ہر حدیث کے بارے میں مشہور ائمہ جرح و تعدیل کی آراء نقل کر کے حدیث کی حیثیت کا تعین بھی کر دیا ہے - مشکل الفاظ اور اصطلاحات کے معانی واضح کئے ہیں - محققین شراح کے اقوال سے حدیث کے صحیح مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ' بعض مقامات پر تطبیق یا ترجیح دیتے وقت متعلقہ اصول حدیث کی بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بقدر ضرورت نشاندہی کر دی ہے۔

ماہرین قانون اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں فقہی اختلافات سے متعلق جو الجھنیں عموماً پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ بھی اس کتاب میں فقہی مسالک کے تقابلی مطالعہ اور طرز استدلال کو سمجھنے کے بعد ان شاء اللہ دور ہونگی

سبل السلام جلد سوم اور چہارم بھی طباعت و اشاعت کے مراحل میں ہے۔ جلد سوم میں بیوع تا جنایات تک اور جلد چہارم میں حدود تا کتاب الجامع تک ابواب ہیں۔ انشاء اللہ وہ بھی جلد ہی قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

امید ہے کہ اسلامی قانون سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے شریعہ اکیڈمی کی یہ کاوش مفید اور ثمر آور ثابت ہو گی۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری باتیں سنیں' انہیں محفوظ رکھا' پھر جیسے سنا تھا انہیں آگے منتقل کر دیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نفلی نماز کا بیان

یعنی وہ نماز جو کوئی اپنی رضا و رغبت سے پڑھے۔ یہ مصدر تطوع کا ہے۔ اس کی مفعول کی طرف نسبت' اور اس کا فاعل محذوف ہے۔ قاموس نے صلوۃ التطوع کا معنی نفلی نماز لکھا ہے۔

۳۳۱- عن ربيعة بن كعب الأسلمي رضي الله تعالى عنه قال: قال لي النبي ﷺ: سل، فقلت: أسألك مرافقتك في الجنة، فقال: أو غير ذلك؟ فقلت: هو ذاك، قال: فأعني على نفسك بكثرة السجود. رواه مسلم.

ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ(۱) سے روایت ہے کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کچھ مانگو" میں نے کہا "میں جنت میں آپ کی رفاقت مانگتا ہوں" آپ نے فرمایا: "کوئی اور بات بتلاؤ" میں نے کہا "بس یہی چاہتا ہوں" آپ نے فرمایا "تو کثرت سجود کو اپنے اوپر لازم کر کے میری (۲) مدد کرو" اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) آپ اہل صفہ سے ہیں۔ ابتداء ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۶۳ھ میں فوت ہوئے اور آپ کی کنیت ابو فراس ہے۔

(۲) یعنی اگر اپنے دل کی مراد چاہتے ہو تو۔

مصنف نے سجدہ کو نفلی نماز پر محمول کیا اور اس طرح اس حدیث کو نفلی نماز پر دلیل بنایا ہے۔ گویا مصنف نے اسے حقیقت سے پھیر دیا کہ بغیر نماز کے بھی سجدہ ہو سکتا ہے جس میں انفرادی طور پر ترغیب نہیں دی گئی۔ اور سجود اگرچہ فرائض پر صادق آتا ہے لیکن فرائض کے ساتھ سجدہ بجا لانا تو ہر مسلم کے لئے لازم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیعہ کو ایسے سجدوں کی ہدایت کی جن سے اس کی مراد حاصل ہو۔

نیز یہ حدیث ربیعہ کے کمال ایمان' بلند ہمتی' عمدہ مراد' اعلیٰ مراتب اور دنیا اور اس کی خواہشات سے بے رغبتی پر دلیل ہے اور اس بات پر بھی کہ ایسے شخص کے حق میں نماز سب سے بہترین عمل ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی مراد کے حصول کے لئے بکثرت نمازوں کی ادائیگی کی تاکید کی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کا مطلوب بہترین مطلوب تھا۔

۳۴۲۔ وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: حفظت من النبي ﷺ عشر ركعات: ركعتين قبل الظهر، وركعتين بعدها، وركعتين بعد المغرب في بيته، وركعتين بعد العشاء في بيته، وركعتين قبل الصبح. متفق عليه. وفي رواية لهما: وركعتين بعد الجمعة في بيته.

ولمسلم: كان إذا طلع الفجر لا يصلّي إلا ركعتين خفيفتين.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں یاد رکھی (۱) ہیں۔ دو رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو اس کے بعد' اور دو رکعتیں مغرب کے بعد اپنے گھر میں(۲) اور دو عشاء کے بعد اپنے گھر میں اور دو صبح سے پہلے(۳)۔ متفق علیہ۔
اور انہی دونوں کی ایک روایت میں ہے کہ: دو رکعتیں نماز جمعہ کے بعد اپنے گھر میں(۴) اور مسلم میں ابن عمر سے روایت ہے کہ فجر طلوع ہونے پر آپ دو ہلکی رکعتوں کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھتے(۵)۔

(۱) یہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے قول کا مجمل حصہ ہے جس کی تفصیل آگے وہ خود بیان کرتے ہیں۔

(۲) گھر کی قید لگانا اس بات پر دلیل ہے کہ باقی رکعتیں آپ مسجد میں ادا کرتے تھے۔

(۳) صبح کی رکعتوں میں گھر کی قید نہیں لگائی۔ حالانکہ یہ رکعتیں بھی آپؐ گھر میں پڑھتے تھے اور شاید اس لئے یہ قید نہ لگائی ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل مشہور تھا۔

(۴) گویا آپ کے دس رکعات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز یہ دس رکعتیں ادا کیا کرتے تھے۔

(۵) یہ دو رکعتیں بھی دس رکعتوں میں شمار ہیں اور مسلم کے الفاظ کی افادیت صرف یہ ہے کہ یہ رکعتیں ہلکی ہوتی تھیں اور طلوع فجر کے بعد آپ اور کچھ نہیں پڑھتے تھے اور انہیں ہلکا کرنا ہی امام مالک' شافعی وغیرہ کا مذہب ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں آیا ہے "حتیٰ کہ میں کہتی کیا آپ نے ام الکتاب بھی پڑھی ہے؟" اور یہ حدیث عنقریب آرہی ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ یہ نماز کے نوافل ہیں اور ان کے مشروع ہونے کی حکمت کے متعلق کہا گیا ہے کہ فرض نمازوں کے آداب میں جو کمی رہ گئی ہو، نماز سے پہلے یا بعد کے نوافل اس کمی کو پورا کر دیں گے اور نماز سے پہلے کے نوافل میں یہ بھی حکمت ہے کہ نمازی کا دل فریضہ کی ادائیگی پر آمادہ اور اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ اور حاکم نے تمیم داری کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے اس کی نماز کا حساب لیا جائے گا- اگر یہ پوری ہوئیں تو پوری لکھ لیا جائے گا اور اگر پوری نہ ہوئیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائے گا' دیکھو! میرے بندے کے کچھ نوافل بھی پاتے ہو؟ ان سے اس کی فرض نمازوں کو پورا کر دو- پھر زکوۃ کے متعلق بھی ایسا ہی معاملہ ہو گا- پھر باقی اعمال کا بھی اسی انداز سے مواخذہ کیا جائے گا" یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے جو نوافل کی مشروعیت کی حکمت کے متعلق کہی گئی ہے-

اور مسلم کی حدیث میں جو یہ قول ہے کہ "آپ طلوع فجر کے بعد ان دو رکعتوں کے علاوہ اور کوئی نماز نہ پڑھتے تھے" اس سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو طلوع فجر کے بعد نوافل کو مکروہ سمجھتے ہیں اور یہ بات ہم پہلے پیش کر چکے ہیں-

۳۳۳- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها أن النبي ﷺ كان لا يدع أربعاً قبل الظهر، وركعتين قبل الغداة. رواه البخاري.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں اور صبح سے پہلے کی دو رکعتیں کبھی نہ چھوڑتے تھے- اسے بخاری نے روایت کیا(۱)-

(۱) یہ حدیث ابن عمر کی حدیث کے منافی نہیں ہے کہ آپ ظہر سے پہلے دو پڑھتے تھے کیونکہ یہ ایسی زیادتی ہے جسے حضرت عائشہؓ تو جانتی تھیں مگر ابن عمرؓ نہیں جانتے تھے- پھر یہ احتمال بھی موجود ہے کہ جن دو رکعتوں کا ان دونوں نے ذکر کیا ہے وہ انہیں چار رکعتوں میں سے ہوں اور آپ دو دو کر کے پڑھتے ہوں- اور ابن عمرؓ نے صرف دو رکعتوں کا مشاہدہ کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دو رکعتیں ان کے علاوہ ہوں اور آپ نے یہ چار رکعتیں متصل پڑھی ہوں- اور اس کی تائید ابو ایوب کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے جسے ابوداؤد نے' ترمذی نے شمائل میں اور ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے بدیں الفاظ روایت کیا ہے کہ "ظہر سے پہلے چار .. اکٹھی پڑھنے سے ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں" اور انس کی حدیث جسے طبرانی نے اوسط میں روایت کیا یوں ہے "ظہر سے پہلے کی چار رکعتوں کا ثواب عشاء کے بعد کی چار رکعتوں کے برابر ہے اور عشاء کے بعد کی چار رکعتوں کا ثواب لیلۃ القدر کے برابر ہے" اس طرح ظہر سے پہلے چھ رکعتیں بن جاتی ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ کبھی چار رکعتیں پڑھ لیتے ہوں اور انہی پر اکتفا کرتے ہوں اور ان کے متعلق حضرت عائشہؓ نے خبر دی ہو اور کبھی دو رکعتیں پڑھتے ہوں اور ان کے متعلق ابن عمرؓ نے خبر دی ہو-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٣٣٤- وعنها رضي الله تعالى عنها قالت: لم يكن النبي ﷺ على شيء من النوافل أشد تعاهداً منه على ركعتي الفجر. متفق عليه.

ولمسلم: ركعتا الفجر خير من الدنيا وما فيها.

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نفلی نمازوں میں سے سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کا خیال(۱) رکھتے تھے- متفق علیہ- اور مسلم میں انہی کی روایت ہے کہ صبح کی دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں(۲)-

(۱) اصل عبارت میں لفظ تعاھدا" آیا ہے جس کا معنی محافظت ہے اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آپ یہ دو رکعتیں کبھی نہیں چھوڑتے تھے خواہ حضر میں ہوں یا سفر میں اور حسن بصری" سے ان رکعتوں کا وجوب بیان کیا گیا ہے-

(۲) یعنی ان کا اجر و ثواب دنیا سے بہتر ہے گویا آپ" نے دنیا سے زمین اور اس میں موجود پورا سازو سامان مراد لیا- اور اس حدیث میں ان کی ادائیگی کی ترغیب پر دلیل ہے نیز یہ کہ یہ رکعتیں واجب نہیں ہیں کیونکہ ان کے چھوڑنے پر عتاب کا ذکر نہیں بلکہ ان کی ادائیگی پر ثواب کا ذکر ہے-

٣٣٥- وعن أم حبيبة أم المؤمنين رضي الله تعالى عنها قالت: سمعت رسول الله ﷺ يقول: **«من صلّى اثنتي عشرة ركعة في يوم وليلة بني له بهن بيت في الجنة»**. رواه مسلم، وفي رواية: «تطوعاً».

وللترمذي نحوه، وزاد: أربعاً قبل الظهر، وركعتين بعدها، وركعتين بعد المغرب، وركعتين بعد العشاء، وركعتين قبل صلاة الفجر.

وللخمسة عنها: من حافظ على أربع قبل الظهر، وأربع بعدها، حرمه الله تعالى على النار.

ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (۱) سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: جو شخص دن اور رات (۲) میں بارہ رکعتیں پڑھ لے تو ان کے عوض اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا(۳) جاتا ہے- اسے مسلم نے روایت کیا اور ایک روایت میں ہے کہ نفلی بارہ رکعت اور ترمذی میں بھی اسی طرح ہے(۴) لیکن اتنا زیادہ ہے(۵) کہ چار رکعتیں ظہر سے پہلے(۶) اور دو رکعتیں اس کے بعد(۷) اور دو رکعتیں مغرب کے بعد(۸) اور دو عشاء کے بعد(۹) اور دو رکعتیں فجر کی نماز سے پہلے(۱۰)- اور پانچوں میں انہی ام حبیبہؓ کی روایت ہے کہ جو شخص ظہر سے پہلے چار رکعت اور ظہر کے بعد چار رکعت(۱۱) کی محافظت کرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گا' اللہ تعالیٰ اس پر آگ کو حرام کر دے گا(۱۲)۔

(۱) ان کا نام اور حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

(۲) یعنی ہر دن اور ہر رات کو۔ یہ مطلب نہیں کہ کسی ایک دن یا کسی ایک رات ایسا کر لے۔

(۳) اور اس کی تفصیل ترمذی کی روایت میں آ رہی ہے۔

(۴) یعنی ام حبیبہؓ ہی کی روایت ہے اور مسلم کی حدیث کی طرح ہے۔

(۵) یعنی مسلم میں جو اجمال تھا یہ اس کی تفصیل ہے۔

(۶) جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے گزشتہ حدیث میں ان کا ذکر کیا ہے۔

(۷) جیسا کہ ابن عمر کی حدیث میں مذکور ہیں۔

(۸) جن کے متعلق ابن عمرؓ نے گھر میں ادا کرنے کی قید لگائی ہے۔

(۹) ان کے متعلق بھی ابن عمرؓ نے گھر میں ادا کرنے کی قید لگائی ہے۔

(۱۰) جن پر گزشتہ دو حدیثوں میں حضرت عائشہؓ اور ابن عمرؓ متفق ہیں۔

(۱۱) ممکن ہے کہ یہ گزشتہ مذکورہ دو رکعتوں کے علاوہ ہوں' اور ممکن ہے کہ ان چار رکعات میں وہ دو رکعت بھی شامل ہوں جن کا ذکر گزر چکا ہے۔

(۱۲) یعنی اس کے آگ میں داخلہ کو روک دے گا۔ جیسے محرم پر حرام کردہ چیز روک دی جاتی ہے۔

۳۳۶ - وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «رحم الله امرأً صلّى أربعاً قبل العصر». رواه أحمد وأبو داود والترمذي، وحسنه، وابن خزيمة، وصححه.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھ لے(۱)"۔ اسے احمد' ابوداؤد' اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے اسے حسن کہا۔ اور ابن خزیمہ نے اسے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا(۲)۔

(۱) یہ چار رکعتیں ایسی ہیں جن کا نوافل میں پہلے ذکر نہیں ہوا۔ اگر آپ اسے ترمذی میں مذکور ام حبیبہؓ کی حدیث سے ملائیں تو فرضوں سے پہلے اور بعد نوافل کی کل تعداد سولہ رکعت ہو جاتی ہے۔

(۲) رہا عصر سے پہلے صرف دو رکعت کا مسئلہ تو وہ اس حدیث میں ہے کہ "ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۳۷- وعن عبد الله بن مغفل المزني رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: صلوا قبل المغرب، صلوا قبل المغرب، ثم قال في الثالثة: لمن شاء، كراهية أن يتخذها الناس سنة. رواه البخاري.

وفي رواية لابن حبان: أن النبي ﷺ صلّى قبل المغرب ركعتين.

عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ(۱) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مغرب سے پہلے نماز پڑھو' مغرب سے پہلے نماز پڑھو- پھر تیسری بار فرمایا: جو چاہے پڑھ لے' آپ اس بات کو نا پسند فرماتے تھے کہ لوگ اسے سنت بنائیں(۲)- اسے بخاری نے روایت کیا(۳)- اور ابن حبان کی ایک(۴) روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں(۵)-

(۱) آپ ابوسعید کنیت سے مشہور ہیں پورا نام عبداللہ بن مغفل بن غنم ہے بیعت رضوان میں شامل تھے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی پھر بصرہ کو گئے تو وہاں گھر بنا لیا- آپ ان دس آدمیوں میں سے ہیں جنہیں حضرت عمرؓ نے لوگوں کو دین سکھلانے کے لئے بصرہ بھیجا تھا- آپ ۶۰ھ میں اور بقول بعض اس سے ایک سال پہلے فوت ہوئے-

(۲) یعنی ایسا معروف طریقہ جس کا خلاف نہ کیا جائے اور کبھی ایسے نوافل سے اول وقت فوت ہو جاتا ہے-

(۳) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ نماز مغرب سے پہلے دو رکعت مستحب ہیں اور اس سے مراد مغرب کی نماز سے پہلے ہے مغرب کے وقت سے پہلے نہیں کیونکہ اس وقت نماز سے منع کیا گیا ہے-

(۴) جو عبداللہ مذکور ہی سے مروی ہے-

(۵) گویا آپ کے قول اور فعل سے ان دو رکعتوں کی مشروعیت ثابت ہو گئی-

۳۳۸- ولمسلم عن ابن عباس رضي الله تعالى عنه قال: كنا نصلّي ركعتين بعد غروب الشمس، وكان النبي ﷺ يرانا، فلم يأمرنا، ولم ينهنا.

اور مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم سورج غروب ہونے کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دیکھتے تھے- آپ نے نہ تو ہمیں ان کا حکم دیا اور نہ ان سے منع کیا(۱)-

(۱) گویا یہ رکعتیں تقریر سے بھی ثابت ہیں- اس طرح یہ دو رکعتیں تینوں قسموں کی سنت سے ثابت ہو گئیں اور شائد انس کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو جس میں ان کا حکم ہے اس طرح نوافل کی بیس رکعت بن جاتی ہیں جبکہ فرائض کی سترہ رکعتیں ہیں- اور جو شخص ان نوافل کی بھی ہر روز محافظت کرے تو یہ کل ۳۷ رکعتیں ہوئیں اور ۳ رکعت وتر گویا ہر دن رات میں چالیس رکعت ہوئیں- ابن قیم کہتے ہیں- یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ چالیس رکعت ادا کرتے تھے ان میں سترہ رکعت فرض ہیں اور بارہ جو ام حبیبہؓ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے روایت کی ہیں اور گیارہ رات (تہجد) کی تو یہ کل چالیس رکعت ہوئیں۔ مخفی نہ رہے کہ نوافل کی یہ تعداد جو یہاں مذکور ہوئی وتروں کے بغیر ہے۔ یہ ابن عمر کی حدیث کی رو سے بائیس ہیں اگر ہم ظہر سے پہلے چار اور بعد دو شمار کریں اور ام حبیبہؓ کی حدیث میں عشاء کے بعد زیادہ ہیں۔ گویا یہ فرض اور وتر کے بغیر ۲۴ رکعتیں ہوئیں۔

۳۳۹- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كان النبي ﷺ يخفف الركعتين اللتين قبل صلاة الصبح، حتى إني أقول: أقرأ بأم الكتاب؟ متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں اتنی ہلکی(۱) پڑھا کرتے کہ میں خیال کرتی کہ شائد آپ نے سورہ فاتحہ بھی پڑھی ہو گی؟ متفق علیہ(۲)

(۱) یعنی آپ اتنا تھوڑا قیام کرتے کہ میں سوچتی کہ شاید آپ نے سورہ فاتحہ بھی پوری پڑھی ہے یا نہیں؟

(۲) جمہور ان کی تخفیف کی طرف گئے ہیں اور عنقریب یہ ذکر ہو گا کہ آپ ان میں کتنا پڑھتے تھے اور حنفیہ ان کو لمبا کرنے کی طرف لے گئے ہیں اور یہ بات نخعی سے منقول ہے اور بیہقی میں سعید بن جبیر سے ایک مرسل حدیث آئی ہے جس میں راوی کا نام مذکور نہیں اور جو کچھ صحیح سے ثابت ہے ایسی حدیث اس کا معارضہ نہیں کر سکتی۔

۳۴۰- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ قرأ في ركعتي الفجر «قل يا أيها الكافرون» و «قل هو الله أحد». رواه مسلم.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی سنتوں میں قل یا ایھا الکافرون(۱) اور قل ھو اللہ احد(۲) پڑھی۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۳)۔

(۱) یعنی پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد

(۲) یعنی دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد

(۳) اور مسلم میں ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے دو آیتیں پڑھیں۔ پہلی رکعت میں قل یا ایھا الکافرون کے عوض قولوا امنا باللہ وما انزل الینا ۔ سورۃ بقرہ کی آخری آیت تک اور دوسری رکعت میں قل ھو اللہ احد کے بجائے قل یا اھل الکتاب تعالوا سورۃ آل عمران کی آیت پڑھی"۔ اور اس حدیث میں کسی سورۃ کے وسط سے ایک آیت پڑھنے پر اکتفا کر لینے پر دلیل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٣٤١- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كان النبي ﷺ إذا صلّى ركعتي الفجر اضطجع على شقه الأيمن. رواه البخاري.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو سنتیں پڑھ چکتے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر ستاتے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

حدیث میں ستانے کے معاملہ میں کچھ علماء افراط کی طرف چلے گئے اور کچھ تفریط کی طرف اور کچھ متوسط رہے۔ اہل ظاہر کی ایک جماعت جن میں ابن حزم اور ان کے پیروکار بھی ہیں' افراط کی طرف گئے اور اس کے وجوب کے قائل ہیں اور اسے چھوڑنے کی صورت میں نماز کو باطل قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی بنیاد اس حدیث میں آپؐ کا مذکورہ فعل ہے۔ نیز امر کی وہ حدیث بھی جسے ابوہریرہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے کہا: "تم میں سے جب کوئی شخص صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جائے"۔ ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث صحیح حسن غریب ہے اور ابن تیمیہ کہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد اکیلا ہے جس کے حفظ میں جرح ہوئی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ اس سے حجت قائم ہو جاتی ہے الا یہ کہ اسے واجب نہ سمجھا جائے کیونکہ اس فعل پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت ثابت نہیں۔ اور جو جماعت تفریط کی طرف گئی وہ اس کی کراہت کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ ابن عمر ایسا نہیں کرتے تھے اور کہتے کہ "سلام پھیرنا ہی کافی ہے" اسے عبدالرزاق نے روایت کیا اور اس لئے بھی کہ جو شخص ایسا کرتا اسے ابن عمرؓ کنکریاں مارتے۔ اور ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ "اس شخص کا کیا حال ہے کہ جب وہ دو رکعتیں پڑھ چکتا ہے تو گدھے کی طرح زمین پر لیٹنی لیتا ہے" اور متوسط گروہ میں مالک وغیرہ ہیں جو اس شخص کے لئے کچھ حرج نہیں سمجھتے جو راحت کے لئے ایسا کرتا ہے اور جو سنت کی پیروی کے طور پر کرے اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس کے علی الاطلاق استحباب کے قائل ہیں خواہ کوئی شخص راحت حاصل کرنے کے لئے لیٹے یا ویسے ہی لیٹ جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ رات کو تہجد پڑھنے والے کے لئے مشروع کیا گیا ہے جیسا کہ عبدالرزاق نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سنت کی وجہ سے نہیں بلکہ رات کے قیام کی وجہ سے لیٹ کر ستاتے تھے" اور اس روایت میں ایک راوی کا نام مذکور نہیں۔ نووی کہتے ہیں "پسندیدہ بات یہی ہے کہ یہ بات ابوہریرہ کی حدیث کی رو سے سنت ہے میں کہتا ہوں یہی بات اقرب ہے۔" اور عائشہ کی حدیث اگر صحیح بھی ہو تو اس میں صرف یہ چیز ہے کہ انہوں نے ایسا سمجھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر ہمیشگی نہ کرنا اس کے سنت ہونے پر دلیل ہے۔ پھر یہ کہ آپ دائیں پہلو پر لیٹا کرتے تھے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دائیں پہلو پر لیٹنے سے معذور ہو تو اشارہ سے ایسا کر لے مگر بائیں پہلو نہ لیٹے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٣٤٢- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«إذا صلّى أحدكم الركعتين قبل صلاة الصبح فليضطجع على جنبه الأيمن»**. رواه أحمد وأبو داود والترمذي، وصححه.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھے تو اپنے دائیں پہلو کے بل لیٹ کر ستا لے۔ اسے احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے صحیح کہا(۱)۔

(۱) پہلے بحث گزر چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کیا کرتے تھے' اور اس روایت میں اس کا حکم ہے اور یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ آپ نے اسے واجب نہیں کیا جیسا کہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا اور یہ بھی کہ اس میں لوگوں نے کیا کچھ کلام کیا ہے۔

٣٤٣- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: **«صلاة الليل مثنى مثنى، فإذا خشي أحدكم الصبح صلى ركعة واحدة، توتر له ما قد صلى»**. متفق عليه، وللخمسة - وصححه ابن حبان - بلفظ «صلاة الليل والنهار مثنى مثنى». وقال النسائي: هذا خطأ.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کی نماز دو دو رکعتیں پڑھنی چاہئے۔ پھر جب کسی کو صبح ہو جانے کا خدشہ ہو تو ایک رکعت پڑھ لے جس سے پہلی نماز وتر بن جائے گی۔ متفق علیہ(۱)۔ اور پانچوں میں روایت(۲) ہے جسے ابن حبان نے ان لفظوں سے صحیح کہا کہ "رات اور دن کی نماز دو دو رکعتیں ہیں" لیکن نسائی نے کہا کہ یہ بات غلط ہے(۳)۔

(۱) یہ حدیث رات کی نماز کو دو دو کر کے پڑھنے پر دلیل ہے۔ لہٰذا ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیر دینا چاہئے۔ جمہور علماء اسی طرف گئے ہیں۔ مالک نے کہا کہ دو رکعتوں پر زیادتی جائز نہیں۔ کیونکہ حدیث کے مفہوم میں حصر ہے اور بیان پر زور ہے کہ "رات کی نماز دو دو رکعت ہی ہے" کیونکہ مبتدا کو معرفہ لانا علی الاغلب پر ہونے کا فائدہ دیتا ہے اور جمہور نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ حدیث رات کی نماز کے متعلق کسی سائل کے جواب میں واقع ہوئی ہے لہٰذا اس میں حصر پر کوئی دلالت نہیں۔ اور اس لئے بھی کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے معارض ہے اور وہ پانچ رکعتوں کو وتر بنانے کا ثبوت ہے جیسا کہ شیخین کے ہاں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے اور آپ کا فعل حصر کا ارادہ نہ ہونے پر قرینہ ہے۔ اور آپ کا یہ قول کہ :

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"اگر کسی کو صبح ہو جانے کا خدشہ ہو تو ایک رکعت سے وتر بنا لے" اس بات پر دلیل ہے کہ فجر کے طلوع کے خدشہ کی صورت میں ایک رکعت سے وتر بنایا جائے ورنہ پانچ یا سات یا زیادہ سے وتر بنایا جا سکتا ہے البتہ تین سے نہیں کیونکہ تین سے نہی آئی ہے۔ کیونکہ دار قطنی' حاکم اور ابن حبان نے ابوہریرۃؓ سے مرفوعاً" روایت کیا کہ "پانچ یا سات یا نو یا گیارہ سے وتر بناؤ" اور حاکم نے یہ زیادہ کیا کہ "تین سے وتر نہ بناؤ' مغرب کی نماز جیسا نہ بنا دو" مصنف کہتے ہیں کہ اس حدیث کے سب رجال ثقہ ہیں اور اگر کوئی اسے موقوف کہتا ہے تو اس کے وقف کا کچھ نقصان نہیں۔ الا یہ کہ ابو ایوب کی اس حدیث سے معارض ہے "جو شخص چاہے کہ تین سے وتر بنائے تو ایسا کر لے" اسے ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ وغیرہم نے روایت کیا ہے اور ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ تین سے ممانعت اس صورت میں ہے جب درمیانی تشہد بیٹھا جائے کیونکہ اسی سے نماز مغرب سے مشابہت ہوتی ہے اگر درمیانی تشہد نہ بیٹھے صرف آخر میں بیٹھے تو مغرب سے مشابہت نہیں ہو گی اور یہ تطبیق کی عمدہ صورت ہے جس کی تائید حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے جسے احمد' نسائی' بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ "آپؐ تین سے وتر بناتے اور درمیان میں فصل نہیں کرتے تھے" اور حاکم کے لفظ "نہیں بیٹھتے تھے" ہیں۔

رہا یہ مفہوم کہ ایک رکعت سے وتر اس صورت میں بنایا جائے جب فجر کے طلوع ہونے کا خدشہ ہو تو یہ ابو ایوب کی حدیث سے معارض ہے جس میں ہے کہ "جو شخص ایک رکعت سے وتر بنانا چاہے وہ ایسا کر لے" اور مفہوم کے لحاظ سے یہ زیر بحث احادیث سے قوی تر ہے۔ اور ابو ایوب کی حدیث میں ایک رکعت سے احرام کی صحت پر دلیل ہے جو عنقریب آ رہی ہے۔

(۲) یعنی پانچوں میں ابوہریرۃؓ کی حدیث ہے۔

(۳) اسے مذکورہ محدثین نے علی بن عبداللہ البارقی الازدی عن ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا۔ اور صحیحین میں اس کی اصل موجود ہے مگر دن کا ذکر نہیں۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ علی کے بغیر ابن عمر سے کسی نے بھی دن کا لفظ نہیں کہا اور انہوں نے اس پر گرفت کی ہے۔ ابن معین اس کی حدیث کو ضعیف قرار دیتے تھے اور اس سے استدلال نہیں کرتے تھے اور کہتے کہ ابن عمر سے نافع' عبداللہ بن دینار اور ایک جماعت نے اس حدیث کو روایت کیا مگر ان میں دن کا ذکر نہیں ہے۔ اور یحییٰ بن معین سے اسی کی سند سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ دن کی نماز چار رکعت ہیں جن میں فصل نہیں کیا جائے گا۔ ان سے کہا گیا کہ احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ رات اور دن کی نماز دو دو رکعت ہے تو انہوں نے کہا "کون سی حدیث کی رو سے؟" کہا گیا "ازدی کی حدیث سے" وہ کہنے لگے: یہ ازدی کون ہے؟ کہ میں اس سے ملوں؟ نسائی کہتے ہیں میرے نزدیک یہ حدیث غلط ہے اور حاکم نے بھی علوم الحدیث میں ایسا ہی کہا ہے۔ اور دار قطنی نے العلل میں کہا۔ اس روایت میں دن کا ذکر وہم ہے۔ اور خطابی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے کہا کہ اس حدیث کو طاؤس، نافع وغیرہما نے ابن عمر سے روایت کیا۔ مگر کسی نے اس میں دن کا ذکر نہیں کیا۔ الا یہ کہ زیادتی کی راہ کو ثقہ راویوں سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور بیہقی نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور زیادتی سے مسلم نے احتجاج کیا ہے اور ثقہ لوگوں سے زیادتی مقبول ہے"

اس زیادتی کے بارے میں ائمہ کے کلام پر نظر ڈالیے کہ انہوں نے اس میں کتنا شدید اختلاف کیا ہے اور غالباً" دونوں باتیں ہی جائز ہیں۔ اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ نمازی کو دن کی نمازوں میں اختیار ہے کہ وہ دو دو کر کے پڑھ لے یا چار چار کر کے مگر اس سے زیادہ نہ کرے۔ اور امام بخاری نے دن کی نماز دو دو رکعت ہونے پر آٹھ احادیث روایت کی ہیں۔

۳۴۴۔ وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**أفضل الصلاة بعد الفريضة، صلاة الليل**». أخرجه مسلم.

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "فرض نمازوں کے بعد(۱) سب سے بہتر رات کی نماز(۲) ہے" اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

(۱) کیونکہ نمازوں میں سے بہتر فرض نمازیں ہیں۔

(۲) ممکن ہے کہ رات سے ابوہریرہؓ کی مراد رات کا درمیانی حصہ ہو۔ کیونکہ ابوہریرہ کی حدیث جسے بخاری کے سوا جماعت نے روایت کیا ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ فرض نمازوں کے بعد کون سی نماز افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "وہ نماز جو رات کے درمیانی حصہ میں ہو" اور عمرو بن عبسہ کی حدیث میں جسے ترمذی نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا ہے یوں ہے کہ "رات کے آخری حصہ میں رب اپنے بندے سے نزدیک تر ہوتا ہے پھر اگر تجھ سے ہو سکے کہ ان لوگوں سے ہو جو اس ساعت میں اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ایسا ضرور کر" اور اسی کی حدیث ابوداؤد میں یوں ہے "میں نے پوچھا یارسول اللہ! رات کے کون سے حصہ میں شنوائی زیادہ ہوتی ہے؟ فرمایا: رات کے آخری حصہ میں۔ لہٰذا جتنی چاہے نماز پڑھ۔ کیونکہ اس وقت کی نماز لکھی جاتی ہے اور اس پر فرشتے حاضر ہوتے ہیں" اور آخری حصہ سے مراد آخری تہائی حصہ ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔

۳۴۵۔ وعن أبي أيوب الأنصاري رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «**الوتر حق على كل مسلم، من أحب أن يوتر بخمس فليفعل، ومن أحب أن يوتر بثلاث فليفعل، ومن أحب أن يوتر بواحدة فليفعل**». رواه الأربعة إلا الترمذي، وصححه ابن حبان، ورجح النسائي وقفه.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وتر ہر مسلمان پر ضروری ہے(۱)، جو پانچ رکعت پڑھنا چاہے وہ پانچ پڑھ لے اور جو تین پڑھنا چاہے وہ تین پڑھ لے(۲) اور جو ایک پڑھنا چاہے وہ ایک پڑھ لے(۳)۔ اسے ترمذی کے سوا چاروں نے روایت کیا۔ اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا۔ اور نسائی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی(۴)۔

(۱) یہ اس شخص کے لئے دلیل ہے جو وتر کے وجوب کا قائل ہے۔

(۲) ہم اس حدیث کی معارض اور ان میں تطبیق کی صورت پہلے پیش کر چکے ہیں۔

(۳) اس کے ساتھ اور کچھ نہ ملائے جیسا کہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) اسی طرح حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہلی، دار قطنی نے العلل میں اور کئی دوسروں نے اسے موقوف کہا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ یہی بات درست ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث رفع کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کا میدان نہیں ہے یعنی رکعات کی تعداد میں۔

اور یہ حدیث وتر کے وجوب پر دلیل ہے۔ نیز ابوہریرہؓ کی یہ حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جسے احمد نے روایت کیا ہے کہ: "جو وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں" اور حنفیہ اس کے وجوب کی طرف گئے ہیں اور جمہور اسے واجب نہیں سمجھتے۔ ان کی بنائے استدلال حضرت علیؓ کی یہ حدیث ہے۔ "وتر فرض نمازوں کی طرح لازم نہیں بلکہ وہ سنت ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں پڑھتے رہے" اور یہ حدیث آگے آرہی ہے اور ابن ماجہ کے ہاں اس کے الفاظ یہ ہیں "وتر لازمی نہیں اور نہ ہی تمہاری فرض نمازوں کی طرح ہیں۔" تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر پڑھے اور فرمایا۔ اے اہل قرآن! وتر پڑھا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے" اور ابن تیمیہ نے بیان کیا کہ ابن المنذر نے ابوایوب کی حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے: "وتر ضروری ہیں لیکن واجب نہیں" اور یہ حدیث بھی "تین چیزیں ایسی ہیں جو مجھ پر فرض ہیں اور تمہارے لئے نفل ہیں" اور انہیں میں سے وتر شمار کیا۔ اگر یہ حدیث ضعیف ہو تو اس کے کئی توابع ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس بنا پر کہ ابوایوب کی جس حدیث سے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے آپ کو معلوم ہو چکا کہ اس کا موقوف ہونا ہی زیادہ صحیح ہے اگرچہ یہ پہلے گزر چکا کہ وہ مرفوع کے حکم میں ہے اور یہ ان دلائل کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی جو عدم وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور وجوب کا اطلاق کبھی سنت موکدہ پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ غسل جمعہ کے بارے میں پہلے گزر چکا۔ اور حدیث کے الفاظ بخمس و بثلاث کا مطلب یہ ہے کہ ان کے درمیان تشہد نہ کرے صرف آخری رکعت میں بیٹھے اور پانچ وتر کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث آرہی ہے اور لفظ بواحدہ کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ ایک پر ہی اکتفا کر لیا جائے اور صحابہ کی ایک جماعت سے فعل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مروی ہے۔ محمد بن نصر وغیرہ نے صحیح اسناد کے ساتھ سائب بن یزید سے روایت کیا ہے کہ "عمرؓ نے ایک رات ایک رکعت میں قرآن پڑھا اور اس کے علاوہ کوئی رکعت نہ ادا کی" اور بخاری نے روایت کیا کہ: معاویہؓ نے ایک وتر پڑھا اور ابن عباسؓ نے اسے درست قرار دیا۔

۳۴۶- وعن علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه قال: ليس الوتر بحتم كهيئة المكتوبة، ولكن سنة سنها رسول الله ﷺ. رواه النسائي والترمذي وحسنه، والحاكم صححه.

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وتر فرض نمازوں کی طرح لازمی نہیں ہیں لیکن یہ ایک سنت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادا کرتے رہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا۔ اور نسائی اور حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا(۱)۔

(۱) وتر کے عدم وجوب پر پہلے دلائل گزر چکے ہیں اور حضرت علی کی اس حدیث میں ایک راوی عاصم بن ضمرہ ہے جس کے بارے میں کئی لوگوں نے کلام کیا ہے۔ اور قاضی نے بلوغ المرام پر اپنے حواشی میں اس کا ذکر کیا ہے میں نے اسے تلخیص میں نہیں پایا بلکہ وہاں یہ مذکور ہے کہ حاکم نے اسے صحیح کہا اور اس کا تعاقب نہیں کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ قاضی خیثمی نے کہاں سے نقل کیا پھر میں نے تقریب میں اس کا یہ تذکرہ دیکھا۔ عاصم بن ضمرہ السلولی الکوفی چھٹے طبقہ میں سے ہے اور سچا ہے۔ ۷۴ھ میں وفات پائی۔

۳۴۷- وعن جابر رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قام في شهر رمضان، ثم انتظروه من القابلة فلم يخرج، وقال: إني خشيت أن يكتب عليكم الوتر. رواه ابن حبان.

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان کی ایک رات قیام فرمایا۔ پھر اگلے دن صحابہ آپ کا انتظار ہی کرتے رہے لیکن آپ نہ آئے اور فرمایا کہ "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر وتر کی نماز فرض نہ کر دی جائے" اسے ابن حبان نے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہ حدیث بخاری میں بھی ہے مگر اس کے الفاظ یہ ہیں "کہ تم پر رات کی نماز فرض نہ کر دی جائے" اور جو حدیث ابوداؤد نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث سے روایت کی اس کے الفاظ یہ ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نماز ادا کی اور صحابہ نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر اگلے دن نماز پڑھائی تو لوگ بہت زیادہ ہو گئے۔ پھر تیسری رات بھی صحابہ اکٹھے ہوئے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس نہ آئے۔ پھر جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ "جو کچھ تم نے کیا وہ میں نے دیکھ لیا اور میں صرف اس لئے تمہارے پاس نہ آیا کہ میں ڈر گیا کہ کہیں تم پر یہ نماز فرض نہ کر دی جائے" اور بخاری کی حدیث اس کے قریب قریب ہے۔

جاننا چاہئے کہ آپ کے صحابہ کے پاس نہ آنے کی یہ وجہ بتلانا کہ آپ ان پر یہ نماز فرض ہونے سے ڈر گئے' میں اشکال پیدا ہو گیا جبکہ یہ حدیث ثابت ہے کہ "یہ پانچ نمازیں فرض ہیں اور ان کا اجر پچاس نمازوں کا ہے اور میرے ہاں قول میں تبدیلی نہیں ہوتی" پھر جب فرض نمازوں کی تعداد میں تبدیلی کا خطرہ نہ تھا تو اس زیادتی کا خوف کیسے واقع ہوا؟ مصنف نے اس کے بہت سے جواب نقل کئے اور انہیں بے کار قرار دیا۔ پھر خود تین جواب دیتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ جواب سمجھائے اور ان کا ذکر کیا اور ان میں اچھے جواب کی نشاندہی کی جو یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا خوف تھا کہ رات کی نماز فرض نہ ہو جائے یعنی رات کی نفلی نماز کی صحت کی شرط یہ ہو کہ تہجد کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کی جائے۔ مصنف نے کہا کہ زید بن ثابت کی حدیث میں اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ "حتیٰ کہ میں ڈر گیا کہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔ اور اگر تم پر فرض کر دی جاتی تو تم اسے نباہ نہ سکتے۔ لہٰذا لوگو! اپنے گھروں میں نماز ادا کر لو" گویا آپ نے صحابہ پر شفقت کرتے ہوئے انہیں مسجد میں جمع ہونے کی شرط سے منع فرمایا تھا۔ میں کہتا ہوں اور یہ بات مخفی نہیں کہ یہ توجیہہ آپؐ کے اس قول کے مطابق نہیں کہ "تم پر رات کی نماز فرض کر دی جائے" جیسا کہ بخاری میں ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ آپ کو صرف اس کے فرض ہونے کا خوف تھا اور یہ واقعہ رمضان میں ہوا جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نے صحابہ کو دو راتیں نماز پڑھائی اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ایک رات نماز پڑھائی۔ اور احمد کی روایت یوں ہے "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تین راتیں نماز پڑھائی اور چوتھی رات مسجد خوب بھر گئی" اور ایک روایت میں ہے کہ "میں ڈرا کہ کہیں تم پر وتر فرض نہ کر دیا جائے" جو اس بات پر دلیل ہے کہ وتر واجب نہیں۔

جاننا چاہئے کہ جو لوگ نماز تراویح کو ثابت اور قیام رمضان کو سنت قرار دیتے ہیں وہ اسی بنا پر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس حدیث میں نہ کیفیت پر کوئی دلیل ہے کہ صحابہ کیسے یہ نماز ادا کرتے تھے اور نہ کمیت یا مقدار پر کہ وہ بیس رکعات جماعت سے ادا کرتے تھے اور ہر دو رکعت کے بعد آرام کرتے تھے۔ رہا نماز تراویح کی جماعت کا معاملہ تو حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لوگوں کو ایک معین امام پر جمع کیا اور کہا "یہ بدعت ہے" جیسا کہ مسلم نے اپنی صحیح میں اور دوسروں نے ابو ہریرہؓ کی حدیث سے اسے یوں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو رمضان میں قیام کی ترغیب دیتے تھے۔ لازمی طور پر قیام کا حکم نہیں دیتے تھے۔ آپ فرماتے کہ "جس شخص نے ایمان رکھتے ہوئے اور اجر و ثواب کی نیت سے رمضان میں قیام کیا اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ مصنف کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ معاملہ اسی طرح تھا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت اور خلافت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک معاملہ یوں ہی چلتا رہا۔ بیہقی نے ایک روایت میں یہ الفاظ زائد کہے ہیں کہ عروہ نے کہا: مجھے عبدالرحمٰن القاری نے خبر دی کہ حضرت عمرؓ رمضان کی ایک رات مسجد میں گئے اور اہل مسجد مختلف ٹولیوں میں اپنے اپنے طور پر نماز پڑھ رہے تھے، کوئی اکیلا پڑھ رہا تھا کوئی دوسروں کے ساتھ مل کر۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان لوگوں کو ایک قاری پر ہم جمع کر دیں تو یہ بہتر ہو گا چنانچہ انہوں نے ابی بن کعبؓ کو حکم دیا کہ رمضان میں لوگوں کو نماز پڑھایا کریں۔ پھر ایک دن حضرت عمر مسجد میں آئے تو لوگ باجماعت نماز ادا کر رہے تھے انہیں دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا "یہ اچھی بدعت ہے" بیہقی نے اپنی سنن میں اس مضمون کی کئی روایات بیان کی ہیں۔

جاننا چاہئے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے ایک امام پر جمع ہونے اور جماعت کے التزام کو بدعت پر محمول کیا اس سے آپ کی یہ مراد نہ تھی کہ جماعت بدعت ہے کیونکہ جماعت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کرائی تھی جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔ اور یہ بھی کہ حضرت عمرؓ نے جماعت کی جو ایک معین شکل کا التزام کیا تھا اسے انہوں نے بدعت کا نام دیا تھا۔ رہا ان کا قول "اچھی بدعت" تو بدعت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کی تعریف کی جائے بلکہ ہر بدعت ضلالت ہی ہوتی ہے۔

رہی کمیت یا تراویح کی رکعات کی تعداد کی بات جسے بیس رکعات مقرر کیا تو اس بارے میں کوئی مرفوع حدیث نہیں سوائے اس روایت کے جسے عبد بن حمید اور طبرانی نے ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کے طریق سے، الحکم سے، مقسم سے، ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے" صاحب سبیل ارشاد نے کہا ہے کہ ابو شیبہ کو احمد، ابن معین، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی وغیرہم سب نے ضعیف اور شعبہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے۔ ابن معین نے کہا وہ ثقہ نہیں اور اس حدیث کو اپنی منکرات میں شمار کیا ہے۔ اور اوزاعی نے متوسط میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو یہ منقول ہے کہ آپ نے جن دو راتوں میں جماعت کرائی تھی وہ بیس رکعت تھی منکر ہے اور زرکشی نے خادم، میں کہا کہ یہ دعویٰ کہ اس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس رکعت نماز پڑھائی تھی صحیح نہیں بلکہ اس نماز کے متعلق جو صحیح اور ثابت روایات ہیں ان میں تعداد رکعات کا ذکر نہیں۔ اور جابر کی روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت اور وتر پڑھائے پھر اگلے دن صحابہ آپ کا انتظار کرتے رہے مگر آپ نہیں آئے" اسے ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور بیہقی نے ابو شیبہ کے طریق سے ابن عباس سے روایت کی پھر کہا کہ وہ ضعیف ہے اور ایسی روایات بیان کیں کہ حضرت عمرؓ نے ابی اور تمیم داری کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھائیں" اور ایک روایت میں ہے کہ صحابہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیس رکعت باجماعت پڑھا کرتے تھے" اور ایک روایت میں تیئس رکعت ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیس رکعت کی امامت کراتے تھے اور تین سے وتر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بتاتے تھے۔ بیہقی نے کہا کہ اس میں قوت ہے۔ آپ کو علم ہو چکا کہ بیس رکعت کے بارے میں کوئی بھی مرفوع روایت نہیں ہے، بلکہ عنقریب حضرت عائشہؓ کی متفق علیہ حدیث آ رہی ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے کبھی کچھ زیادہ نہیں کرتے تھے۔"

ان تصریحات سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ نماز تراویح کا وہ اسلوب جس پر اکثر لوگوں نے اتفاق کر لیا ہے، بدعت ہے۔ البتہ قیام رمضان کے سنت ہونے میں کسی کو کچھ اختلاف نہیں اور تراویح کے نوافل کی جماعت بھی ناپسندیدہ نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے بھی رات کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باجماعت پڑھی لیکن یہ کیفیت اور کمیت سنت ہے البتہ نماز تراویح کی محافظت ہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ بدعت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب پہلی بار مسجد گئے اور لوگ الگ الگ ٹولیوں کی شکل میں نماز پڑھ رہے تھے ان میں سے کوئی اکیلا پڑھ رہا تھا اور کوئی جماعت کے ساتھ جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پڑھتے تھے اور اچھا کام وہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا۔

رہی یہ بات کہ قیام اللیل کا نام نماز تراویح کیسے پڑ گیا تو اس کی وجہ وہ ہے جسے بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو چار رکعت نماز پڑھتے پھر آرام کرتے آپ انہیں اتنا لمبا کرتے مجھے آپ پر ترس آنے لگتا۔ الحدیث۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اس روایت میں مغیرہ بن دیاب منفرد ہے اور وہ قوی نہیں۔ اور اگر یہ روایت ثابت ہو تو اس کی اصل نماز تراویح میں امام کا آرام کرنا ہے۔

رہی یہ حدیث کہ "میرے بعد تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے اس کو تھامے رکھو اور اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑے رکھو" جسے احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے اسے صحیح کہا اور حاکم نے اسے روایت کیا اور اسے شیخین کی شرط پر قرار دیا۔ اور اسی طرح کی یہ حدیث ہے۔ "میرے بعد حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اقتداء کرو" اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا، نیز احمد، ابن ماجہ اور ابن حبان نے روایت کیا۔ اس کے کئی طرق ہیں اور ان سب میں کلام ہوا ہے الا یہ کہ وہ ایک دوسرے کو قوی بناتے ہیں تو اس سے مراد صرف خلفائے راشدین کی وہ سنت ہے جو دشمنوں سے جہاد اور دین کے شعائر کی تقویت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کے موافق ہو۔ گویا یہ حدیث ہر خلیفہ راشد کے لئے عام ہے، شیخین سے مختص نہیں۔ اور قواعد شرعیہ سے معلوم ہے کہ کسی خلیفہ راشد کے لئے جائز نہیں کہ وہ ایسا طریقہ مشروع کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہ ہو۔ پھر خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان کی راتوں میں باجماعت نماز کو دیکھ کر خود بھی اسے بدعت کا نام دیا اور یہ نہیں کہا کہ یہ سنت ہے۔

پھر یہ بھی غور فرمائیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کئی مواقع پر اور کئی مسائل میں حضرت ابوبکر اور عمرؓ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختلاف کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ صحابہ کرام حدیث کو اس بات پر محمول نہیں کرتے تھے جو خلیفہ کہے اور نہ ان کے ہر کام کو حجت سمجھتے تھے۔ برماوی نے اصول الفقہ کی شرح الفیہ میں اس بحث کی تحقیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ صرف پہلی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر چاروں خلفاء کسی بات پر متفق ہو جائیں تو وہ حجت ہے کسی بھی ایک خلیفہ کی بات حجت نہیں ہے اور یہ بھی تحقیق کی ہے کہ اقتداء الگ چیز ہے اور تقلید الگ۔ اقتداء کو تقلید نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ ہم نے شرح نظم الکافل میں اجماع کی بحث میں اس کی تحقیق کی ہے۔

۳۴۸- وعن خارجة بن حذافة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: إن الله أمدكم بصلاة هي خير لكم من حمر النعم، قلنا: وما هي يا رسول الله؟ قال: الوتر، ما بين صلاة العشاء إلى طلوع الفجر. رواه الخمسة إلا النسائي، وصححه الحاكم.

وروى أحمد عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده نحوه.

خارجہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت(۱) ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نماز کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے" ہم نے پوچھا: "یا رسول اللہ وہ کونسی نماز ہے؟" آپ نے فرمایا: نماز وتر جو عشاء کے بعد سے لے کر طلوع فجر تک ہے۔ اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے(۲)۔ اور احمد نے عمرو بن شعیب سے' اپنے باپ سے' اپنے دادا سے اسی طرح روایت کیا(۳) ہے۔

(۱) آپ قرشی عدوی ہیں ہزار گھڑ سواروں کے برابر سمجھے جاتے تھے روایت ہے کہ عمرو بن عاص نے حضرت عمرؓ سے تین ہزار گھڑ سواروں کی کمک طلب کی تو حضرت عمرؓ نے صرف تین آدمی بھیج دیئے اور وہ تھے۔ خارجہ بن حذافہ' زبیر بن عوام اور مقداد بن الاسود' حضرت عمرؓ نے خارجہ کو عمرو بن عاص کے لئے مصر میں قضاء کا والی بنایا۔ اور بعض کہتے ہیں خارجہ مصر میں پولیس اور فوج کے افسر اعلیٰ تھے۔ خارجہ کو ایک خارجی نے عمرو بن عاص گمان کرتے ہوئے شہید کر دیا۔ جبکہ خوارج نے تین آدمیوں کے قتل کا آپس میں عہد و پیمان کیا تھا اور وہ تھے حضرت علی' معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم۔ امیرالمومنین حضرت علی کے حق میں اللہ کا امر پورا ہوا اور باقی دو بچ گئے۔ اور عمرو بن عاص کی جگہ غلطی سے خارجہ شہید کر دیئے گئے کسی شاعر نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

فلیتها اذ فدت عمرا بخارجه

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اے کاش اگر یوں ہوتا کہ جس طرح عمر کی جگہ خارجہ نے شہادت کا فدیہ قبول کیا

فدت علیا بمن شاءت من البشر

حضرت علی کی جگہ بھی کسی اور بشر کی شہادت بھی قبول کرتی۔ (قدرت الٰہیہ)

حضرت خارجہؓ ۴۰ھ میں شہید ہوئے۔

(۲) میں کہتا ہوں کہ ترمذی نے یہ حدیث روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ "خارجہ بن حذافہ کی حدیث غریب ہے۔ ہم اسے یزید بن ابی حبیب کی حدیث کے سوا نہیں پہچانتے۔ اور بعض محدثین نے اس حدیث میں وہم کیا ہے پھر اس میں وہم کا بیان کیا لہٰذا مصنف کے لئے بہتر تھا کہ وہ تو ترمذی کے قول سے متنبہ ہو جاتے۔ اور اس حدیث میں "امدکم" کا لفظ وتر کے عدم وجوب کا فائدہ دیتا ہے۔ کیونکہ امداد ایسی زیادتی ہے جو تقویت میں اضافہ کرے۔ کہتے ہیں مدالجیش وامدہ جب لشکر میں اور آدمی بھیجے جائیں جو اسے تقویت پہنچائیں اور دوات کی مدد سے مراد ایسی چیز کا اضافہ ہے جو دوات کو درست کرو ے۔ اسی طرح چراغ کی مدد تیل سے اور زمین کی مدد کھاد سے ہوتی ہے جو ان کی اصلاح کر دیتے ہیں۔

نوافل کے مشروع ہونے کی حکمت۔ احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ اور حاکم نے تمیم داری کی حدیث کو مرفوعاً روایت کیا کہ "قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے اس کی نماز کا حساب لیا جائے گا۔ اگر پوری ہوئیں تو پوری لکھ لی جائیں گی اور اگر ناتمام ہوئیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائے گا۔ میرے بندے کی نفلی نمازیں دیکھو اور ان سے اس کی فرض نمازوں کی کمی پوری کر دو۔ پھر زکوۃ کا بھی ایسا ہی معاملہ ہو گا پھر اسی طرح اس کے تمام اعمال کا مواخذہ ہو گا" اور حاکم نے "الکنیٰ" میں ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا کہ "سب سے پہلے میری امت پر اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کیں اور ان کے اعمال میں سے سب سے پہلے یہی پانچ نمازیں اٹھائی جائیں گی اور سب سے پہلے ان پانچ نمازوں سے متعلق ہی لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔ اگر کسی نے ان سے کچھ ضائع کیا ہو گا تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائیں گے "میرے بندے کی نفلی نمازوں کی طرف دیکھو کیا تم ایسی چیز پاتے ہو جس سے فرضوں کی کمی پوری کر سکو۔ اور میرے بندے کے ماہ رمضان کے روزوں کی طرف نظر کرو۔ اگر ان میں کوئی چیز ضائع ہو گئی تو اس کے نفلی روزوں کو دیکھو جس سے اس کے روزوں کی کمی کو پورا کر سکو۔ اور میرے بندے کی زکوۃ کو دیکھو اگر اس سے کچھ ضائع ہو گئی ہو تو اس کے نفلی صدقات کو دیکھ کر اس کی زکوۃ کی کمی کو پورا کر دو۔ پھر اللہ کے فرائض کا اسی طرح حساب لیا جائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا عدل ہے۔ اگر اس کی کوئی زائد چیز پائی گئی تو وہ اس کی میزان میں رکھ دی جائے گی اور کہا جائے گا کہ اسے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حال میں جنت میں داخل کرو کہ وہ مسرور ہے۔ اور اگر اس کے لئے کوئی بھی ایسی چیز نہ پائی گئی تو جہنم کے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ اسے اس کے دونوں ہاتھوں اور پاؤں سے پکڑلیں پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا" اور یہ حدیث گویا تمیم داری کی حدیث کی ہی شرح و تفصیل ہے۔

(۳) یعنی خارجہ کی حدیث کی طرح اس کی شرح بھی اسی کی شرح ہے۔

۳۴۹- وعن عبد الله بن بريدة، عن أبيه رضي الله تعالى عنهما، قال: قال رسول الله ﷺ: «الوتر حق، فمن لم يوتر فليس منا». أخرجه أبو داود بسند لين، وصححه الحاكم، وله شاهد ضعيف عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه عند أحمد.

عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ(۱) اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وتر پڑھنا ضروری(۲) ہے اور جو وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں۔" اسے ابوداؤد نے کمزور(۳) سند سے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح کہا(۴)۔ اور اس حدیث کا ایک ضعیف شاہد احمد کے ہاں(۵) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے۔

(۱) بریدۃ بن الحصیب اسلمی کے بیٹے عبداللہ ثقات تابعین میں سے ہیں۔ اپنے باپ سے، سمرۃ ابن جندب اور دوسروں سے سماع کیا مرو میں قضا کے منصب پر فائز ہوئے اور وہیں فوت ہوئے۔

(۲) اصل عبارت میں حق بمعنی لازم کا لفظ آیا ہے اور یہ حدیث وتر کے وجوب کے دلائل سے ایک دلیل ہے۔

(۳) کیونکہ اس کی سند میں عبداللہ بن عبداللہ العتکی ہے جسے بخاری اور نسائی نے ضعیف کہا ہے اور ابو حاتم نے صالح الحدیث کہا ہے۔

(۴) اور ابن معین نے کہا کہ یہ حدیث موقوف ہے۔

(۵) جسے ان لفظوں سے روایت کیا ہے: "جو وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں" اس کی سند میں خلیل بن مرۃ ہے جو منکر الحدیث ہے اور اس کی سند منقطع ہے جیسا کہ احمد نے کہا ہے اور ہم سے نہیں کا معنی یہ ہے کہ وہ ہماری سنت اور ہمارے طریقہ پر نہیں اور یہ حدیث وتر کے سنت موکدہ ہونے پر محمول ہے اور عدم وجوب پر دلالت کرنے والی حدیثوں میں اس سے تطبیق ہو سکتی ہے۔

۳۵۰- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: ما كان رسول الله ﷺ يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة، يصلّي أربعاً، فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلّي أربعاً، فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلّي

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثلاثاً، قالت عائشة فقلت: يا رسول الله أتنام قبل أن توتر؟ قال: يا عائشة إن عيني تنامان، ولا ينام قلبي. متفق عليه.

وفي رواية لهما عنها رضي الله تعالى عنها كان يصلّي من الليل عشر ركعات، ويوتر بسجدة، ويركع ركعتي الفجر، فتلك ثلاث عشرة.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رمضان ہو یا غیر رمضان' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ آپ چار(۱) چار کر کے پڑھتے۔ ان کی خوبی اور ان کی لمبائی کے متعلق مت(۲) پوچھو۔ پھر آپ تین رکعت پڑھتے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا آپ وتروں سے پہلے(۳) سو جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: عائشہ! میری آنکھیں (۴) سو جاتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا۔ متفق علیہ۔ اور بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہؓ ہی سے(۵) روایت ہے کہ آپ رات کی نماز دس رکعتیں پڑھتے(۶)۔ پھر ایک(۷) وتر پڑھتے پھر دو رکعت فجر کی سنتیں پڑھتے تو یہ کل تیرہ رکعتیں بن جاتیں(۸)۔

(۱) ممکن ہے آپ چار رکعت اکٹھی پڑھتے ہوں جیسے بظاہر معلوم ہوتا ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ آپ دو دو کر کے پڑھتے ہوں اور یہ بعید از قیاس ہے الا یہ کہ اس طرح اس حدیث کی موافقت ہو جاتی ہے "رات کی نماز دو دو رکعت ہے"

(۲) حضرت عائشہؓ نے یہ پوچھنے سے روک دیا۔ اس لئے کہ مخاطب اگر ایسی رکعتیں پڑھنے پر قادر نہیں تو پھر اس کا کیا فائدہ؟ یا اس لئے کہ مخاطب کو آپ کی نماز کی خوبی اور لمبائی کا شہرت کی وجہ سے علم تھا یا اس لئے کہ خود حضرت عائشہ نماز کی خوبی اور لمبائی بیان کرنے سے اپنے آپ کو قاصر سمجھتی تھیں۔

(۳) گویا آپ دوسری بار چار رکعت پڑھنے کے بعد سو جاتے۔ پھر اٹھ کر تین رکعت پڑھتے۔ اور حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم تھا کہ نیند وضوء کی ناقض ہے لہٰذا حضرت عائشہؓ نے یہ سوال کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ جواب دیا۔

(۴) یہ جملہ اس بات پر دلیل ہے کہ وضوء کو توڑنے والی دل کی نیند ہے اور جو شخص بھی ایسی گہری نیند سوئے اس کا وضوء ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نیند سے وضوء نہ ٹوٹنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے ہو۔ مصنف نے تلخیص میں اسی بات کی صراحت کی ہے اس نے اسی حدیث سے نیز ابن عباس کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو جاتے حتیٰ کہ خراٹے لیتے پھر اٹھتے اور نماز پڑھتے اور وضوء نہیں کرتے تھے" اور بخاری میں ہے کہ "انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے"

(۵) جاننا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کی کیفیت اور رکعات کی تعداد کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی روایات میں اختلاف ہے چنانچہ ان سے فجر کی دو سنتوں کے علاوہ سات' نو اور گیارہ رکعت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایت کی گئی ہیں- انہی میں سے ایک روایت یہ ہے-
(٦) ظاہر الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اکٹھی دس رکعتیں پڑھتے اور ان میں بیٹھتے نہیں تھے-
(٧) اصل عبارت میں سجدہ کا لفظ ہے جس سے مراد رکعت ہے-
(٨) اور ایک روایت میں ہے کہ "آپ رات کی نماز تیرہ رکعت پڑھتے پھر جب صبح کی اذان سنتے تو دو ہلکی پھلکی رکعتیں پڑھ لیتے تو یہ کل پندرہ رکعت بن جاتیں" حضرت عائشہ کی روایات میں چونکہ اختلاف ہے اس لئے بعض لوگوں نے یہ گمان کیا کہ یہ حدیث مضطرب ہے حالانکہ ایسی بات نہیں بلکہ یہ روایات مختلف اوقات پر محمول ہیں- یعنی آپؐ حسب نشاط یا طبیعت کی دلجمعی کی نسبت سے ان میں کمی بیشی کر لیتے تھے اور یہ سب صورتیں جائز ہیں اور حضرت عائشہؓ یا کسی دوسرے کے متعلق ایسی بات کہنا مناسب نہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اغلب فعل کی خبر دی ہے- لہٰذا اگر اس میں اختلاف ہو تو وہ ایک دوسرے کا منافی نہیں کیونکہ وہ کبھی کبھار ہونے والے واقعہ کی اطلاع ہے-

٣٥١- وعنها رضي الله تعالى عنها قالت: كان رسول الله ﷺ يصلّي من الليل ثلاث عشرة ركعة، يوتر من ذلك بخمس، لا يجلس في شيء إلا في آخرها.

اور حضرت عائشہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز تیرہ رکعت پڑھتے(١)- ان میں سے پانچ کو وتر بنا لیتے اور صرف آخری رکعت میں تشہد بیٹھتے(٢)-
(١) حضرت عائشہؓ نے اس کی کوئی تفصیل نہیں بتلائی اور نہ یہ وضاحت کی کہ آپؐ نے کتنی رکعت کے بعد سلام پھیرا جیسا کہ گزشتہ حدیث میں یہ بات ثابت ہے یہ بات صرف وتر سے ثابت ہوتی ہے-
(٢) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر پڑھنے کی انواع میں سے یہ بھی ایک نوع ہے جیسا کہ ایک قسم تین وتروں کی ادائیگی ہے جیسے گزشتہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے-

٣٥٢- وعنها رضي الله تعالى عنها قالت: من كل الليل قد أوتر رسول الله ﷺ، فانتهى وتره إلى السحر. متفق عليهما.

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے ہر حصے میں(١) وتر پڑھ لیا کرتے تھے- مگر آخر میں آپ نے سحر کے وقت وتر پڑھنا مقرر کیا- متفق علیہ(٢)-
(١) یعنی رات کے پہلے یا درمیانی یا آخری حصے میں-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) یعنی ان دونوں حدیثوں پر شیخین متفق ہیں۔ اور اس حدیث میں وتر کے وقت کی وضاحت ہے کہ نماز عشاء کے بعد ساری رات ہی اس کا وقت ہے اور خارجہ کی حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وتر کا وقت نماز عشاء کے بعد سے لے کر طلوع فجر تک ہے اور وتر کی جو انواع وارد ہوئی ہیں وہ ہم نے "ضوء النہار" کے حاشیہ میں درج کر دی ہیں۔

۳۵۳ - وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله تعالى عنهما قال: قال لي رسول الله ﷺ: يا عبد الله لا تكن مثل فلان، كان يقوم من الليل، فترك قيام الليل. متفق عليه.

عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! فلاں شخص(۱) کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو قیام کرتا تھا پھر اس نے رات کا قیام چھوڑ دیا۔ متفق علیہ۔

(۱) مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ کسی بات میں کسی شخص کا نام نہ لینا بھی ایک طریقہ ہے اور ایسے ابہام کا مقصد پردہ پوشی ہے۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ قیام اللیل واجب نہیں اگر واجب ہوتا تو آپؐ اتنی بات پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اس شخص کی پوری طرح مذمت کرتے۔ نیز اس میں کسی اچھی عادت میں کمی نہ کرنے اور اسے ہمیشہ جاری رکھنے کا استحباب ہے۔ نیز اس سے عبادت منقطع کر دینے کی کراہت مستنبط ہوتی ہے۔

۳۵۴- وعن علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «أوتروا يا أهل القرآن! فإن الله وتر، يحب الوتر». رواه الخمسة، وصححه ابن خزيمة.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے قرآن والو! وتر پڑھا کرو کیونکہ اللہ خود بھی وتر(۱) ہے۔ اور وتر کو پسند کرتا(۲) ہے۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا(۳)۔

(۱) یعنی اپنی ذات میں ایک ہے۔ جو نہ تقسیم کو قبول کرتا ہے اور نہ تجزیہ کو' نیز وہ اپنی صفات میں اکیلا ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے اور نہ مثال' نیز وہ اپنے افعال میں منفرد ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ مددگار۔

(۲) وتر پڑھنے والے کو اجر و ثواب دیتا اور اس کا عمل قبول کرتا ہے۔

(۳) اہل قرآن سے مراد مومن ہیں جنہوں نے قرآن کی تصدیق کی بالخصوص وہ جنہوں نے حفظ کیا اس کی تلاوت کرتے رہتے اور اس کی حدود و احکام کو ملحوظ رکھتے ہیں اور وجہ یہ بتلائی کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے۔ قاضی عیاض کہتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں کہ جس کسی سے کوئی ادنیٰ سی بھی مناسبت ہو اس سے پیار ہوتا ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ یہاں امر استحباب کے لئے ہے اس لئے کہ وتر کے عدم وجوب پر پہلے دلائل گزر چکے ہیں۔

۳۵۵- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، عن النبي ﷺ قال: «اجعلوا آخر صلاتكم بالليل وتراً». متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات کی نماز میں وتر کی نماز کو آخری بنایا کرو۔ متفق علیہ (۱)۔

(۱) فتح الباری میں ہے کہ سلف نے دو جگہوں میں اختلاف کیا ہے۔ ایک وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کی مشروعیت میں' دوسری جو شخص وتر پڑھنے کے بعد نفل پڑھنے کا ارادہ کرے تو کیا اس کے پہلے وتر کافی ہوں گے اور جتنے چاہے نفل پڑھ لے یا پہلے وتر کا جوڑا بنائے پھر نفل پڑھے؟ پھر جب وہ جوڑا بنا لے تو کیا پھر اسے وتر پڑھنا ہوں گے یا نہیں؟ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ مسلم میں ابو سلمہ عن عائشہ کے طریق سے آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اور بعض اہل علم کا یہی مذہب ہے۔ اور آپؐ نے اپنے قول "رات کی آخری نماز وتر بنایا کرو" میں امر کا صیغہ استعمال فرمایا۔ جو اس شخص سے مختص ہے جو رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھے اور جو اس کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ دو رکعتیں وہی فجر کی رکعتیں ہیں اور نووی نے اسے اس بات پر محمول کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام اس لئے کیا کہ وتر کے بعد نفل اور بیٹھ کر نفل پڑھنے کے جواز کی وضاحت ہو جائے۔ اور دوسری بات کے متعلق اکثر کا مذہب یہ ہے کہ وہ جتنی چاہے جوڑے جوڑے نماز پڑھے اس کا پہلا وتر برقرار رہے گا جیسا کہ درج ذیل ہے۔

۳۵۶- وعن طلق بن علي رضي الله تعالى عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا وتران في ليلة. رواه أحمد والثلاثة، وصححه ابن حبان.

طلق بن علی سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک رات میں دوبار وتر نہیں۔ اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا(۱)۔

(۱) یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وتر کے بعد جتنے چاہے جوڑے کر کے نفل پڑھ لے اور بعد میں وتر نہ پڑھے۔ یہ آپؐ کے فعل پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوا ہے۔ ورنہ جب وہ اپنے پہلے وتر کا جوڑا بنائے گا اور جتنے جوڑے پڑھے گا آخر میں ایک ہی وتر باقی رہ جائے گا اور ابن عمر سے متعلق یہ روایت بھی ہے کہ جب ان سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ جب تجھے صبح کا یا نیند کا ڈر نہ ہو تو جوڑا بنا پھر جتنی چاہے نماز پڑھ لے پھر وتر پڑھ لے۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۵۷- وعن أبي بن كعب رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ يوتر «بسبح اسم ربك الأعلى» و «قل يا أيها الكافرون» و «قل هو الله أحد» رواه أحمد وأبو داود والنسائي، وزاد: ولا يسلم إلا في آخرهن.

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتروں میں (پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد) سبح اسم ربک الاعلیٰ (دوسری میں) قل یا ایہا الکافرون اور (تیسری میں) قل ہو اللہ احد پڑھا کرتے تھے اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا اور نسائی میں اتنا زیادہ ہے کہ آخری رکعت میں سلام پھیرتے(۱)۔

(۱) اس حدیث میں تین وتر پڑھنے پر دلیل ہے جبکہ اس سے ابوہریرہ کی یہ حدیث معارض ہے "تین وتر نہ پڑھا کرو" اور اسے حاکم نے صحیح کہا ہے نیز حاکم نے ابن عباسؓ اور عائشہؓ کی تین وتروں کی کراہت والی روایت کو بھی صحیح کہا ہے اور ہم ان میں تطبیق کی صورت پہلے پیش کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں تین وتر بھی وتر کی انواع میں سے ایک نوع ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔ لہٰذا اس میں تعین نہیں کیا جا سکتا۔ حنفیہ اور ہادویہ تین وتر کے تعین کی طرف گئے ہیں کہ وہ اکٹھے پڑھے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کا تین وتر اکٹھے پڑھنے کے جواز پر اجماع ہے۔ اور باقی علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے اور جو اس سے دلیل لیتا ہے وہ اجماع سے لیتا ہے اور انہیں اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس پر صحابہ کا اجماع ثابت نہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔

۳۵۸- ولأبي داود والترمذي نحوه عن عائشة رضي الله تعالى عنها، وفيه: كل سورة في ركعة، وفي الأخيرة «قل هو الله أحد» و «المعوذتين».

اور ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح مروی ہے اس میں یہ لفظ ہیں کہ آپ ہر رکعت میں ایک سورت (۱) پڑھتے اور آخری رکعت میں قل ہو اللہ احد اور معوذتین پڑھتے(۲)۔

(۱) یعنی پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی اور دوسری میں قل یا ایہا الکافرون جیسا کہ ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

(۲) حضرت عائشہ کی اس روایت میں کمزوری ہے کیونکہ اس کی سند میں خصیف الجزری ہے۔ نیز اسے ابن حبان اور دار قطنی نے یحییٰ بن سعید عن عمرہ عن عائشہ کے طریق سے روایت کیا ہے عقیلی کہتے ہیں کہ اس کی اسناد صالح ہیں اور ابن الجوزی کہتے ہیں کہ احمد اور یحییٰ بن معین نے معوذتین کے اضافہ کو ناپسند کیا ہے۔ اور ابن سکن نے عبداللہ بن سرجیلی کی ایک غریب سند والی حدیث سے اس کا ایک شاہد روایت کیا ہے۔

۳۵۹- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه أن النبي ﷺ قال: «أوتروا قبل أن تصبحوا». رواه مسلم.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ولابن حبان: من أدرك الصبح ولم يوتر، فلا وتر له.

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صبح ہونے سے پہلے پہلے وتر پڑھ لیا کرو(۱)" اسے مسلم نے روایت کیا۔ اور ابن حبان میں ابو سعید سے روایت ہے کہ جو شخص صبح ہونے تک وتر نہ پڑھ سکے' اس کے کوئی وتر نہیں(۲)۔

(۱) اس بات پر دلیل ہے کہ وتر طلوع فجر سے پہلے ہی پڑھے جا سکتے ہیں۔

(۲) یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وقت نکل جانے کے بعد وتر جائز نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس کی قضاء درست نہیں تو یہ بات غلط ہے جبکہ کسی نے دانستہ طور پر وتر ترک نہ کئے ہوں کیونکہ اس نے ایک بہت بڑی سنت کو ضائع کیا جس کا تدارک ممکن نہیں اور ابن المنذر نے سلف کی ایک جماعت سے بیان کیا کہ وتر کا وہ وقت جو فجر ہونے پر ختم ہو جاتا ہے وہ اختیاری ہے اور اس کا اضطراری وقت صبح کی نماز تک رہتا ہے البتہ جو شخص سونے یا بھول جانے کی وجہ سے وتر نہ پڑھ سکے اس کا حکم درج ذیل حدیث میں ہے۔

۳۶۰۔ وعنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من نام عن الوتر أو نسيه، فليصل إذا أصبح أو ذكر». رواه الخمسة إلا النسائي.

اور ابو سعید خدری ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص وتر پڑھنے سے پہلے سو جائے یا جو بھول جائے تو سونے والا صبح کے وقت وتر پڑھ لے اور بھولنے والے کو جب یاد آجائے۔ اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ وتر سے پہلے سونے والے اور بھولنے والے کا وہی حکم ہے جو فرض نمازوں سے سونے اور بھولنے والے کا ہے کہ سونے والا بیدار ہونے پر اور بھولنے والا یاد آنے پر انہیں ادا کرے اور قیاس یہی ہے کہ سونے والے یا بھولنے والے کی نماز ادا ہوئی ہے قضاء نہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔

۳۶۱۔ وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من خاف أن لا يقوم من آخر الليل فليوتر أوّله، ومن طمع أن يقوم آخره فليوتر آخر الليل، فإن صلاة آخر الليل مشهودة، وذلك أفضل». رواه مسلم.

جابر (بن عبداللہ) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو یہ خطرہ ہو کہ وہ آخر رات بیدار نہ ہو سکے گا' وہ رات کے پہلے حصہ میں وتر پڑھ لے اور جو آخر رات جاگنے کی امید رکھتا ہو وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخر رات میں پڑھے کیونکہ آخری رات میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور افضل ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ وتروں کو موخر کرنا افضل ہے لیکن اگر یہ خطرہ ہو کہ بیدار نہ ہو سکے گا تو پہلے پڑھ لے تاکہ فوت نہ ہو جائیں سلف کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے کہ یہ دونوں صورتیں درست ہیں اور نماز کے مشہود ہونے کا معنی یہ ہے کہ آخری رات کی نماز میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

۳۶۲- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، عن النبي ﷺ قال: «إذا طلع **الفجر فقد ذهب كل صلاة الليل، والوتر، فأوتروا قبل طلوع الفجر**». رواه الترمذي.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب فجر طلوع ہو جائے تو رات کی سب(۱) نمازوں کا اور وتر(۲) کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طلوع فجر سے پہلے وتر پڑھ لیا کرو(۳)"۔ اسے ترمذی نے (۴) روایت کیا۔

(۱) یعنی وہ نوافل جو رات کو مشروع ہیں۔

(۲) یہ عام پر خاص کا عطف ہے وتر کی عظمت کی وضاحت کے لئے اس کا الگ بھی ذکر کیا گیا۔

(۳) وتروں کی شان کی وجہ سے ان کی ادائیگی کا خصوصی حکم دیا گیا اور واضح کیا گیا کہ وتر رات کی نماز میں اہم چیز ہے اور رات گزر جانے پر اس کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

ابو سعید خدری کی حدیث میں پہلے گزر چکا ہے کہ سونے والا بیدار ہونے پر اور بھولنے والا یاد آنے پر وتر ادا کر سکتا ہے اور یہ حکم وتر سے خاص ہے تو معلوم ہوا کہ ان دو عذروں کے علاوہ اگر کوئی وتر چھوڑ دے تو رات گزر جانے پر وتر کا وقت بھی گزر جاتا ہے۔ نیند کی وجہ سے ترک ہونے کے بارے میں ترمذی میں مذکور حضرت عائشہؓ کی حدیث یوں ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نیند یا آنکھوں کے غلبہ کی وجہ سے رات کو رات کی نماز ادا نہ کر سکتے تو صبح کو بارہ رکعت پڑھ لیتے" ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس طرح گویا تلافی مافات ہو جاتی ہے۔

(۴) میں کہتا ہوں کہ ترمذی نے یہ حدیث روایت کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی سند میں سلمان بن موسیٰ ان الفاظ کے بیان کرنے میں منفرد ہے۔

۳۶۳- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كان رسول الله ﷺ يصلّي الضحى أربعاً، ويزيد ما شاء الله. رواه مسلم.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضحیٰ کی نماز چار رکعت پڑھا کرتے اور جب اللہ چاہتا تو زیادہ بھی کر لیتے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(ا)۔

(ا) یہ حدیث ضحیٰ یا چاشت کی نماز کی شرعیت پر دلیل ہے اور اس کی کم از کم چار رکعت ہیں اور بعض کے نزدیک دو رکعت ہیں جیسا کہ ابوہریرہ کی حدیث میں ہے "اور چاشت کی دو رکعت" ابن دقیق العید کہتے ہیں شاید کم از کم رکعت کا ذکر آپ کے فعل میں تاکید پائے جانے کی وجہ سے ہے۔ اور اس میں چاشت کی نماز کے مستحب ہونے پر دلیل ہے اور وہ کم از کم دو رکعت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کام کو ہمیشہ نہ کرنا اس کے مستحب ہونے کے منافی نہیں کیونکہ یہ قول سے دلیل ہے اور حکم کے لئے یہ شرط نہیں ہوتی کہ بہت سے قولی اور فعلی دلائل اس کی تائید کریں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس فعل پر ہمیشگی کی ہو وہ اس فعل سے راجح ہو گا جس پر ہمیشگی نہ کی ہو۔

رہا اس کے حکم کا معاملہ تو ابن قیم نے اقوال جمع کئے تو وہ چھ بن گئے پہلا یہ کہ یہ مستحب سنت ہے' دوسرا یہ کہ یہ صرف سبب کی بنا پر مشروع ہے' تیسرا یہ کہ اصلا" یہ مستحب نہیں' چوتھا یہ کہ مستحب یہ ہے کبھی اسے کیا جائے اور کبھی چھوڑ دیا جائے' پانچواں یہ کہ گھروں میں اس پر ہمیشگی کرنا مستحب ہے اور چھٹا یہ کہ یہ بدعت ہے۔ اور اس مقام پر ابن قیم نے ہر قول کی بنائے استدلال بھی ذکر کی ہے اور ان سب میں راجح قول یہ ہے کہ یہ سنت مستحبہ ہے جیسا کہ ابن دقیق العید نے کہا ہے اور حضرت عائشہؓ کی درج ذیل حدیث اس کی معارض ہے۔

٣٦٤- وله عنها أنها سئلت: هل كان رسول الله ﷺ يصلي الضحى؟ قالت: لا إلا أن يجيء من مغيبه.

اور مسلم میں حضرت عائشہ ہی کی روایت ہے کہ انہیں پوچھا گیا کہ "آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی نماز پڑھا کرتے تھے؟ تو حضرت عائشہ نے کہا نہیں' مگر جب آپ سفر سے واپس آتے(ا)۔

(ا) پہلی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ہمیشہ یہ نماز پڑھا کرتے تھے کیونکہ لفظ کان تکرار پر دلالت کرتا ہے اور یہ دوسری حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ جب سفر سے واپس آتے تو صرف اس وقت یہ نماز پڑھتے تھے اور ان میں جمع کی صورت یہ ہے کہ لفظ کان دوام پر نہیں بلکہ غالب پر دلالت کرتا ہے اور جب قرینہ اس کے خلاف قائم ہو گیا تو صورت حال بدل گئی اور دوسرے لفظ غالب نے اسے دوام سے پھیر دیا اور حضرت عائشہؓ کے قول کہ "آپ صرف سفر سے واپسی پر پڑھتے تھے" سے مراد حضرت عائشہ کی چاشت کی نماز کی روایت سے نفی ہے کہ وہ صرف اس وقت آپؐ کو نماز چاشت پڑھتے دیکھتی تھیں آگے پیچھے نہیں۔ اور پہلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیث میں خبر ہے جو حضرت عائشہ کو پہنچی کہ آپ چاشت کی نماز ترک نہیں کرتے تھے لیکن درج ذیل حدیث اس توجیہ کو کمزور بنا دیتی ہے۔

ولہ عنها: ما رأيت رسول الله ﷺ يصلي سبحة الضحى قط، وإني لأسبحها.

اور مسلم(۱) میں حضرت عائشہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی چاشت کی نماز پڑھتے نہیں دیکھا البتہ میں یہ نماز ضرور پڑھتی ہوں(۲)۔

(۱) یہ روایت بخاری میں بھی بلفظہ موجود ہے لہٰذا اگر مصنف لہ کے بجائے لھما کہتا تو زیادہ مناسب تھا۔

(۲) گویا حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی رویت کی نفی کی اور اپنے فعل کی خبر دی اس فعل کے محرک وہ اقوال اور ترغیب تھی جو حضرت عائشہؓ کو دوسروں سے پہنچی۔ لہٰذا ان الفاظ میں تعارض نہ رہا۔ بیہقی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ کے قول سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو یہ نماز پڑھتے یا اس پر ہمیشگی کرتے نہیں دیکھا' اور ابن عبدالبر کہتے ہیں۔ راجح وہ بات ہے جس پر شیخین کا اتفاق ہے اور وہ اثبات کی روایت ہے اور نفی رویت کی روایت صرف مسلم میں ہے وہ کہتے ہیں حضرت عائشہؓ کی عدم رویت عدم وقوع کو مستلزم نہیں جسے دوسروں نے ثابت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اثبات نماز چاشت میں جس روایت پر شیخین متفق ہیں وہ صحیحین میں مروی ابوہریرہ کی یہ حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ کو یہ وصیت کی کہ وہ چاشت کی دو رکعت کبھی نہ چھوڑیں" اور ترغیب میں آپ کے فعل پر بہت سی احادیث ہیں علاوہ ازیں دوسری کتب احادیث میں بھی متعدد احادیث درج ہیں۔

۳۶۵۔ وعن زيد بن أرقم رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «صلاة الأوابين حين ترمض الفصال». رواه الترمذي.

زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز اوابین(۱) کا وقت وہ ہے جب اونٹنی کے بچے دھوپ کی شدت(۲) محسوس کرنے لگیں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا(۳)۔

(۱) اوابین جمع اواب ؛معنی گناہوں کو چھوڑنے اور اچھے کام کرنے کے اقرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔

(۲) ترمض یعنی جب ریت پر دھوپ پڑنے سے زمین حرارت کی شدت سے تپ جائے اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سورج بلند ہو چکا ہو اور اس کی تاثیر گرمی ہو اور فصال' فصیل کی جمع ہے ؛معنی اونٹنی کا بچہ اور اسے فصیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ماں سے جدا ہو جاتا ہے۔
(۳) اور رکعات کی تعداد کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ بزار نے ثوبان کی حدیث سے روایت کیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصف النہار کے بعد نماز پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ تو حضرت عائشہؓ نے کہا: "یا رسول اللہ! آپ اس گھڑی میں نماز پسند فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس گھڑی میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی خلقت کو رحمت کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ ایسی نماز ہے جس پر حضرت آدمؑ نوحؑ ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے محافظت کی۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی متروک ہے۔ اور بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اس نماز کی رکعت چار ہیں۔

۳۶۶- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«مَنْ صلّى الضحى ثنتي عشرة ركعة، بنى الله له قصراً في الجنة»**. رواه الترمذي، واستغربه.

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نماز چاشت کی بارہ رکعت پڑھے اللہ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور اسے غریب کہا(ا)۔
(ا) مصنف کہتے ہیں کہ اس کی اسناد ضعیف ہیں اور بزار نے ابن عمر سے روایت کی کہ: میں نے ابوذر سے کہا: چچا! مجھے کچھ وصیت فرمائیے۔ ابوذر نے کہا تو نے مجھ سے وہ سوال کیا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: اگر تو چاشت کی دو رکعت پڑھتا رہے تو غافلوں میں نہیں لکھا جائے گا اور اگر چار رکعت پڑھے تو عابدوں میں لکھا جائے گا اور اگر چھ رکعت پڑھے تو گناہ سے بچا رہے گا اور اگر آٹھ رکعت پڑھے تو فرمانبرداروں میں لکھا جائے گا اور اگر بارہ رکعت پڑھے تو جنت میں تیرے لئے ایک گھر بنایا جائے گا" اس روایت کی سند میں حسین بن عطاء ہے جسے ابو حاتم وغیرہ نے ضعیف کہا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا کہ خطا بھی کرتا تھا اور تدلیس بھی۔ اور اس باب میں جتنی احادیث وارد ہیں کوئی بھی کلام سے نہیں بچی۔

۳۶۷- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: دخل رسول الله ﷺ بيتي، فصلّى الضحى ثماني ركعات. رواه ابن حبان في صحيحه.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں داخل ہوئے تو چاشت کی نماز آٹھ رکعت ادا کی۔ اسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا(ا)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ا) پہلے مسلم میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ "انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی نماز پڑھتے نہیں دیکھا" اور یہ حدیث حضرت عائشہ کے گھر میں آپؐ کی نماز کو ثابت کر رہی ہے۔ اور ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رویت کی نفی کی ہے اور ممکن ہے کہ آپ نے حضرت عائشہؓ کے گھر میں نماز پڑھی ہو مگر حضرت عائشہ نے انہیں نماز پڑھتے نہ دیکھا ہو۔ لیکن روایت سے ان پر یہ ثابت ہوا ہو۔ اور قاضی عیاض نے اسی وجہ کو پسند کیا ہے اور اس میں کچھ بعد نہیں کہ آپؐ نے حضرت عائشہ کے گھر نماز پڑھی ہو اور وہ اس وقت آپ کی نماز سے غافل رہی ہوں لہٰذا ان میں کچھ منافات نہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو تطبیق کرنا واجب ہے۔

نماز چاشت کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ یہ نماز ہر روز انسان کے جوڑوں کے صدقہ کا بدل بن جاتی ہے اور وہ تین سو ساٹھ جوڑ ہیں جیسا کہ مسلم میں ابوذرؓ کی وہ روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ "چاشت کی دو رکعت ان سے کفایت کرتی ہیں"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نماز باجماعت اور امامت کا بیان

٣٦٨- عن عبد الله بن عمر رضي الله تعالى عنهما أن رسول الله ﷺ قال: «**صلاة الجماعة أفضل من صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة**». متفق عليه.

ولهما عن أبي هريرة: «بخمس وعشرين جزءً» وكذا للبخاري عن أبي سعيد، وقال: «درجة».

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جماعت کی نماز کا اجر اکیلے کی نماز سے ستائیس گنا زیادہ ہے۔ متفق علیہ

اور انہی دونوں (بخاری، مسلم) میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں پچیس(١) گنا ہے اور اسی طرح(٢) بخاری میں ابوسعید کی روایت ہے اور اس میں (٣) درجہ کا لفظ ہے۔

(١) یعنی ستائیس درجے کے بجائے پچیس گنا

(٢) یعنی پچیس کا لفظ آیا ہے۔

(٣) یعنی جزء کے بجائے درجہ کا لفظ ہے۔

اس حدیث کو مذکورہ تین صحابہ کے علاوہ صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ انہی میں انس، عائشہ، صہیب، معاذ، عبداللہ بن زید اور زید بن ثابت ہیں۔ ترمذی نے کہا۔ صحابہ نے بالعموم پچیس درجے کا ذکر کیا ہے مگر ابن عمر نے ستائیس کا۔ اور ابن عمر ہی کی ایک روایت میں پچیس بھی ہے اور ان میں کچھ منافات نہیں۔ کیونکہ عدد کا تعین مقصود نہیں اور پچیس والی روایات بھی ستائیس کے تحت داخل ہیں۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے کم از کم عدد کی خبردی پھر زیادہ سے زیادہ کی اور یہ زیادتی اللہ کا مزید فضل ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ گمان کیا کہ سات اس شخص کے لئے ہے جو مسجد میں باجماعت نماز ادا کرے اور پانچ اس کے لئے جو مسجد کے علاوہ باجماعت ادا کرے اور بعض کہتے ہیں کہ سات مسجد سے دور والے کے لئے ہے اور پانچ قریب والے کے لئے۔ اور کچھ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے عجیب و غریب قسم کی مناسبتیں اور توجیہات پیش کی ہیں۔ مصنف نے ان سب کا فتح الباری میں ذکر کیا ہے اور وہ سب تخمینی اقوال ہیں جن پر کوئی نص نہیں۔

اور اس مقام پر جزء اور درجہ ایک ہی معنی ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئے ہیں اور ان دونوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لفظوں کی تفسیر نماز سے بھی آئی ہے۔ یعنی باجماعت نماز اکیلے کی ستائیس نمازوں کے برابر ہے اور یہ جماعت سے نماز ادا کرنے پر ابھارتی ہے۔ اور اس میں باجماعت نماز کے عدم وجوب پر دلیل ہے اور علماء کی ایک جماعت اس کے وجوب کی قائل ہے اور وہ درج ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

٣٦٩- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «**والذي نفسي بيده، لقد هممت أن آمر بحطب فيحتطب، ثم آمر بالصلاة فيؤذن لها، ثم آمر رجلا فيؤم الناس، ثم أخالف إلى رجال لا يشهدون الصلاة فأحرق عليهم بيوتهم، والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم أنه يجد عرقاً سميناً، أو مرماتين حسنتين لشهد العشاء**». متفق عليه، واللفظ للبخاري.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ (۱) میں میری جان ہے کہ میں نے (۲) ارادہ کیا کہ لکڑیاں اکھٹی کرنے کا حکم دوں پھر کسی کو نماز کا حکم دوں تو نماز کے لئے اذان کہی جائے پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو امامت کرائے اور خود لوگوں کے پاس (۳) جاؤں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دوں' اور اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر ان لوگوں کو معلوم ہو کہ انہیں ایک پر گوشت ہڈی (۴) یا گوشت والے اور اچھے بازو مل جائیں گے تو ضرور عشاء میں حاضر ہوتے۔ متفق علیہ اور یہ لفظ بخاری کے ہیں (۵)۔

(۱) یعنی اس کی ملک اور اس کے تصرف کے تحت ہے۔

(۲) یہ جواب قسم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قسم کھانا مذکورہ بات کے عظیم الشان اور اس کی اہمیت کی وضاحت اور ترک جماعت سے سرزنش کے لئے ہے۔

(۳) اصل عبارت میں لفظ اخالف آیا ہے کہتے ہیں خالف الی فلاں یعنی اس شخص کے پاس جاتا جو اس سے غائب ہو یا آنے سے اعراض کرے۔

(۴) اصل میں لفظ عرقا" ہے یعنی ایسی ہڈی جس پر گوشت ہو۔

(۵) یہ حدیث جماعت میں شمولیت کے واجب عین ہونے پر دلالت کرتی ہے کفایہ پر نہیں۔ کیونکہ جو جماعت میں شامل ہو جائیں گے وہ عقوبت کے مستحق نہ رہیں گے اور عقوبت صرف واجب کے ترک یا حرام کام کے کرنے پر ہوتی ہے۔ عطاء ' اوزاعی' احمد' ابو ثور' ابن خزیمہ' ابن المنذر' ابن حبان اور اہل بیت سے ابوالعباس سب اسے فرض عین قرار دیتے ہیں اور ظاہریہ بھی اس بات کے قائل ہیں۔ اور داؤد نے کہا کہ یہ نماز کی صحت کے لئے شرط ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ نماز کا ہر واجب نماز کے لئے شرط ہے اور اس کی یہ بات تسلیم نہیں کی گئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیونکہ شرط لگانے کے لئے دلیل ضروری ہے اسی لئے احمد وغیرہ' نے کہا کہ یہ بغیر شرط واجب ہے۔ اور ہادی مذہب سے اثر لے کر ابوالعباس اس کے فرض کفایہ ہونے کی طرف گئے اور معتقدین شافعیہ کی اکثریت بھی اور حنفیہ اور مالکیہ کی اکثریت بھی اسی طرف گئی ہے اور زید بن علی' الموید باللہ' ابوحنیفہ اور صاحبین' اور ناصر کا مذہب یہ ہے کہ یہ سنت موکدہ ہے۔

جو لوگ اس کے وجوب کے قائل ہیں وہ زیر بحث حدیث سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ عقوبت بالغہ صرف ترک فرائض پر ہوتی ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی احادیث ہیں جیسے ابن ام مکتوم کی حدیث "انہوں نے کہا: یارسول اللہ مجھے جو تکلیف ہے وہ آپ جانتے ہیں اور میرا کوئی رہنما بھی نہیں' اور میرے اور مسجد کے درمیان درخت بھی ہیں اور کھجوریں بھی اور میں ہمہ وقت کوئی رہنما رکھنے پر بھی قدرت نہیں رکھتا" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کیا اقامت سنتے ہو؟ ابن ام مکتوم نے کہا "ہاں" آپؐ نے فرمایا تو پھر جماعت میں حاضر ہوا کرو" اس حدیث کو احمد' ابن خزیمہ' حاکم اور ابن حبان نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے "کیا اذان سنتے ہو؟ انہوں نے کہا "ہاں" آپ نے فرمایا تو پھر آؤ خواہ گھسٹ کر آؤ" اور اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں اور ابن ام مکتوم کی حدیث اور ابن عباس کی حدیث آگے آرہی ہے۔ بخاری اس کے علی الاطلاق وجوب کے قائل ہیں اور اس باب کا عنوان یہ رکھا ہے "باجماعت نماز کے وجوب کا باب" یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ فرض عین ہے اگر یہ فرض کفایہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ والوں کا فعل اسے وجوب سے ساقط کر دیتا۔ رہی سزاؤں میں آگ سے جلانے کی بات' اگرچہ بالعموم اس کی نہی ثابت ہے مگر یہ خاص موقعہ ہے۔

اور جو اس کے فرض کفایہ ہونے کے قائل ہیں ان کے دلائل بھی وہی ہیں جو فرض عین کہنے والوں کے ہیں کیونکہ جو دلائل اس کے فرض عین ہونے پر دیئے جاتے ہیں انہی دلائل کو وہ فرض کفایہ کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

اور جو لوگ اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں انہوں نے اس حدیث کے جواب میں طویل بحث کی ہے مگر اس سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ قریب الفہم بات یہ ہے کہ آپؐ نے جو گھر جلانے کی بات کی تھی وہ محض سرزنش کے طور پر تھی حقیقت نہیں تھی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کیا نہیں تھا۔ نیز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی دلیل پیش کرتے ہیں جو ابوہریرہ کی حدیث میں یوں مذکور ہے "جماعت کی نماز اکیلے کی نماز سے افضل ہے" کیونکہ فضیلت میں شریک دونوں ہیں اگرچہ اکیلے کو وہ فضیلت نہیں جو جماعت میں شامل ہونے والے کی ہے نیز وہ اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں "اس وقت اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گھروں میں نماز پڑھ لیا کرو" گویا ان دونوں کے لئے اپنے اپنے گھروں میں نماز ثابت ہو گئی۔ اور یہ وضاحت نہیں کی کہ اس وقت گھروں میں جماعت ہو گی۔ اور یہ حدیث آگے آ رہی ہے۔

۳۷۰- وعنه رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «أثقل الصلاة على المنافقين صلاة العشاء وصلاة الفجر، ولو يعلمون ما فيهما لأتوهما ولو حبواً». متفق عليه.

اور انہی (ابوہریرہ) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منافقوں (۱) پر سب سے بھاری نماز عشاء اور (۲) فجر کی نماز ہے۔ اور اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں کتنا اجر ہے تو ضرور ان میں حاضر ہوں خواہ گھسٹ (۳) کر آئیں۔ متفق علیہ۔

(۱) منافقوں پر تو سب ہی نمازیں بھاری ہوتی ہیں کیونکہ وہ جب بھی نماز کو آتے ہیں تو سست اور ڈھیلے ڈھالے آتے ہیں لیکن مذکورہ نمازیں زیادہ بھاری ہیں۔

(۲) عشاء کی نماز اس لئے کہ وہ راحت اور سکون کا وقت ہوتا ہے اور فجر کی اس لئے کہ وہ نیند کا وقت ہوتا ہے اور ان کے لئے کوئی دینی داعیہ نہیں ہوتا اور نہ وہ ان کے اجر کو حقیقت سمجھتے ہیں جو انہیں نماز کو آنے پر آمادہ کروے اور ان پر آنا آسان ہو جائے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ رات کی تاریکی کے اوقات ہیں اور ریا کا داعیہ' جس کی وجہ سے وہ نماز پڑھتے ہیں' تقریباً مفقود ہوتا ہے کیونکہ اندھیرے میں کم ہی لوگ انہیں نماز پڑھتے دیکھ سکتے ہیں' اس طرح' ان دونوں نمازوں اور دوسری نمازوں میں بھی دینی محرک مفقود ہو جاتا ہے۔ اور دوسری نمازوں میں دنیوی محرک بھی' ان کے دینی محرک کے فقدان کو دیکھتے ہوئے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ولویعلمون مافیہما فرمایا جو آگے مذکور ہے۔

(۳) اصل عبارت میں حبواً کا لفظ ہے یعنی جیسے بچہ اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ابتداً چلتا ہے اور بعض اس کے معنی گھٹنوں کے بل گھسٹنا کہتے ہیں اور بعض سرینوں کے بل اور طبرانی میں ابوامامہ کی حدیث میں ہے یوں ہے کہ "خواہ وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بل گھسٹ کر آئے" اور طبرانی کی روایت میں یہ لفظ ہے "خواہ گھسٹ کر یا سرینوں کے بل آہستہ آہستہ چل کر"

اس حدیث میں ان دونوں نمازوں میں حاضر ہونے کی انتہائی ترغیب ہے۔ اور اگر مومن کو ان کے اجر کا علم ہو جائے تو وہ ہر حال میں ان میں حاضر ہو گا۔ منافق کو ان نمازوں میں حاضر ہونے میں جو چیز حائل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر ملنے والے اجر کو حقیقت نہیں سمجھتے نہ ان کے دل اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

١٧٣- وعنه قال: أتى النبي ﷺ رجل أعمى فقال: يا رسول الله! إنه ليس لي قائد يقودني إلى المسجد، فرخص له، فلما ولى دعاه فقال: هل تسمع النداء بالصلاة؟ قال: نعم، قال: فأجب. رواه مسلم.

اور انہی ' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نابینا(۱) آدمی آیا اور کہنے لگا "یارسول اللہ! میرے پاس کوئی رہنما نہیں جو مجھے مسجد تک لایا کرے تو آپ نے اسے گھر نماز پڑھنے کی رخصت دے دی(۳)- جب وہ واپس چلا تو آپ نے اسے بلایا اور پوچھا "کیا نماز کے لئے اذان کی آواز(۲) سنتے ہو؟ وہ کہنے لگا۔ "ہاں" آپ نے فرمایا "تو پھر اس کی پکار کو قبول کرو" اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اس کی تفسیر میں دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابن مکتوم تھے۔

(۲) اور ایک روایت میں نداء کے بجائے اذان کے لفظ ہیں۔

(۳) اولاً" رخصت مطلق تھی' اذان کی آواز سننے سے مقید نہیں تھی۔ لہذا آپ نے رخصت دے دی۔ پھر اس سے پوچھا کہ اذان سنتے ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ تو آپ نے اسے قبول کرنے اور مسجد میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اذان نہ سنتا تو اس کا عذر درست تھا۔ اور جب اذان سن لی تو حاضر نہ ہونے کے لئے کوئی عذر نہ رہا۔ یہ حدیث نماز باجماعت کے واجب عین ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ لیکن اس وجوب عین کو اذان سننے کی خبر سے مقید کرنا چاہئے کیونکہ حدیث اعمیٰ اور حدیث ابن عباس میں یہ قید موجود ہے اور جن احادیث میں اطلاق ہے انہیں مقید پر محمول کیا جائے گا۔

جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تو اب جان لیجئے کہ وجوب جماعت کا دعویٰ عین ہے یا کفایہ ہے۔ اور اس کی دلیل جلانے کے ارادہ والی حدیث اور حدیث اعمیٰ ہے اور یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں جماعت میں حاضر ہونے پر دلالت کرتی ہے اور وہ بھی اس کے لئے جو اذان سنے۔ اور یہ شرائط وجوب جماعت سے اخص ہیں اور اگر جماعت علی الاطلاق واجب ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نابینا کے لئے وضاحت فرما دیتے اور اسے فرماتے "دیکھ لو کون تمہارے ساتھ نماز ادا کرے گا؟ اور جماعت سے پیچھے رہنے والوں کے متعلق فرماتے۔ وہ نہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت میں حاضر ہوتے ہیں اور نہ اپنے گھروں میں جماعت کراتے ہیں۔ اور عندالضرورت وضاحت میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔ گویا یہ احادیث صرف اذان سننے والے کے لئے اور آپؐ ہی کی جماعت میں حاضری کے وجوب عین پر دلالت کرتی ہیں علی الاطلاق ہی جماعت کے واجب کفایہ یا عین ہونے پر نہیں کرتیں(۱)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان سننے والے کے لئے حاضر ہونے میں کوئی رخصت نہیں۔ اگرچہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نابینا کے لئے اور عذر بھی تھا تو آپ نے اس عذر کا ذکر کیا اور اندریں صورت قائد نہ ہونے کا عذر قبول نہیں کیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ نابینا کے عذر ہی کے لئے اسے پہلے رخصت دی گئی پھر اسے "استحباباً" حاضر ہونے کا حکم دیا گیا ہو وجوباً" نہ دیا گیا تاکہ وہ اس کے اجر سے محروم نہ رہے اور جماعت میں حاضری سے دل میں جو سرور ہوتا ہے وہ راستہ کی مشقت پر حاوی ہو جائے۔ یعنی اس عذر کی موجودگی میں آپ کا امر استحباب پر دلالت کرتا ہے۔

٣٧٢- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، عن النبي ﷺ قال: «من سمع النداء فلم يأت فلا صلاة له إلا من عذر». رواه ابن ماجه والدارقطني وابن حبّان والحاكم، وإسناده على شرط مسلم، لكن رجح بعضهم وقفه.

ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو شخص اذان سن کر بغیر عذر کے مسجد میں نہ آئے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اسے ابن ماجہ' دار قطنی' ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا' اور اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے لیکن بعض نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے(ا)۔

(ا) اس حدیث کو شعبہ کے طریق سے موقوفاً" اور مرفوعاً" روایت کیا گیا ہے اور "الامن عذر" کا اضافہ موقوف میں ہے حاکم نے اسے شعبہ کے اکثر اصحاب تک موقوف قرار دیا ہے۔ اور طبرانی نے کبیر میں ابوموسیٰ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث یوں روایت کی ہے "جو شخص اذان سنے پھر کسی تکلیف یا عذر کے بغیر جماعت میں نہ آئے تو اس کی نماز نہیں ہوتی"

ھیثمی کہتے ہیں اس کی سند میں قیس بن الربیع ہے جسے شعبہ اور سفیان ثوری نے ثقہ قرار دیا ہے لیکن ایک جماعت نے اسے ضعیف کہا ہے۔ نیز ابن عباس کی مذکورہ حدیث کو ابوداؤد نے اس زیادتی کے ساتھ اور ضعیف اسناد سے روایت کیا ہے "صحابہ نے پوچھا' عذر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا خوف یا عرض' اللہ تعالیٰ اس کی وہ نماز قبول نہیں کرے گا جو اس نے اکیلے پڑھی"

یہ حدیث جماعت میں شامل ہونے کی تاکید پر دلیل ہے اور جو اس نے فرض عین ہونے کے قائل ہیں ان کے لئے حجت ہے اور جو اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں وہ آپؐ کے قول فلا صلوۃ لہ کی تاویل کر لیتے ہیں یعنی نماز کامل نہیں ہوتی اور کمال کی نفی مبالغۃ ذات کی نفی کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ اور ترک جماعت کے عذر ابوداؤد کی حدیث میں مذکور ہیں ان میں بارش' ٹھنڈی ہوا' تھوم اور ایسی ہی دوسری بدبودار چیزوں کا کھانا ہے ایسے لوگوں کو مسجد میں نہ آنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے تھوم وغیرہ سے ممانعت اس لئے ہو

(ا) تخصیص کا دعویٰ اس پر دلیل نہیں' حقیقت وہی ہے جس پر احادیث کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ جماعت واجب ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ اس کے کھانے سے نماز باجماعت کا فریضہ فوت ہو جاتا ہے۔ گویا کھانے والا اس وجہ سے گنہگار ہوتا ہے کہ اس نے ایک فریضہ کے ترک کا سبب اختیار کیا۔ لیکن جو لوگ وجوب جماعت کے قائل ہیں وہ غالباً" اس عذر کی بنا پر مسجد میں باجماعت نماز کے سقوط کے قائل ہیں گھر میں نہیں۔ لہٰذا ایسا شخص گھر میں جماعت سے نماز پڑھ لے۔

٣٤٧- وعن يزيد بن الأسود رضي الله تعالى عنه، أنه صلّى مع رسول الله ﷺ صلاة الصبح، فلما صلّى رسول الله ﷺ، إذا هو برجلين لم يصلّيا، فدعا بهما، فجيء بهما، ترعد فرائصهما، فقال لهما: ما منعكما أن تصلّيا معنا؟ قالا: قد صلّينا في رحالنا، قال: فلا تفعلا، إذا صلّيتما في رحالكما ثم أدركتما الإمام، ولم يصلِّ، فصلّيا معه، فإنها لكما نافلة. رواه أحمد، واللفظ له، والثلاثة، وصححه الترمذي وابن حبان.

یزید بن اسود(۱) سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تو دو آدمیوں کو دیکھا جنہوں نے (آپ کے ساتھ) نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ نے انہیں بلایا تو انہیں لایا گیا۔ ان کا بدن(۲) کانپ رہا تھا۔ آپ نے ان سے پوچھا: "ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے تمہیں کس چیز نے روکے رکھا؟ وہ کہنے لگے: ہم پہلے اپنے گھروں (۳) میں پڑھ کر آئے ہیں" آپ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو۔ جب تم نے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لی۔ پھر تم امام کو نماز پڑھتے ہوئے پاؤ تو اس کے ساتھ نماز پڑھ لیا کرو۔ یہ تمہارے لئے نفلی نماز ہو جائے گی(۴)۔ اسے احمد نے روایت کیا اور یہ لفظ اسی کے ہیں اور تینوں نے روایت کیا اور ابن حبان اور ترمذی نے صحیح کہا(۵)۔

(۱) آپ ابوجابر یزید بن الاسود السوائی ہیں۔ بعض الخزاعی اور بعض العامری کہتے ہیں۔ آپ سے ان کے بیٹے جابر روایت کرتے ہیں آپ کا شمار اہل طائف میں اور تذکرہ کوفیین میں ہوتا ہے۔

(۲) اصل میں لفظ فرائص آیا ہے جو فریصہ کی جمع ہے یعنی وہ گوشت جو کسی جانور کے پہلو اور کندھے کے درمیان ہوتا ہے۔ یعنی وہ خوف سے کانپ رہے تھے۔

(۳) اصل میں لفظ رحال آیا ہے جمع رحل' بمعنی منزل اور اس کا اطلاق منزل کے علاوہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہاں منزل ہی مراد ہے۔

(۴) اور فرض پہلی نماز ہی رہے گی خواہ جماعت سے پڑھی جائے یا اکیلے۔ کیونکہ خبر مطلق ہے۔

(۵) مصنف نے تلخیص میں مزید لکھا: اور حاکم اور دار قطنی نے اور ابن السکن نے اسے صحیح کہا۔ یہ سب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایات یعلی بن عطاء عن جابر بن یزید بن الاسود عن ابیہ کے طریق پر ہیں۔ شافعی القدیم میں کہتے ہیں کہ اس کی اسناد مجہول ہیں بیہقی نے کہا وجہ یہ ہے کہ یزید بن الاسود کا اس کے بیٹے کے سوا کوئی راوی نہیں۔ اور نہ اس کے بیٹے جابر کا یعلی کے بغیر کوئی راوی ہے۔ یعلی مسلم کے رجال سے ہے اور جابر کو نسائی وغیرہ نے ثقہ کہا ہے۔

اور یہ واقعہ حجتہ الوداع کے دوران مسجد خیف میں ہوا تھا اور یہ حدیث امام کے ساتھ نماز ادا کرنے پر دلیل ہے۔ جب اسے نماز پڑھتے ہوئے یا عنقریب پڑھنے والا پائے جبکہ وہ خود پہلے جماعت سے یا اکیلا پڑھ چکا ہو اور پہلی نماز ہی فرض ہو گی اور دوسری نفل جیسا کہ حدیث نے اس کی صراحت کر دی ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ اسے پہلی نماز کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ زید بن علی' موید اور آل سے ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور یہی شافعی کا قول ہے اور ہادی اور مالک اس طرف گئے ہیں اور یہ شافعی کا قول ہے کہ دوسری نماز فرض ہو گی اس لئے کہ ابوداؤد نے یزید بن عامر کی حدیث سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب نماز کا وقت آئے اور تو لوگوں کو نماز پڑھتے پائے تو ان کے ساتھ نماز پڑھ خواہ تو پہلے پڑھ چکا ہو۔ وہ پہلی تیرے لئے نفل اور دوسری فرض ہو جائے گی" اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ نووی وغیرہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور بیہقی کہتے ہیں کہ یہ یزید بن الاسود کی حدیث کے مخالف ہے اور وہ صحیح تر ہے' اسے دار قطنی نے ان لفظوں سے روایت کیا "تاکہ گھر میں پڑھی ہوئی نماز کو نفلی بنا دے"۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے اس قول کے مطابق ضروری ہے کہ دوسری نماز میں داخل ہونے کے بعد پہلی کو چھوڑ دیا جائے اور بعض کہتے ہیں کہ دوسری نماز سے فراغت کی شرط پر صحیح ہے اس بارے میں شافعی کا قول تیسرا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے جس کا چاہے گا حساب لے لے گا بقول ابن عمر کسی نے اس بارے میں ان سے پوچھا تو آپ نے کہا: کیا یہ بات تیرے ذمہ ہے؟ یہ بات تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے جس کا چاہے حساب لے لے" اسے مالک نے موطاء میں روایت کیا۔ البتہ اس سے وہ حدیث معارض ہے جسے ابوداؤد' صنعانی وغیرہما نے ابن عمر سے مرفوعا" روایت کیا ہے "ایک ہی دن میں کوئی نماز دو مرتبہ نہ پڑھو" اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ منی عنہ بات یہ ہے کہ دونوں فرض سمجھ کر نہ پڑھی جائیں اس لیے نہیں کہ ان میں سے ایک نفل ہو' یا یہ مراد ہے کہ دونوں بار اکیلا نہ پڑھے۔ پھر اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ تمام نمازوں میں ایسا عموم ہے اور شافعی کا یہی مذہب ہے۔ اور ابوحنیفہ نے کہا کہ صرف ظہر اور عشاء دوبارہ پڑھی جائے۔ صبح اور عصر نہ پڑھی جائیں کیونکہ ان کے بعد نماز سے منع کیا گیا ہے رہی مغرب تو چونکہ یہ دن کے وتر ہیں اگر اعادہ کیا جائے تو یہ شفع ہو جائے گی۔ اور مالک نے کہا کہ اگر پہلی نماز بھی جماعت سے پڑھی تھی تو پھر نہ پڑھے اور اگر اکیلے پڑھی تھی تو پھر پڑھ لے۔ اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ یہ ابوحنیفہ اور مالک کے قول کے خلاف ہے بلکہ یزید بن الاسود کی حدیث میں یہ صراحت ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ وہ صبح کی نماز تھی۔ گویا ابوحنیفہ کے قول کا رد واضح ہو گیا اور ہر دو اوقات میں نماز کی نہی کے عموم میں اس حدیث سے تخصیص ہو گئی۔

امام کی اقتداء

٣٧٤۔ وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**إنما جعل الإمام ليؤتم به، فإذا كبر فكبروا، ولا تكبروا حتى يكبر، وإذا ركع فاركعوا، ولا تركعوا حتى يركع، وإذا قال: «سمع الله لمن حمده» فقولوا: «اللهم ربنا لك الحمد» وإذا سجد فاسجدوا، ولا تسجدوا حتى يسجد، وإذا صلّى قائماً فصلّوا قياماً، وإذا صلّى قاعداً فصلّوا قعوداً أجمعين**». رواه أبو داود، وهذا لفظه، وأصله في الصحيحين.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ لہٰذا جب وہ تکبیر(١) کہے تو تم بھی تکبیر کہو، امام سے پہلے تکبیر نہ کہو(٢) اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو۔ امام سے پہلے رکوع نہ کرو(٣)۔ اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ، کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ امام سے پہلے سجدہ نہ کرو اور جب وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھائے تو تم کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب بیٹھ کر(٤) پڑھائے تو تم سب(٥) بیٹھ کر نماز پڑھو۔

اسے ابو داؤد نے روایت کیا اور یہ لفظ اسی کے ہیں اور ان کی اصل صحیحین میں موجود ہے(٦)۔

(١) یعنی تکبیر تحریمہ یا مطلق تکبیر جس میں تکبیر نفل بھی شامل ہے۔

(٢) یہ تکرار تاکید مزید کے لئے ہے تاکہ شرط کے مفہوم کی افادیت معلوم ہو۔ آگے آنے والے تمام جملوں میں یہی صورت ہے۔

(٣) یعنی جب وہ رکوع میں چلا جائے یہ نہیں کہ رکوع سے فارغ ہو جیسا کہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

(٤) کسی عذر کی بناء پر

(٥) اصل میں لفظ اجمعین آیا ہے جو حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ روایت بخاری میں بھی ہے اور اکثر روایات میں اجمعین کی بجائے اجمعون رفعی حالت میں ہے جو ضمیر جمع کی تاکید ہے۔

(٦) امام مقرر کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ اسی کے وصف پر انحصار کیا جائے اور اقتداء کرنے والا امام کی مخالفت کرتے ہوئے اس سے آگے نہ بڑھے اور ائتمام بمعنی اقتداء اور اتباع ہے۔

یہ حدیث امامت کی شرعیت پر دلیل ہے تاکہ امام کی اقتداء کی جائے اور تابع اور مقتدی کا کام یہ ہے کہ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ اپنے متبوع سے آگے بڑھے اور نہ اس کے برابر چلے اور نہ اس کے موقف پر پیشگی کرے۔ بلکہ امام کے احوال کا خوب خیال رکھے اور اس کے فعل کے مطابق اس کے اثر پر چلے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی حالت میں اس کی مخالفت نہ کرے اور اس حدیث میں آپ کے اس قول سے اس کی تفصیل موجود ہے پھر جب وہ تکبیر کہے۔ تا آخر۔ اور جن احوال کا ذکر نہیں ہوا ان میں بھی ایسا ہی کرے جیسے سلام پھیرنا۔ اور جو شخص اس کی مخالفت کرے گا وہ گنہگار ہے لیکن اس سے اس کی نماز کی فاسد نہیں ہوگی الا یہ کہ تکبیر تحریمہ امام سے پہلے کہہ لے یا کرے کیونکہ اس طرح اس کی امام کے ساتھ نماز منعقد نہ ہوگی کیونکہ اس نے امام کو امام بنایا ہی نہیں جو بعد میں نماز میں داخل ہوا۔ اور یہی امام کی اقتداء اور اسے امام بنانے کا مطلب ہے۔

اور امام کی مخالفت پر اس کی نماز فاسد ہونے پر استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رکوع اور سجود میں امام سے سبقت کرنے والے کو ڈرایا ہے کہ اللہ اس کا سر گدھے کے سر جیسا نہ بنا دے لیکن اسے نماز کو دہرانے کا حکم نہیں دیا اور نہ یہ کہا کہ اس کی نماز نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں اس حدیث میں امام اور مقتدی کی نیت میں مساوات شرط نہیں۔ جب امام اور مقتدی کی نیت میں اختلاف ہو' ایک کی نیت فرض کی ہو اور دوسرے کی نفل کی یا ایک کی نیت عصر کی ہو اور دوسرے کی ظہر کی تو اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جماعت کی نماز درست ہے اور شافعیہ کا یہی مذہب ہے اور اس کا بیان عنقریب جابر کی حدیث میں معاذ کی نماز کے متعلق آرہا ہے۔

اور آپؐ کا قول کہ "جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ امام تو یہ کہے اور مقتدی "اللھم ربنا لک الحمد کہے" اور "و" کے اضافہ اور اللھم کے حذف سے بھی روایت آئی ہیں اور یہ سب صورتیں جائز ہیں اور راجح عمل یہ ہے کہ اللھم کی اور "و" کی یعنی دونوں اضافے اختیار کئے جائیں کیونکہ زائد معنی کا فائدہ دیتے ہیں اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ امام اور ماموم دونوں تسمیع اور تحمید کو جمع نہ کریں وہ اسی حدیث سے احتجاج کرتے ہیں اور وہ ہادویہ اور حنفیہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ امام اور منفرد کے لئے تسمیع مشروع ہے اور یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور ابو یوسف اور محمد کہتے ہیں کہ امام اور منفرد تسمیع اور تحمید دونوں کہیں اور مقتدی ابوہریرہ کی اس حدیث کی رو سے سمع اللہ لمن حمدہ کہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے" اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ خواہ آپ منفرد ہوتے یا امام ہوتے کیونکہ بحیثیت موتم یا مقتدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نادر ہی ہوتی تھی۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ دلیل کہاں ہے جو تسمیع میں مقتدی کو بھی شامل کرتی ہے۔ اور ابوہریرہ کی حدیث تو یہ ہے کہ مقتدی حمد بیان کرے۔ اور امام یحییٰ' نووی اور اوزاعی اس طرف گئے ہیں کہ امام اور منفرد تسمیع اور تحمید دونوں جمع کریں اور مقتدی حمد بیان کرے کیونکہ اس حدیث کا یہی مفہوم ہے جو آپ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"فقولوا اللھم" تا آخر یعنی مقتدی صرف یہی کہے گا اور شافعی کا یہ مذہب ہے کہ ہر نمازی دونوں کو جمع کرے۔ وہ ابن ابی اوفی کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جسے مسلم نے یوں روایت کیا ہے۔ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تو کہتے: "سمع اللہ لمن حمدہ اللھم ربنا لک الحمد" الحدیث۔ شافعی کہتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ آپ کی نماز کے عمومی احوال جماعت اور منفرد کے ہوتے تھے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نماز ایسے پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو" ان تمام روایات میں سے کسی ایک میں بھی صرف ایک ہی جملہ (تسمیع یا تحمید) کہنے پر کوئی حجت نہیں کیونکہ کسی روایت میں عدم ذکر اس کی عدم شرعیت پر دلالت نہیں کرتا اور آپ کا قول "جب امام سمع اللہ لمن حمدہ' کہے"' "ربنا ولک الحمد" کہنے کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔ اور آپ کا قول "قولوا ربنا لک الحمد" مقتدی کےسمع اللہ لمن حمدہ' کہنے کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔ اور ابن ابی اوفی کی حدیث کے بیان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل میں یہ زیادتی موجود ہے۔ اور یہ زیادتی مقبول ہے کیونکہ کوئی قول اس کا معارض نہیں اور ابن المنذر نے یہی قول عطاء' ابن سیرین وغیرہما سے بھی روایت کیا ہے گویا شافعی اس میں منفرد نہیں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول سمع اللہ لمن حمدہ' اس وقت ہوتا جب رکوع سے سر اٹھاتے اور ربنا لک الحمد اس وقت ہوتا جب آپ سیدھے کھڑے ہو جاتے۔

اور آپؐ کا یہ قول "تو سب بیٹھ کر نماز پڑھو" اس بات پر دلیل ہے کہ امام اگر کسی عذر کی بنا پر بیٹھ کر نماز پڑھائے تو امام کی پیروی لازم ہے اور یہ کہ مقتدی کھڑا ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر پڑھے اور اس کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ اہل فارس اور روم کا فعل ہے یعنی امام بیٹھا ہو اور مقتدی کھڑے رہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شاید اب تم فارس اور روم جیسا کام کرنے لگے ہو جو اپنے بادشاہوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور بادشاہ بیٹھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسا نہ کرو" اور احمد بن حنبل اور اسحاق وغیرہما کا یہی مذہب ہے۔ اور ہادویہ اور مالک وغیرہم اس طرف گئے ہیں کہ بیٹھنے والے کے پیچھے کھڑا ہونے والے کی نماز درست نہیں نہ کھڑا ہونے والے کے پیچھے بیٹھنے والے کی نماز درست ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "اپنے امام کی مخالفت نہ کرو اور بیٹھنے میں اس کی پیروی نہ کرو" شرح قاضی میں ایسا ہی مذکور ہے لیکن اس نے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا' نہ ہی میں نے اس کا یہ قول "اور بیٹھنے میں اس کی پیروی نہ کرو" کسی حدیث میں پایا ہے۔

اور شافعی کا مذہب یہ ہے کہ بیٹھنے والے کے پیچھے کھڑا ہونے والے کی نماز درست ہے اور مقتدی بیٹھنے میں امام کی پیروی نہ کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپؐ کی مرض الموت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ جب آپ مسجد میں آئے تو حضرت ابوبکرؓ نماز کی جماعت شروع کر چکے تھے۔ آپؐ حضرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابوبکرؓ کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ گویا آپ کا یہ فعل اس حکم کا ناسخ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے متعلق دیا تھا جس کا ذکر ابوہریرہ کی حدیث میں ہے اور یہ بیٹھنے کا واقع اس نماز میں ہوا جب آپ گھوڑے سے گرے اور آپ کے پاؤں کا جوڑ ہل گیا تھا۔ گویا ان دونوں احکام میں آخری فعل یہ تھا۔ لہٰذا یہ عمل اسی طرح متعین ہو گیا اور شافعی نے اسی کی تائید کی ہے۔

اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ایسی احادیث جن میں آپ نے صحابہ کو بیٹھنے کا حکم دیا' کہ نہ صحت میں کوئی اختلاف ہے اور نہ بیان میں۔ رہا آپ کی مرض الموت میں نماز کا مسئلہ تو اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا آپ امام تھے یا ماموم؟ اور اس مرض الموت کی نماز سے استدلال صرف اس صورت میں مکمل ہوتا ہے جب آپ امام ہوں نیز اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ کا بیٹھنے کا حکم دینا استحباب کے طور پر ہو اور آپ کا قیام پر خاموش رہنا اس پر قرینہ ہو۔ تو اس طرح سب مذاہب سے خارج رہتے ہوئے دونوں روایتوں میں تطبیق ہو جاتی ہے کیونکہ وہ مقتدی کے لئے کھڑے ہونے اور بیٹھنے میں سے کسی ایک چیز پر اختیار رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔

علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کی ایک جماعت سے یہ فعل ثابت ہے کہ انہوں نے بیٹھ کر امامت کرائی تو مقتدیوں نے بھی بیٹھ کر نماز پڑھی۔ انہیں میں سے اسید بن حضیر اور جابر ہیں اور ابوہریرہ نے یہی فتویٰ دیا۔ ابن المنذر کہتے ہیں کہ اس بارے میں کسی صحابی کا اختلاف انہیں یاد نہیں۔ رہی یہ حدیث کہ "میرے بعد کوئی شخص بیٹھ کر امامت نہ کرائے جبکہ لوگ کھڑے ہوں" تو یہ حدیث ضعیف ہے۔ جسے بیہقی اور دار قطنی نے جابر الجعفی عن الشعبی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے روایت کیا ہے اور جابر انتہائی ضعیف ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث مرسل ہے۔ شافعی کہتے ہیں کہ معلوم ہو گیا کہ اس سے کون احتجاج کرتا ہے' بلاشبہ اس میں حجت نہیں کیونکہ یہ مرسل ہے اور اس کے راویوں میں ایک ایسا آدمی ہے جو اہل علم کو روایت سے متنفر کرتا تھا اور وہ جابر جعفی ہے۔

اور احمد بن حنبل ان دونوں حدیثوں میں جمع کے قائل ہیں وہ یوں کہ جب امام ایسے مرض کی وجہ سے ابتداء" سیدھا بیٹھ جائے جس سے صحت کی اسے امید نہ ہو تو اس کے پیچھے لوگ بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں اور جب امام ابتداء" کھڑا ہو جائے تو مقتدیوں پر لازم ہے کہ وہ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ یک لخت کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھانے لگے یا ایسا نہ ہو جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الموت کی حدیث میں ہے کہ آپ نے صحابہ کو بیٹھ کر پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ اس لئے کہ ان کے امام (حضرت ابوبکرؓ) نے ابتداء" کھڑے ہو کر نماز پڑھانا شروع کی تھی پھر باقی نماز کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر امامت کرائی۔ بخلاف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی مرض کے جس میں آپ نے ابتداء" ہی بیٹھ کر کی تھی لہٰذا صحابہ کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا اور تطبیق کی یہ صورت خوب ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۷۵- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ رأى في أصحابه تأخراً، فقال تقدموا، فأتموا بي، وليأتم بكم من بعدكم. رواه مسلم.

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پیچھے بیٹھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: آگے آجاؤ اور میری اقتدا کرو اور جو تمہارے پیچھے ہیں وہ تمہاری(۱) اقتداء کریں۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) یعنی تم میرے افعال کی اقتداء کرو اور تمہارے پیچھے والے تمہاری اقتداء کریں اس دلیل سے کہ تمہارے افعال کی اقتداء میرے ہی افعال کی اقتداء ہو گی۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ ان لوگوں کے لئے امام کے پیچھے ایسے لوگوں کی اتباع جائز ہے جو امام کو دیکھ نہ سکیں یا اس کی آواز نہ سن سکیں۔ جیسے دوسری صف والے پہلی صف والوں کی اقتداء کریں اور تیسری والے دوسری صرف والوں کی علی ہذاالقیاس یا ان کی جن تک امام کی آواز نہ پہنچتی ہو اور اس حدیث میں صف اول پر ترغیب اور بعد والوں کی کراہت مذکور ہے اور اس حدیث کا آخری حصہ یوں ہے: "لوگ پیچھے ہٹتے رہیں گے تا آنکہ اللہ تعالیٰ انہیں پیچھے ہی کر دے گا"

۳۷۶- وعن زيد بن ثابت رضي الله تعالى عنه قال: احتجر رسول الله ﷺ حجرة مخصفة، فصلّى فيها، فتتبع إليه رجال، وجاءوا يصلّون بصلاته، الحديث. وفيه: أفضل صلاة المرء في بيته، إلا المكتوبة. متفق عليه.

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھاس پھونس کا ایک حجرہ(۱) بنایا۔ پھر اس میں نماز پڑھی۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی آگئے اور آپ کے پیچھے نماز پڑھنے لگے۔ الحدیث۔ اور اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ فرض نماز کے علاوہ آدمی کی بہتر نماز وہ ہے جو گھر میں (۲) پڑھے۔ متفق علیہ۔

(۱) اصل عبارت میں لفظ احتجر ہے ٭معنی بوریا' ٹاٹ اور گھاس پھونس وغیرہ کو ایک دوسرے پر جوڑ کر حجرہ کی شکل کی کوئی چیز بنانا اور ایک روایت میں آخری ر کی جگہ ز ہے یعنی احتجز ٭معنی روکنے والی چیز بنانا۔ یعنی گھر کے علاوہ ایسی جگہ جس میں عام لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے۔

(۲) اور یہ بات پہلے باب التطوع میں جابر کی حدیث کی شرح میں بیان ہو چکی ہے اور اس حدیث میں مسجد میں کوئی ایسی جگہ بنا لینے کے جواز پر دلیل ہے جبکہ نمازیوں کو تنگی نہ ہو کیونکہ آپ رات کو ایسا کرتے اور دن کو اسے کھول دیتے تھے اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ آپ نے یہ مستقل طور پر نہیں بنایا تھا۔" اور تتبع کا معنی طلب ہے یعنی صحابہ نے ڈھونڈا اور وہاں جمع ہو گئے۔ اور بخاری کی روایت میں ہے کہ "لوگ اس طرف اٹھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئے" اور ایک روایت میں ہے کہ آپ اس رات کو نماز پڑھتے تھے تو آپ کے صحابہ نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ بیٹھے رہے پھر انہیں فرمایا: مجھے تمہارا یہ کام معلوم ہو چکا سو لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو کیونکہ فرض نمازوں کے علاوہ آدمی کی بہتر نماز وہ ہے جو وہ گھر میں پڑھے" یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کے بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔ اور مصنف یہ حدیث امامت کے ابواب میں اس لئے لائے ہیں کہ نفلی نماز کی جماعت کا جواز معلوم ہو جائے اور اس کے معنی نفلی نماز کے باب میں گزر چکے ہیں۔

٣٧٧- وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: صلى معاذ بأصحابه العشاء، فطوّل عليهم، فقال النبي ﷺ: أتريد أن تكون يا معاذ فتاناً؟ إذا أممت الناس فاقرأ «بالشمس وضحاها» و «سبح اسم ربك الأعلى» و «اقرأ باسم ربك» و «الليل إذا يغشى» متفق عليه، واللفظ لمسلم.

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ معاذؓ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی تو اسے خوب لمبا کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: معاذ! کیا تم لوگوں کے لئے آزمائش بننا چاہتے ہو؟ جب لوگوں کی امامت کراؤ تو والشمس وضحاھا، سبح اسم ربک الاعلیٰ' اقرا باسم ربک اور واللیل اذا یغشی جیسی سورتیں پڑھا کرو۔ متفق علیہ(ا)۔

(ا) اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں اور بخاری میں اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں۔ ایک شخص دو چھڑکاؤ کرنے والی اونٹنیوں سمیت آیا۔ رات کافی گزر چکی تھی اس نے معاذ کو نماز پڑھاتے دیکھا تو اپنی اونٹنیاں چھوڑ کر معاذ کی نماز میں شامل ہو گیا۔ معاذ نے سورہ بقرہ یا سورہ نساء پڑھنا شروع کر دی۔ اس شخص نے معاذ کی اقتداء چھوڑ کر الگ اپنی نماز پڑھ لی" اس پر بخاری نے یوں باب باندھا ہے "جب امام نماز لمبی کر دے اور آدمی یعنی مقتدی ضرورت کی بنا پر نکل جائے' اس آدمی نے معاذ کے متعلق باتیں کیں جو معاذ تک پہنچ گئیں تو معاذ کہنے لگے کہ یہ شخص منافق ہے۔ وہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور معاذ کی شکایت کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے فرمایا: معاذ! کیا تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہو؟ اور یہ جملہ آپ نے تین بار دہرایا اور فرمایا: اگر تو نماز پڑھائے تو سبح اسم ربک الاعلیٰ' والشمس وضحاھا' واللیل اذا یغشی پڑھ لے کیونکہ تیرے پیچھے بوڑھے بھی ہوتے ہیں' کمزور بھی اور ضرورت مند بھی" اور بخاری میں اس حدیث کے ان الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ بھی ہیں۔

اور اصل عبارت میں فتان کا لفظ آیا ہے یعنی کیا تو نماز کو لمبا کر کے اپنے ساتھیوں کو دکھ پہنچاتا ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ نے اس طوالت کو مقتدیوں کی کراہت پر محمول کیا ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سورہ اعراف نماز مغرب اور دوسری نمازوں میں پڑھی اور ظہر میں آپ کے قیام کی مقدار ساٹھ آیات تھیں اور اس سے کم بھی پڑھتے تھے مطلب یہ ہے کہ امام اور مقتدیوں کے اوقات کے اختلاف سے قیام میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔

نیز یہ حدیث نفل نماز پڑھنے والے امام کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی نماز کی صحت پر دلیل ہے کیونکہ معاذ عشاء کی فرض نماز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر اپنے اصحاب کی طرف جا کر انہیں نماز پڑھاتے اور ان کی اپنی یہ نفل نماز ہوتی تھی اور جابر کی یہ حدیث عبدالرزاق' شافعی اور طحاوی نے سند صحیح کے ساتھ روایت کی ہے اس میں ہے "یہ معاذ کی نفل نماز ہوتی تھی" اور مصنف نے فتح الباری میں اس حدیث سے استدلال پر طویل بحث کی ہے اور ہم نے اس موضوع پر سوالا" جوابا" ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس میں اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی نماز کی صحت پر حدیث سے دلیل قائم نہیں ہوتی۔

اور اس حدیث کی افادیت یہ ہے کہ امام اپنی نماز اور قراءت میں تخفیف کر سکتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قراءت کی مقدار معین کر دی اور یہ حدیث آگے آ رہی ہے "جب کوئی شخص امامت کرائے تو نماز ہلکی کرے"

۳۷۸- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، في قصة صلاة رسول الله ﷺ بالناس وهو مريض، قالت: فجاء حتى جلس عن يسار أبي بكر، **فكان يصلي بالناس** جالساً، وأبو بكر قائماً، يقتدي أبو بكر بصلاة النبي ﷺ، **ويقتدي الناس بصلاة أبي** بكر. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز کے قصہ میں روایت کرتی ہیں جو آپ نے بیماری کی حالت میں لوگوں کو پڑھائی۔ آپؐ آئے اور حضرت ابوبکرؓ کی بائیں جانب(۱) بیٹھ گئے۔ آپؐ لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے۔ ابوبکر کھڑے ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتداء کرتے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے۔ متفق علیہ(۲)

(۱) بخاری کے باب "الرجل یاتم بالامام" میں بھی ایسی ہی روایت ہے جس میں آپ کے بیٹھنے کے مقام کا تعین ہے اور وہ حضرت ابوبکرؓ کی بائیں جانب ہے اور یہی امام کی جگہ ہوتی ہے۔ اور بخاری کے باب " حدالمریض ان یشھدالجماعه" میں یہ لفظ ہیں "آپ حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ گئے" اور آپ کے بیٹھنے کا مقام معین نہیں کیا۔ لیکن مصنف کہتے ہیں کہ بخاری نے حسن اسناد کے ساتھ ایک روایت میں مقام معین کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ "وہ حضرت ابوبکر کی بائیں جانب تھی" میں کہتا ہوں کہ صحیح ہی کی بعض روایات میں جو اجمال تھا' دوسری روایات میں اس کی وضاحت ہو گئی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے۔

(۲) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ امام کے دائیں جانب ایک شخص کا کھڑا ہونا جائز ہے خواہ اور لوگ بھی نماز پڑھ رہے ہوں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے یہ کام اس لئے کیا ہو کہ آپ سے ابوبکر دوسروں تک پہنچا دیں اور اس لئے بھی کہ ابتدائے نماز میں حضرت ابوبکرؓ ہی امام تھے' یا اس لئے کہ صف تنگ نہ ہو جائے یا اور بھی کئی احتمال ہو سکتے ہیں جبکہ کسی احتمال پر بھی دلیل موجود نہیں ہے اور بظاہر یہ جواز علی الاطلاق ہے۔

اور یہ قول کہ "ابوبکر اقتداء کر رہے تھے" یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ اقتداء امام ہونے کی صورت میں ہو۔ گویا ابوبکر امام بھی ہوں اور ماموم بھی اور یہ بھی احتمال ہے کہ ابوبکر صرف مبلغ (آواز پہنچانے والے) ہوں امام نہ ہوں۔ جان لیجئے کہ حضرت عائشہ کی اس حدیث اور ایسی دوسری حدیثوں میں یہ اختلاف واقع ہوا کہ آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے یا ماموم۔ روایات ان میں سے ہر موقف کی تائید کرتی ہیں۔ تاہم ہم نے ظاہر الفاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امام ہونا ثابت کیا ہے۔ علماء میں سے بعض روایات میں ترجیح کی طرف گئے ہیں اور انہوں نے کئی وجوہ کی بنا پر آپ کے امام ہونے کو ترجیح دی ہے۔ جنہیں فتح الباری میں اور بعض دوسری شروح میں مکمل طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور نویں حدیث کی شرح میں اس کے برعکس پر بعض وجوہ پیش کر دی گئی ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ ایک نہیں بلکہ متعدد قصے ہیں۔ آپؐ اپنی مرض الموت میں کبھی امام تھے اور کبھی ماموم۔ انہوں نے حضرت عائشہ کی اس حدیث اور اس قول سے استدلال کیا ہے "حضرت ابوبکر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے اور لوگ ابوبکر کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے" گویا ابوبکر ماموم امام تھے۔ بخاری نے اس پر باب قائم کرتے ہوئے کہا "اس شخص کا باب جو امام کی اقتداء کرے اور لوگ ماموم کی اقتداء کریں" ابن بطال کہتے ہیں کہ یہ مسروق اور شعبی کے قول کے موافق ہے ایک صف کے دوسری صف کی اقتداء کرنے میں جمہور کا اختلاف ہے۔ شعبی کہتے ہیں کہ جس شخص نے اپنے ساتھ والی صف کے لوگوں کے رکوع سے سر اٹھانے سے قبل تکبیر تحریمہ کہہ لی اس نے رکعت پا لی اگرچہ امام اس سے پہلے سر اٹھا چکا ہو کیونکہ ہر صف پچھلی صف کے لئے امام ہوتی ہے یہ چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ انہیں ایک دوسرے کا ذمہ دار دیکھتا ہے جس کا امام ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور اس کی تائید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے "آگے آؤ تم میری اقتداء کرو اور جو تمہارے پیچھے ہیں وہ تمہاری اقتداء کریں" اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "ابوبکرؓ صحابہ کو تکبیر سناتے تھے" جو اس بات پر دلیل ہے کہ مقتدیوں کو سنانے کے لئے تکبیر کو بلند آواز سے کہنا جائز ہے تاکہ وہ اس کی اتباع کر سکیں اور مقتدی کے لئے تکبیر کی آواز کی اتباع جائز ہے یہ جمہور کا مذہب ہے جس میں مالکیہ کو اختلاف ہے۔ قاضی عیاض ان کے مذہب کے متعلق کہتے ہیں۔ ان میں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ ایسے ہیں جو مقتدی کی نماز کو باطل قرار دیتے ہیں اور کچھ باطل نہیں کہتے اور کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر امام انہیں سنانے کی اجازت دے تو اقتداء درست ہو گی ورنہ نہیں ہو گی- اس کی اور بھی کئی تفاصیل ہیں جن پر کوئی دلیل نہیں- گویا وہ اس حدیث کے بارے میں یوں کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ ہی امام تھے' اور اس سے کسی کو انکار نہیں کہ حضرت ابوبکر اپنے پچھلے لوگوں کو معلوم کرانے کے لئے اپنی آواز بلند کرتے تھے-

۳۷۹- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ قال: «إذا أم أحدكم الناس فليخفف، فإن فيهم الصغير والكبير والضعيف وذا الحاجة، فإذا صلى وحده فليصلّ كيف شاء». متفق عليه.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- تم میں جب کوئی شخص امامت کرائے تو نماز ہلکی پڑھائے کیونکہ نمازیوں میں چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی' کمزور بھی اور کام کاج والے بھی(۱) اور اگر اکیلا نماز پڑھے تو جیسے چاہے' پڑھ لے(۲) متفق علیہ-

(۱) اور یہ سب لوگ تخفیف چاہتے ہیں لہٰذا امام کو ان کا خیال رکھنا چاہئے-

(۲) خواہ ہلکی یا طویل- اس حدیث میں منفرد کو نماز کے تمام ارکان کے لمبا کرنے کے جواز پر دلیل ہے خواہ اسے وقت نکل جانے کا خوف ہو اور اس بات کو بعض شافعیہ نے صحیح کہا ہے- لیکن یہ ابوقتادہ کی اس حدیث سے معارض ہے" نماز میں نقصان کی صورت یہ ہے کہ تو نماز کو موخر کرے حتیٰ کہ آخر وقت آجائے" اسے مسلم نے روایت کیا ہے پھر جب نماز کے کمال میں مبالغہ اور تطویل کی مصلحت وقت نکل جانے کے مفسدہ سے ٹکرا رہا ہو تو مفسدہ کو ترک کرنا بہتر ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ موخر سے مراد ہی یہ ہو کہ وقت نکل جائے اور ابھی اس نے نماز شروع ہی نہ کی ہو- البتہ جس نے نماز شروع کی ہوئی ہو اور وقت نکل جائے تو اس پر یہ بات صادق نہیں آتی-

۳۸۰- وعن عمرو بن سلمة قال: قال أبي: جئتكم من عند النبي ﷺ حقاً، قال: فإذا حضرت الصلاة فليؤذن أحدكم، وليؤمكم أكثركم قرآناً، قال: فنظروا، فلم يكن أحد أكثر قرآناً مني، فقدموني، وأنا ابن ست أو سبع سنين. رواه البخاري وأبو داود والنسائي.

عمرو بن سلمہ(۱) سے روایت ہے کہ میرے باپ(۲) نے کہا: میں اس وقت سچے(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سے آرہا ہوں- آپ نے فرمایا: جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی شخص اذان کہے اور امامت وہ کرائے جو قرآن زیادہ جاننے والا ہو- پھر ان لوگوں نے نظر کی تو مجھ سے زیادہ قرآن کو جاننے والا کوئی نہ تھا(۴)- لہٰذا انہوں نے مجھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آگے کر دیا (امام بنا دیا) اور اس وقت میری عمر چھ یا سات سال تھی۔ اسے بخاری' ابوداؤد اور نسائی نے روایت(۵) کیا۔

(۱) آپ بخاری وغیرہ کے قول کے مطابق ابویزید ہیں (زیادت سے) اور مسلم اور دوسروں نے ابو برید (ب ر ی د) کہا ہے پورا نام عمرو بن سلمہ الجرمی ہے ابن عبدالبر نے کہا: عمرو بن سلمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی قوم کی امامت کراتے تھے اس لئے کہ سب سے زیادہ قرآن جاننے والے تھے' بعض کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے ہمراہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عمرو نے بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان سے ابوقلابہ' عامر الاحول اور ابوالزبیر مکی نے روایت کی ہے۔

(۲) یعنی سلمہ بن نفیع یا ابن لائی ' لائی میں ل پر فتحہ اور ہمزہ پر خلاف دستور جزم ہے۔

(۳) اصل میں لفظ حقا" آیا ہے جس پر مصدر محذوف کی بناء پر نصب ہے یعنی نبوۃ حقا" ' یا حقا" کا لفظ مشمولہ جملہ کے لئے مصدر موکد ہے اور پر زور بنانے کے لئے آیا ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اس صورت میں یہ دوسرے کے لئے مصدر موکد ہے۔

(۴) ان کے قرآن زیادہ جاننے کی وجہ یہ تھی کہ آپ ان سواروں کو ملتے رہتے تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفد کی صورت میں بھیجتے تھے اور وہ عمرو اور اس کے گھر والوں کے پاس سے گزرتے تھے۔ چنانچہ ان سے وہ کچھ سیکھ لیا جو وہ قراءت کرتے تھے اور یہ بات ان کے باپ اور قوم کے اسلام لانے سے پہلے کی ہے۔

(۵) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ امامت کا حقدار وہ ہے جو زیادہ قرآن جاننے والا ہو۔ اور ایسی ہی حدیث عنقریب آگے آرہی ہے اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ امامت اذان سے افضل ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے لئے کوئی شرط نہیں لگائی اور سات سال کے لڑکے کو امام بنانا ایک دلیل ہے جس کے حسن بصری' شافعی اور اسحاق قائل ہیں کہ تمیز رکھنے والے لڑکے کی امامت میں کچھ کراہت نہیں جبکہ مالک اور ثوری نے اسے مکروہ سمجھا ہے اور احمد اور ابوحنیفہ سے دو روایتیں ہیں ان میں سے مشہور یہ ہے کہ نوافل میں بچے کی امامت جائز ہے فرائض میں نہیں۔ اور ہادی اور ناصر اور کچھ دوسرے بچے کو مجنون پر قیاس کرتے ہوئے عدم صحت کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمرو کے اس قصہ میں کوئی حجت نہیں کیونکہ ایسی کوئی روایت نہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بچے کو امام بنایا تھا اور نہ ہی اس کی تقریر ثابت ہے۔

اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دلیل کا جواز اس واقعہ کا وحی کے زمانہ میں نہ ہونا ہے۔ جو فعل جائز نہ ہو بالخصوص نماز جو اسلام کا بہت بڑا رکن ہے وہ بحال نہیں رکھا جا سکتا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے میں گندگی لگی تھی تو وحی کے ذریعہ آپ کو متنبہ کر دیا گیا۔ اگر بچے کی امامت صحیح نہیں تھی تو اس کے متعلق ضرور وحی نازل ہونا چاہئے تھی اور ابو سعید اور جابر نے اس بات سے بھی استدلال کیا ہے کہ وہ نزول قرآن کے زمانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں عزل کرتے تھے اور وہ وفد جو عمرو کے پاس سے گزرا وہ صحابہ کی جماعت تھی۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کی اس بارے میں مخالفت کی وجہ نہیں سمجھتے اور یہ احتمال کہ ان لوگوں نے عمرو کو نفلی نماز کا امام بنایا تھا۔ قصہ کے انداز بیان کی رو سے بعید از قیاس ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرائض کے اوقات کی تعلیم دی تھی پھر انہیں فرمایا: "تمہاری امامت وہ کرائے جو قرآن زیادہ جانتا ہو" اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا کہ عمرو نے کہا: قبیلہ جرم میں میں جہاں کہیں بھی گیا میں ہی ان کا امام ہوتا تھا" اور یہ بات فرائض و نوافل سب کو عام ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو شخص فرض اور نفل میں تفریق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں کام میں بچے کی امامت درست ہے اور فلاں میں نہیں تو یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔ پھر حدیث میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے فرض نماز پڑھنے والے کی نماز درست ہے شرح میں ایسا ہی ہے لہٰذا ان لوگوں کا دعویٰ محل نظر ہے۔

امامت کا زیادہ حقدار

۳۸۱۔ وعن ابن مسعود رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«يؤم القوم أقرؤهم لكتاب الله تعالى، فإن كانوا في القراءة سواء فأعلمهم بالسنة، فإن كانوا في السنة سواء فأقدمهم هجرة، فإن كانوا في الهجرة سواء فأقدمهم سلماً - وفي روايه «سنا» - ولا يؤمن الرجل الرجل في سلطانه، ولا يقعد في بيته على تكرمته، إلا باذنه».** رواه مسلم.

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کی امامت وہ کرائے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کا سب سے زیادہ قاری(۱) ہو اور قرات میں سب برابر ہوں تو وہ کرائے جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو اور اگر سنت میں سب برابر ہوں تو وہ کرائے جس نے پہلے ہجرت کی ہو اور اگر ہجرت میں سب برابر ہوں تو وہ کرائے جو پہلے اسلام لایا ہو اور ایک روایت میں ہے جو عمر میں بڑا ہو۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کے حلقہ اقتدار میں اس کے اہل کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرائے اور نہ ہی کوئی شخص کسی کی اپنے گھر میں مخصوص نشست(۲) پر اس کے اہل کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۳)۔

(۱) بظاہر مراد یہ ہے کہ جسے زیادہ قرآن حفظ ہو اور بعض کہتے ہیں کہ جو اس کے احکام زیادہ جاننے والا ہو اور یہ حدیث پہلے قول سے مناسبت رکھتی ہے۔

(۲) تکرمہ بمعنی بستر اور اسی طرح کی ہر وہ چیز جو صاحب خانہ کے لئے بچھائی جائے یا اس سے مختص ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ قاری فقیہ پر مقدم ہے اور ابو حنیفہ اور احمد کا یہی مذہب ہے اور ہادویہ کے نزدیک فقیہ قاری پر مقدم ہے کیونکہ مضبوط وہ ہے جس سے لوگ قراءت سیکھنے کے محتاج ہوں وہ نہیں جس سے قراءت کے معنی اور مفہوم سمجھنے کے محتاج ہوں۔ اور بعض دفعہ نماز میں ایسے معاملات پیش آجاتے ہیں جن کی کوئی کامل فقیہ ہی نگہداشت رکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو دوسروں پر مقدم رکھا حالانکہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ تم میں سب سے بہتر قاری ابی ہیں نیز کہتے ہیں صحابہ کے احوال سے پتہ چلتا ہے کہ جو زیادہ قاری ہوتا وہی زیادہ فقیہ بھی ہوتا تھا چنانچہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم دس آیات سے تجاوز نہیں کرتے تھے تا آنکہ ان کے اوامر و نواہی کو پہچان نہ لیں۔ واضح رہے کہ یہ بات آپؐ کے اس قول سے بعید ہے "اگر وہ قراءت میں برابر ہوں تو سنت کو زیادہ جاننے والے کو امام بناؤ" کیونکہ اس میں مطلقاً" قاری کی تقدیم پر دلیل ہے اور علماء نے قاری کی یہی تفسیر کی ہے کہ وہ سنت کو زیادہ جاننے والا ہو اور اگر اس سے یہی مراد لی جائے تو پھر ان دو قسموں کی ایک ہی قسم بنتی ہے۔

نیز آپ نے فرمایا: "جس نے پہلے ہجرت کی ہو" خواہ یہ ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کی گئی ہو یا اس کے بعد جیسے کوئی شخص دارا لکفر سے دارالسلام کی طرف ہجرت کرے۔ رہی یہ حدیث کہ "فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں" تو اس سے مراد مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت ہے کیونکہ یہ دونوں دارالسلام بن گئے تھے اور شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ "تقدیم میں مہاجرین کی اولاد کا حکم ان کے آباء کے حکم جیسا ہے۔

اور "سلما" سے مراد اس شخص کی تقدیم ہے جو پچھلوں سے پہلے اسلام لایا ہو اور "سنا" سے مراد عمر میں بڑا ہے۔ اور مالک بن حویرث کی حدیث میں یہ ثابت ہے کہ "تم میں سے بڑا تمہاری امامت کرائے" اور جو لوگ تقدیم کے مستحق ہیں ان میں سے قریش بھی ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے "قدموا قریشا" حافظ مصنف کہتے ہیں کہ انہوں نے جزء کبیر میں اس کے سب طریق جمع کئے ان میں توجیہہ کے لحاظ سے بہتر وہی ہے جو اس حدیث میں آیا ہے اور اس میں ایک راوی ضعیف ہے۔

رہا آپ کا قول "اور کوئی آدمی کسی دوسرے کے حلقہ اقتدار (سلطان) میں امامت نہ کرائے" تو یہ نہی اس کے لئے جس کا اقتدار نہ ہو۔ اور اس سے مراد صاحب ولایت ہے خواہ وہ بڑا بادشاہ ہو یا اس کا نائب ہو اور اس کا ظاہر یہی ہے خواہ دوسرے اس سے زیادہ قاری اور فقیہ ہوں۔ تو یہ حکم خاص ہے۔

اور حدیث کا پہلا حکم عام ہے اور سلطان سے صاحب خانہ بھی مل جاتا ہے کیونکہ صاحب خانہ کے بارے میں حدیث میں خصوصی حکم آیا ہے کہ وہ زیادہ حقدار ہے اسے طبرانی نے ابن مسعود کی حدیث سے یوں روایت کیا "میں نے جان لیا کہ سنت یہ ہے کہ صاحب خانہ کو مقدم رکھا جائے" مصنف نے کہا کہ اس کے رجال ثقہ ہیں، رہا امام مسجد تو اگر وہ حکومت یا انتظامیہ کی طرف سے مقرر ہو تو وہ سلطان کے حکم میں داخل ہے اور اگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہل مسجد کے اتفاق سے ہو تو اس کے بھی زیادہ حقدار ہونے کا احتمال ہے اور یہ ولایت خاصہ ہے اسی طرح اس مقام پر بیٹھنے کی بھی ممانعت ہے جو بادشاہ اپنے گھریا دربار میں اپنے لئے مخصوص کرے یا کوئی شخص اپنے لئے بستر یا تخت یا ایسی ہی کوئی نشست مخصوص کرلے اس کی اجازت کے بغیر وہاں نہیں بیٹھنا چاہئے۔

عورت اور فاسق شخص کی امامت

۳۸۲۔ ولابن ماجه من حديث جابر رضي الله تعالى عنه؛ ولا تؤمن امرأة رجلاً، ولا أعرابي مهاجراً، ولا فاجر مؤمناً، وإسناده واه.

اور ابن ماجہ میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی عورت مرد کی امام نہ بنے اور نہ کوئی دیہاتی مہاجر کا امام بنے اور نہ کوئی فاجر مومن کا امام بنے اور اس کی سند ناقابل اعتبار ہے(۱)۔

(۱) اس سند میں عبداللہ بن محمد العدوی عن علی بن زید بن جدعان ہے اور عدوی کو وکیع نے حدیث گھڑنے سے متہم کیا ہے اور اس کا اسناد ضعیف ہے اس کے دوسرے طریق میں عبدالملک بن حبیب ہے جو حدیث کی چوری اور سند کو خلط ملط کرنے سے متہم ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت مرد کی امامت نہیں کرا سکتی' ہادویہ' حنفیہ' شافعیہ وغیرہم کا یہی مذہب ہے' اور مزنی اور ابوثور نے عورت کی امامت کو جائز قرار دیا ہے۔ اور طبری نے نماز تراویح میں عورت کی امامت کو جائز سمجھا ہے جبکہ کوئی قرآن کا حافظ نہ مل رہا ہو اور ان لوگوں کی دلیل ام ورقہ والی حدیث ہے جو آگے آرہی ہے یہ حضرات نہی کو تنزیہہ پر محمول کرتے ہیں یا کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

اسی طرح یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اعرابی مہاجر کی امامت نہ کرائے' اور یہ بات غالباً" کراہت پر محمول ہے جیسا کہ ابتدائے اسلام میں تھا۔ اسی طرح یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ فاجر مومن کی امامت نہ کرائے اور فاجر وہ ہے جو نافرمانیوں میں ڈوبا ہوا ہو۔ ہادویہ کا یہی مذہب ہے انہوں نے مقتدیوں کے امام کو عادل سمجھنے کی شرط لگائی ہے اور کہتے ہیں کہ فاسق کی امامت درست نہیں اور شافعیہ اور حنفیہ اس کی امامت کو درست سمجھتے ہیں۔ وہ ابن عمر وغیرہ کی حدیث سے دلیل پیش کرتے ہیں جو آگے آرہی ہے اور بہت سی احادیث ہر نیک اور فاجر کے پیچھے نماز درست ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ الا یہ کہ وہ سب کی سب ضعیف ہیں اور ان سے یہ حدیث معارض ہے "اپنے ذہن میں جرات دکھانے والا تمہارا امام نہ بنے" اور یہ بھی ضعیف ہے وہ کہتے ہیں کہ فریقین کی احادیث ضعیف ہیں تو ہم اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کسی کی امامت درست ہونا اس کی نماز کی صحت پر دلیل ہے اور صحابہ کا فعل اس کی تائید کرتا ہے اسے بخاری نے تاریخ میں عبدالکریم سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بارہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصحاب کو دیکھا ہے جو ظالم اماموں کے پیچھے نماز پڑھتے رہے" نیز مسلم کی روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے (آپ نے کسی صحابی سے پوچھا) "اس وقت تیرا کیا حال ہو گا جب تمہارے امراء نماز کو اس کے وقت سے موخر کریں گے یا اس کے وقت سے ضائع کر دیں گے؟ صحابی نے کہا پھر آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: "نماز اپنے وقت پر پڑھ لے پھر اگر تو ان کی جماعت پائے تو پڑھ لے وہ تیرے نفل ہو جائیں گے" گویا آپ نے ان کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی اور اسے نفل بنایا۔ کیونکہ انہوں نے نماز کا وقت نکال دیا تھا اور اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نماز اپنے وقت پر پڑھیں تو ان کے پیچھے فرض نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۳۸۳- وعن أنس رضي الله تعالى عنه أن النبي ﷺ قال: «رصّوا صفوفكم، وقاربوا بينها، وحاذوا بالأعناق». رواه أبو داود والنسائي، وصححه ابن حبان.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنی صفیں مضبوط کرو(۱) اور قریب کھڑے(۲) ہو اور گردنیں ایک دوسرے کے مقابل رکھو(۳)۔ اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا۔

(۱) یعنی نماز با جماعت میں ایک دوسرے ساتھ مل کر مضبوط بناؤ۔

(۲) یعنی صفوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ رکھو۔

(۳) یعنی صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہو۔

سنن ابی داؤد میں اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے: "اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں شیطانوں کو دیکھ رہا ہوں کہ صف کی خالی جگہوں میں داخل ہوتے ہیں گویا وہ بکری کے چھوٹے بچے ہیں" نیز شیخین اور ابوداؤد نے نعمان بن بشیر کی حدیث سے روایت کرتے ہوئے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے پھر فرمایا: اپنی صفیں درست کرو (تین بار فرمایا) اللہ کی قسم! صفیں درست کر لو ورنہ اللہ تمہارے دلوں میں مخالفت ڈال دے گا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے کندھے کو اپنے ساتھ والے کے کندھے سے اور ٹخنے کو ٹخنے سے چمٹاتا تھا" اور ابو داؤد نے نعمان بن بشیر ہی سے روایت کرتے ہوئے کہا: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو یوں سیدھا کرتے تھے جیسے تیر انداز تیر کو سیدھا کرتا ہے حتیٰ کہ جب آپ کو یقین ہو گیا کہ ہم اس حکم پر عمل پیرا ہو گئے ہیں اور سمجھ گئے ہیں تو ایک دن متوجہ ہوئے۔ اس وقت ایک شخص اپنا سینہ پیچھے ہٹائے ہوئے تھا تو آپؐ نے فرمایا: یا تو تم لوگ اپنی صفیں درست کر لو یا پھر اللہ تمہارے چہرے پیچھے کو لگا دے گا" نیز ابو داؤد نے براء بن عازب کی حدیث سے روایت کرتے ہوئے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جانب سے دوسری جانب تک صف کو ملاتے تھے۔ ہمارے سینوں اور کندھوں کو ہاتھ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آگے پیچھے کرتے اور فرماتے: "اختلاف مت کرو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے" یہ احادیث اور ان میں جو وعید ہے، صفوں کی درستگی کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس میں لوگ تساہل کرتے ہیں جیسا کہ اس چیز سے تساہل کرتے ہیں جو انسؓ کی حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگلی صف کو پورا کرو پھر اس کے بعد ساتھ والی کو اور جو کمی ہو وہ سب سے آخری صف میں ہو" اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ مسجد میں جماعت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو پہلی صف کو پر نہیں کرتے کہ اسے درست کرلیں پھر جب نماز کھڑی ہو جاتی ہے تو دو یا تین اور ایسے ہی متفرق سی صفیں بنا لیتے ہیں۔ اور ابوداؤد نے جابر بن سمرۃ کی حدیث سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم ایسی صفیں نہیں بناتے جیسی فرشتے اپنے رب کے ہاں بناتے ہیں؟" ہم نے پوچھا کہ فرشتے اپنے رب کے ہاں کس طرح صفیں بناتے ہیں؟ فرمایا: "وہ اگلی صفوں کو پورا کرتے ہیں اور صف میں خوب مل کر کھڑے ہوتے ہیں" اور خالی جگہ کو پر کرنے کے متعلق کئی احادیث ہیں جیسے ابن عمرؓ کی یہ حدیث کہ: "اجر کے لحاظ سے کوئی قدم اس قدم سے بڑا نہیں جو کوئی شخص صف میں خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے اٹھاتا ہے" اسے طبرانی نے اوسط میں روایت کیا۔ نیز اوسط میں ہی عائشہ کی حدیث سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے صف میں خلا کو پر کیا اس کے عوض اس کا ایک درجہ بلند کرے گا اور جنت میں ایک گھر بنائے گا" ھیثمی کہتے ہیں کہ اس کی سند میں مسلم ابن خالد الزنجی ہے اور وہ ضعیف ہے اور ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے اور بزاز نے ابی جحیفہ کی حدیث سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس نے صف میں خلا کو پر کیا اسے بخش دیا جائے گا" ھیثمی کہتے ہیں اس کی اسناد حسن ہیں اور یہ حدیث اس سے بے نیاز کر دیتی ہے "اپنی صفوں کو مضبوط بناؤ" الحدیث۔ کیونکہ خلاء صرف اسی صورت میں رہتا ہے جب صفوں کو مضبوط نہ بنایا جائے۔

۳۸۴ـ وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**خير صفوف الرجال أولها، وشرها آخرها، وخير صفوف النساء آخرها، وشرها أولها**». رواه مسلم.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں کی پہلی صف سب سے بہتر(۱) ہے اور آخری سب سے بری۔ اور عورتوں کی پچھلی صف سب سے بہتر ہے اور پہلی سب سے بری۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۲)۔

(۱) یعنی اس کا اجر زیادہ ہے اور پہلی صف میں شامل ہونے پر فرشتے درود بھیجتے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) نیز بزاز نے اور طبرانی نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا اور پہلی صف کی فضیلت میں بہت لمبی چوڑی احادیث آئی ہیں۔ اسے احمد نے روایت کیا۔ ھیثمی کہتے ہیں۔ اس کے رجال ثقہ ہیں اور طبرانی نے کبیر میں ابو امامہ کی حدیث بیان کرتے ہوئے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ اور اس کے فرشتے پہلی صف پر درود بھیجتے ہیں" صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! اور دوسری پر؟ فرمایا: دوسری پر بھی" اور احمد اور بزار نے بقول ھیثمی ثقہ رجال سے نعمان بن بشیر کی حدیث روایت کرتے ہوئے کہا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپؐ نے پہلی صف کے لئے تین بار مغفرت طلب کی اور دوسری کے لئے دو بار اور تیسری کے لئے ایک بار" ھیثمی کہتے ہیں کہ اس میں ایوب بن عقبہ ہے جسے حافظہ کی بنا پر ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

پھر پہلی صف کی دائیں جانب اور امام سے نزدیک اور اس کی بائیں جانب پر افضیلت سے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں چنانچہ طبرانی نے اوسط میں ابوبردہ کی حدیث روایت کرتے ہوئے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تجھ سے ہو سکے تو امام کے پیچھے کھڑا ہو ورنہ اس کی دائیں طرف" ھیثمی کہتے ہیں اس میں ایک ایسا راوی ہے جس کا ذکر میں نے کہیں نہیں پایا۔ نیز طبرانی نے اوسط اور کبیر میں ابن عباس کی حدیث روایت کی۔ پہلی صف کو لازم کر لو اور دائیں جانب کو لازم کر لو۔ اور دیواروں کے درمیان صف سے بچو۔ ھیثمی کہتے ہیں۔ اس میں اسماعیل بن مسلم مکی ضعیف ہے۔

جان لیجئے کہ پہلی صف کے زیادہ حقدار سمجھ بوجھ والے لوگ ہیں چنانچہ بزار نے عامر ابن ربیعہ کی حدیث میں روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے نزدیک تم میں سے سمجھ بوجھ والے لوگ ہونے چاہئیں پھر ان کے ساتھ وہ جو ان سے کم درجہ کے ہوں" ھیثمی کہتے ہیں۔ اس میں عاصم بن عبیداللہ العمری ہے جسے بہت لوگوں نے ضعیف کہا ہے اور اس حدیث سے احتجاج میں اختلاف ہوا ہے۔ اور مسلم نے اور چاروں نے ابن مسعود کی حدیث سے اس زیادتی کے ساتھ روایت کیا ہے۔ "اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے اور بازاروں کے فتنوں سے بچو۔ اور اس بارے میں ان کے علاوہ بھی احادیث ہیں"۔

نیز زیر بحث حدیث میں عورتوں کے صفیں بنانے کے جواز پر دلیل ہے اور ظاہر یہ ہے کہ خواہ ان کی نماز مردوں کے ساتھ ہو یا عورتوں کے ساتھ ہو۔ اور عورتوں کی آخری صف کے بہتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں وہ مردوں سے دور ہوتی ہیں نہ انہیں دیکھ سکتی ہیں نہ ان کا کلام سن سکتی ہیں اور یہ وجہ اسی صورت میں پوری ہوتی ہے جب عورتوں کی نماز مردوں کے ساتھ ہو اگر عورتوں ہی کی جماعت ہو اور ان کی امام عورت ہو تو ان کی صفیں مردوں کی طرح ہوں گی اور پہلی صف افضل ہو گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۸۵- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: صلّيت مع رسول الله ﷺ ذات ليلة، فقمت عن يساره، فأخذ رسول الله ﷺ برأسي من ورائي، فجعلني عن يمينه، متفق عليه.

ابن عباس رضی اللہ عنھا سے روایت ہے کہ ایک رات(۱) میں نے نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنی دائیں جانب کر لیا۔ متفق علیہ(۲)

(۱) یہ وہ رات تھی جو ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گزاری تھی۔

(۲) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے نفلی نماز درست ہے نیز اس بات پر کہ اگر امام کے ساتھ ایک ہی آدمی ہو تو اس کا مقام امام کے دائیں جانب ہے اس کی دلیل آپ کا ابن عباس کو پھیر کر دائیں طرف کرنا ہے۔ اگر اس کا مقام بائیں جانب ہوتا تو آپ نماز میں ابن عباس کو نہ پھراتے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے جبکہ نخعی نے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب امام اور ایک آدمی ہو تو وہ ایک آدمی امام کے پیچھے کھڑا ہو اور اگر امام کے رکوع کرنے تک کوئی اور آدمی نہ آئے تو وہ امام کے دائیں جانب کھڑا ہو جائے۔ اسے سعید ابن منصور نے روایت کیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ امامت اجتماع کا مظنہ ہے لہٰذا مقتدی کے مقام میں اس کا اعتبار کیا جائے گا تا آنکہ اس کا خلاف ظاہر ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حدیث امام کے بائیں جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی صحت پر دلیل ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس کو نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا اور اس بات پر بھی کہ کہ آپ ابن عباس کو جہالت کی وجہ سے معذور سمجھتے ہوئے انہیں حکم نہ دیا ہو یا یہ کہ ابن عباس نے نماز کے لئے تکبیر تحریمہ نہ کہی ہو۔

پھر آپ کے اس قول "پھر آپ نے مجھے اپنی دائیں طرف کر لیا" کا ظاہر یہی ہے کہ آپ نے ابن عباس کو اپنے برابر کھڑا کیا" اور اس حدیث کے بعض الفاظ یوں ہیں "تو میں آپ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا" اور بعض اصحاب شافعی کہتے ہیں کہ مقتدی تھوڑا سا پیچھے کھڑا ہو۔ الا یہ کہ اسے ابن جریج نے روایت کرتے ہوئے کہا۔ ہم نے عطاء سے پوچھا "اگر ایک آدمی ایک آدمی کے ساتھ نماز پڑھے تو وہ امام سے کس جگہ کھڑا ہو؟ عطاء نے جواب دیا "اس کے پہلو میں۔ میں نے پوچھا "کیا اس کے برابر کھڑا ہو حتیٰ کہ اس کے ساتھ صف بنائے اور ایک دوسرے میں کچھ فرق نہ ہو؟ عطاء نے کہا ہاں۔ میں نے کہا "اس طرح کہ وہ دور نہ ہو حتیٰ کہ ان کے درمیان کچھ خلا نہ رہے؟ عطاء نے کہا' ہاں۔" اور موطا میں بھی عمر سے ابن مسعود کی حدیث میں اسی طرح ہے کہ وہ آدمی امام کے ساتھ صف ہے لہٰذا اس کے قریب ہو حتیٰ کہ اس کی دائیں جانب بالکل اس کے برابر ہو جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٣٨٦- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: صلى رسول الله ﷺ، فقمت أنا ويتيم خلفه، وأم سليم خلفنا. متفق عليه، واللفظ للبخاري.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تو میں اور ایک یتیم(ا) بچہ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور ام سلیم(٢) ہمارے پیچھے تھی۔ متفق علیہ(٣)۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

(ا) اصل میں "فقمت یتیم" ہے اس میں مرفوع متصل پر بغیر تاکید اور فصل کے عطف ہے اور یہ کوفیوں کے مذہب کے مطابق صحیح ہے اور یتیم کا نام ضمیرہ ہے اور وہ حسین ابن عبداللہ بن ضمیرہ کا دادا ہے۔

(٢) وہ انس کی والدہ ہیں بچپن میں ان کا نام ملیکہ تھا جو اسم تصغیر ہے۔

(٣) یہ حدیث نفلوں کی جماعت کی صحت پر دلالت کرتی ہے اور تعلیم اور تبرک کے لئے نماز کی صحت پر بھی جیسا کہ یہ قصہ اس پر دلالت کر رہا ہے اور اس پر بھی کہ اگر دو آدمی ہوں تو امام کے پیچھے کھڑے ہوں اور اس پر بھی کہ چھوٹا بھی اپنے وقوف میں شمار ہوتا اور پہلو کو پر کرتا ہے اور یہ بات یتیم کے لفظ سے ظاہر ہے کیونکہ بلوغت کے بعد وہ یتیم نہیں رہتا اور اس بات پر کہ عورت مردوں کے ساتھ صف نہیں بنا سکتی وہ الگ صف بنائے گی اور اگر کوئی دوسری عورت شامل نہ ہو تو یہ اس میں عذر ہے۔ اور اگر عورت مردوں کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ حدیث میں صرف اس کے آخر پر کھڑا ہونے پر سکوت ہے اور یہی اس کا مقام ہے اور وہ کسی اور جگہ پڑھ لے تو اس کے نماز فاسد ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ اور ہادویہ کے نزدیک اس عورت کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے اور اس صف کی بھی اس سے پچھلی صرف والوں کی بھی اگر وہ یہ بات جانتے ہوں اور ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ عورت کے پیچھے مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اور ان دونوں صورتوں میں نماز کے فاسد ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔

٣٨٧- وعن أبي بكرة أنه انتهى إلى النبي ﷺ وهو راكع، فركع قبل أن يصل إلى الصف، فذكر ذلك للنبي ﷺ، فقال - له النبي ﷺ -: زادك الله حرصاً، ولا تعد. رواه البخاري، وزاد أبو داود فيه: «فركع دون الصف، ثم مشى إلى الصف».

ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے اور وہ رکوع میں تھے ابوبکرہ نے صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کر لیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: اللہ تیری حرص زیادہ کرے (ا) آئندہ ایسا نہ کرنا(٢) اسے بخاری نے روایت کیا اور ابوداؤد میں یہ زیادہ ہے کہ اس نے صف میں ملنے سے پہلے رکوع کر لیا پھر چل کر صف میں شامل ہو گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) یعنی بھلائی طلب کرنے پر

(۲) اصل عبارت لا تعد ہے اور تعد عود سے ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص امام کو رکوع میں پائے تو صف میں شامل ہونے سے پہلے نماز میں داخل نہ ہو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نماز کو دہرانے کا حکم نہیں دیا جو نماز کی صحت پر دلالت کرتا ہے میں کہتا ہوں شاید اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے حکم نہ دیا ہو کہ وہ اس حکم کو نہیں جانتا تھا اور جہالت عذر ہے' اور طبرانی نے اوسط میں عطاء عن ابن الزبیر کی روایت سے روایت کیا' اور ہیثمی نے کہا کہ اس کے رجال صحیح ہیں' کہ آپ نے فرمایا: تم سے کوئی شخص جب مسجد میں داخل ہو اور لوگ رکوع میں ہوں تو چاہئے کہ رکوع کرے جب داخل ہو پھر رکوع کی حالت میں ہی آہستہ آہستہ صف میں مل جائے' کیونکہ یہی سنت ہے" عطاء کہتے ہیں کہ میں نے اسے (ابن زبیر کو) ایسا کرتے دیکھا ہے۔ ابن جریج نے کہا کہ میں نے عطاء کو ایسا کرتے دیکھا ہے میں کہتا ہوں کہ ان کی بنائے استدلال لفظ ولا تعد ہے جو اعادہ سے ہے۔ یعنی اللہ بھلائی کی طلب پر تیری حرص زیادہ کرے۔ نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ تیری نماز درست ہے۔ اور تعد کا لفظ ع کی جزم سے بھی مروی ہے جو عدو سے ہے اور اس کی تائید ابن السکن کی اس روایت سے ہوتی ہے جو اس نے ابوبکرہ کے الفاظ میں یوں بیان کی ہے "نماز کھڑی ہو چکی تھی' چنانچہ میں دوڑتا ہوا چلا یہاں تک کہ صف میں شامل ہو گیا پھر جب نماز پوری ہو گئی تو آپ نے پوچھا: ابھی ابھی کون دوڑ رہا تھا ابوبکرہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا وہ میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تیری حرص زیادہ کرے آئندہ ایسا نہ کرنا" اور روایت کا قریبی مفہوم یہی ہے کہ تعد' عود سے ہو یعنی صف میں شامل ہونے کے لئے آئندہ دوڑ کر نہ آنا۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے اس کی نماز کا فساد معلوم ہو حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فتویٰ دیں کہ پھر ایسا نہ کرے بلکہ آپ کے قول "اللہ تیری حرص زیادہ کرے" سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نماز کفایت کرتی تھی یا لاتعد عدو سے ہے۔

۳۸۸- وعن وابصة بن معبد رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ رأى رجلاً يصلي خلف الصف وحده، فأمر أن يعيد الصلاة. رواه أحمد وأبو داود والترمذي، وحسنه، وصححه ابن حبان.

وابصہ بن معبد(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھتے دیکھا تو اسے حکم دیا کہ وہ نماز کو دہرائے(۲)۔ اسے احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) آپ ابو قرصافہ ابن معبد ہیں اور ابن معبد ابن مالک بنی اسد بن خزیمہ الانصاری اسدی سے ہیں وابصہ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے پھر حیرہ چلے گئے اور رقہ میں وفات پائی۔

(۲) اس حدیث میں صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنے کے باطل ہونے پر دلیل ہے نخعی اور احمد اسی بات کے قائل ہیں اور شافعی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا اور کہتے ہیں کہ اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں گا بیہقی نے کہا مذکورہ خبر کے ثبوت کی وجہ سے ایسے کام سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اور جو نماز کے باطل ہونے کے قائل نہیں وہ ابوبکرہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے اسے دہرانے کا حکم نہیں دیا حالانکہ ابوبکرہ نے نماز کا کچھ حصہ صف کے پیچھے اکیلے ادا کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس روایت میں اعادہ استحباب کی بنا پر ہے بعض کہتے ہیں کہ ابوبکرہ کی حدیث کو عذر پر محمول کیا جائے اور وہ بقدر امکان صف میں شامل ہونے کی صورت میں رکعت کے فوت ہونے کا ڈر تھا اور اس کے لئے پوری جماعت میں کوئی عذر نہیں۔

میں کہتا ہوں اس سے بھی بہتر یہ بات ہے کہ کہا جائے کہ ابوبکرہ کی حدیث اس سے معارض نہیں بلکہ اس کے موافق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابوبکرہ کو نماز دہرانے کا حکم نہ دینے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جہالت کی بناء پر معذور تھے اور ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو آپ نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنے پر دہرانے کا حکم دیا وہ یہ حکم جانتا ہو نیز درج ذیل حدیث بھی نماز کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

۳۸۹- وله عن طلق: لا صلاة لمنفرد خلف الصف. وزاد الطبراني في حديث وابصة: ألا دخلت معهم، أو اجتررت رجلاً؟

اور ابن حبان میں ہی طلق بن علی(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے کی نماز نہیں(۲) ہوتی اور طبرانی میں وابصہ کی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ تو کیوں نہ ان میں شامل ہو گیا یا کسی کو کھینچ(۳) لیا؟

(۱) ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) یہ نفی دراصل نماز کی صحت کی نفی ہے۔

(۳) یعنی صف سے جو تیرے ساتھ شامل ہو جاتا' اور طبرانی میں اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے "اگر تجھ سے جگہ تنگ ہو جاتی ہے تو نماز دہرائے کیونکہ تیری نماز نہیں ہوئی" اور یہ مجمع الزوائد میں ابن عباس کی روایت میں اس طرح ہے "تم میں سے کوئی شخص جب صف کی طرف جائے اور وہ پوری ہو چکی ہو اسے چاہئے کہ اپنی طرف ایک آدمی کھینچ لے جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو جائے" اور کہا کہ طبرانی نے اسے اوسط میں روایت کیا ہے اور کہا ہے "یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی سند سے مروی ہے اور اس میں السری بن ابراہیم ہے جو انتہائی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضعیف ہے اور مجمع الزوائد کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وابصہ کی حدیث میں سری بن اسماعیل ہیں اور وہ ضعیف ہے اور شارح نے ذکر کیا کہ سری طبرانی کی اس روایت میں ہے جس میں زیادتی ہے الا یہ کہ ابوداؤد نے مراسیل میں مقاتل بن حبان کی روایت سے مرفوعا" روایت کیا کہ "اگر تم میں سے کوئی شخص آئے اور جگہ نہ پائے تو صف سے ایک آدمی کو اپنی طرف کھینچ لے اور اس کے ساتھ کھڑا ہو اور کھینچنے والے کو بہت بڑا اجر ہے" اور طبرانی نے اوسط میں ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے کو حکم دیا' "جبکہ صفیں پوری ہو چکی تھیں' کہ ایک آدمی کو اپنی طرف کھینچ لے جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو" اور اس کی سند ناقابل اعتبار ہے۔

۳۹۰۔ وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: إذا سمعتم الإقامة فامشوا إلى الصلاة، وعليكم السكينة والوقار، ولا تسرعوا، فما أدركتم فصلوا، وما فاتكم فأتموا، متفق عليه. واللفظ للبخاري.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اقامت کی آواز سنو تو نماز کی طرف آؤ اور اطمینان(۱) اور وقار(۲) کو لازم سمجھو' دوڑتے ہوئے مت آؤ۔ پھر جتنی نماز تمہیں مل جائے وہ (جماعت کے ساتھ) پڑھو اور جو رہ جائے وہ (بعد میں) پوری کر لو۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

(۱) اصل عبارت میں سکینہ ہے ' بمعنی اپنی حرکات سوچ سمجھ کر کرنا اور بے فائدہ کاموں سے پرہیز کرنا۔

(۲) وقار کا تعلق ہیئت سے ہے جیسے نظر نیچی اور پست رکھنا اور ادھر ادھر توجہ نہ کرنا اور بعض کہتے ہیں کہ ان دونوں لفظوں کا معنی ایک ہی ہے اور دوسرا لفظ تاکیداً ذکر کیا گیا ہے مسلم کی روایت میں اس ادب کی شرعیت میں حکمت پر متنبہ کرتے ہوئے ابوہریرہ کی حدیث کے آخر میں یوں ہے۔ تم میں سے جب کوئی شخص نماز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ نماز میں ہی ہوتا ہے" یعنی وہ نمازی کے حکم میں ہوتا ہے لہٰذا اسے ویسا ہی اعتماد کرنا چاہئے جیسے نمازی کو ہوتا ہے اور جن کاموں سے نمازی اجتناب کرتا ہے اسے بھی کرنا چاہئے۔

اس حدیث میں نماز کو آتے وقت وقار کا حکم اور جلدی کرنے یا دوڑ کر آنے کی ممانعت ہے۔ اس طرح کئی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور اگر ان کا خیال رکھے تو یہ فضیلت پالیتا ہے۔ چنانچہ مسلم میں جابر کی حدیث سے یہ ثابت ہے "نمازی کے ہر قدم کے عوض درجہ ہے جو وہ نماز کے لئے اٹھاتا ہے" اور ابو داؤد میں مرفوعا" آیا ہے "تم میں سے کوئی شخص جب اچھی طرح وضو کرے پھر مسجد کی طرف نکلے تو جو دایاں قدم وہ اٹھاتا ہے اللہ اس کے لئے ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور ہر بائیں قدم کے عوض ایک برائی مٹا دیتا ہے پھر جب مسجد میں آتا اور جماعت سے نماز پڑھتا ہے تو اسے بخش دیا جاتا ہے پھر جب وہ آئے اور لوگوں نے کچھ نماز پڑھ لی ہو اور کچھ باقی ہو تو جو کچھ پائے وہ پڑھ لے "تو جو پاؤ پڑھ لو" شرط کا جواب ہے جو محذوف ہے یعنی جب تم نے وہ کام کر لیا جس کا تمہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکم دیا گیا ہے یعنی دوڑ کر نہ آؤ وغیرہ تو جو پاؤ وہ پڑھ لو۔ اور اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ وہ جماعت کی فضیلت پالیتا ہے خواہ جماعت کا کچھ حصہ ہی پائے اگرچہ وہ ایک رکعت سے بھی کم ہو۔ جمہور اسی بات کے قائل ہیں اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ نماز کو پانے والا وہی ہو سکتا ہے جو کم از کم ایک رکعت پالے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جس نے نماز کی ایک رکعت پالی' اس نے نماز پالی" اور عنقریب جمعہ کے بیان میں رکعت پانے کی شرط کا ذکر ہوگا اور اسی پر دوسری رکعتوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اوقات کے بارے میں ہے جماعت کے بارے میں نہیں اور جمعہ خاص چیز ہے لہٰذا اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور زیر بحث حدیث میں امام کو کسی بھی حالت میں پانے اور اس کے شامل ہونے کی صحت پر استدلال کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے مرفوعا" روایت کیا "جو شخص مجھے رکوع کرتے یا کھڑے یا سجدہ میں پائے تو اسے چاہئے کہ اسی حالت میں میرے ساتھ شامل ہو جائے جس حالت میں میں ہوں۔"

میں کہتا ہوں کہ اس نے جو کچھ پا لیا اس حدیث میں نہ اس کے شمار ہونے پر کوئی دلالت ہے اور نہ محروم ہونے پر بلکہ اس میں تو حکم ہے کہ آپؐ جس حالت میں ہوں ان کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ طبرانی نے کبیر میں ثقہ رجال سے نقل کیا ہے جیسا کہ ہیثمی نے کہا ہے، علی اور ابن مسعود دونوں سے روایت کیا ان دونوں نے کہا۔ جس نے رکوع نہیں پایا، اس نے رکعت نہیں پائی نیز کبیر میں یہ بھی روایت کیا اور بقول ہیثمی اس کے رجال ثقہ ہیں اور زید بن وہب کی حدیث بیان کرتے ہوئے کہا میں اور ابن مسعود مسجد میں داخل ہوئے اور امام رکوع میں تھا ہم نے رکوع کیا پھر چل کر صف میں شامل ہو گئے۔ جب امام فارغ ہو گیا تو میں نے کھڑے ہو کر اس کا فیصلہ چاہا تو اس نے کہا "تو نے وہ رکعت پالی" اور یہ آثار موقوف ہیں اور آخر میں دلیل وہی جانی پہچانی بات یعنی ابوبکرہ کی حدیث کے احتمالات میں سے ایک احتمال ہے ورنہ یہ سب موقوف ہیں جن پر کوئی دلیل نہیں ہو ابن الزبیر کا مذہب اور یہ بیان پہلے گزر چکا ہے اور زیر بحث حدیث کی بعض روایات میں اتموا کے بجائے فاقضوا کا لفظ آیا ہے اور قضاء کا اطلاق کسی چیز کے ادا کرنے پر ہوتا ہے گویا یہ بھی اتموا کے ہی معنی میں ہے ان میں کچھ مغایرت نہیں۔

پھر اس بات میں بھی علماء نے اختلاف کیا ہے کہ جتنی نماز ملنے والے نے امام کے ساتھ پائی ہے وہ اس کی نماز کا پہلا حصہ ہوگا یا پچھلا اور حق یہی ہے کہ وہ پہلا ہوگا۔ اور ہم نے ضوء النہار کے حواشی میں اس کی تحقیق پیش کر دی ہے۔ پھر اس بات میں بھی اختلاف ہوا کہ جب ملنے والے نے امام کو رکوع میں پایا اور اس کے ساتھ اس نے رکوع کر لیا تو اس رکعت میں قرات اس سے ساقط ہو جائے گی؟ یہ سوال ان لوگوں کی طرف سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جو قراءت فاتحہ کو واجب سمجھتے ہیں کیونکہ اگر قراءت قضاء ہو جائے تو رکعات شمار نہ ہو گی اور اگر ساقط نہ ہو تو شمار ہو گی؟ بعض کہتے ہیں شمار ہو جائے گی کیونکہ اس نے امام کو اپنی پشت سیدھی کرنے سے پہلے پا لیا اور بعض کہتے ہیں کہ شمار نہیں ہو گی کیونکہ اس کی قراءت فاتحہ رہ گئی۔ ہم نے اس موضوع پر تفصیل سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور ہمارے نزدیک رکعت شمار ہو جانے کو ترجیح ہے۔ ان دلائل میں سے ایک دلیل ابوبکرہ کی حدیث ہے جب اس نے رکوع کیا اور لوگ رکوع میں تھے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بحال رکھا۔ آپ نے ابوبکرہ کو صرف اس بات سے منع کیا تھا کہ صف میں شامل ہونے سے پہلے نماز میں داخل نہ ہو جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔

٣٩١- وعن أبي بن كعب رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«صلاة الرجل مع الرجل أزكى من صلاته وحده، وصلاته مع الرجلين أزكى من صلاته مع الرجل، وما كان أكثر فهو أحب إلى الله عز وجل»**. رواه أبو داود والنسائي، وصححه ابن حبان.

ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو آدمی مل کر نماز پڑھیں تو وہ اکیلے کی نماز سے بہتر(١) ہے۔ اور تین آدمی مل کر پڑھیں تو دو کے مل کر پڑھنے سے بہتر ہے اور جتنے آدمی زیادہ ہوتے جائیں وہ نماز اللہ عزوجل کو اتنی ہی زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا(٢)۔

(١) یعنی اکیلے کی نماز سے بہت زیادہ اجر والی ہے۔

(٢) اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا اور ابن السکن' عقیلی اور حاکم نے صحیح کہا اور اس میں اختلاف کا ذکر کیا۔ اور بزار اور طبرانی نے ان الفاظ سے روایت کیا: "دو آدمیوں کی نماز میں ایک امامت کرائے' اللہ کے نزدیک ان سو نمازوں سے بہتر ہے جو اکیلے اکیلے یا باری باری پڑھی جائیں" اور اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جماعت کی نماز دو افراد یعنی امام اور ایک مقتدی بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اس کی موافقت ابوموسیٰ کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے جسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔"دو اور اس سے اوپر جتنے ہوں جماعت ہے" اور بیہقی نے بھی انس کی حدیث سے اسے روایت کیا اور ان دونوں میں ضعف ہے اور بخاری نے باب کا عنوان ان الفاظ سے قائم کیا ہے۔ "باب اثنان فما فوقهما جماعه" اور مالک بن حویرث کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے "جب نماز کا وقت آجائے تو اذان دو پھر اقامت ہو پھر تم دونوں میں سے جو بڑا ہے وہ امامت کرائے" نیز احمد نے ابن سعید کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیث یوں روایت کی ہے: ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ آپ اس وقت صحابہ کو ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے پوچھا "اے فلاں! تجھے جماعت میں شامل ہونے سے کس چیز نے روکے رکھا؟" اس نے اس کی کچھ وجہ بیان کی پھر وہ کھڑا ہوا اور نماز پڑھنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کوئی ہے جو اس شخص پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ ایک شخص اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا" ہیثمی کہتے ہیں کہ اس کے سب رجال صحیح ہیں۔

۳۹۲- وعن أم ورقة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ أمرها أن تؤم أهل دارها. رواه أبو داود، وصححه ابن خزيمة.

ام ورقہ(۱) رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے گھروالوں کی امامت کرانے کا حکم دیا تھا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا(۲)۔

(۱) آپ ام ورقہ بنت نوفل انصاریہ ہیں اور بعض ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث بن عویمر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہاں جایا کرتے تھے اور اس کا نام شہیدہ رکھا تھا۔ اس نے قرآن جمع کیا تھا اور اپنے گھروالوں کی امامت کراتی تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کے لئے نکلے تو اس نے کہا کہ "یا رسول اللہ! مجھے اپنے ساتھ جنگ میں شمولیت کی اجازت دیجئے۔ الحدیث۔ اور آپ نے اسے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروالوں کی امامت کرائے۔ آپؐ نے اس کے لئے ایک موذن مقرر کیا جو اذان دیتا تھا۔ ام ورقہ کا ایک غلام اور ایک لونڈی تھی جنہیں اس نے مدبر کر دیا تھا (یعنی ورقہ کی موت کے بعد وہ آزاد ہوں گے) اور ایک حدیث میں ہے کہ وہ غلام اور لونڈی ایک رات اس کے گرد کھڑے ہوئے اور ایک چادر سے اس طرح ڈھانپا کہ ام ورقہ مرگئی۔ اور وہ دونوں چلے گئے۔ صبح کو حضرت عمرؓ لوگوں میں کھڑے ہو کر کہنے لگے۔ کیا کسی کو ان دونوں کے متعلق کچھ علم ہے یا کسی نے انہیں دیکھا ہو تو وہ انہیں لے کر آئے۔ چنانچہ وہ دونوں پکڑے گئے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ اور مدینہ میں یہ پہلے مصلوب تھے۔

(۲) یہ حدیث عورت کے گھروالوں کی امامت کرنے پر دلیل ہے خواہ ان میں مرد بھی ہو، ام ورقہ کا جو موذن تھا وہ بوڑھا آدمی تھا جیسا کہ روایت میں ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے غلام اور لونڈی کی امامت کراتی تھی۔ ابوثور' غزنی اور طبری تو عورت کی امامت کی صحت کے قائل ہیں مگر جمہور نے اس سے اختلاف کیا ہے البتہ مرد عورتوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن احمد نے ابی بن کعب کی حدیث سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایت کیا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگے: "یا رسول اللہ! میں نے آج رات ایک کام کیا ہے آپ نے پوچھا: وہ کیا؟ کہنے لگے: میرے گھر میں جو عورتیں ہیں وہ مجھے کہنے لگیں کہ تم تو قراءت کر سکتے ہو اور ہم نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا ہمیں نماز پڑھاؤ۔ چنانچہ میں نے آٹھ رکعت اور وتر نماز پڑھائی۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ ابی کہتے ہیں کہ ہم نے سمجھ لیا کہ آپ کا سکوت رضا ہے" ہیثمی کہتے ہیں اس کی سند میں ایک راوی کا نام نہیں لیا گیا وہ کہتے ہیں کہ اسے ابو یعلی نے اور طبرانی نے اوسط میں روایت کیا اور اس کی سند حسن ہے۔

۳۹۳- وعن أنس رضي الله تعالیٰ عنه، أن النبي ﷺ استخلف ابن أم مكتوم، يؤم الناس وهو أعمى. رواه أحمد وأبو داود،

۳۹۴- ونحوه لابن حبان عن عائشة.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم(۱) کو اپنا خلیفہ بنایا وہ لوگوں کی امامت کراتے تھے اور وہ اندھے تھے اسے احمد اور ابوداؤد(۲) نے روایت کیا۔ اور ابن حبان میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی اسی طرح (۳) مروی ہے۔

(۱) ان کا نام پہلے اذان کے باب میں گزر چکا ہے۔

(۲) ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے انہیں دو مرتبہ خلیفہ بنایا' اور طبرانی کی اوسط میں عائشہ کی حدیث میں ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو مرتبہ خلیفہ بنایا۔ وہ لوگوں کی امامت کراتے تھے" اور خلیفہ بنانے سے مراد نماز اور دوسرے کاموں میں اپنا نائب بنانا ہے چنانچہ طبرانی میں ان لفظوں میں روایت کیا ہے "نماز میں اور دوسرے کاموں میں" او راس کی سند حسن ہے ابن ام مکتوم کے خلیفہ بننے کے مواقع کو شمار کیا گیا تو تیرہ بار تک پہنچ گئے جیسا کہ خلاصہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ حدیث بلا کراہت اندھے کی امامت کی صحت پر دلیل ہے۔

(۳) یعنی انس کی حدیث کی طرح۔ اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ طبرانی نے اسے اوسط میں روایت کیا ہے۔

۳۹۵- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: **«صلّوا على من قال لا إله إلا الله، وصلّوا خلف من قال لا إله إلا الله»**. رواه الدارقطني بإسناد ضعيف.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے اس پر نماز جنازہ پڑھو۔ اور جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے اس کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیا کرو اسے دار قطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا(۱)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ا) بدر منیر میں کہا ہے اس حدیث کے جتنے بھی طریق ہیں ان میں سے کوئی بھی ثابت نہیں اور یہ اس بات پر دلیل ہے جو شخص کلمہ شہادت پڑھتا ہو اس پر جنازہ پڑھا جائے خواہ وہ واجبات بھی پورے نہ کرتا ہو زید بن علی اور احمد بن عیسیٰ کا یہی مذہب ہے اور ابو حنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے مگر انہوں نے ڈاکو اور باغی کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے۔ اور ڈاکو کے بارے میں شافعی کے کئی اقوال ہیں جب ان کو سولی دیا جائے' دراصل یہ ہے کہ جس نے کلمہ شہادت پڑھ لیا اس کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں اور انہیں میں سے ایک نماز جنازہ پڑھنا ہے۔ اور اس پر اس شخص والی حدیث ولالت کرتی ہے جس نے تیروں سے خودکشی کر لی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھاؤں گا تاہم دوسروں کو اس پر جنازہ پڑھنے سے منع نہیں فرمایا" اور اس لئے بھی کہ نماز جنازہ کی شریعت کا عموم کلمہ پڑھنے والوں میں سے کسی دلیل کے ساتھ خاص کیا جا سکتا ہے رہا لا الہ الا اللہ پڑھنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا تو اس پر پہلے بحث گزر چکی ہے نیز اس پر عدالت کی شرط عائد کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں نیز یہ کہ جس کی نماز درست ہے اس کی امامت بھی درست ہے۔

٣٩٦- وعن علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«إذا أتى أحدكم الصلاة، والإمام على حال، فليصنع كما يصنع الإمام»**.
رواه الترمذي بإسناد ضعيف.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص جب نماز کے لئے آئے اور امام کسی بھی حال میں ہو تو جو کچھ امام کرے وہی کچھ وہ بھی کرے۔ اسے ترمذی نے ضعیف سند سے روایت کیا۔

اسے ترمذی نے علی اور معاذ کی حدیث سے روایت کیا اور اس میں ضعف بھی ہے اور انقطاع بھی اور کہا کہ ہم اس طریق کے علاوہ کسی طریقے کو نہیں جانتے جس سے کسی نے اسے روایت کیا ہو۔ نیز ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی حدیث سے روایت کرتے ہوئے کہا۔ ہمارے اصحاب الحدیث نے ہم سے حدیث بیان کی اور اس میں معاذ ہیں جنھوں نے کہا کہ "میں نے امام کو جس حال میں دیکھا اسی میں شریک ہو گیا" اس سے انقطاع دور ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عبدالرحمٰن کے لئے راوی صرف معاذ ہی نہیں بلکہ صحابہ کی ایک جماعت ہے اور انقطاع کا دعویٰ صرف عبدالرحمٰن اور معاذ کے درمیان کیا جاتا ہے وہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے معاذ سے سماعت نہیں کی حالانکہ اس نے دوسرے صحابہ سے کی ہے اور یہاں جو اصحابنا کہا ہے تو اس سے مراد صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ امام نماز کے جس حصہ میں بھی ہو آنے والے کو اس کے ساتھ مل جانا واجب ہے اگر امام کھڑا ہو یا رکوع میں ہو تو اس کی رکعت شمار ہو جائے گی جیسا کہ گزر چکا اور اگر وہ بیٹھا ہو یا سجدہ میں ہو تو وہ امام کے ساتھ بیٹھنے میں یا سجدہ میں شریک ہو جائے اور اس کی یہ رکعت شمار نہیں ہو گی اور اس کی تائید جیسا کہ گزر چکا' ابن ابی شیبہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے "جس نے مجھے کھڑے یا رکوع میں یا سجدہ میں پایا تو وہ میرے ساتھ اسی حالت میں شریک ہو جائے جس پر میں ہوں" اور ابن خزیمہ نے ابو ہریرہ سے مرفوعاً" روایت کیا کہ جب تم آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو اسے کچھ نہ شمار کرو' اور جس نے رکوع پالیا' اس نے رکعت پا لی۔ نیز ابوداؤد نے ہی ابو ہریرہ سے مرفوعاً" روایت کیا کہ جس نے نماز میں امام کے پشت سیدھی کرنے سے پہلے رکوع پالیا اس نے رکعت پا لی' اور اس کے باب کا عنوان یہ قائم کیا "اس وقت کا بیان جس میں مقتدی رکعت پانے والا ہے اور یہ وہ وقت ہے جب اس کا امام رکوع میں ہو" اور حدیث کے لفظ "تو آنے والا وہی کچھ کرے جو امام کر رہا ہے" اس بات میں صریح نہیں کہ آنے والا تکبیر تحریمہ کے ساتھ امام کے ساتھ شامل ہو۔ بلکہ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ جب امام کھڑا ہو یا رکوع میں ہو تو آنے والا قیام کی تکبیر کے بعد پھر رکوع کرے یا جس حال میں ہو امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور کب وہ تکبیر تحریمہ کہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس میں یہ احتمال بھی ہے الا یہ کہ منفرد اور امام کے قیام کی حالت میں تکبیر تحریمہ اس صورت میں کفایت کر سکتی ہے اور احتمال کے ساتھ اس کے داخل ہونے میں یہ بات زیادہ واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

جماعت ترک کرنے میں کون کون سے عذر مقبول ہیں؟ شیخین نے ابن عمر سے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ "آپ ندا کرنے والے کو حکم دیتے تھے کہ وہ ندا کرے کہ سفر میں بارش والی یا ٹھنڈی رات میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر نماز ادا کر لو" اور جابر سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر پر نکلے تو بارش ہو گئی تو آپ نے فرمایا کہ "تم میں سے جو چاہے اپنے ٹھکانے پر نماز پڑھ لے" اسے مسلم' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے صحیح کہا اور شیخین نے ابن عباس سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک بارش کے دن اپنے موذن سے کہا "جب تو اشہد ان محمدا رسول اللہ کہے تو حی علی الصلوۃ مت کہہ بلکہ یوں کہہ "اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو" راوی کہتا ہے کہ لوگوں نے اس بات کو ناپسند کیا تو ابن عباس نے کہا کہ "تم کس بات پر تعجب کرتے ہو؟ یہ کام تو اس نے کیا جو مجھ سے بہتر تھا یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم" اور مسلم میں ہے کہ "ابن عباس نے جمعہ کے دن جو بارش کا دن تھا' اپنے موذن کو ایسا حکم دیا" اور بخاری نے ابن عمر سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب کوئی شخص کھانا کھا رہا ہو تو جلدی نہ کرے تا آنکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی حاجت سے فارغ ہو جائے خواہ نماز کھڑی ہو جائے" اور احمد اور مسلم نے عائشہ کی حدیث سے روایت کیا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کھانا سامنے پڑا ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ نہ اس وقت ہوتی ہے جب اسے پیشاب یا پاخانہ تنگ کر رہے ہوں" اور بخاری نے ابوداؤد سے روایت کیا کہ یہ آدمی کے سمجھدار ہونے کی دلیل ہے کہ پہلے اپنی حاجت پوری کرے پھر نماز کی طرف اس حال میں متوجہ ہو کہ اس کا دل مطمئن ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسافر اور مریض کی نماز کا بیان

٣٩٧- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: أول ما فرضت الصلاة ركعتان، فأقرت صلاة السفر، وأتمت صلاة الحضر. متفق عليه.

وللبخاري: ثم هاجر، ففرضت أربعاً، وأقرت صلاة السفر على الأول.

وزاد أحمد: إلا المغرب، فإنها وتر النهار، وإلا الصبح، فإنها تطول فيها القراءة.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ابتداء میں نماز دو رکعت فرض (١) ہوئی۔ پھر سفر کی نماز تو یہی بحال(٢) رکھی گئی اور مقیم کے لئے (چار رکعت) پوری کی گئی(٣)۔ متفق علیہ اور صرف بخاری میں عائشہ سے ہے کہ پھر آپؐ نے ہجرت کی تو چار فرض کی گئیں اور سفر کی نماز پہلی حالت پر بحال رکھی گئی اور احمد میں یہ زیادہ ہے سوائے مغرب(٤) کے کہ وہ دن کے وتر ہیں اور سوائے صبح کے کہ اس میں قراءت لمبی کی جاتی ہے(٥)۔

(١) سوائے مغرب کے کہ سفر و حضر میں تین رکعت پہلے سے فرض ہے۔

(٢) یعنی اللہ نے سفر میں دو رکعتیں برقرار رکھیں۔

(٣) سوائے مغرب کے اور تین نمازوں میں دو دو رکعت بڑھا دی گئیں۔ پورا کرنے سے مراد بڑھانا ہے گویا وہ سفر کی نماز کے مقابلہ میں مکمل ہیں۔

(٤) یعنی حضرت عائشہ کی روایت میں ان کے اس قول کے بعد "پہلے جو نماز فرض کی گئی یعنی مغرب کے سوا۔ کیونکہ وہ تین رکعت ہی فرض ہوئی تھی وہ دن کے وتر ہیں۔

(٥) اس حدیث میں سفر میں قصر کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ فرضت' وجبت کے معنوں میں ہے ہادویہ' حنفیہ وغیرہم کا مذہب اس کا وجوب ہے اور شافعی اور ایک جماعت اس بات کے قائل ہیں کہ یہ رخصت ہے اور پوری نماز پڑھنا افضل ہے کچھ لوگوں نے کہا کہ فرضت بمعنی قدرت ہے یا اس کے لئے فرض کی گئی ہے جو قصر کا ارادہ رکھے اور ان لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوۃ "اگر تم نماز میں قصر کرلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں"۔

اور اس لئے بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپؐ کے ہمراہ سفر کیا تو کچھ لوگ قصر کرتے تھے اور کچھ پوری پڑھتے تھے اور کوئی ایک دوسرے کا عیب نہیں نکالتا تھا اور اس لئے بھی کہ عثمانؓ پوری نماز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھتے تھے اور اسی طرح عائشہ بھی جیسا کہ مسلم نے روایت کیا کہ "سفر کی نماز دو رکعت ہیں جو آسمان سے نازل ہوئیں اب اگر تم چاہو تو انہیں واپس لوٹا دو" ہیثمی کہتے ہیں کہ اس کے رجال ثقہ ہیں اور یہ توقیف ہے لہٰذا اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں نیز طبرانی نے کبیر میں ابن عمر ہی سے صحیح رجال سے روایت کیا کہ "سفر کی نماز دو رکعت ہیں جس نے سنت کی مخالفت کی اس نے کفر کیا" آپ نے سنت کا لفظ استعمال کیا جو اس کے مرفوع ہونے پر دلیل ہے جیسا کہ دستور ہے ابن قیم الهدی النبوی میں کہتے ہیں "آپ صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعتوں سے قصر کر کے دو رکعت پڑھا کرتے تھے جب آپ سفر پر نکلتے تو واپس مدینہ آنے تک قصر ہی کرتے تھے۔ آپ سے یہ ہرگز ثابت نہیں کہ آپ نے سفر میں چار رکعت پڑھی ہوں۔

اور اس حدیث میں الاالمغرب کا لفظ ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اصولاً مغرب کی تین رکعت ہی مشروع ہوئیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نیز یہ لفظ انہا وترالنہار یعنی دن کی نماز جوڑے جوڑے تھی۔ اور مغرب دن کے آخر میں واقع ہوتی ہے اور اسی کا آخری حصہ ہے تو گویا یہ دن کی نماز کے وتر ہوئے۔ جیسا کہ آپ نے رات کی نماز کے وتر مشروع کئے اور وتر اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں جیسا کہ حدیث کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے کہ "اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے"۔

نیز اس حدیث میں الاالصبح آیا ہے کیونکہ صبح کی نماز میں قراءت لمبی کی جاتی ہے لہٰذا اس میں قصر نہیں کیا گیا۔ یہ سفر و حضر میں وہی رہتی ہے کیونکہ ان میں قرات کو لمبا کرنا مشروع کیا گیا ہے۔ اسی لئے اس نماز کو قرآن میں قرآن الفجر سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس میں قراءت لمبی کرنا اس کا رکن اعظم ہے تو اعظم جزء کا نام لے کر اسے کل مراد لیا گیا ہے۔

۳۹۸- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها أن النبي ﷺ كان يقصر في السفر ويتم، ويصوم ويفطر. رواه الدارقطني، ورواته ثقات، إلا أنه معلول، والمحفوظ عن عائشة من فعلها، وقالت: إنه لا يشق علي. أخرجه البيهقي.

اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں کبھی نماز میں قصر کرتے اور کبھی پوری پڑھتے تھے، کبھی روزہ رکھ لیتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے اسے دار قطنی نے روایت کیا اور اس کے راوی(۱) ثقہ ہیں سوائے اس کے کہ یہ حدیث معلول ہے اور عائشہ ہی کی محفوظ حدیث خود عائشہ کے فعل سے متعلق ہے۔ اور اس (عائشہ) نے کہا کہ اس طرح کرنا مجھ پر مشکل نہیں۔ اسے بیہقی نے روایت کیا(۲)۔

(۱) یعنی عطاء کے طریق سے حضرت عائشہ سے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) احمد نے اسے منکر کہا ہے کیونکہ عروہ نے عائشہ سے روایت کیا کہ وہ پوری نماز پڑھتی تھیں اور انہوں نے بھی ایسے ہی تاویل کر لی تھی جیسے عثمانؓ نے کر لی تھی جیسا کہ صحیح میں ہے اور اگر عائشہ کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت ہوتی تو عروہ یوں نہ کہتے کہ انہوں نے تاویل کر لی تھی۔ حالانکہ صحیحین میں اس کے خلاف ثابت ہے۔ اور دار قطنی نے عطاء سے ہی اور بیہقی نے عائشہ سے روایت کیا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ عمرہ کے لئے مدینہ سے مکہ تک سفر کیا۔ یہاں تک کہ جب مکہ پہنچے تو عائشہ نے کہا "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں نے نماز پوری بھی پڑھی اور قصر بھی کی اور روزے رکھے بھی ہیں اور چھوڑے بھی۔ تو آپ نے فرمایا: "عائشہ! تو نے اچھا کیا اور مجھ پر کوئی عیب نہ لگایا۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ یہ روایت یوں بھی مروی ہے یقصر و تتم اور یفطر و تصوم (یعنی آپؐ قصر کرتے اور روزہ چھوڑتے اور عائشہ پوری پڑھتیں اور روزہ رکھتیں) یعنی عزیمت پر عمل کرتی تھیں۔ ہمارے شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں یہ باطل ہے کہ عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کے خلاف کیا ہو اور ان کے خلاف نماز پڑھی ہو اور صحیح میں عائشہ ہی سے روایت ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے دو رکعت نماز فرض کی پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو حضر کی نماز زیادہ کی گئی اور سفر کی نماز بحال رکھی گئی" پھر یہ کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ عائشہ نے آپؐ اور مسلمانوں کے ہمراہ رہ کر ان کے خلاف نماز پڑھی ہو؟

میں کہتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عائشہ نماز پوری پڑھا کرتی تھیں۔ ابن عباس وغیرہ نے کہا ہے کہ انہوں نے بھی عثمان کی طرح تاویل کر لی تھی۔

اور اس حدیث کے متصل ہونے میں اختلاف ہے کیونکہ یہ عبدالرحمٰن الاسود سے، عائشہ سے مروی ہے دار قطنی نے کہا کہ اس نے حضرت عائشہ کا زمانہ اس وقت پایا جبکہ وہ بالغ ہی نہیں ہوا تھا۔ مصنف رحمہ اللہ نے بھی وہی کہا ہے جو بخاری کی تاریخ وغیرہ میں ہے کہ اس کا کوئی شاہد نہیں ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا وہ عائشہ کے ہاں گیا اور وہ چھوٹا تھا اور ان سے کچھ نہیں سنا اور ابن ابی شیبہ اور طحاوی نے عائشہ سے سماع کے ثبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اس حدیث کے بارے میں دار قطنی کا قول مختلف ہے چنانچہ اس نے سنن میں کہا اس کی سند حسن ہے۔ اور العلل میں کہا اس کے مرسل ہونے کا شبہ ہے۔ یہ مصنف کا کلام ہے جسے شارح نے نقل کیا ہے پھر میں نے سنن دار قطنی کی طرف رجوع کیا تو دیکھا کہ روایت کرنے کے بعد اسے صحیح کہا ہے پھر اس میں علاء بن زبیر بھی ہے اور ذہبی نے میزان میں کہا کہ ابن معین نے اسے ثقہ کہا ہے اور ابن حبان نے کہا وہ ان لوگوں سے تھا جو ثقات سے روایت کرتے ہیں جس سے اثبات کی حدیث مشتبہ نہیں ہوتی۔ گویا ایسی حدیث سے، جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اثبات موافق نہ ہو احتجاج باطل ہے اور اس سے ابن حزم کا اس کے متعلق جہالت کا دعویٰ بھی باطل ہوا بلکہ وہ اسے خوب پہچانتا تھا۔ اور ابن قیم نے عائشہ کی حدیث روایت کرنے کے بعد یوں کہا کہ میں نے شیخ الاسلام کو یہ کہتے سنا ہے "اور یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ پر جھوٹ ہے۔" یعنی یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں نماز قصر بھی کر لیتے تھے اور پوری بھی پڑھ لیتے تھے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے سفر میں کبھی چار رکعت پوری نہیں کیں نہ ہی کبھی فرض روزہ رکھا۔

۳۹۹- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «**إن الله يحب أن تؤتى رخصه، كما يكره أن تؤتى معصيته:**». رواه أحمد، وصححه ابن خزيمة وابن حبان، وفي رواية: «كما يحب أن تؤتى عزائمه».

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے۔ جیسا کہ وہ اپنی نافرمانی کرنے کو ناپسند کرتا ہے اسے احمد نے روایت کیا۔ اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح کہا اور ایک روایت میں ہے جیسے وہ بنیادی احکام پر عمل کو پسند فرماتا ہے(۱)۔

(۱) اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اللہ کی محبت اس کی رضا کے کاموں سے ہوتی ہے اور خلاف ورزی سے کراہت ہوتی ہے اصولیوں کے نزدیک رخصت سے مراد وہ احکام ہیں جو کسی عذر کی بنا پر مشروع ہیں اور عزیمت کا لفظ رخصت کے مقابلہ میں ہے اور یہاں رخصتوں سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے سہل بنا دیئے ہیں اور شدت کے وقت بعض واجبات کے ترک اور بعض حرام اشیاء کے مباح کرنے کی گنجائش رکھ دی ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ رخصت کے حالات میں رخصت پر عمل کرنا عزیمت پر عمل کرنے سے افضل ہے ایسا ہی کہا گیا ہے اور اس حدیث میں اس پر کوئی دلیل نہیں جبکہ یہ رخصت اور عزیمت کی مساوات پر دلالت کرتی ہے اور یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس قول کے موافق ہے۔ یریداللہ بکم الیسر ولایریدبکم العسر "اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا"۔

۴۰۰- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا خرج مسيرة ثلاثة أميال أو ثلاثة فراسخ صلّى ركعتين. رواه مسلم.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تین میل یا تین فرسخ سفر کرتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ا) حضرت انس کے قول اذاخرج کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ اس قدر مسافت کا ارادہ کرتے' یہ مراد نہیں کہ جب طویل سفر کا ارادہ فرماتے تو قصر تب شروع کرتے جب تین میل یا تین فرسخ طے کر لیتے اور راوی کے قول امیال اور فراسخ میں راوی کا شک بیان ہوا ہے اس سے تخییر مراد نہیں۔ خطابی کہتے ہیں کہ شعبہ نے اس میں شک کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ میل کی حد یہ ہے کہ کوئی شخص ہموار زمین پر دور سے یہ تمیز نہ کر سکے کہ وہ کوئی مرد ہے یا عورت ہے یا کوئی اور چیز ہے اور نووی نے کہا کہ میل چھ ہزار ہاتھ ہے اور ہاتھ درمیانہ درجہ کی چوبیس انگلیوں کی چوڑائی ہے اور انگلی درمیانہ درجہ کے چھ چوڑائی کے رخ رکھے جائیں اور بعض کہتے ہیں کہ میل انسان کے بارہ ہزار قدم کے برابر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ چار ہزار ذراع ہے اور بقول بعض اونٹ کے ہزار قدم اور بقول بعض تین ہزار ہاشمی ہاتھ جو بتیس انگلیوں کے برابر ہوتا ہے اور یہ ہادی علیہ الصلوۃ والسلام کا ذراع ہے وہی ذراع عمری ہے جو صنعاء اور آس پاس کے شہروں میں استعمال ہوتا ہے۔ رہا فرسخ تو وہ تین میل کے برابر ہے اور فرسخ کا لفظ فارسی سے معرب ہے۔

جاننا چاہئے کہ علماء نے قصر کی مسافت میں اختلاف کیا ہے اور اس بارے میں تقریباً بیس اقوال جنہیں ابن المنذر نے بیان کیا ہے ظاہریہ کا مذہب اسی حدیث پر عمل ہے اور کہتے ہیں کہ قصر کی مسافت تین میل ہے اور انہیں جواب دیا گیا کہ یہ حدیث تین میل کی تحدید میں مشکوک ہے لہذا اس سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ تین فرسخ کی تحدید سے احتجاج کیا جا سکتا ہے کیونکہ میل بھی اس میں شامل ہے اور احتیاط اسی میں کہ زیادہ مسافت کو قبول کیا جائے۔ لیکن کہا گیا ہے کہ تین فرسخ کی تحدید کسی کا بھی مذہب نہیں ہاں ظاہریہ کا استدلال اس حدیث سے درست ہے جو سعید بن منصور نے ابو سعید کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک فرسخ کا سفر کرتے تو قصر کرتے" اور یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اور قصر کی کم از کم مسافت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہے جسے ابن ابی شیبہ نے ابن عمر کی حدیث سے موقوفاً" روایت کیا ہے وہ کہتے تھے "جب تو ایک میل سفر کرے تو نماز قصر کی جا سکتی ہے اور اس کی سند صحیح ہے اور اس نے یہ بات بحر میں داؤد سے روایت کی ہے۔ اور ان دونوں اقوال سے باقر' صادق' احمد بن عیسیٰ اور ہادی وغیرہم کا قول بھی مل جاتا ہے کہ ایک بریدیا اس سے زیادہ مسافت پر قصر کیا جا سکتا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں جو ابو ہریرہ کی حدیث میں مرفوعاً" مروی ہے کہ "کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ایک برید کا سفر کرے الا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو" اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ گویا انہوں نے برید کی مسافت کو سفر کا نام دیا۔ واضح رہے کہ اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ برید سے کم مسافت کو سفر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کہا جا سکتا یہ تو اس سفر کی تحدید ہے جس میں عورت کے لئے محرم واجب ہے اور یہ ضروری نہیں کہ قصر کی مسافت بھی وہی ہو جو محرم کے وجوب کی ہے کیونکہ لوگوں پر تخفیف کی وجہ سے قصر کی مسافت محرم سے کم رکھی گئی ہے زید بن علی' موید و غیرہما اور حنفیہ کہتے ہیں بلکہ اس کی مسافت چوبیں فرسخ ہے جیسا کہ بخاری نے ابن عمر کی حدیث کو مرفوعاً" روایت کیا ہے کہ: "کسی عورت کے لئے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے یہ جائز نہیں کہ وہ محرم کے بغیر تین دن سے زائد سفر کرے کہتے ہیں کہ ایک اونٹ ایک دن میں آٹھ فرسخ کی مسافت طے کرتا ہے اور شافعی نے کہا ایسا نہیں بلکہ قصر کی مسافت چار برد ہے کیونکہ ابن عباس کی مرفوع حدیث اس طرح ہے کہ "چار برد سے کم مسافت ہو تو نماز قصر نہ کرو" اور یہ حدیث آگے آرہی ہے۔

اور بیہقی نے صحیح سند سے ابن عباس اور ابن عمر کا فعل روایت کیا ہے اور بخاری نے ابن عباس کی حدیث کو تعلیقاً" یقین کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہیں پوچھا گیا: "کیا مکہ سے عرفہ جا کر نماز قصر کی جا سکتی ہے؟ کہنے لگے نہیں لیکن عسفان' طائف' یا جدہ جا کر کی جا سکتی ہے" اور یہ سب مقامات مکہ سے چار برد یا اس سے زیادہ ہیں اور اقوال ایک دوسرے سے معارض ہیں جیسا کہ آپ سن چکے اور دلائل مد مقابل ہیں زاد المعاد میں کہا ہے: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے قصر اور روزہ چھوڑنے کے لئے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ صرف علی الاطلاق سفر کا ذکر کیا جیسا کہ تیمم کو مطلق رکھا جو ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے اور وہ روایات جن میں ایک یا دو دن یا تین دن کے سفر کا ذکر ہے ان سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔ اور سفر کے طویل یا چھوٹا ہونے میں نیز قصر اور جمع کے بارے میں بہت سے مذاہب ہیں جو سلف میں موجود تھے۔

۴۰۱- وعنه رضي الله تعالى عنه قال: خرجنا مع رسول الله ﷺ من المدينة إلى مكة، فكان يصلّي ركعتين ركعتين، حتى رجعنا إلى المدينة. متفق عليه، واللفظ للبخاري.

اور انہی (انس) سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ سے مکہ کو نکلے تو آپ دو رکعتیں(۱) نماز پڑھتے رہے۔ تا آنکہ ہم مدینہ واپس آگئے۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں(۲)۔

(۱) یعنی چار رکعت والی نمازیں۔

(۲) ممکن ہے کہ یہ فتح مکہ کے سفر کا ذکر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حجتہ الوداع کے سفر میں ایسا ہوا ہو البتہ ابو داؤد میں یہ الفاظ زیادہ ہیں لوگوں نے انس سے پوچھا: "تم وہاں کتنی مدت مقیم رہے؟ کہنے لگے ہم وہاں دس دن مقیم رہے۔" اور یہ روایت بھی آرہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دوران وہاں پندرہ دن یا پندرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دن سے زیادہ مقیم رہے۔ اور ابو داؤد کی حدیث میں یہ صراحت ہے یعنی پندرہ دن یا تقریباً اس کے لگ بھگ قیام فتح مکہ کی بات ہے اور اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ اتنی مدت قیام کے باوجود آپ نے پوری نماز نہیں پڑھی۔ جیسا کہ اگلی حدیث بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے نیز اس حدیث میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ سفر کی نیت سے شہر سے نکلنے کا ارادہ ہی قصر کا مقتضی ہوتا ہے اگرچہ شہر سے ایک میل یا اس سے بھی کم شہر سے باہر نکلے ہوں اور قصر کرتا جائے حتیٰ کہ واپس آکر شہر میں داخل ہوں اور اس جگہ بھی قصر کرے جہاں سے گھر نظر آرہے ہوں۔

۴۰۲۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: أقام النبي ﷺ تسعة عشر يوماً يقصر، وفي لفظ: «بمكة، تسعة عشر يوماً». رواه البخاري. وفي رواية لأبي داود: «سبع عشرة». وفي أخرى: «خمس عشرة».

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انیس دن قیام کیا اور قصر کرتے رہے اور ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں انیس دن رہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

اور ابوداؤد کی ایک روایت(۱) میں سترہ(۲) دن کا ذکر ہے اور ایک دوسری روایت میں پندرہ دن کا۔

(۱) ابن عباس سے۔

(۲) پہلی روایت میں مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے کیونکہ معدود جو بطور تمیز آیا ہے یعنی لفظ مذکر ہے اور ابوداؤد کی روایت میں مونث کا صیغہ ہے کیونکہ تمیز (یوم) کا لفظ حذف ہے اور اس کی جگہ لفظ لیلتہ ہے بطور تمیز مقدر اور اسی سے ابوداؤد کی روایت میں پہلی روایت کی طرح تسعہ عشر آیا ہے۔

۴۰۳۔ وله عن عمران بن حصين: «ثماني عشرة».

۴۰۴۔ وله عن جابر: أقام بتبوك عشرين يوماً يقصر الصلاة. ورواته ثقات، إلا أنه اختلف في وصله.

اور اسی (ابوداؤد) میں عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اٹھارہ راتیں مروی ہیں(۱)۔ اور اسی (ابوداؤد) میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں بیس دن قیام کیا اور قصر کرتے رہے اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس کے متصل ہونے میں اختلاف ہے(۲)۔

(۱) اور ابوداؤد میں اس کے الفاظ یہ ہیں "میں فتح مکہ میں آپؐ کے پاس حاضر تھا۔ آپ نے مکہ میں اٹھارہ راتیں قیام فرمایا اور آپ دو رکعت ہی پڑھتے رہے اور فرماتے: شہر والو! تم چار رکعت نماز پڑھو کیونکہ ہم مسافر لوگ ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) اس کا وصل یہ ہے۔ معمر عن یحییٰ بن ابی کثیر عن محمد بن عبدالرحمٰن عن ثوبان عن جابر۔ ابوداؤد نے کہا کہ معمر کے بغیر کسی نے اس کی سند بیان نہیں کی۔ اور اسے دار قطنی نے العلل میں ارسال اور انقطاع کی بنیاد پر معلول قرار دیا ہے مصنف رحمہ اللہ نے کہا کہ اسے بیہقی نے جابر سے بضع عشرۃ کے لفظ سے روایت کیا ہے یعنی دس سے کچھ دن زائد۔

جاننا چاہئے کہ ابوداؤد نے اس حدیث کے باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے "مسافر کب نماز پوری پڑھے" پھر اس میں ابن عباس کا کلام درج کیا گیا "جو شخص سترہ دن قیام کرے قصر کرے اور جو زیادہ کرے وہ پوری پڑھے" اور علماء نے اقامت کی مدت کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس کے بعد مسافر کو پوری نماز پڑھنا چاہئے اور اس بارے میں کئی اقوال ہیں ابن عباس اس بات کے قائل ہیں اور ہادویہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ اقامت کی کم از کم مدت دس دن ہے کیونکہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "جب تو دس دن مقیم رہے" اسے موید باللہ نے شرح التجرید میں کئی طریقوں سے روایت کیا ہے جن میں ضرار بن صرد ہے۔ مصنف نے تقریب میں کہا ہے کہ وہ ثقہ نہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ توقیفی حکم ہے اور حنفیہ پندرہ دنوں کے قائل ہیں وہ ابن عباس کی ایک روایت ہے اور ابن عمر کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں کہ "جب تو مسافر ہونے کی صورت میں شہر جائے اور تیرے دل میں پندرہ دن قیام کا ارادہ ہو تو پوری نماز پڑھ" اور مالکیہ اور شافعیہ کا مذہب کم از کم چار دن کا قیام ہے اور یہ عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس سے مراد آنے اور جانے کا دن نکال کر باقی مدت چار دن ہے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے مہاجرین کو حج کے مناسک پورے کرنے کے بعد مکہ میں تین دن سے زیادہ قیام سے منع فرما دیا جو چار دن مقیم ہونے پر دلالت کرتا ہے ان کے علاوہ اور بھی کئی اقوال ہیں جن پر کوئی دلیل نہیں اور یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ مسافر کا کتنی مدت قیام کا ارادہ تھا اور جس کو مدت اقامت میں تردد ہو اور کوئی یقینی بات نہ کہہ سکے تو اس میں بھی اختلاف ہے ہادویہ کہتے ہیں کہ ایک ماہ تک قصر کر سکتا ہے کیونکہ حضرت علیؓ نے فرمایا "جو شخص کہے کہ میں آج چلا جاؤں گا' کل چلا جاؤں گا وہ ایک ماہ تک قصر کر سکتا ہے" اور حنفیہ اور اس کے اصحاب کا یہ مذہب ہے اور یہی شافعی کا قول ہے اور امام یحییٰ بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ وہ ہمیشہ قصر کر سکتا ہے کیونکہ اصل بنیاد سفر ہے اور ابن عمرؓ کے فعل کی بنا پر بھی کہ انہوں نے آذربائیجان میں چھ ماہ قیام کیا اور قصر کرتے رہے۔ اور انس بن مالک سے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے نیشاپور میں ایک سال یا دو سال قیام کیا اور قصر کرتے رہے اور صحابہ کی ایک جماعت سے متعلق مروی ہے کہ وہ رام ہرمز میں نو ماہ مقیم رہے اور قصر کرتے رہے۔ اور کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اقامت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا اندازہ پندرہ اور سترہ اور اٹھارہ دن بتلایا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ اور تبوک میں مدت قیام سے متعلق روایات ہیں اور مدت قیام اس سے بڑھ جائے تو نماز پوری پڑھے۔
مخفی نہ رہے کہ قصر کی معین مدت پر کوئی دلیل نہیں کہ کب تک قصر کرے اور کب سے اس پر زیادہ کرے۔ پھر جب مدت قیام پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی تو اقرب یہی ہے کہ وہ قصر پڑھتا رہا جیسا کہ صحابہ کرتے رہے۔ کیونکہ انہوں نے تردد کے ساتھ رہنے کے لئے کسی مدت کی تعین نہیں کی خواہ یہ مدت کتنی ہی لمبی ہو جائے۔ اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہو جاتی ہے جیسے بیہقی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں چالیس دن اقامت پذیر رہے اور قصر کرتے رہے" پھر بیہقی نے کہا کہ اس کی سند میں حسین بن عمارہ ہے اور وہ ناقابل احتجاج ہے۔

۴۰۵- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا ارتحل قبل أن تزيغ الشمس، أخر الظهر إلى وقت العصر، ثم نزل فجمع بينهما، فإن زاغت الشمس قبل أن يرتحل، صلّى الظهر ثم ركب. متفق عليه.

وفي رواية الحاكم في الأربعين بالإسناد الصحيح: صلّى الظهر والعصر ثم ركب.

ولأبي نعيم في مستخرج مسلم: كان إذا كان في سفر فزالت الشمس صلّى الظهر والعصر جميعاً، ثم ارتحل.

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سورج ڈھلنے سے پہلے سفر کے لئے کوچ کرتے تو ظہر کی نماز کو عصر کے وقت تک موخر کر لیتے۔ پھر اترتے اور ان دونوں کو جمع کر لیتے۔ اور اگر آپ کے کوچ کرنے سے پیشتر سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر کی نماز(۱) پڑھتے پھر سوار ہو جاتے۔ متفق علیہ۔ (۲) اور حاکم کی اربعین میں صحیح سند کے ساتھ ایک روایت میں ہے کہ آپ ظہر اور عصر دونوں پڑھ لیتے(۳) پھر سوار ہوتے(۴) اور ابو نعیم نے صحیح مسلم کی مستخرج میں روایت کیا ہے کہ جب آپؐ سفر میں ہوتے اور سورج ڈھل جاتا تو آپ ظہر اور عصر اکٹھی پڑھ لیتے پھر کوچ فرماتے(۵)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) یعنی صرف ظہر کی نماز اور عصر کو ساتھ نہیں ملاتے تھے۔

(۲) اس حدیث میں مسافر کے لئے دو نمازوں کو جمع موخر کرنے پر دلیل ہے اور اس بات پر بھی وہ جمع مقدم نہیں کر سکتا کیونکہ حدیث میں صرف ظہر پڑھنے کا لفظ ہے کیونکہ اگر جمع مقدم جائز ہوتی تو آپ ظہر کے ساتھ عصر بھی پڑھ لیتے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل ان احادیث کا مخصص ہے جو اوقات نماز کے بارے میں گزر چکی ہیں اور علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ہادویہ کا یہی مذہب ہے اور ابن عباس' ابن عمر اور صحابہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ اور مالک' احمد اور شافعی سے مسافر کے لئے جمع موخر اور جمع مقدم دونوں کا جواز مروی ہے جمع موخر تو اس حدیث پر عمل سے اور مقدم بعد میں مذکور احادیث سے' اور اوزاعی اس حدیث پر عمل سے مسافر کے لئے صرف جمع موخر کے قائل ہیں۔ اور وہ مالک اور احمد بن حنبل سے مروی ہے اور ابو محمد بن حزم نے اسے ہی پسند کیا ہے اور نخعی' حسن اور ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ مسافر کے لئے نہ جمع مقدم جائز ہے اور نہ موخر۔ ان لوگوں نے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جمع سے متعلق مروی ہے اس کی تاویل یہ کی کہ یہ جمع صوری ہے اور وہ ظہر کا آخری اور عصر کا ابتدائی وقت ہے اور یہی صورت عشاء کی ہے اور انہیں جواب یہ دیا گیا کہ ان کی یہ تاویل جمع مقدم میں تو چل سکتی ہے مگر جمع موخر میں پوری نہیں ہو سکتی جیسا کہ آگے مذکور ہے۔

(۳) یعنی جب آپ کے کوچ کرنے سے پہلے سورج ڈھل چکا تھا تو آپ نے دونوں فرض نمازیں اکٹھی پڑھیں۔

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل جمع تقدیم کا ثبوت مہیا کرتا ہے اور اس میں جمع صوری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) گویا حاکم اور ابو نعیم کی روایت جمع تقدیم کا ثبوت بھی مہیا ہو گیا اور یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں جیسا کہ مصنف نے کہا ہے۔ الا یہ کہ ابن قیم نے کہا کہ حاکم کی روایت میں اختلاف کیا گیا ہے بعض اسے صحیح کہتے ہیں' بعض حسن اور بعض نے اس میں جمع کر کے اسے موضوع قرار دیا اور وہ حاکم ہی ہیں جنہوں نے اس پر وضع کا حکم لگایا ہے پھر اس حدیث کے موضوع ہونے میں حاکم کی وضاحت کا ذکر کیا۔ پھر ابن القیم نے اس کا جواب دیا اور اس بات کو اختیار کیا کہ یہ موضوع نہیں اور مصنف کا اس مقام پر چپ اور مطمئن رہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور حاکم کے کلام کی تردید پر دلالت کرتی ہے اور اس حدیث کی صحت کی تائید درج ذیل حدیث سے بھی ہو جاتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٤٠٦ـ وعن معاذ بن جبل رضي الله تعالى عنه قال: خرجنا مع النبي ﷺ في غزوة تبوك، فكان يصلّي الظهر والعصر جميعاً. رواه مسلم.

معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم غزوہ تبوک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے آپ ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی کر کے پڑھتے تھے اور مغرب اور عشاء کی اکٹھی کر کے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(ا)۔

(ا) اس حدیث کے الفاظ میں جمع تاخیر کا بھی احتمال ہے اور جمع تقدیم کا بھی۔ لیکن ترمذی نے اسے ان الفاظ سے روایت کیا ہے "جب آپ سورج ڈھلنے سے پہلے کوچ فرماتے تو ظہر کو موخر کر لیتے یہاں تک کہ عصر کے ساتھ ملا کر دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد کوچ فرماتے تو عصر میں تعجیل کر کے اسے ظہر سے ملا کر دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے" یہ گویا مسلم کی روایت کے اجمال کی تفصیل ہے الا یہ کہ ترمذی نے اسے روایت کرنے کے بعد کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اس کی سند میں قتیبہ منفرد ہے ہم نہیں جانتے کہ لیث کے علاوہ کسی نے اس سے روایت کیا ہو۔ ترمذی نے کہا کہ اہل علم کے ہاں معاذ کی حدیث معروف ہے جو ابن الزبیر کی حدیث سے، ابوالطفیل سے معاذ سے مروی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو جمع کیا"۔

آپ کو معلوم ہو چکا کہ جمع تقدیم کے ثبوت کی روایات میں گفتگو ہوئی ہے البتہ صحیح مسلم پر متخرج کی روایت میں کسی نے کلام نہیں کیا۔ چنانچہ ابن حزم کا یہی مذہب ہے کہ وہ روایات کے ثبوت کی بنا پر جمع تاخیر کو تو جائز سمجھتے ہیں جمع تقدیم کو نہیں۔ نخعی بھی اسی کے قائل ہیں اور مالک اور احمد سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

پھر اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ آیا مسافر کے لئے جمع کرنا افضل ہے یا وقت پر نماز ادا کرنا؟ شافعیہ کہتے ہیں جمع کو ترک کرنا افضل ہے اور مالک نے کہا جمع کو ترک کرنا مکروہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ جمع اس کے لئے مخصوص ہے جس کے لئے کوئی عذر ہو۔

جاننا چاہئے کہ ابن قیم نے الهدی النبوی میں کہا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفر میں مسلسل جمع نہیں کیا کرتے تھے جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں نہ ہی آپ سفر کو ختم کرنے اور نزول کے بعد جمع کرتے تھے۔ آپ صرف اس دوران جمع کرتے جب سفر جاری ہوتا اور جب نماز کے بعد سفر کرتے جیسا کہ تبوک کی احادیث میں ہے رہا نزول کے بعد جمع کا معاملہ تو سوائے عرفہ اور مزدلفہ کے آپ سے ایسا منقول نہیں ہے کیونکہ عرفہ اور مزدلفہ میں وقوف کے اوقات متصل ہیں جیسا کہ شافعی نے اور ہمارے شیخ نے کہا ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابو حنیفہ نے اسے مناسک حج کی تکمیل قرار دیا ہے اور یہ اس کا سبب ہے اور احمد' مالک اور شافعی نے کہا کہ عرفہ اور مزدلفہ میں جمع کا سبب سفر ہے۔ اور یہ سب کچھ سفر کے دوران جمع کا معاملہ ہے۔ رہا حضر میں جمع کرنا تو شارح نے جواز کے قائلین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہا کہ اکثر امام اس طرف گئے ہیں کہ حضر میں جمع جائز نہیں جیسا کہ ان احادیث میں گزر چکا جو نمازوں کے اوقات کی وضاحت کرتی ہیں اور اس لئے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی محافظت سے متعلق احادیث متواتر ہیں حتیٰ کہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بے وقت نماز ادا کرتے نہیں دیکھا۔ الا یہ کہ آپ مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھ لیتے تھے۔ اور ایک دن آپ نے فجر کی نماز اس کے وقت سے پہلے پڑھی۔ رہی مسلم میں ابن عباس کی یہ حدیث کہ "آپ نے مدینہ میں ظہر اور عصر کو جمع کیا اور مغرب اور عشاء کو جبکہ نہ کوئی خوف تھا اور نہ بارش تھی" تو ابن عباس سے پوچھا گیا کہ اس سے آپ چاہتے کیا ہیں؟ کہنے لگے "میں چاہتا ہوں کہ آپ کی امت پر تنگی نہ ہو۔ تو اس حدیث سے احتجاج درست نہیں کیونکہ یہ حدیث جمع تقدیم و تاخیر سے کوئی چیز بھی متعین نہیں کرتی۔ جیسا کہ یہ بات مسلم کی حدیث سے واضح ہے اور اس معاملہ میں ایک معنیٰ کا تعین تحکم ہے تو اس واجب کی طرف رجوع کرنا واجب ہے جو معذور وغیرہ کے اوقات کی حدیث میں عموم پر باقی ہیں اور مسافر کی تخصیص اس لئے ہے کہ مخصص کا ثبوت موجود ہے اور یہی وہ جواب ہے جو دو ٹوک ہے رہے وہ آثار جو صحابہ اور تابعین سے مروی ہیں تو وہ حجت نہیں کیونکہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور بعض لوگوں نے ابن عباس کی حدیث کی جمع صوری سے تاویل کی ہے۔ اور قرطبی نے اسے پسند کیا ہے۔ اور ابن الماجشون اور طحاوی نے اسے ترجیح دی ہے اور اس پر یقین کا اظہار کیا ہے اور ابن سیدالناس نے اسے تقویت پہنچائی ہے۔ کیونکہ شیخین نے اس حدیث کے راوی عمرو بن دینار سے' ابوالشعثاء سے روایت کرتے ہوئے کہا: "میں نے پوچھا ابوالشعثاء میں گمان کرتا ہوں کہ آپؐ نے ظہر کو موخر اور عصر کو معجل اور مغرب کو موخر اور عشاء کو معجل کیا ہو گا۔ تو اس نے کہا میں بھی یہی گمان کرتا ہوں ابن سیدالناس نے کہا کہ حدیث کا راوی اس کی مراد کو دوسروں سے زیادہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ ابوالشعثاء کو اس کا یقین نہ ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تو صرف راوی کا ظن ہے اور جس شخص کے بارے میں یہ بات کہی گئی وہ انہی روایت کا زیادہ جاننے والا تھا وہ اپنی تفسیر میں صرف لفظ[1] مثلاً لاتا ہے اس بنا پر یہ دعویٰ محل نظر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "بسا اوقات فقہ پہنچانے والے سے وصول کرنے والا زیادہ فقیہ ہوتا ہے" اس عموم کو رد کرتا ہے ہاں یہ تاویل معین ہو سکتی ہے کیونکہ نسائی نے ابن عباس کی حدیث کی اصل کی صراحت کر دی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اس کے الفاظ ہیں "میں نے مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ (۲) اکٹھی اور سات اکٹھی پڑھیں۔ آپ نے ظہر کو موخر اور عصر کو معجل کیا اور مغرب کو موخر اور عشاء کو معجل کیا" اور نووی پر تعجب ہے کہ کیسے اس تاویل کو ضعیف کہہ دیا اور روایت کردہ حدیث سے غفلت کی اور انداز بیان کو مقید پر محمول کیا جائے گا جب دونوں ایک ہی قصہ میں ہوں جیسا کہ اس میں ہے۔

اور یہ قول "آپ اپنی امت پر تنگی نہیں چاہتے تھے" اس جمع صوری کو ضعیف کر دیتا ہے کیونکہ اس میں تنگی کو ہٹانا موجود ہے کیونکہ یہ اوقات نماز میں آسانی ہے کہ دو نمازوں کے لئے آمادگی اور مسجد کو جانے کا ایک قصد کفایت کر جاتا ہے گو بلاشک اس جمع میں حرج بہت کم ہے رہا اس قیاس کو مسافر پر منطبق کرنا جیسا کہ کہا گیا ہے تو یہ وہم ہے کیونکہ اصل میں علت تو یہی سفر ہے جو اس فرع میں موجود نہیں ورنہ ایسے ہی یہ قصر اور روزہ چھوڑنے کے بارے میں بھی لازم آئے گا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ سنجیدہ کلام ہے اور ہم شارح کے کلام پر وقوف سے پہلے اپنے رسالہ الیواقیت فی المواقیت میں اس سے ملنے والے امور کا ذکر کر چکے ہیں اللہ اسے جزائے خیر دے۔ پھر اس نے کہا کہ جمع تقدیم میں عظیم خطرہ ہے اور وہ ایسا ہے جیسے کوئی نماز کا وقت آنے سے پہلے نماز پڑھ لے اور فاعل کا حال ایسے ہو جائے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا "اور وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں"۔ اور یہ وقت سے پہلے ادا کی ہوئی نماز ایسی ہے جس کے نہ منطوق پر کوئی دلیل ہے نہ مفہوم پر نہ عموم پر اور نہ خصوص پر۔

۴۰۷- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«لا تقصروا الصلاة في أقل من أربعة برد، من مكة إلى عسفان»**. رواه الدارقطني بإسناد ضعيف، والصحيح أنه موقوف، كذا أخرجه ابن خزيمة.

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "چار برد سے کم فاصلہ سفر میں جو کہ مکہ سے عسفان تک ہے قصر نہ کیا کرو" اسے دار قطنی نے ضعیف سند(۱) سے روایت کیا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف(۲) ہے ابن خزیمہ نے اسے اسی طرح روایت کیا ہے۔

---

(۱) مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔

(۲) یعنی آٹھ رکعت اور سات رکعت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) کیونکہ یہ عبدالوہاب بن مجاہد کی روایت سے ہے اور وہ متروک ہے ثوری نے اس پر جھوٹا ہونے کا الزام لگایا ہے ازدی نے کہا کہ اس سے روایت جائز نہیں۔ پھر یہ روایت منقطع بھی ہے کیونکہ اس نے اپنے باپ سے سماعت نہیں کی۔

(۲) یعنی یہ حدیث ابن عباس پر موقوف ہے اور اس کی سند صحیح ہے لیکن اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی رائے ہو اور یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ کسی مرفوع حدیث میں فاصلہ کی تحدید ثابت نہیں۔

۴۰۸۔ وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**خير أمتي الذي إذا أساءوا استغفروا، وإذا سافروا قصروا وأفطروا**». أخرجه الطبراني في الأوسط بإسناد ضعيف، وهو في مرسل سعيد بن المسيب عند البيهقي مختصراً.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے بہتر لوگ وہ ہیں کہ جب وہ برے کام کریں تو استغفار کریں اور جب سفر کریں تو نماز قصر پڑھیں اور روزہ چھوڑ دیں۔ اسے طبرانی نے اوسط میں ضعیف سند سے روایت کیا۔ اور بیہقی میں سعید بن المسیب کی مرسل روایات میں ایک روایت ہے جو یہاں مختصراً مذکور ہے(۱)۔

(۱) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ مسافر کے لئے قصر کرنا اور روزہ نہ رکھنا اس کے برعکس عمل سے افضل ہے۔ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ جمع کو ترک کرنا افضل ہے گویا قیاس تو یہ چاہئے تھا کہ وہ کہتے کہ پوری نماز پڑھنا افضل ہے اور انہوں نے اس کی بھی تصریح کی ہے گویا وہ اس حدیث کے ضعیف ہونے کے قائل نہیں۔

۴۰۹۔ وعن عمران بن حصين رضي الله تعالى عنه قال: كانت بي بواسير، فسألت النبي ﷺ عن الصلاة، فقال: صل قائماً، فإن لم تستطع فقاعداً، فإن لم تستطع فعلى جنب. رواه البخاري.

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے بواسیر کی بیماری تھی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بارے میں پوچھا(۱) تو آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو یہ نہ کر سکو تو بیٹھ کر پڑھ لو اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو لیٹ کر پڑھ لو۔ اسے بخاری نے روایت کیا(۲)۔

(۱) مصنف جب پہلے اس روایت کو لایا تھا تو اس میں یہ الفاظ نہ لایا تھا یعنی بواسیر کا قصہ۔

(۲) یہ وہ حصہ ہے جو کچھ پہلے گزر چکا ہے مصنف نے اس کی کسی کی طرف نسبت نہیں کی اور ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ بخاری کے علاوہ کسی نے اسے روایت کیا ہے اور اس میں کیا کچھ فائدے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٤١٠- وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: عاد النبي ﷺ مريضاً، فرآه يصلي على وسادة، فرمى بها، وقال: صلِّ على الأرض إن استطعت، وإلا فأوم إيماء، واجعل سجودك أخفض من ركوعك. رواه البيهقي، وصحح أبو حاتم وقفه.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مریض کی عیادت کی تو اسے دیکھا کہ وہ ایک تکئے پر نماز پڑھ رہا ہے آپ نے وہ تکیہ پرے پھینک دیا اور فرمایا اگر طاقت رکھتے ہو تو زمین پر نماز پڑھو ورنہ اشارہ سے پڑھ لو- اور سجدہ کے لئے اشارہ رکوع کے اشارہ سے اور نیچے کرو- اسے بیہقی نے روایت کیا اور ابو حاتم نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا(۱)-

بیہقی نے پہلے جو کچھ قوی سند سے بیان کیا تھا یہ اس سے زائد ہے- پہلے یہ دونوں روایتیں سجود السہو کے باب میں انہی لفظوں سے گزر چکی ہیں اور وہاں ہم نے اس کی شرح کر دی ہے لہٰذا یہاں چھوڑ دی ہے- پھر وہاں عائشہ کی حدیث بھی ذکر کی اور وہ بھی جو باب صفۃ الصلوۃ میں چوتیسویں حدیث گزر چکی ہے اور شارح نے شرح کی اور وہاں کہا- اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے اور یہاں یہ کہا ہے کہ اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور وہ یہ حدیث ہے-

٤١١- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: رأيت النبي ﷺ يصلي متربعاً. رواه النسائي، وصححه الحاكم.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چار زانوں بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا ہے- اسے نسائی نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا ہے-

(۱) یہ مریض کی نماز کی احادیث سے ہے مسافر کی نماز کی احادیث سے نہیں اور مصنف وہی حدیثیں لایا ہے جو پہلے گزر چکی ہیں اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اگر مریض نماز میں کھڑا ہونے سے معذور ہو تو کس طرح بیٹھ کر پڑھے اور اس میں اختلاف ہے جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمعہ کی نماز کا بیان

دور جاہلیت میں جمعہ کے دن کو العروبہ کہتے تھے۔ ترمذی نے ابوہریرہ کی حدیث روایت کر کے کہا کہ یہ حسن صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن حضرت آدم پیدا کئے گئے' اسی دن جنت میں داخل ہوئے' اسی دن جنت سے نکالے (اور زمین پر آباد کئے) گئے اور قیامت بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہو گی۔

۴۱۲۔ عن عبد الله بن عمر، وأبي هريرة رضي الله تعالى عنهم، أنهما سمعا رسول الله ﷺ يقول على أعواد منبره: **«لينتهين أقوام عن ودعهم الجمعات، أو ليختمن الله على قلوبهم، ثم ليكونن من الغافلين»**. رواه مسلم.

عبداللہ بن عمر اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم' دونوں سے روایت ہے کہ انہوں نے برسر منبر(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ جمعہ کی نماز چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا(۲) دے گا۔ پھر وہ غافلوں میں شمار ہوں گے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(۳)۔

(۱) اصل میں لفظ علی اعواد منبرہ آئے ہیں یعنی وہ منبر جو لکڑی کا تھا وہ نہیں جو مٹی کا تھا اور نہ ہی وہ کھجور کا تنہ تھا جس سے آپ ٹیک لگایا کرتے تھے اور یہ منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ۷ھ اور بقول بعض ۸ھ میں بنایا گیا تھا اسے ایک انصاری عورت کے غلام نے بنایا تھا جو نجار تھا صحیح قول کے مطابق اس کا نام میمون تھا۔ اس منبر کی تین درجے یا تین سیڑھیاں تھیں اور یہ اسی صورت میں رہا حتیٰ کہ مروان نے معاویہ کے عہد میں اس کے نیچے سے زینے چھ تک بڑھا دیئے اور اس زیادتی کا بھی ایک قصہ ہے جو یوں ہے معاویہ نے اسے لکھا کہ وہ اسے دمشق لے جائے۔ مروان نے حکم دیا کہ اسے اکھاڑا جائے اس پر مدینہ میں تاریکی چھا گئی۔ مروان نکلا اور خطبہ دیا اور کہا "مجھے امیرالمومنین نے حکم دیا ہے کہ میں اسے بلند کر دوں اور کہا کہ زیادتی صرف اس لئے کی جارہی ہے کہ لوگ زیادہ ہو گئے ہیں پر یہ اسی صورت میں رہا حتیٰ کہ ۶۵۴ھ میں مسجد نبوی جل گئی تو یہ بھی جل گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) ختم بمعنی کسی چیز پر مہر لگا دینا جو اس کو چھپا لے اور ڈھانپ لے تاکہ کوئی چیز اس میں مل نہ جائے اور نہ اس میں جھانکا جا سکے اور دلوں کی تشبیہ اس لئے دی گئی کہ وہ حق سے اعراض کرتے' اس کے قبول کرنے سے تکبر کرتے ہیں اور حق ان کی طرف نفوذ نہیں کر سکتا اور مہر سے ایسی چیزوں میں پابند اور موکد کر دیا جاتا ہے کہ پھر کوئی چیز ان کے باطن کی طرف نفوذ نہیں کر سکتی اور یہ سزا انہیں اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کرنے کی بناء پر ملتی ہے اور جمعہ میں حاضر نہ ہونا اس تنگی کو اسان بنانے کے باب سے ہے۔

(۳) ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے بعد وہ ایسے اعمال کرنے سے غافل ہو جاتے ہیں جو انہیں فائدہ دیں اور ایسے کاموں کے چھوڑنے سے بھی' جو انہیں نقصان پہنچائیں اور اس حدیث میں ترک جمعہ اور اس میں سستی کرنے پر زبردست سرزنش ہے اور اس میں یہ بھی بتلایا کہ جمعہ کو چھوڑنا کلی طور پر رسوائی کے بڑے اسباب میں سے ہے اور جمعہ کے علی الاطلاق وجوب پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہ فرض عین ہے اور معالم السنن میں کہا ہے کہ فقہاء کے نزدیک یہ فرض کفایہ ہے۔

۴۱۳ـ وعن سلمة بن الأكوع رضي الله تعالى عنه قال: كنا نصلّي مع رسول الله ﷺ الجمعة، ثم ننصرف وليس للحيطان ظل نستظل به. متفق عليه، واللفظ للبخاري.

وفي لفظ لمسلم: كنا نجمع معه إذا زالت الشمس، ثم نرجع، نتتبع الفيء.

سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ کے دن نماز پڑھتے۔ پھر واپس لوٹتے تو دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم ان کے سایہ میں چل سکیں۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کے لفظ یہ ہیں کہ ہم آپؐ کے ساتھ سورج ڈھلنے تک جمعہ پڑھ لیتے تھے پھر جب لوٹتے تو سایہ تلاش کرتے پھرتے(۱)۔

(۱) یہ حدیث جمعہ کی نماز میں جلدی کرنے اور سورج ڈھلتے ہی پڑھ لینے پر دلیل ہے اور حدیث کے ان الفاظ سے "دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم سایہ میں چل سکیں" یہ مراد نہیں کہ سایہ بالکل نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ وہ دلیل بن جائے کہ سورج ڈھلنے سے پہلے ہی نماز پڑھ لی جاتی تھی اور یہی تاویل جمہور کے نزدیک معتبر ہے۔ جو اس بات کے قائل ہیں کہ جمعہ کا وہی وقت ہے جو ظہر کا ہے اور احمد اور اسحاق کا مذہب یہ ہے کہ نماز جمعہ کا صحیح وقت زوال سے پہلے ہے اور احمد کے اصحاب میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں اس کا وقت نماز عید کا وقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا وقت دن کی چھٹی ساعت ہے اور مالک زوال سے پہلے خطبہ کو جائز سمجھتے ہیں نماز کو نہیں ان کی دلیل حدیث کا ظاہر ہے اور جو کچھ اس کے بعد آرہا ہے اور اس سے زیادہ واضح جابر کی حدیث ہے جسے احمد اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ پڑھایا کرتے پھر ہم اپنے اونٹوں کی طرف جاتے پھر انہیں گھر واپس لاتے جب سورج ڈھل چکا ہوتا" یعنی اپنی چھڑکاؤ کرنے والی اونٹنیوں کو واپس لاتے اور دار قطنی نے عبداللہ بن شیبان سے روایت کیا کہ "میں نے ابوبکر کے ساتھ جمعہ پڑھا تو ان کا خطبہ اور نماز نصف النہار سے پہلے تھا۔ پھر میں نے عمر کے ساتھ جمعہ پڑھا تو ان کا خطبہ اور نماز نصف النہار کے وقت ہوتا تھا۔ پھر میں نے عثمان کے ساتھ پڑھا تو ان کا خطبہ اور نماز اس وقت ہوتا کہ میں کہتا کہ دن ڈھل گیا میں نے دیکھا کہ اس پر کوئی شخص نہ عیب لگاتا اور نہ اسے ناپسند کرتا تھا" اور احمد بن حنبل نے اپنے بیٹے عبداللہ کی روایت میں کہا "اور اسی طرح ابن مسعود' جابر' سعید اور معاویہ سے متعلق مروی ہے کہ وہ زوال سے پہلے نماز پڑھ لیتے تھے اور احمد کے مذہب پر یہ واضح دلالت ہے اور جمہور کی وہ تاویل جو پہلے گزر چکی اسے یہ بات رد کر دیتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جبکہ وہ اس میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقین پڑھتے تھے اور خطبہ اگر یہ سب کچھ بعد زوال ہوتا تو جب لوگ جمعہ سے واپس جاتے تو دیواروں کا سایہ ضرور ہونا چاہئے تھا جس میں وہ چل سکتے۔ شرح میں ایسا ہی مذکور ہے اور ہم نے ضوء النہار کے حواشی میں تحقیق کی ہے کہ اس کا وقت زوال کا وقت ہے نیز درج ذیل حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔

۴۱۴ - وعن سهل بن سعد رضي الله تعالى عنه قال: ما كنا نقيل ولا نتغدى إلا بعد الجمعة. متفق عليه، واللفظ لمسلم. وفي رواية: في عهد رسول الله ﷺ.

سہل بن سعد(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم جمعہ کے دن دوپہر کا کھانا اور دوپہر(۲) کا آرام جمعہ کے بعد ہی کیا کرتے تھے۔ متفق علیہ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں"

(۱) آپ ابوالعباس سہل بن سعد بن مالک الخزرجی الساعدی انصاری ہیں کہتے ہیں کہ آپ کا نام حزن تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام سہل رکھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے اس وقت آپ پندرہ سال کے تھے۔ مدینہ میں ۷۱ھ میں فوت ہوئے صحابہ میں سے مدینہ میں آپ ہی سب سے آخر میں فوت ہوئے۔

(۲) اصل میں نقیل کا لفظ آیا ہے نہایہ میں ہے کہ المقیل اور القیلولہ دوپہر کے وقت آرام کرنے کو کہتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اگرچہ نیند نہ آئے۔
یہ حدیث بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے اور یہ احمد کے دلائل سے ہے اور مصنف رحمہ اللہ کی روایت کے یہ لفظ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں" صرف اس لئے لایا ہے کہ قائل یہ نہ کہہ سکے کہ راوی نے یہ صراحت نہیں کی کہ کیا یہ بات پہلی روایت میں ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اور آپ کی تقریر ہے لہٰذا یہ روایت لا کر اس بات کا رد کر دیا اور ثابت کیا کہ آپؐ کے عہد میں ایسا ہوتا تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے عہد میں مدینہ میں مسجد نبوی کے علاوہ جمعہ اور کہیں نہیں ہوتا تھا۔ گویا یہ آپ کی نماز کے متعلق اطلاع ہے اور اس میں زوال سے پہلے نماز پر کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ صحابہ مدینہ میں اور مکہ میں ظہر کے بعد ہی دوپہر کا کھانا کھاتے اور آرام کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "جب تم ظہر کے وقت اپنے کپڑے اتارتے ہو" ہاں یہ بات ضرور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بخلاف ظہر زوال کے شروع ہوتے ہی نماز کے لئے جلدی کرتے اور اس کے بعد لوگوں کے جمع ہونے تک اسے موخر کرتے تھے۔

٤١٥ - وعن جابر رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ كان يخطب قائماً، فجاءت عير من الشام، فانفتل الناس إليها، حتى لم يبق إلا اثنا عشر رجلا. رواه مسلم.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دفعہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے کہ شام سے ایک قافلہ(۱) آگیا تو لوگ اٹھ کر اس کی طرف چلے گئے اور بارہ آدمیوں کے سوا وہاں کوئی بھی مسجد میں باقی نہ رہا(۲)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اصل میں لفظ عیر استعمال ہوا ہے ۔ بمعنی لدے ہوئے اونٹوں کا قافلہ (نہایہ)

(۲) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر خطبہ دینا مشروع ہے نیز یہ کہ سننے والوں کی تعداد کی تعین کوئی شرط نہیں جیسا کہ کہا گیا ہے کہ چالیس آدمی ہونا شرط ہے اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر بارہ سے کم ہوں تو جمعہ منعقد نہ ہو گا جیسا کہ مالک سے مروی ہے۔ کیونکہ اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ بارہ سے کم پر جمعہ منعقد نہ ہو گا اور یہ وہی قصہ ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی واذا راو تجارۃ" ..... الایہ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں روایت کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خطبہ جو مراسیل میں مذکور ہے جس میں صحابہ اٹھ کر چلے گئے تھے تو یہ واقعہ نماز جمعہ کے بعد کا تھا۔ صحابہ نے یہ گمان کیا کہ خطبہ سے اٹھ کر چلے جانے میں ان پر کچھ گناہ نہیں اور اس قصہ سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے پہلے نماز جمعہ پڑھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے تھے" قاضی کہتے ہیں کہ یہ بات صحابہ کے احوال سے زیادہ مشابہ ہے صحابہ کے متعلق گمان کرنے والوں نے گمان کیا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز ادا نہیں کی تھی۔ یہ بات نہیں بلکہ صحابہ کا یہ گمان تھا کہ نماز پوری ہو جانے کے بعد چلے جانا جائز ہے۔

۴۱۶۔ وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من أدرك ركعة من صلاة الجمعة وغيرها فليضف إليها أخرى، وقد تمت صلاته». رواه النسائي وابن ماجه والدارقطني، واللفظ له، وإسناده صحيح، لكن قوّى أبو حاتم إرساله.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص نماز جمعہ کی یا دوسری نماز کی ایک رکعت پا لے تو دوسری اس کے ساتھ ملا کر نماز پوری کر لے۔" اسے نسائی' ابن ماجہ اور دار قطنی نے روایت کیا اور یہ لفظ دار قطنی کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے۔ لیکن ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے(ا)۔

(ا) اس حدیث کو محدثین نے بقیہ کی حدیث کے طور پر یوں روایت کیا ہے حدثنی یونس بن یزید عن سالم عن ابیه الحدیث ابوداؤد اور دار قطنی نے کہا کہ اس روایت میں بقیہ عن یونس منفرد ہے اور ابن ابی حاتم نے العلل میں کہا کہ عن ابیه منفرد ہے یہ متن میں غلطی ہے اور اس کی سند صرف یہ ہے زہری سے' ابو سلمہ سے ابو ہریرہ سے مرفوع روایت ہے "جس نے نماز کی ایک رکعت پا لی اس نے نماز پا لی"

رہے اس روایت کے یہ لفظ "جمعہ کی نماز سے" تو یہ وہم ہے نیز یہ حدیث تیرہ طریقوں سے ابوہریرہ سے مروی ہے اور تین طریقوں سے ابن عمر سے اور ان سب میں گفتگو ہوئی ہے اور اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ ملنے والا اگر کچھ بھی خطبہ نہ سنے تو جمعہ درست ہے زید بن علی' موید' شافعی اور ابو حنیفہ کا یہی مذہب اور ہادویہ کا مذہب یہ ہے کہ خطبہ کا کچھ نہ کچھ حصہ سننا شرط ہے ورنہ جمعہ درست نہ ہو گا۔ یہ حدیث ان لوگوں پر حجت ہے اگرچہ اس میں گفتگو ہوئی ہے لیکن اس کے طریقوں کی کثرت ایک دوسرے کو قوت دیتی ہے مزید یہ کہ حاکم نے اسے تین طریقوں سے روایت کیا ہے ان سے ایک طریقہ ابوہریرہ کی حدیث سے ہے جس کے متعلق حاکم نے کہا کہ یہ شیخین کی شرط پر ہے۔ پھر اصل تو شرط کا نہ ہونا ہے جب تک اس پر دلیل قائم نہ ہو۔

۴۱۷۔ وعن جابر بن سمرة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ كان يخطب قائماً، ثم يجلس، ثم يقوم فيخطب قائماً، فمن أنبأك أنه كان يخطب جالساً فقد كذب. أخرجه مسلم.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے' پھر بیٹھ جاتے' پھر کھڑے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے اور کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ اب جو شخص تجھے یہ بتلائے کہ آپ بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے اس نے جھوٹ بولا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(۱)۔

(۱) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ دونوں خطبوں کے دوران کھڑا ہونا اور ان کے درمیان بیٹھنا مشروع ہے۔ اس بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ واجب ہے یا سنت؟ ابوحنیفہ قیام اور بیٹھنے کے سنت ہونے کے قائل ہیں اور مالک کا مذہب یہ ہے کہ قیام واجب ہے۔ اگر چھوڑے تو اس نے برا کام کیا اور خطبہ درست ہو گا اور شافعی کا مذہب یہ ہے کہ کھڑا ہو کر وہی شخص خطبہ دے جو اس کی طاقت رکھتا ہے قیام اور قعود پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشگی کرنے سے علماء نے احتجاج کیا ہے حتیٰ کہ جابرؓ نے کہا "جو شخص تجھے یہ بتلائے .... تا آخر" اور اس روایت سے بھی کہ ایک دفعہ کعب بن عجرہؓ مسجد میں داخل ہوئے تو عبدالرحمٰن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا تو کعب نے اس کو برا منایا اور یہ آیت پڑھی وترکوک قائما اور ابن خزیمہ کی روایت میں ہے "میں نے ایسا دن کبھی نہیں دیکھا کہ امام مسلمانوں کی امامت کرائے اور خطبہ بیٹھ کر دے۔ یہ بات دو بار کہی" اور ابن ابی شیبہ نے طاؤس سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ عمر اور عثمان سب کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ پہلا شخص جس نے منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیا وہ معاویہ ہے" اور ابن ابی شیبہ نے شعبی سے روایت کیا کہ "معاویہ نے محض اپنے پیٹ کی چربی اور گوشت زیادہ ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر خطبہ دیا" اور یہ اس کے عذر کی وضاحت ہے گویا خطبہ کے متفق حکم میں عذر کی بنا پر بیٹھنا جائز ہے رہی ابو سعید کی وہ حدیث جسے بخاری نے روایت کیا ہے کہ "ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ کے گرد بیٹھ گئے۔ تو اس کا شافعی نے یہ جواب دیا ہے کہ وہ جمعہ کا دن نہیں تھا سو یہ ہیں وہ دلائل جو خطبہ کے دوران مذکورہ قیام اور قعود کی مشروعیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ رہا ان کا وجوب اور جمعہ کی صحت کے لئے ان کا شرط ہونا تو حدیث کے الفاظ میں اس پر کوئی دلالت نہیں۔ الا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کے وجوب کو اس کے ساتھ ملا لیا جائے۔ نیز آپؐ نے فرمایا ہے: "نماز ایسے پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو" اور جمعہ کے دونون خطبوں میں اور ان کے نماز سے پہلے ہونے کے بارے میں جمعہ کی آیت وضاحت کر رہی ہے گویا جس بات پر آپ نے ہمیشگی کی وہ واجب ہے اور جس پر نہیں کی تو ترک میں اس کے عدم وجوب پر دلیل ہے۔ پھر اگر یہ درست ہو کہ ابو سعید کی حدیث کے مطابق آپ خطبہ جمعہ میں ہی بیٹھتے تھے تو پہلا قول قوی تر ہوا اور اگر ثابت نہ ہو سکے تو دوسرا قوی تر ہو گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فائدہ۔ منبر پر چڑھ کر خطیب کا لوگوں کو السلام علیکم کہنے کے بارے میں ایک حادیث ہے جسے اثرم نے اپنی سند سے شعبی سے روایت کیا ہے کہ "جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر چڑھتے اور لوگوں کی طرف منہ کرتے تو السلام علیکم کہتے" الحدیث۔ یہ حدیث مرسل ہے اور ابن عدی نے روایت کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر کے قریب آتے تو ان لوگوں کو سلام کہتے جو منبر کے قریب ہوتے پھر منبر پر چڑھتے۔ پھر جب لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے تو سلام کہتے۔ پھر بیٹھتے" اس حدیث کو ابن عدی نے عیسیٰ بن عبداللہ انصاری کی وجہ سے ضعیف کہا ہے نیز ابن حبان نے بھی ضعیف کہا ہے۔

۴۱۸۔ وعن جابر بن عبد الله رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا خطب احمرت عيناه، وعلا صوته، واشتد غضبه، حتى كأنه منذر جيش يقول: **«صبحكم ومساكم»**، ويقول: **«أما بعد، فإن خير الحديث كتاب الله، وخير الهدي هدي محمد، وشر الأمور محدثاتها، وكل بدعة ضلالة»**. رواه مسلم.

وفي رواية له: كانت خطبة النبي ﷺ يوم الجمعة: يحمد الله، ويثني عليه، ثم يقول على إثر ذلك، وقد علا صوته.

وفي رواية له: من يهد الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادي له. وللنسائي: «وكل ضلالة في النار».

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں آواز بلند ہو جاتی اور سخت غصہ میں معلوم ہوتے گویا آپ کسی لشکر سے لوگوں کو ڈرا رہے ہیں اور کہتے کہ "صبح کو تم سے یہ کچھ ہونے والا ہے اور شام کو یہ کچھ۔ پھر اما بعد کہتے اور فرماتے کہ "بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ (۱) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ اور بدترین کام نئے نئے کام(۲) ہیں اور ہر بدعت(۳) گمراہی ہے" اسے مسلم نے روایت(۴) کیا اور مسلم ہی میں جابرؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ یہ ہوتا کہ آپ اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے۔ پھر اس کے بعد کہتے اور اس وقت آپ کی آواز بلند ہو چکی ہوتی(۵) اور مسلم میں جابر ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں(۶)۔ اور نسائی میں جابر سے ہی یہ لفظ بھی ہیں "اور ہر گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے(۷)۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) اصل میں دو جگہ لفظ ھدی آیا ہے جو دونوں جگہ ھدی بھی پڑھا جا سکتا ہے اس صورت میں اس کا معنی طریق (راستہ) ہے یعنی سب سے بہتر راستہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور ھدی کو ھدی بھی پڑھا جا سکتا ہے اس صورت کا معنی رہنمائی اور ہدایت ہے اور اس کی نسبت رسولوں کی طرف اور قرآن کی طرف ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وانک لتھدی اور فرمایا: ان ھذا القران یھدی اور کبھی اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اس صورت میں اس کا معنی مہربانی' توفیق اور عصمت ہوتا ہے جیسے فرمایا:انک لاتھدی من احببت'......الایہ

(۲) اصل میں لفظ محدثات آیا ہے یعنی ایسے کام جو اللہ کے رسول کی شرع سے ثابت نہ ہوں۔
(۳) یعنی ایسا کام جس کی پہلے مثال نہ ہو یہاں اس سے مراد ایسا کام ہے جس کا کتاب و سنت سے مشروع ہونا ثابت نہ ہو۔
(۴) بعض علماء نے بدعت کی پانچ اقسام بنا ڈالی ہیں[1] (۱) بدعت راجبہ۔ جیسے تدوین کے ذریعہ علوم کو محفوظ کرنا اور دلائل قائم کر کے ملحدین کا رد کرنا (۲) بدعت مستحبہ جیسے مدارس تعمیر کرنا (۳) بدعت مباحہ جیسے کھانے پینے کی چیزوں اور لباس فاخرہ اقسام اور ان کی توسیع (۴) بدعت مکروہہ اور (۵) بدعت محرمہ۔ بدعت مکروہہ اور بدعت محرمہ یہ دونوں تو واضح ہیں لیکن آپ نے فرمایا کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔"
اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ خطیب خطبہ میں آواز بلند کرے۔ عمدہ کلام کرے اور ترغیب و ترہیب سے متعلق جوامع الکلم پیش کرے اور حمد و ثناء کے بعد اما بعد کہے۔ امام بخاری نے اس کے مستحب ہونے پر باب قائم کیا ہے اور اس میں ایسی تمام احادیث ذکر کر دی ہیں اور ایسی روایات جمع کر دی گئی ہیں بعض محدثین نے اما بعد کا لفظ ذکر کیا ہے اور انہیں بتیس صحابہ سے روایت کیا ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام خطبات میں اللہ کی حمد و ثناء اور شہادتین کے بعد اما بعد کہا کرتے تھے جیسا کہ مشار الیہا روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

(۵) پہلی روایت پر انحصار کرتے ہوئے کہی ہوئی بات کو حذف کیا گیا ہے جو یہ ہے "اما بعد .... سب سے بہتر ہے ....تا آخر جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اور یہاں شہادت کا ذکر نہیں کیا اور دوسری روایات میں ثبوت موجود ہونے کی بنا پر اختصار کر دیا گیا ہے چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "ہر وہ خطبہ جس میں تشہد نہ ہو مجذوم ہاتھ کی طرح ہے اور بیہقی کے دلائل النبوۃ میں ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث مذکور ہے جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ عزوجل کی طرف سے بیان ہوئی ہے کہ میں نے تیری امت کو ایسا بنایا ہے کہ ان کے لئے کوئی خطبہ جائز نہیں تا آنکہ وہ گواہی نہ دیں کہ تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں خود بھی اپنا نام لیتے تھے۔

(۶) یعنی یہ الفاظ اما بعد کے بعد کہے۔

(۷) یہ الفاظ کل بدعه ضلاله کے بعد ہیں جیسا کہ نسائی میں ہے۔ اور اسے مصنف نے مختصر کر دیا اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہر صاحب بدعت آگ میں ہو گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبہ میں صحابہ کو اسلام کے اصول اور شرائع کی تعلیم دیا کرتے اور جب کوئی حکم دینے کا یا منع کرنے کا معاملہ پیش آجاتا تو انہیں اپنے خطبہ میں حکم دیا یا منع کیا کرتے تھے۔ جیسے آپ نے ایک آنے والے کو اپنے خطبہ کے دوران دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔ نیز آپ اپنے خطبہ میں انہیں شریعت کے بڑے بڑے اصولوں اور جنت' دوزخ اور اخروی باز پرس سے نصیحت کیا کرتے تھے۔ آپ انہیں اللہ سے ڈرنے اس کے غضب سے بچنے اور اس کی خوشنودی کے کاموں کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ اور مسلم کی حدیث میں آیت کی قرات کا بھی ذکر آیا ہے۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے دیتے' ان کے درمیان بیٹھتے' قرآن پڑھتے' لوگوں کو نصیحت کرتے اور ڈراتے تھے۔ اور اس حدیث کا ظاہر خطبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ چیزوں پر محافظت ہے نیز یہ کہ ایسا کرنا واجب ہے کیونکہ آپؐ کا یہ فعل آیت جمعہ کے اجمال کی تفصیل ہے نیز آپ نے فرمایا: "نماز ایسے پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو" امام شافعی کا یہی مذہب ہے اور ہادویہ کہتے ہیں کہ دونوں خطبوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے سوا کچھ واجب نہیں اور ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ والحمدللہ ولاالہ الا اللہ واللہ اکبر کفایت کرتا ہے اور مالک کہتے ہیں کہ وہی کچھ کفایت کر سکتا ہے جسے خطبہ کا نام دیا جا سکے۔

---

(۱) بدعت کی یہ تقسیم صرف لغوی معنوں کے لحاظ سے ہے اور اس کا شرعی مفہوم وہ ہے جس پر حضرت عائشہؓ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ "جس نے ہمارے اس امر دین میں کوئی نیا کام کیا جو اس میں سے نہ تھا وہ مردود ہے" گویا یہاں امر سے مراد دین کا معاملہ ہے اور بعض علماء نے یہ تفسیر کی ہے۔ ایسا نیا کام جو اس حق کے خلاف ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چلا آرہا ہے اور اسے دین قیم اور صراط مستقیم کا حصہ بنا دیا جائے۔ ایسی بدعت جب بھی دین میں آئے گی گمراہی ہی ہو گی۔ کیونکہ الفاظ میں عموم ہے۔ شاطبی کی الاعتصام کی طرف رجوع فرمایئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۱۹- وعن عمار بن ياسر رضي الله تعالى عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «إن طول صلاة الرجل وقصر خطبته مئنة من فقهه». رواه مسلم.

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "آدمی کی عقلمندی کی علامت(۱) یہ ہے کہ وہ نماز کو لمبا اور خطبہ کو چھوٹا کرے(۲)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اصل میں لفظ مینہ آیا ہے بمعنی علامت یعنی ایسی چیز جس سے آدمی کی سمجھ کو پہچانا جا سکے اور ہر وہ چیز جو دوسری پر دلالت کرے وہ اس کے لئے مینہ ہے۔

(۲) آپؐ نے خطبہ چھوٹا کرنے کو آدمی کی سمجھ اور عقل کی علامت قرار دیا۔ اس لئے کہ فقیہ وہ ہوتا ہے جو معانی کے حقائق سے واقف ہو۔ کثیرالمعانی الفاظ سے اپنے مطلب کو عمدہ الفاظ میں ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہو اسی لئے اس حدیث کا بقیہ حصہ یوں ہے "لہذا اپنی نماز کو لمبا اور خطبہ کو چھوٹا کرو اور بعض بیان جادو کا اثر رکھتا ہے" گویا آپ نے خطیب کے کلام کو دلوں کو متاثر کرنے اور عقلوں پر جادو کرنے سے تشبیہ دی۔ کیونکہ بیان الفاظ کی عمدگی دلائل میں ربط، کثیرالمعانی اور وسیع المعانی الفاظ سے استفادہ اور ترہیب میں مجاز اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ان چیزوں پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو معانی کو خوب سمجھتا ہو۔ اور دلائل میں ربط قائم کر سکتا ہو اور جوامع الکلم کے استعمال سے یہ استطاعت پیدا ہوتی ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ایک یہ بات تھی کہ آپ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے تھے۔

اور نماز کی لمبائی سے مراد اتنی لمبائی بھی نہیں کہ اس کا فاعل نہی کے حکم کے تحت داخل ہو جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھتے تھے اور یہی لمبائی آپ کے خطبہ کی نسبت سے تھی نیز تطویل منہی عنہ نہیں ہے۔

۴۲۰- وعن أم هشام بنت حارثة رضي الله تعالى عنها قالت: ما أخذت «ق والقرآن المجيد» إلا عن لسان رسول الله ﷺ، يقرأها كل جمعة على المنبر إذا خطب الناس. رواه مسلم.

ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سورت ق و القرآن المجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یاد کر لی جسے آپ ہر جمعہ کو منبر پر پڑھتے۔ جب آپ لوگوں کو خطبہ دیتے(۲)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) آپ انصاریہ ہیں- آپ سے حبیب بن عبدالرحمٰن بن سیاف نے روایت کیا ہے احمد بن زہیر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے سنا کہ ام ہشام بنت حارثہ نے بیعت رضوان کے وقت بیعت کی تھی ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اس کا ذکر کیا ہے مگر اس کا نام ذکر نہیں کیا اور مصنف نے تقریب میں ذکر کیا مگر نام اس نے بھی نہیں لیا- صرف یہ کہا کہ وہ مشہور صحابیہ ہیں-

(۲) اس حدیث میں ہر جمعہ کے خطبہ میں سورہ ق والقرآن مجید پڑھنے کی مشروعیت پر دلیل ہے عطاء کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورہ کو اس لئے اختیار فرمایا کہ یہ سورت موت' بعث بعدالموت' قیمتی پندونصائح اور سخت قسم کی سرزنش جیسے اہم مضامین پر مشتمل ہے نیز اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ خطبہ میں قرآن سے کچھ نہ کچھ ضرور پڑھنا چاہئے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے البتہ اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ خطبہ میں مذکورہ بالا سورت یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھنا واجب نہیں ہے- اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو مذکورہ سورت پر محافظت کرتے رہے تو یہ آپ کی پسند کی بات تھی کیونکہ وعظ و تذکیر کے لحاظ سے یہ سورت بہت خوب ہے- نیز اس حدیث میں خطبہ میں وعظ کو بار بار دہرانے پر بھی دلیل ہے-

۴۲۱- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «**من تكلم يوم الجمعة: والإمام يخطب، فهو كمثل الحمار يحمل أسفاراً، والذي يقول له: أنصت، ليست له جمعة**». رواه أحمد بإسناد لا بأس به.

وهو يفسر حديث أبي هريرة في الصحيحين مرفوعاً:

۴۲۲-إذا قلت لصاحبك: أنصت، يوم الجمعة، والإمام يخطب، فقد لغوت.

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن امام کے خطبہ دیتے وقت کلام کرے اس کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں- اور جو شخص اسے کہے کہ خاموش ہو جا' اس کا بھی جمعہ نہیں ہوتا- اسے احمد نے معتبر سند(۱) سے روایت کیا- اور یہ حدیث(۲) (آگے مذکور حدیث کی) تفسیر کرتی ہے- اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں مرفوعاً" مروی ہے کہ: جب تو جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے دوران اپنے ساتھی سے کہے کہ خاموش ہو جا تو تو نے بھی لغو کام کیا-

(۱) اور اس کا ایک قوی شاہد جامع حماد مرسل میں ہے-

(۲) یعنی ابن عباس کی اس حدیث کی-

حدیث کے لفظ ہیں یوم الجمعہ جو اس بات پر دلیل ہے کہ جمعہ کے علاوہ دوسرا خطبہ ایسا نہیں کہ اس میں کلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے منع کیا گیا ہو اور والامام یخطب اس بات پر دلیل ہے کہ کلام کرنا صرف خطبہ کے دوران ممنوع ہے اور اس میں اس شخص کا رد ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ امام کے آنے سے ہی کلام ممنوع ہو جاتا ہے رہا دو خطبوں کے دوران امام کے بیٹھنے کے وقت کلام کرنا تو اس کی ممانعت نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ وقت چونکہ بہت تھوڑا ہوتا ہے جس طرح خطیب خطبہ کے دوران سانس لینے کے لئے رکتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی خطبہ ہی کے حکم میں ہے۔

اور کتابیں اٹھانے والے گدھے سے اس لئے تشبیہ دی کہ اس نے نفع بخش فائدہ اٹھانے کے موقعہ کو ضائع کر دیا۔ حالانکہ اس میں جمعہ میں حاضر ہونے کی مشقت بھی برداشت کی اور لیست لہ جمعتہ کے الفاظ اس بات پر دلیل ہیں کہ اس کی نماز نہیں ہوئی تو اس سے جمعہ کی نماز مراد ہے۔ جبکہ یہ نماز بالاجماع کفایت کرتی ہے لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے جو یہ ہے کہ اسے وہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی جو چپ رہنے والے کو ہوتی ہے جیسا کہ ابن عمر کی حدیث میں ہے جسے ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے "جس شخص نے کوئی لغو کام کیا یا لوگوں کی گردنیں پھلانگیں تو اس کی ظہر ہو گی (جمعہ نہیں ہو گا)" اس حدیث کے ایک راوی ابن وہب نے کہا کہ اس کی نماز ہو گئی مگر جمعہ کی فضیلت سے محروم رہا اور جو لوگ خطبہ کے دوران کلام کے حرام ہونے کے قائل ہیں' انہوں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے اور وہ ہادویہ' ابوحنیفہ' مالک اور شافعی کی ایک روایت ہے کیونکہ مکروہ مشبہ بہ سے تشبیہ اور وجہ تشبیہ اس فعل کے برا ہونے پر دلالت کرتی ہے اسی طرح اس کی نسبت جمعہ سے حاصل ہونے والی فضیلت کے ضائع ہونے کی طرف ہے۔ کلام کرنے والا گناہ کا جو بوجھ اٹھاتا ہے وہ فضیلت کے مدمقابل آجاتا ہے اور اس فضیلت کو رخصت کر دیتا ہے۔

اور قاسم' ہادی کے دونوں بیٹوں' احمد کے دو اقوال میں سے ایک قول اور شافعی نے ان دو شخصوں کے درمیان فرق کیا ہے جن میں ایک تو خطبہ سن رہا ہے اور دوسرا سن نہیں سکتا۔ اور جو شخص جمعہ کا خطبہ سن رہا ہے اس کے چپ رہنے کے وجوب پر ابن عبدالبر سے اجماع منقول ہے مگر تابعین میں سے چند لوگ اس کے قائل نہیں۔

اور حدیث کے الفاظ "جب تو نے اپنے ساتھی سے کہا: خاموش ہو جا تو تو نے لغو کام کیا" میں کلام سے ممانعت کی تاکید ہے۔ کیونکہ جب امربالمعروف (یعنی چپ رہنے کو کہنا) بھی لغو میں شمار ہوا تو دوسرا کلام تو اور بھی برا ہو گا۔ اسی بناء پر اس پر واجب ہے کہ اسے اشارہ سے چپ رہنے کا حکم دے اگر وہ ایسا کر سکے۔ اور انصات (خاموش ہو جانے) سے مراد بعض لوگ لوگوں کی باہمی گفتگو لیتے ہیں۔ اس صورت میں ذکر اور قرآن کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرات جائز قرار پاتی ہے جبکہ یہ واضح ہے کہ اس نہی میں ہر قسم کا کلام شامل ہے۔ اور جو ان میں فرق کرتا ہے تو دلیل کی ذمہ داری اس پر ہے اس کی مثال سلام کا جواب دینا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ہے جس کے بعض لوگ وجوب کے قائل ہیں گویا اس موقعہ پر نہی کے عموم میں اور ان دونوں کے وجوب کے عموم میں تعارض پیدا ہو گیا۔ اور ان میں سے کسی ایک کی تخصیص ترجیح کے بغیر کرنا تحکم (سینہ زوری) ہے۔ نیز لغوت کے معنی میں بھی اختلاف کیا گیا ہے اور اقرب وہی ہے جو ابن منیر نے کہا ہے کہ لغو وہ کام ہے جس سے کچھ حاصل نہ ہو اور بعض اس کا معنی یہ بتلاتے ہیں کہ تیرے جمعہ کی فضیلت باطل ہو گئی اور وہ صرف ظہر رہ گئی۔

۴۲۳- وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: دخل رجل يوم الجمعة، والنبي ﷺ يخطب، فقال: صليت؟ قال: لا، قال: قم، فصلّ ركعتين. متفق عليه.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "جمعہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص داخل ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا' کیا تو نے سنتیں پڑھ لی ہیں؟ اس نے کہا نہیں' آپ نے فرمایا۔ اٹھ اور دو رکعتیں پڑھ لے۔" متفق علیہ۔

وہ شخص سلیک غطفانی تھا' مسلم کی روایت میں اس کا نام مذکور ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ کوئی اور تھا۔ اور صلیت سے پہلے ہمزہ استفہامیہ محذوف ہے اصل میں یہ اصلیت؟ ہی ہے اور مسلم میں "اصلیت" ہی ہے۔ اور بخاری کے بعض طریقوں سے بھی یہ ثابت ہے۔

اور صل رکعتین کا بخاری میں بخفیفتین سے وصف بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہلکی دو رکعتیں پڑھ لو۔ اور مسلم میں وتجوز فیهما کا لفظ ہے یعنی ان میں اختصار کرو اور بخاری نے اس کے لئے باب کا یہ عنوان رکھا ہے۔ "جو شخص امام کے خطبہ کے دوران آئے وہ دو ہلکی رکعتیں پڑھ لے"

اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ تحیه المسجد کی دو رکعتیں خطبہ کے دوران بھی پڑھنا ضروری ہے۔ آل کے ایک گروہ' فقہاء اور محدثین کا یہی مذہب ہے۔ اور ہلکی اس لئے کہ خطبہ سننے کے لئے جلد فارغ ہو جائے۔ اور سلف اور خلف کی ایک جماعت خطبہ کے دوران اس کی عدم مشرعیت کی قائل ہے اور یہ حدیث ان پر حجت ہے۔ ان لوگوں نے اس حدیث کی گیارہ تاویلیں کی ہیں جو سب کی سب مردود ہیں۔ مصنف نے فتح الباری میں ترتیب وار ان کا ذکر کر کے ان کا رد کیا ہے اور شارح رحمہ اللہ نے انہیں شرح میں نقل کیا ہے۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے اس قول فاستمعوا له و انصتوا سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس میں کوئی دلیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں اس لئے کہ یہ حکم خاص ہے اور آیت میں حکم عام ہے اور اس لئے بھی کہ خطبہ قرآن نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو اپنے ساتھی کو "چپ ہو جاؤ" کہنے سے بھی منع کر دیا جبکہ خطیب خطبہ دے رہا ہو۔ حالانکہ یہ امر بالمعروف ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی شارع کا حکم ہے اور وہ بھی شارع کا حکم ہے لہٰذا اس کے دونوں حکموں میں تعارض نہیں۔ بلکہ بیٹھنے والا تو چپ رہے اور آنے والا تحیہ کی نماز پڑھ لے۔

اور مالکیہ کی دلیل یہ ہے کہ اہل مدینہ سلف سے خلف تک خطبہ کے دوران نوافل سے منع کرتے رہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ اہل مدینہ کا اجماع حجت نہیں جیسا کہ علم الاصول میں معروف ہے کہ ان کے اجماع کا دعویٰ مکمل نہیں۔ چنانچہ ترمذی اور ابن خزیمہ نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا کہ ابو سعید آئے اور مروان خطبہ دے رہا تھا انہوں نے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ مروان کے چوکیدار نے چاہا کہ آپ کو روک دے مگر آپ نے اسے تسلیم نہ کیا اور دو رکعتیں پڑھ لیں۔ پھر کہا: میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے ان کا حکم دیا۔ لہٰذا میں انہیں چھوڑنے والا نہیں۔ رہی ابن عمر کی وہ حدیث جو طبرانی کی کبیر میں مرفوعاً" ان الفاظ سے ہے "جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو اور امام خطبہ دے رہا ہو تو جب تک امام فارغ نہ ہو نہ نماز ہے اور نہ کلام" اس کی سند میں ایوب بن نہیک ہے جو متروک ہے اور اسے ایک جماعت نے ضعیف کہا ہے اور ابن حبان نے اس کا ثقات میں ذکر کیا اور کہا یہ خطا کرتا تھا۔

نیز اس حدیث سے یہ نتیجہ بھی نکالا گیا ہے کہ خطیب کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ خطبہ روک کر تھوڑی سی کوئی دوسری بات کر لے اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی وہ انہیں اوامر میں سے تھی جن کے لئے خطبہ مشروع کیا گیا ہے۔ اور آپ کا اسے دو رکعتوں کا حکم دینا ہی اس کے وجوب پر دلیل ہے اور بعض کا یہی مذہب ہے۔

اور جو شخص حرم میں داخل ہو جبکہ خطبہ کی صورت نہ ہو تو اس کے لئے طواف مشروع ہے کیونکہ اس کا یہی تحیہ ہے یا اس لئے کہ وہ اغلباً" طواف کی دو رکعتوں کے بعد ہی بیٹھتا ہے رہی نماز عید سے پہلے نماز تو اگر نماز کھلے میدان میں ہو اور وہ راہ گزر نہ ہو تو وہاں ہرگز تحیہ مشروع نہیں اور اگر نماز مسجد میں ہو تو جائز ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی نماز عید کے لئے نکلتے تو نماز عید سے پہلے کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے۔ اس لئے کہ آپ جاتے ہی عید کی نماز میں مشغول ہو جاتے اور اس لئے بھی کہ آپ عید کھلے میدان میں پڑھتے تھے صرف ایک بار صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسجد میں نماز پڑھی۔ لہٰذا اس میں اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ اگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھلے میدان کے علاوہ کسی جگہ پر بھی مشروع نہیں۔ مثلاً جب عید مسجد میں پڑھی جا رہی ہو۔

۴۲۴۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ كان يقرأ في صلاة الجمعة سورة الجمعة والمنافقين. رواه مسلم.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز (کی پہلی رکعت) میں سورہ جمعہ اور (دوسری) میں سورہ المنافقون(۱) پڑھتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۲)۔

(۱) یعنی سورہ فاتحہ کے بعد جیسا کہ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) آپ نے ان سورتوں میں نماز جمعہ میں پڑھنے کے لئے اس لئے خاص کر لیا تھا کہ سورہ جمعہ میں نماز جمعہ میں حاضر ہونے کی ترغیب اور جلدی جلدی آنے کا بیان ہے۔ نیز اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ نیز آپ کی بعثت کے سلسلہ میں چار حکم مذکور ہیں کہ آپ لوگوں کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں۔ ان کی تربیت کرتے ہیں اور انہیں کتاب اللہ کی تعلیم دیتے اور حکمت سکھلاتے ہیں۔ نیز اس میں اللہ کے ذکر پر ابھارا گیا ہے۔ اور سورہ منافقون اس لئے پڑھتے تھے کہ اس میں منافقوں پر سرزنش کی گئی ہے۔ انہیں توبہ پر ابھارا گیا ہے اور اس بات پر بھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر ان سے اللہ سے معافی کے لئے دعا کرائیں۔ کیونکہ جمعہ کی نماز میں منافقوں کی کثیر تعداد جمع ہو جاتی تھی اور اس لئے کہ اس سورہ کے آخر میں نصیحت ہے اور صدقہ پر ابھارا گیا ہے۔

۴۲۵۔ وله عن النعمان بن بشير كان يقرأ في العيدين وفي الجمعة «بسبح اسم ربك الأعلى» «وهل أتاك حديث الغاشية».

اور مسلم ہی میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی اور جمعہ کی نماز میں سبح اسم ربک الاعلیٰ(۱) اور هل أتٰك حديث الغاشيه(۲) پڑھا کرتے تھے۔

(۱) سورہ فاتحہ کے بعد پہلی رکعت میں۔

(۲) یعنی دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد۔ گویا کبھی تو وہ سورتیں پڑھتے تھے جن کا ابن عباس نے ذکر کیا ہے اور کبھی یہ جن کا نعمان نے ذکر کیا ہے اور سورہ الاعلیٰ اور غاشیہ میں آخرت کے احوال سے تذکیر بھی ہے، وعدہ بھی اور وعید بھی جن کی قراءت اس جامع نماز کے لئے خوب مناسبت رکھتی ہے اور عیدین کے بارے میں یہ بھی آیا ہے کہ سورہ ق اور اقتربت پڑھتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٤٢٦- وعن زيد بن أرقم رضي الله تعالى عنه قال: صلى النبي ﷺ العيد، ثم رخص في الجمعة، فقال: من شاء أن يصلّي فليصلِّ. رواه الخمسة إلا الترمذي، وصححه ابن خزيمة.

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی(۱) پھر جمعہ کی رخصت(۲) دے دی- پھر فرمایا: جو شخص جمعہ کی نماز پڑھنا چاہے پڑھ لے(۳)- اسے ترمذی کے سوا پانچوں نے روایت کیا اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا(۴)-

(۱) جمعہ کے دن

(۲) یعنی جمعہ کی نماز کی

(۳) یہ رخصت کی وضاحت ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ رخصت دی گئی ہے-

(۴) نیز اسے ابوداؤد نے ابوہریرہ کی حدیث سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آج کے دن دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں اب جو شخص چاہے جمعہ نہ پڑھے اور ہم تو دونوں پڑھیں گے" نیز ابن ماجہ اور حاکم نے ابو صالح کی حدیث روایت کی اور اس کی سند میں بقیہ ہے دار قطنی وغیرہ' نے اس کے مرسل ہونے کو درست سمجھا ہے اور اس بارے میں عطاء کی حدیث بھی ہے جو ابن زبیر سے روایت کی گئی ہے کہ "اس نے جمعہ ترک کیا اور ابن عباس نے پوچھا تو ابن عباس نے کہا: تو نے سنت کے مطابق کیا-

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ نماز عید کے بعد جمعہ کی نماز رخصت بن جاتی ہے- جمعہ پڑھ لینا بھی جائز ہے اور چھوڑ دینا بھی- اور یہ رخصت خاص اس کے لئے ہے جس نے عید کی نماز پڑھی ہو نہ پڑھنے والے کے لئے نہیں- ہادی اور ایک جماعت کا یہی مذہب ہے مگر جب تین مزید آدمی ایسے امام کے ساتھ ہو جائیں تو وہ نماز جمعہ کا پابند ہے اور شافعی اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ جمعہ رخصت نہیں لیتا- ان کا استدلال یہ ہے کہ جمعہ کا وجوب عام ہے خواہ کوئی بھی دن ہو اور جو احادیث و آثار اس بارے میں مذکور ہیں وہ اتنے قوی نہیں کہ تخصیص کر سکیں کیونکہ ان سب کی اسناد میں گفتگو ہوئی ہے-

میں کہتا ہوں کہ زید بن ارقم کی حدیث کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے اور اس میں کسی نے طعن نہیں کیا لہٰذا یہ تخصیص کی صلاحیت رکھتی ہے- اس لئے کہ آحاد سے' عام کی تخصیص ہو سکتی ہے اور عطاء اس طرف گئے ہیں کہ سب سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ آپؐ کے قول "جو نماز پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے" سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے اور ابن زبیر کے فعل کی بنا پر بھی کہ ابن زبیر نے جمعہ کے دن لوگوں کو عید کی نماز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھائی عطاء کہتے ہیں پھر ہم جمعہ کی نماز کے لئے گئے تو ابن زبیر نہیں آئے اور ہم نے اکیلے نماز پڑھ لی۔ عطاء کہتے ہیں کہ ابن عباس طائف میں تھے جب ہم وہاں پہنچے تو ان سے اس بات کا ذکر کیا تو ابن عباس نے کہا اس نے سنت کے مطابق کیا' نیز ابن زبیر اس بات کے بھی قائل تھے کہ جمعہ کے دن عید کی نماز سے ظہر کا فرض ساقط ہو جاتا ہے عید کی نماز کے بعد اب عصر ہی پڑھے۔ چنانچہ ابوداؤد نے ابن زبیر سے روایت کیا کہ "ایک ہی دن میں دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں تو آپ نے انہیں جمع کیا اور صبح کو دو رکعتیں پڑھائیں اور اس پر کچھ زیادہ نہ کیا حتیٰ کہ عصر کی نماز پڑھی۔"

اور ایک قول کے مطابق جمعہ کے دن جمعہ اصل ہے اور ظہر اس کا بدل ہے جو اس قول کی صحت کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ادائیگی کے امکان کے باوجود جب اصل کا وجوب ساقط ہو گیا تو بدل بھی ساقط ہو گیا اور حدیث کا ظاہر بھی یہی ہے کہ جب آپ نے لوگوں کو جمعہ کی رخصت دے دی اور انہیں ظہر کی نماز کا حکم بھی نہیں دیا حالانکہ جمعہ کے ساقط ہونے سے ظہر کے سقوط کا بھی گمان ہو سکتا ہے' اسی بات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ شارح نے کہا ہے اور شارح نے ابن زبیر کے مذہب کی تائید کی ہے۔

میں کہتا ہوں مخفی نہ رہے کہ عطاء نے خبر دی کہ ابن زبیر جمعہ کی نماز کے لئے نہیں آئے۔ اور یہ کوئی ایسی دو ٹوک بات نہیں کہ ابن زبیر نے اپنے گھر پر بھی ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ لہٰذا ابن زبیر کے مذہب کے متعلق یہ یقین کر لینا کہ جو شخص عید کے دن عید کی نماز پڑھ لے وہ ظہر کی نماز نہ پڑھے صحیح نہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ انہوں نے گھر پر پڑھ لی ہو۔ بلکہ عطاء کا بیان یہ ہے کہ انہوں نے اکیلے اکیلے نماز پڑھ لی۔ یعنی ظہر کی نماز جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ظہر کی نماز کے سقوط کے قائل نہیں تھے اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے جمعہ کی نماز اکیلے اکیلے پڑھ لی تھی کیونکہ جمعہ کی نماز تو اجتماعاً" ہی ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ قول بھی مرجوح ہے کہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ہی اصل ہے اور ظہر اس کا بدل ہے بلکہ اصلی فرض تو ظہر ہے جو شب معراج میں فرض کی گئی اور جمعہ اس کے بعد فرض ہوا پھر جب جمعہ کی نماز فوت ہو جائے تو ظہر بالاجماع واجب ہو جاتی ہے گویا یہ اس کا بدل بن جاتی ہے اور اس بات کی تحقیق ہم نے مستقل رسالہ میں پیش کر دی ہے۔

٤٢٧- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**إذا صلى أحدكم الجمعة فليصلّ بعدها أربعاً**». رواه مسلم.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی شخص جمعہ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ اس کے بعد چار رکعت (سنتیں) پڑھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہ حدیث جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعت پڑھنے کی مشروعیت پر دلیل ہے اور آپ نے ان کا حکم دیا جو اگرچہ وجوب پر دلالت کرتا ہے مگر اسے مسلم نے ابن الصباح کی روایت سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے "جو شخص نماز جمعہ کے بعد نماز پڑھنا چاہئے تو چار رکعت پڑھے" جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ چار رکعت واجب نہیں اور چار رکعت پڑھنا دو رکعت سے بہتر ہے کیونکہ چار رکعت سے متعلق حکم آیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ایسا کیا کرتے تھے۔ ابن قیم نے الھدی النبوی میں کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز جمعہ پڑھ چکتے تو اپنے گھر آکر اس کی دو سنتیں پڑھتے اور حکم یہ دیا کہ جو شخص نماز پڑھنا چاہے تو چار رکعت پڑھے۔ ہمارے شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اگر مسجد میں پڑھے تو چار رکعت پڑھے اور اگر اپنے گھر میں پڑھے تو دو رکعت پڑھے۔

میں کہتا ہوں کہ احادیث بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہیں چنانچہ ابوداؤد نے ابن عمر سے ذکر کیا کہ جب وہ مسجد میں نماز پڑھتے تو چار رکعت پڑھتے اور جب اپنے گھر میں پڑھتے تو دو رکعت پڑھتے۔ اور صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ آپؐ جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعت پڑھتے تھے۔

٤٢٨- وعن السائب بن يزيد ، أن معاوية رضي الله تعالى عنه قال له: إذا صلّيت الجمعة فلا تَصِلْها بصلاة حتى تتكلم أو تخرج، فإن رسول الله ﷺ أمرنا بذلك: أن لا نوصل صلاة بصلاة حتى نتكلم أو نخرج. رواه مسلم.

سائب بن یزید رضی اللہ عنہ(۱) سے روایت ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا "جب تو جمعہ کی نماز پڑھ لے تو اس کے ساتھ کوئی اور نماز نہ ملا تا آنکہ تو کلام کرے یا وہاں سے چلا جائے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسی بات کا حکم دیا تھا کہ ہم نماز کے ساتھ نماز کو نہ ملائیں تا آنکہ کلام کر لیں یا وہاں سے اٹھ جائیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۲)۔

(۱) آپ ابو یزید السائب بن یزید الکندی مشہور صحابہ سے ہیں ۲ھ میں پیدا ہوئے اور حجتہ الوداع میں اپنے باپ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ سات سال کے تھے۔

(۲) اس حدیث میں نفلی نماز کو فرض سے جدا کرنے کی مشروعیت ہے اور یہ کہ انہیں ملایا نہ جائے اور بظاہر نہی سے تحریم معلوم ہوتی ہے اور یہ بات جمعہ کی نماز سے خاص نہیں ہے۔ کیونکہ راوی نے بالخصوص جمعہ کی نماز کا ذکر کر کے ایسی حدیث سے استدلال کیا ہے جو جمعہ اور غیر جمعہ سب میں عام ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ فرض نفلوں سے مشتبہ نہ ہو جائیں اور یہ بھی آیا ہے کہ یہ ہلاکت ہے۔ اور علماء نے ذکر کیا ہے کہ فرض نماز کی جگہ کو نفلوں کی خاطر تبدیل کرنا مستحب ہے اور افضل یہ ہے کہ نوافل کے لئے اپنے گھر چلا جائے۔ کیونکہ نوافل گھروں میں ادا کرنا افضل ہے ورنہ مسجد میں ہی جگہ تبدیل کر لے کہ اس میں سجدہ کرنے کے مقامات میں کثرت مقصود ہے۔ چنانچہ ابو داؤد نے ابوہریرہ کی حدیث سے مرفوعاً" روایت کیا "کیا تم ایسا کرنے سے عاجز ہو کہ تم سے کوئی شخص نماز کے لئے آگے ہو جائے کوئی پیچھے کوئی دائیں اور کوئی بائیں" اور ابو داؤد نے اسے ضعیف نہیں کہا اور بخاری نے اپنی صحیح میں ابوہریرہ سے مرفوعاً" ذکر کیا کہ "امام اپنی جگہ پر نفل نماز نہ پڑھے" اور اس نہی کو صحیح نہیں کہا۔

۴۲۹۔ وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من اغتسل، ثم أتى الجمعة، فصلى ما قدر له، ثم أنصت حتى يفرغ الإمام من خطبته، ثم يصلي معه، غفر له ما بينه وبين الجمعة الأخرى، وفضل ثلاثة أيام». رواه مسلم.

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے غسل کیا (۱) پھر جمعہ کے لئے آیا اور جو نماز اس کے مقدر تھی وہ پڑھی پھر خاموش بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہو جائے پھر اس کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کے پچھلے جمعہ سے لے کر اس جمعہ تک کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے زائد بھی (۲)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) یعنی جمعہ کے لئے بمطابق حدیث "تم میں سے کوئی شخص جب جمعہ کو آئے تو غسل کرلے" یا ویسے ہی غسل کرے۔

(۲) اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ نہانے کا جو اجر ذکر کیا گیا ہے اس کی حفاظت ضروری ہے مگر مسلم ہی کی روایت میں ہے کہ: "جس شخص نے اچھی طرح وضوء کیا پھر جمعہ کے لئے آیا" اس روایت میں یہ وضاحت ہے کہ جمعہ کا غسل واجب نہیں بلکہ نوافل سے ہے اور ہر شخص اپنے حسب توفیق کر لے پھر اگر کسی طرح بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے پورا اجر مل جائے گا اگرچہ وہ تحیہ المسجد پر اکتفا کرے۔ اور انصت ' انصات سے ہے بمعنی سکوت اور اس کا معنی صرف سننا یا سن پانا نہیں بلکہ کسی چیز کو سننے کے لئے ادھر جھکنا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فاستمعوا له وانصتوا اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ آیا خاموش رہنا واجب ہے یا نہیں؟ اور اس حدیث میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ کلام کرنے کی ممانعت صرف خطبہ کے دوران ہے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں نہیں خواہ یہ کلام نماز سے پہلے ہو کیونکہ اس کی ممانعت نہیں جیسا کہ حتیٰ کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے۔

اور آپ کے قول "اس جمعہ اور اس سے بعد والے جمعہ کے درمیان کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اس جمعہ اور خطبہ کے وقت سے لے کر دوسرے جمعہ کے خطبہ کے وقت تک کے گناہ۔ یہ پورے سات دن ہوئے اس دوران ہونے والی خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں اور تین زائد دنوں کی بھی تو یہ کل دس دن ہوئے۔ رہی یہ بات کہ آیا سب کبیرہ اور صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں کبیرہ گناہوں کو اللہ تعالیٰ توبہ کے بغیر معاف نہیں کرتا۔

۴۳۰- وعنه رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ ذكر يوم الجمعة، فقال: فيه ساعة لا يوافقها عبد مسلم، وهو قائم يصلي يسأل الله عز وجلّ شيئاً، إلا أعطاه إياه. وأشار بيده يقللها. متفق عليه. وفي رواية لمسلم: وهي ساعة خفيفة.

اور انہی ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جمعہ میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ جو مسلمان بندہ کھڑا ہو کر (۱) نماز کے دوران(۲) اللہ سے کچھ سوال(۳) کرے تو اللہ عزوجل ضرور وہ چیز اسے عطا کرتا ہے۔ اور آپؐ نے اپنے ہاتھ کے اشارہ بتلایا کہ وہ وقت بہت تھوڑا ہے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ وہ ساعت بہت تھوڑی ہوتی ہے(۴)۔

(۱) یہ جملہ حالیہ ہے یا بندے کی صفت ہے اور واؤ اس صفت کو ملانے کی تاکید کے لئے ہے۔

(۲) یہ دوسری حالت ہے۔

(۳) یہ تیسری حالت ہے۔

(۴) یہی وہ بات ہے جو پہلی روایت میں لفظ یقللھا سے معلوم ہوتی ہے پہلی روایت میں اس ساعت کا ابہام تھا دوسری میں اس کا تعین آگیا اور قائم سے مراد صرف کھڑا ہونے کی حالت نہیں بلکہ وہ شخص ہے جو کھڑا ہو کر نماز کے ارکان کو پوری طرح بجا لارہا ہو۔ اور یہ جملہ حفاظ حدیث کی ایک جماعت سے ثابت ہے اور آخرین کی روایت میں محذوف ہے اور بعض علماء کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس جملہ کو حدیث سے حذف کرنے کا حکم دیتے تھے کیونکہ اس سے نماز مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس گھڑی کا وقت عصر کے بعد ہے اور وہ نماز کی کراہت کا وقت ہے اور بعض کے نزدیک وہ وقت ہے جب خطیب منبر پر بیٹھتا ہے پھر اٹھنے لگتا ہے۔ چنانچہ اس جملہ کی تاویل کی گئی کہ اس سے مراد نماز کے لئے منتظر شخص ہے حالانکہ نماز کا منتظر بھی نماز میں ہی ہوتا ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ہم اس بات کے قائل ہیں کہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرنے والے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے جیسا کہ مالک کی روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اشارہ کرنے والا کوئی راوی ہے۔ رہی اشارہ کی کیفیت تو وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی انگلی وسطی اور خنصر کے درمیان میں رکھی جو اس کی قلت کی وضاحت کرتی ہے۔

اور اس مقام پر تو سوال علی الاطلاق مذکور ہے جبکہ دوسری روایات میں یہ مقید ہے جیسے ابن ماجہ میں ہے کہ "جب تک وہ کسی گناہ کی بات کا سوال نہ کرے" اور احمد میں ہے کہ "جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی بات کا سوال نہ کرے"

۴۳۱ ـ وعن أبي بردة رضي الله تعالى عنه، عن أبيه، قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: **«هي ما بين أن يجلس الإمام إلى أن تقضى الصلاة»**. رواه مسلم، ورجح الدارقطني أنه من قول أبي بردة.

ابوبردہ(۱) رضی اللہ عنہ اپنے باپ(۲) سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ وقت(۳) امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے لے کر جماعت پوری ہو جانے تک ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا اور دار قطنی نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ قول ابوبردہ(۴) کا ہے۔

(۱) آپ عامر بن عبداللہ بن قیس ہیں اور عبداللہ ہی ابو موسیٰ اشعری ہیں اور ابوبردہ مشہور تابعین میں سے ہیں انہوں نے اپنے باپ سے، علی رضی اللہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہم سے سماعت کی ہے۔

(۲) ابو موسیٰ اشعری۔

(۳) یعنی جمعہ کی وہ ساعت۔

(۴) علماء نے اس ساعت کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور مصنف نے فتح الباری میں علماء سے تینتالیس (۴۳) اقوال ذکر کئے ہیں جن کی طرف عنقریب وہ اشارہ کرے گا۔ اور شارح رحمہ اللہ نے انہیں شرح میں ترتیب وار درج کر دیا ہے۔ انہیں میں سے ایک یہ قول ہے جو ابو موسیٰ سے مروی ہے اور مسلم نے اسی کو ترجیح دی ہے اس بنا پر کہ اسے بیہقی نے روایت کرتے ہوئے کہا: اس باب میں یہی قول سب سے عمدہ اور صحیح ہے۔ اور بیہقی، ابن عربی اور ایک جماعت اسی کے قائل ہیں اور قرطبی نے کہا: "اختلاف کے موقع پر یہ دو ٹوک ہے لہٰذا دوسری طرف توجہ نہ کرنا چاہئے اور نووی نے کہا یہی صحیح بلکہ خوب ہے۔ مصنف نے کہا کہ یہ سارا وقت ہی وہ گھڑی نہیں بلکہ اسی دوران ہوتی ہے کیونکہ حدیث میں یقللھا اور خفیفہ کے الفاظ ہیں اور وقت کے ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ وہ گھڑی ابتدائے خطبہ سے لے کر انتہائے نماز تک منتقل ہوتی رہتی ہے اور مختلف اوقات میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آتی ہے اور اس بات کا کہ دار قطنی نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ ابوبردہ کا قول ہے یہ جواب دیا گیا ہے کہ مرفوع حدیث کے بارے میں یہ بات ممکن نہیں کیونکہ عبادات کے اوقات کی تعین میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور وہ روایت بھی عنقریب آرہی ہے جسے دار قطنی نے معلول کہا ہے۔

۴۳۲-۴۳۳۔وفي حديث عبد الله بن سلام عند ابن ماجه، وجابر عند أبي داود والنسائي: أنها ما بين صلاة العصر إلى غروب الشمس.

وقد اختلف فيها على أكثر من أربعين قولاً أمليتها في شرح البخاري.

اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن سلام(۱) کی حدیث میں اور ابوداؤد اور نسائی میں جابر کی حدیث میں ہے کہ وہ(۲) وقت نماز عصر سے لے کر سورج غروب ہونے تک ہے۔ اس وقت میں اتنا اختلاف کیا گیا کہ اس بارے میں چالیس سے زائد اقوال ملتے ہیں جنہیں میں نے بخاری کی شرح میں لکھ دیا(۳) ہے۔

(۱) آپ ابو یوسف بن سلام اسرائیلی قبیلہ بنو قینقاع سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوسف بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے علمائے یہود میں سے تھے۔ اور جن جن آدمیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خوشخبری دی ان میں سے ایک ہیں آپ سے آپ کے دو بیٹوں یوسف اور محمد نے' نیز انس بن مالک وغیرہم نے روایت کی ہے۔ مدینہ میں ۴۳ھ میں فوت ہوئے۔ اور سلام کا لفظ لام کی تخفیف سے ہے۔ مبرد نے کہا کہ عرب میں ان کے بغیر کوئی سلام (تخفیف سے) نہیں ہوا۔

اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن سلام سے روایت ہے کہ: میں نے کہا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم اللہ کی کتاب یعنی تورات میں پاتے ہیں کہ جمعہ کے دن ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ مومن بندہ نماز کے دوران اللہ عزو جل سے جو بھی سوال کرتا ہے اللہ اس کی حاجت پوری کر دیتا ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے کہا یہ ساعت کا کچھ حصہ۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے سچ فرمایا' یا ساعت کا کچھ حصہ' پھر میں نے پوچھا' وہ ساعت کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ دن کی گھڑیوں میں سے آخری گھڑی ہے میں نے کہا۔ وہ تو نماز کی گھڑی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا' مومن بندہ جب نماز پڑھنے کے بعد بیٹھتا ہے تو اس کا بیٹھنا بھی نماز ہی ہے۔ گویا وہ نماز میں ہے۔

(۲) اصل میں لفظ انھا آیا ہے جو مبتدا ہے اور اس کی خبر پہلے عبداللہ بن سلام کی حدیث گزر چکی ہے اور احمد بن حنبل نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ قول ترمذی نے اس سے روایت کیا ہے۔ احمد نے کہا اکثر احادیث ایسی ہی ہیں اور ابن عبدالبر نے کہا۔ اس باب میں یہی بات زیادہ ثابت ہے۔ سعید بن منصور نے صحیح سند سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا۔ کچھ صحابہ نے جمع ہو کر جمعہ کی ساعت کے متعلق مذاکرہ کیا پھر جدا ہوئے تو ان میں اس بات میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ وہ جمعہ کے دن کی آخری ساعت ہے۔ اسحاق وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے اور شافعی کا بھی یہی فیصلہ بیان کیا گیا ہے یہاں یہ اشکال پیش آتا ہے یہ ترجیح تو صحیح میں مذکور بات سے الگ بات پر ہے اور علوم حدیث وغیرہ میں یہ بات معروف ہے کہ جو کچھ صحیحین میں یا ان دونوں میں سے کسی ایک میں مذکور ہے وہ دوسری روایات پر مقدم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحیحین میں یا ان میں سے کسی میں مذکور حدیث اس وقت معتبر ہوتی ہے جبکہ حفاظ حدیث نے اس پر تنقید نہ کی ہو جیسے ابو موسیٰ کی حدیث جو مسلم میں ہے جسے انقطاع اور اضطراب کی بنا پر معلول قرار دیا ہے یہ منقطع اس لئے ہے کہ یہ مخرمہ بن بکیر کی روایت سے ہے اور اس نے تصریح کی ہے کہ اس نے اپنے باپ سے ساعت نہیں کی للذا یہ مسلم کی شرط پر نہیں اور مضطرب اس لئے ہے کہ کوفیوں نے اسے ابوبردہ سے غیر مرفوع روایت کیا ہے۔ اور ابوبردہ کوفی اور اس کے علاقہ کے لوگ اس حدیث کو بکیر سے زیادہ جانتے تھے اگر یہ حدیث ابوبردہ کے نزدیک مرفوع ہوتی تو وہ اسے موقوف نہ کہتے۔ اسی لئے دار قطنی نے یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اس کا موقوف ہونا ہی درست ہے۔ اور ابن قیم نے ابوموسیٰ کی اور عبداللہ بن سلام کی حدیث میں تطبیق یوں دی ہے کہ وہ ساعت ان دونوں وقتوں میں سے کسی ایک میں منحصر ہے اور اس سے پہلے احمد بن حنبل نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔

(۳) اس طرف اشارہ پہلے گزر چکا ہے خطابی کہتے ہیں۔ اس میں اقوال پر اختلاف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ساعت اٹھا لی گئی ہے اور یہ بات بعض صحابہ سے منقول ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ باقی ہے اور اس کی تعین میں اختلاف ہے پھر سب اقوال ذکر کئے تو وہ اس تعداد کو نہیں پہنچے جو مصنف نے بتلائی ہے یہاں مصنف نے صرف دو اقوال پر انحصار کیا ہے۔ گویا دلیل کے لحاظ سے یہی دو اقوال اس کے نزدیک زیادہ راجح ہیں اور اس حدیث میں اسی ساعت کے اختصاص سے جمعہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

۴۳۴- وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: مضت السنة أن في كل أربعين فصاعداً جمعة. رواه الدارقطني بإسناد ضعيف.

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ سنت چلی آتی ہے کہ جہاں چالیس یا اس سے زیادہ آدمی ہوں وہاں جمعہ پڑھا جائے۔ اسے دار قطنی نے ضعیف(۱) سند سے روایت کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ا) اس لئے کہ یہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کی روایت ہے اور عبدالعزیز کے متعلق احمد نے کہا۔ اس کی حدیثوں کو جھوٹ سے متہم کیا گیا ہے یا وہ موضوع ہیں نسائی کہتے ہیں وہ ثقہ نہیں۔ دار قطنی کہتے ہیں منکر الحدیث ہے اور ابن حبان نے کہا۔ اس سے احتجاج جائز نہیں۔ اور اس سلسلہ میں جتنی بھی حدیثیں ہیں ان کی کوئی اصل نہیں۔ عبدالحق کہتے ہیں حدیث میں تعداد ثابت نہیں اور اس بات میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ کتنے لوگ ہوں تو جمعہ پڑھا جائے؟ عمر بن عبدالعزیز اور شافعی کا مذہب یہ ہے کہ جمعہ چالیس آدمیوں پر واجب ہے کم پر نہیں اور ان میں سے ایک کے امام ہونے میں شافعیہ کے نزدیک دو وجوہ ہیں اور ابو حنیفہ' موید اور ابو طالب کا مذہب یہ ہے کہ امام سمیت تین آدمی ہوں تو منعقد ہو جاتا ہے اس سے کم پر نہیں۔ اتنی تعداد بھی پوری نہ ہو تو جمعہ واجب نہیں ہوتا وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ فاسعوا الی ذکر الله وہ کہتے ہیں کہ جمعہ کی اذان کے بعد یہ خطاب جماعت کے لئے ہے اور وہ کم از کم تین ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک اذان کہنے والا ہے گویا امام سمیت تین آدمی ہوں اس سے زیادہ تعداد کی شرط لگانے پر کوئی دلیل نہیں اس پر اعتراض یہ کیا گیا کہ جماعت کے خطاب سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اکٹھے مل کر وہ کام کریں اور بحر میں اس کی تصریح موجود ہے ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے۔ واقیموا الصلوة واتوا الزکوة - وجاهدوا۔ اس لئے یہ لازم نہیں کہ زکوۃ جماعت کی صورت میں ادا کی جائے۔

میں کہتا ہوں حق بات یہ ہے کہ کوئی بھی عبادت ہو اس میں کسی چیز کی شرط لگانا دلیل سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہاں تعداد کی مقدار پر کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں بس اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ جمعہ کی نماز جماعت کی صورت میں ہے۔ جیسا کہ ابن ماجہ اور ابن عدی میں ابو موسیٰ کی حدیث آئی ہے اور احمد اور طبرانی میں ابو امامہ کی حدیث اور حدیث میں کم از کم دو پر بھی جماعت کا لفظ آیا ہے جیسے "الاثنان جماعۃ" جس سے واضح ہے کہ دو بھی جماعت ہے اور شارح نے جمعہ کی نماز کے لئے معتبر تعداد کی مقدار پر اختلافات اور اقوال کا شمار کیا تو وہ چودہ تک پہنچ گئے۔ اور یہ بھی ذکر کیا کہ ہر قائل نے اپنا دعویٰ کس دلیل سے ثابت کیا ہے اور وہ دعوے ایسے ہیں جو شرط ہونے پر حجت قائم نہیں کرتے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ آپ کثیر مجمع کو نماز پڑھاتے تھے جس کا انحصار تعداد پر نہیں ہوتا تھا جو اس بات پر دلیل ہے کہ جماعت وہی ہے جسے جماعت سمجھا جائے اور یہ لوگ کثرت میں ہوں جس سے منافق کو غصہ اور طیش آئے' منکر چال چلے اور تصدیق کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والا خوش ہو اور آیۃ جمعہ بھی جماعت کو حکم دینے پر دلالت کرتی ہے پھر اگر تعداد اتنی کم ہو جس پر یہ آیت دلالت نہ کرے تو جمعہ منعقد نہ ہو گا۔

میں کہتا ہوں ہم نے جمعہ کی شرائط کے بارے میں ایک رسالہ لکھا ہے جو علماء نے بیان کی ہیں پھر ان کے استدلال اور بحث کو تفصیل سے ذکر کیا اور اس کو اللمعه فی تحقیق شرائط الجمعه کا نام دیا ہے۔

۴۳۵- وعن سمرة بن جندب رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ كان يستغفر للمؤمنين والمؤمنات في كل جمعة. رواه البزار بإسناد لين.

سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ کو مومن مردوں اور مؤمن عورتوں کے لئے دعائے مغفرت کیا کرتے تھے۔ اسے بزار نے کمزور سند سے روایت کیا(۱)۔

(۱) میں کہتا ہوں کہ بزار نے یہ کہا ہے کہ ہم اس روایت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سند کے علاوہ اور کسی سند میں نہیں جانتے اور بزار کی سند میں یوسف بن خالد البستی ہے جو ضعیف ہے اور اسے طبرانی نے بھی کبیر میں والمسلمین والمسلمات کے اضافہ سے روایت کیا ہے اور اس حدیث میں خطیب کے لئے دعا کرنے کی مشروعیت پر دلیل ہے کیونکہ یہ دعاء کا موقع ہوتا ہے۔ ابوطالب اور امام یحیٰ کا مذہب یہ ہے کہ خطیب کو اپنے اور مومنوں کے لئے دعا کرنا واجب ہے' گویا وہ اس بات کے قائل ہیں کہ کسی کام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت (ہمیشگی) اس کے وجوب پر دلیل ہے جیسا کہ کان یستغفر سے معلوم ہوتا ہے اور دوسرے کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے کیونکہ اس کے وجوب پر کوئی دلیل نہیں۔ شارح کہتے ہیں کہ پہلا قول ہی زیادہ واضح ہے۔

۴۳۶- وعن جابر بن سمرة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ كان في الخطبة يقرأ آيات من القرآن، يذكر الناس. رواه أبو داود، وأصله في مسلم.

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے خطبہ میں قرآن کی آیات پڑھ کر لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی اصل مسلم میں موجود ہے(۱)۔

(۱) اس سے مراد وہی ہے جو پہلے ام ہشام بنت حارثہ کی حدیث میں گزر چکی ہے ام ہشام نے کہا: میں نے ق والقرآن المجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حفظ کی ہے۔ آپ اسے ہر جمعہ کو برسر منبر پڑھا کرتے تھے۔ اور طبرانی نے اوسط میں علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر قل یاایھاالکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھا کرتے تھے' اور اس کی سند میں ایک آدمی مجہول اور باقی ثقہ ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور طبرانی نے اوسط میں ہی جابر کی حدیث سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تو اپنے خطبہ میں سورہ زمر کا آخری حصہ پڑھا تو دو مرتبہ منبر ہل گیا اور اس کی سند میں دو ضعیف راوی ہیں۔

۴۳۷- وعن طارق بن شهاب رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «**الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة، إلا على أربعة: مملوك، وامرأة، وصبي، ومريض**». رواه أبو داود، وقال: لم يسمع طارق من النبي ﷺ، وأخرجه الحاكم من رواية طارق المذكور عن أبي موسى.

طارق بن شہاب(۱) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کی جماعت میں شامل ہونا ہر مسلمان پر فرض ہے ماسوائے چار طرح کے لوگوں کے یعنی غلام اور عورت اور بچہ اور مریض' اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور کہا کہ طارق نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا(۲)- نیز حاکم نے بھی اس روایت کو طارق مذکور سے ابو موسیٰ کے واسطہ سے روایت کیا(۳)-

(۱) بن عبدشمس الاحمسی البجلی الکوفی' عمر جاہلیت میں گزاری' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا مگر سماع نہیں کیا حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی خلافت میں تینتیس یا چونتیس غزوات و سرایا میں شامل ہوئے- اور ۸۲ھ میں فوت ہوئے-

(۲) الا یہ کہ سنن ابی داؤد میں الفاظ یوں ہیں عبد مملوک اوامراہ او صبی او مریض یعنی واؤ کے بجائے اوَ کا لفظ آیا ہے اور مصنف نے تلخیص میں بھی ایسا ہی ذکر کیا ہے پھر ابو داؤد نے کہا کہ "طارق نے بیشک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے ہیں مگر آپ سے سنا کچھ نہیں"

(۳) مصنف کی مراد یہ ہے کہ یہ حدیث موصول ہے اور اس سلسلے میں تمیم داری' ابن عمر اور ابن زبیر کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کی بھی روایات ہیں جنہیں بیہقی نے روایت کیا ہے اور تمیم کی حدیث میں چار قسم کے کمزور لوگ اسی ترتیب سے مذکور ہیں ابن قطان نے اس کے بارے میں کہا کہ ابن عمر کی حدیث جسے طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ان الفاظ میں ہے "مسافر پر جمعہ نہیں" اور اوسط ہی میں ابوہریرہ کی مرفوع حدیث ہے کہ "پانچ قسم کے لوگ ہیں جن پر جمعہ فرض نہیں' عورت' مسافر' غلام' بچہ اور بدوی لوگ"

۴۳۸- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «**ليس على مسافر جمعة**». رواه الطبراني بإسناد ضعيف.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسافر پر جمعہ فرض نہیں" اسے طبرانی نے ضعیف سند سے روایت کیا(۱)-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصنف نے تلخیص میں اس روایت کے ضعیف ہونے کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اس کے ضعف کی وجہ بیان کی ہے ان احادیث کو جمع کرنے سے آپ کو معلوم ہو چکا کہ چھ قسم کے لوگ ہیں جن پر جمعہ فرض نہیں۔ بچے کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس پر جمعہ فرض نہیں اور غلام پر بھی ابوداؤد کے سوا سب کا اتفاق ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی آیت یایھاالذین امنوا اذا نودی للصلوۃ میں عموم ہے اور اس عموم میں غلام بھی داخل ہے لہٰذا اس پر جمعہ واجب ہے کیونکہ علم الاصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ غلام بھی خطاب میں داخل ہے اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ احادیث میں ان کی تخصیص ہے اور اگرچہ ان احادیث میں گفتگو ہوئی ہے تاہم وہ ایک دوسری کو مضبوط بناتی ہیں اور عورت پر بھی عدم وجوب جمعہ مجمع علیہ ہے اور شافعی کہتے ہیں کہ بوڑھی عورتوں کو اپنے خاوند کے اذن سے جمعہ میں حاضر ہونا مستحب ہے اور بحر میں جو شافعی سے روایت ہے کہ عورتوں پر جمعہ واجب ہے اس کے خلاف ہے جو شافعیہ کی کتب میں صریح طور پر لکھا ہے۔ اور اگر مریض کو تکلیف کا خطرہ ہو تو اس پر حاضر ہونا واجب نہیں نہ ہی مسافر پر واجب ہے اور اس میں یہ احتمال ہے کہ دوران سفر اس پر واجب نہ ہو اور کہیں فروکش ہو تو پھر واجب ہے خواہ نماز کی مقدار ہی ہو آل کی ایک جماعت وغیرہم کا یہی مذہب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ فروکش ہونے پر بھی واجب نہیں کیونکہ اس وقت بھی وہ مسافر ہی ہوتا ہے۔ آل ہی کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے اور یہی اقرب ہے کیونکہ سفر کے احکام مثلاً قصرو فطراس کے لئے باقی رہتے ہیں۔ اسی لئے مصنف نے یہ نقل نہیں کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے دوران عرفات میں جمع کی نماز ادا کی حالانکہ آپ مسافر تھے' اسی طرح عید کی نماز بھی مسافر سے ساقط ہو جاتی ہے اور اسی لئے اس نے یہ روایت نہیں کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسی حج میں عید کی نماز ادا کی۔ ابن حزم کو وہم ہوا تو اس نے کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں نماز پڑھی اور علماء نے اسے غلط سمجھا۔ چھٹی قسم بدوی لوگ ہیں نہایہ میں ہے کہ اہل بادیہ سے مراد خانہ بدوش لوگ مراد ہیں شہری اور دیہاتی لوگ نہیں اور شرح عمدہ میں ہے کہ اہل القریٰ (دیہاتی لوگوں) کا حکم ہی اہل بادیہ کا حکم ہے جسے اس نے اس حدیث "کوئی شہری بدوی سے خریدوفروخت نہ کرے" کی شرح میں ذکر کیا ہے۔

۴۳۹- وعن عبد الله بن مسعود رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا استوى على المنبر، استقبلناه بوجوهنا. رواه الترمذي بإسناد ضعيف. وله شاهد من حديث البراء عند ابن خزيمة.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہو جاتے تو ہم آپ کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے۔ اسے ترمذی نے ضعیف اسناد(۱) سے روایت کیا۔ اور ابن خزیمہ میں براء کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیث سے اس کا ایک شاہد بھی(۲) ہے۔

(۱) کیونکہ اس میں محمد بن الفضل بن عطیہ ہے جو ضعیف ہے یہ روایت اسی کے واسطہ سے مروی ہے۔ اور دار قطنی اور ابن عدی وغیرہما نے اسے ضعیف کہا ہے۔

(۲) جس کا شارح نے ذکر نہیں کیا نہ ہی میں نے اسے تلخیص میں دیکھا ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ لوگوں کا خطیب کی طرف منہ کر کے بیٹھنا ایسا کام ہے جو شروع سے چلا آرہا ہے اور یہ چیز مجمع علیہ کے حکم میں ہے شافعیہ میں سے ابوالطیب تختی سے اس کے وجوب کے قائل ہیں اور ہادویہ کے نزدیک ان سننے والوں کے بارے میں جو امام کے پاس ہوتے ہیں اور وہ امام کی طرف منہ نہیں کر سکتے ہیں دو احتمال ہیں کہ آیا یہ درست ہے یا نا درست؟ اور صاحب 'الاثمار' نے یہ دو ٹوک بات کہی ہے کہ کم از کم اتنے لوگوں کے لئے امام کی طرف دیکھنا واجب ہے جن سے جمعہ منعقد ہو سکتا ہے دوسرے لوگوں کے لئے نہیں۔

۴۴۰ - وعن الحكم بن حزن رضي الله تعالى عنه قال: شهدنا الجمعة مع النبي ﷺ، فقام متوكئاً على عصا أو قوس. رواه أبو داود.

حکم(۱) بن حزن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ پڑھتے' آپ کھڑے ہوتے تو عصا یا کمان پر ٹیک لگا لیتے(۲)۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا۔

(۱) ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ حکم فتح مکہ کے سال اسلام لائے اور بعض کہتے ہیں جنگ یمامہ کے دن اسلام لائے تھے اور آپ کے باپ حزن بن ابی وہب مخزومی ہیں۔

(۲) سنن ابی داؤد میں اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلکے پھلکے اور پاکیزہ کلمات سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر فرمایا: "لوگو! تم میں نہ یہ طاقت ہے اور نہ تم ایسا کر سکتے ہو کہ جو کچھ بھی تمہیں حکم دیا جائے اسے بجا لا سکو۔ لہٰذا درمیانہ روش اختیار کرو اور آسانی کی راہ پر چلو۔ اور ایک روایت میں "اور لوگوں کو خوشخبری سناؤ" کے الفاظ بھی ہیں اور اس کی سند حسن ہے جسے ابن السکن نے صحیح کہا ہے' اور ابوداؤد میں براء کی حدیث سے اس کا ایک شاہد بھی ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو اپنی برچھی پر ٹیک لگا لیتے اور برچھی نصف نیزہ کے برابر یا اس سے بڑھی ہوتی اور اس میں بھی نیزے کے پھل کی طرح پھل ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ خطیب کے لئے خطبہ دیتے وقت اپنی تلوار(1) یا کسی ایسی ہی چیز پر ٹیک لگا دینا مستحب ہے' اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اس طرح دل مضبوط رہتا ہے اور ہاتھ عبث حرکت سے بچا رہتا ہے اور اسے ٹیک لگانے کو کوئی چیز نہ ملے تو اپنے ہاتھ کھلے چھوڑ دے یا اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھ لے یا منبر کے کسی جانب رکھ لے اور تلوار سے منبر کو نہ مارے کیونکہ ایسا اثر نہیں ملتا۔ للذا یہ بدعت ہے۔

www.KitaboSunnat.com

1۔ یہ استدلال محل نظر ہے صاحب الھدی نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات محفوظ نہیں ہے کہ آپ منبر پر چڑھنے کے بعد تلوار یا کمان یا کسی اور چیز پر بوجھ ڈالتے اور اس کا سہارا لیتے تھے اور اگر یہ سنت ہوتی تو اسے چھوڑ نہ دیا جاتا' جیسا کہ آپ سے یہ بات بھی محفوظ نہیں کہ آپ منبر پر چڑھنے سے پہلے تلوار پکڑ لیتے تھے۔ البتہ آپ کمان یا عصا پر ٹیک ضرور لگاتے تھے اور جاہلوں کا جو یہ خیال ہے کہ آپ تلوار پر ٹیک لگاتے تھے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے قائم ہوا۔ ان لوگوں کی جہالت کی کوئی حد ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نماز خوف کا بیان

۴۴۱- عن صالح بن خوات ، عمن صلّى مع النبي ﷺ يوم ذات الرقاع صلاة الخوف: أن طائفة صفت معه، وطائفة وجاه العدو، فصلى بالذين معه ركعة، ثم ثبت قائماً، وأتموا لأنفسهم، ثم انصرفوا، فصفوا وجاه العدو، وجاءت الطائفة الأخرى، فصلى بهم الركعة التي بقيت، ثم ثبت جالساً، وأتموا لأنفسهم، ثم سلم بهم. متفق عليه، وهذا لفظ مسلم. ووقع في المعرفة لابن مندة: عن صالح بن خوات، عن أبيه.

صالح بن خوات(۱) رضی اللہ عنہ اس آدمی(۲) سے روایت کرتے ہیں جس نے ذات الرقاع(۳) کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز خوف پڑھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے آپ کے ساتھ صف بنائی اور ایک جماعت دشمن کے مقابلہ پر رہی۔ آپ نے ان لوگوں کو ایک رکعت پڑھائی پھر آپ تو وہیں کھڑے رہے اور ان لوگوں نے اپنے اپنے طور پر دوسری رکعت پوری کر لی پھر واپس جا کر دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ اب دوسری جماعت ائی تو آپ نے ان کو ایک رکعت پڑھائی جو باقی رہتی تھی پھر آپ بیٹھے رہے اور انہوں نے اپنے طور پر دوسری رکعت پوری کی۔ پھر آپ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ متفق علیہ اور یہ لفظ مسلم کے ہیں اور ابن (۴) مندہ کی "المعرفت" میں یہ روایت صالح بن خوات عن ابیہ (۵) سے مروی ہے۔

(۱) انصاری مدنی مشہور تابعی ہیں صحابہ کی ایک جماعت سے سماع کیا۔

(۲) اور صحیح مسلم میں عن صالح بن خوات بن جبیر عن سھل بن ابی حشمہ ہے گویا مسلم نے یہ تصریح کر دی کہ کس نے یہ حدیث بیان کی تھی اور ایک روایت میں اس نے ابہام رہنے دیا جیسا کہ یہاں ہے۔

(۳) یہ غطفان کے علاقہ میں نجد میں ایک جگہ ہے۔ مجاہدین نے اس کا یہ نام اس لئے رکھا کہ ان کے پاؤں چھلنی ہو گئے تو انہوں نے پاؤں پر چیتھڑے لپیٹ لئے جیسا کہ بخاری میں ابو موسیٰ کی حدیث میں ہے اور یہ غزوہ جمادی الثانی ۴ھ میں پیش آیا۔

(۴) حدیث کے بہت بڑے امام ہیں۔

(۵) یعنی خوات جو صحابی ہیں مبہم کا ذکر کرایا کہ وہ اس کا باپ ہے اور مسلم میں وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ یہ غزوہ ۴ھ میں ہوا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور یہی وہ بات ہے جو اہل سیر و مغازی میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ابن اسحاق وغیرہ اور ان سے ملنے والوں نے کہی ہے ابن قیم کہتے ہیں کہ اس میں سخت اشکال ہے کیونکہ یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ غزوہ خندق میں ایک دن مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نماز سے روک دیا تھا تو آپ نے یہ سب نمازیں اکٹھی پڑھیں اور یہ نماز خوف کے حکم کے نزول سے پہلے کی بات ہے اور غزوہ خندق' ذات الرقاع کے بعد ۵ھ میں ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار نماز خوف عسفان میں پڑھی اور اس بات میں بھی کسی کو اختلاف نہیں کہ عسفان' خندق کے بعد ہوئی تھی اور یہ بات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ذات الرقاع کے موقعہ پر نماز خوف پڑھی تو معلوم ہوا کہ ذات الرقاع' خندق اور عسفان کے بعد واقع ہوئی تھی۔ ہمارے لئے تو یہ بات واضح ہے اور وہ لوگ اہل سیر ہیں۔

اور جو لوگ اہل سیر کی روایت کے مطابق جنگ خندق سے پہلے نماز خوف کے مشروع ہونے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے موقع پر نماز خوف اس لئے نہیں پڑھی تھی کہ آپ حضر (مدینہ ہی) میں تھے آپ کی نماز کی کیفیت کا بیان جو حدیث میں مذکور ہے واضح ہے صحابہ کی اور ان کے بعد آل کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے اور شافعی نے یہ شرط لگائی کہ نماز خوف اس صورت میں پڑھی جائے گی جب دشمن قبلہ کے علاوہ کسی دوسری سمت میں ہو نیز یہ کیفیت دو دو رکعت والی نمازوں کی ہے اور اگر تین رکعت والی ہو تو امام پہلے تشہد میں انتظار کرے اور جماعت تیسری رکعت پوری کرے اور اسی طرح چار رکعت والی میں' اگر ہم اس بات کے قائل ہوں کہ آپ نے حضر میں نماز خوف ہی پڑھی تھی' تو بھی امام تشہد میں انتظار کرے۔ اور قرآن کا ظاہر بھی اس کے مطابق ہے جس پر یہ حدیث جلیلہ ولالت کرتی ہے ارشاد باری ہے۔

ولتاءت طائفه اخری لم یصلوا فلیصلوا معک پھر دوسری جماعت آئے جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھے۔

یہی وہ کیفیت ہے جو حسب معمول نماز میں ہے افعال کی کمی اور امام کی متابعت کے لحاظ سے اقرب ہے۔

۴۴۲۔ وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنه قال: غزوت مع رسول الله ﷺ قبل نجد فوازينا العدو، فصاففناهم، فقام رسول الله ﷺ، فصلى بنا، فقامت طائفة معه، وأقبلت طائفة على العدو، وركع بمن معه، وسجد سجدتين، ثم انصرفوا مكان الطائفة التي لم تصل، فجاؤوا، فركع بهم ركعة، وسجد سجدتين، ثم سلم فقام كل واحد منهم، فركع لنفسه ركعة وسجد سجدتين. متفق عليه، واللفظ للبخاري.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (۱) نجد کی طرف ایک غزوہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں شریک ہوا۔ ہم دشمن کے مقابلہ پر آئے اور ان کے سامنے صفیں باندھ لیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور ہمیں نماز پڑھائی(۲)۔ ایک جماعت تو آپ کے سامنے کھڑی ہوئی اور ایک دشمن کے مقابلہ پر رہی اور جو جماعت آپ کے ساتھ تھی انہوں نے آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھی اور دو سجدے کئے پھر وہ ان لوگوں کی جگہ پر (۳) چلے گئے جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی تھی وہ آئے تو انہیں بھی آپ نے ایک رکعت پڑھائی اور دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر ایک رکعت اور دو سجدے ادا کر لئے۔ متفق علیہ اور یہ لفظ بخاری کے ہیں(۴)۔

(۱) بلاد عرب میں جو علاقہ بھی اونچا ہو اسے نجد کہہ دیتے ہیں۔

(۲) بخاری کی کتاب المغازی میں ہے کہ وہ عصر کی نماز تھی نیز بخاری میں صلی بنا کے بجائے صلی لنا ہے مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ اس کا معنی "ہمارے لئے" ہے اور اس روایت کا ذکر نہیں کیا جس میں صلی بنا ہے نیز اس میں صلی کی بجائے یصلی فعل مضارع سے ہے۔

(۳) یعنی ابھی دوسری رکعت نہیں پڑھی اور نہ اپنی نماز سے سلام پھیرا تھا۔

(۴) مصنف کہتے ہیں کہ ابن عمر کی اس روایت میں طریقے مختلف نہیں ہوتے۔ ممکن ہے انہوں نے ایک ہی حالت میں نماز پوری کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں کی ہو اور معنی کے لحاظ سے یہی راجح ہے ورنہ مطلوبہ دشمن کی نگہبانی کا ضیاع اور امام کو اکیلے چھوڑ دینا لازم آتا ہے اور اس بات کو وہ روایت بھی ترجیح دیتی ہے جسے ابو داؤد نے ابن مسعود کی حدیث سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے "پھر آپ نے سلام پھیرا تو وہ لوگ کھڑے ہو گئے" یعنی دوسری جماعت تو انہوں نے اپنے طور پر ایک رکعت پڑھ لی۔ پھر سلام پھیر کر چلے گئے اور وہ لوگ اپنے مقام کی طرف لوٹ آئے اور اپنے طور پر ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیرا۔

اور لفظ طائفہ کا اطلاق تھوڑی تعداد پر بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ پر بھی۔ حتیٰ کہ ایک پر بھی ہو سکتا ہے یعنی اگر صرف تین ہوں تو امام کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک کے ساتھ نماز پڑھے اور تیسرا نگہبانی کرے پھر امام کے ساتھ نماز پڑھے اور یہ کم سے کم تعداد ہے جس سے نماز خوف کی جماعت ادا ہو سکتی ہے۔ اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ دوسری جماعت اپنی دونوں رکعتوں کو الگ الگ ادا کرے۔ پھر اس کے بعد پہلی جماعت آئے۔ ابو حنیفہ اور محمد اسی کیفیت کی طرف گئے ہیں۔

۴۴۳۔ وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: شهدت مع رسول الله ﷺ صلاة الخوف، فصففنا صفين، صف خلف رسول الله ﷺ، والعدو بيننا وبين القبلة، فكبّر النبي ﷺ، وكبرنا جميعاً، ثم ركع، وركعنا جميعاً، ثم رفع رأسه من الركوع، ورفعنا جميعاً، ثم انحدر بالسجود، والصف الذي يليه، وقام الصف المؤخر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

في نحر العدو، فلما قضى السجود وقام الصف الذي يليه، فذكر الحديث.

وفي رواية: ثم سجد، وسجد معه الصف الأول، فلما قاموا سجد الصف الثاني، ثم تأخر الصف الأول، وتقدم الصف الثاني، وذكر مثله، وفي آخره: ثم سلم النبي ﷺ، وسلمنا جميعاً. رواه مسلم.

۴۴۴- ولأبي داود عن أبي عياش الزرقي[1] مثله، وزاد:

۴۴۵- وللنسائي من وجه آخر عن جابر، أن النبي ﷺ صلى بطائفة من أصحابه ركعتين، ثم سلم، ثم صلى بآخرين أيضاً ركعتين، ثم سلم.

۴۴۶- ومثله لأبي داود عن أبي بكرة.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دو صفیں بنائیں اور دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر (تحریمہ) کہی اور ہم سب نے بھی تکبیر کہی۔ پھر آپ نے رکوع کیا تو ہم سب نے رکوع کیا پھر آپ نے رکوع سے اپنا سر اٹھایا تو ہم سب نے بھی اٹھایا پھر آپ سجدہ کے لئے جھکے تو اگلی صف تو آپ کے ساتھ سجدہ میں چلی گئی مگر پچھلی صف دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہی پھر جب سجدہ پورا ہو گیا تو اگلی صف کھڑی ہوئی۔ پھر جابر نے آخر تک حدیث بیان کی(۱)۔

اور ایک روایت میں ہے(۲) پھر آپ نے سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ پہلی صف نے سجدہ کیا جب وہ کھڑے ہو گئے تو دوسری صف نے سجدہ کیا پھر پہلی صف تو پیچھے ہٹ گئی اور دوسری آگے بڑھ گئی۔ باقی حدیث(۳) اسی طرح ہے اور اس کے آخر میں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو ہم سب نے بھی سلام پھیرا۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۴)۔ اور ابوداؤد نے ابوعیاش زرقی سے اسی(۵) طرح روایت کیا اور اتنا(۶) زیادہ کیا کہ یہ جنگ عسفان(۷) میں ہوئی تھی۔ اور نسائی میں ایک دوسری(۸) طرح جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی ایک جماعت کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر دیا۔ پھر دوسروں کو بھی دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیرا۔ (۹) اور ابوداؤد(۱۰) میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

(۱) اس کا باقی حصہ یوں ہے "اور پچھلی صف سجدہ میں چلی گئی اور کھڑے ہوئے۔ پھر پچھلی صف آگے اور اگلی پیچھے ہو گئی پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا تو ہم سب نے ان کے ساتھ رکوع کیا پھر آپ نے رکوع سے سر اٹھایا تو ہم سب نے بھی اٹھایا۔ پھر آپ سجدہ میں گئے تو اگلی صف بھی چلی گئی جو پہلی رکعت میں پچھلی صف تھی اور پچھلی صف دشمن کے مقابلہ پر کھڑی رہی پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اگلی صف نے سجدہ کر لیا تو پچھلی صف سجدہ کے لئے جھکی اور سجدہ کیا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا اور ہم سب نے سلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھیرا- جابر کہتے ہیں کہ "جیسے تمہارے یہ چوکیدار اپنے امراء کی نگہبانی کرتے ہیں-"

(۲) یہ روایت بھی مسلم میں جابرؓ ہی سے ہے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے لڑائی کی تھی حدیث کے الفاظ یہ ہیں "ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جھینہ کے لوگوں سے جہاد کیا- ان لوگوں نے ہم سے زبردست لڑائی کی پھر جب ہم ظہر کی نماز پڑھنے لگے تو مشرک آپس میں کہنے لگے کہ کیوں نہ ہم ان پر یکبارگی پل پڑیں اور ان کا صفایا کریں تو جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ذکر کیا- جابر کہتے ہیں کہ مشرک کہنے لگے ابھی ایک اور نماز کا وقت آرہا ہے جو مسلمانوں کو پہلی نماز (ظہر) سے زیادہ محبوب ہے' پھر جب عصر کا وقت آگیا تو ......

(۳) جابر کہتے ہیں پھر وہ پہلے مقام پر کھڑے ہو گئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی اور ہم نے بھی کہی اور رکوع کیا اور ہم نے بھی کیا پھر سجدہ کیا تو صرف پہلی صف نے آپ کے ساتھ سجدہ کیا اور دوسری کھڑی رہی پھر جب دوسری صف نے سجدہ کیا تو سب بیٹھ گئے-

(۴) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ یہ صورت صرف اس وقت ہو گی جب دشمن قبلہ کی سمت میں ہو اور جب کوئی دوسری سمت ہو تو نماز کی صورت مختلف ہو گی کیونکہ دشمن کے حملہ کی نگہبانی اکھٹے نماز پڑھنے سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ اس لئے کہ نگہبانی کی ضرورت صرف سجدہ کے وقت ہوتی ہے لہٰذا مقتدی قیام اور رکوع میں تو امام کی پیروی کرتے ہیں اور دونوں سجدوں کی حالت میں پچھلی صف نگہبانی کرتی اور امام کی پیروی ترک کرتی ہے- پھر وہ پہلی صف کے کھڑا ہونے پر سجدہ کر لیتے ہیں- اور پچھلی صف پہلی کے مقام پر اور پہلی پیچھے چلی جاتی ہے تاکہ آخری دو سجدوں میں وہ امام کی متابعت کر سکیں اور ہر جماعت یا صف میں سجدوں میں اس طرح امام کی پیروی درست ہے نیز یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ نگہبانی کی ضرورت سجدہ کی حالت میں ہوتی ہے رکوع کی حالت میں نہیں ہوتی کیونکہ رکوع میں دشمن کی نقل و حرکت کا پتہ چل سکتا ہے اور نماز خوف کی یہ کیفیت بظاہر آیت سے اور صالح بن خوات والی پہلی روایت سے اور ابن عمر کی روایت سے موافقت نہیں رکھتی الایہ کہ یہ کہلا دیا جاتا ہے کہ حالات کے اختلاف کی بنا پر نماز کی صفات بھی مختلف ہو جاتی ہیں-

(۵) یعنی جابر کی اس روایت کی طرح

(۶) نماز کے مقام کی تعین کر دی-

(۷) مکہ سے دو منزل پر ایک گاؤں ہے- (قاموس)

(۸) یعنی اس وجہ کے علاوہ جو مسلم نے روایت کی ہے-

(۹) گویا ایک جماعت کے ساتھ فرض پڑھے اور دوسری کے ساتھ نفل' حسن بصری نے بھی اسی کے مطابق عمل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا اور طحاوی نے اس بنا پر اس کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے کہ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی نماز درست نہیں۔ اور یہ کہ نسخ پر کوئی دلیل نہیں۔

(۱۰) اور ابوداؤد نے کہا کہ "اسی طرح مغرب کی نماز امام چھ رکعت پڑھے اور لوگ تین تین۔

۴۴۷- وعن حذيفة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ صلّى صلاة الخوف بهؤلاء ركعة، وهؤلاء ركعة، ولم يقضوا. رواه أحمد وأبو داودٌ والنسائي، وصححه ابن حبان،

۴۴۸- ومثله عند ابن خزيمة عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما.

اور حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت کو بھی نماز خوف ایک رکعت پڑھائی اور دوسری جماعت کو بھی ایک رکعت پڑھائی۔ پھر کسی نے اس کی قضا نہ دی۔ اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا۔ اور ابن خزیمہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے بھی ایسا نقل کیا ہے۔

اور یہی نماز اسی کیفیت سے حذیفہ نے طبرستان میں پڑھی۔ سعید بن عاص امیر تھے انہوں نے کہا "تم میں سے کس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز خوف پڑھی ہے؟ حذیفہ نے کہا "میں نے" چنانچہ حذیفہ نے انہیں یہ نماز پڑھائی' اور ابوداؤد نے ابن عمر اور زید بن ثابت سے روایت کیا زید نے کہا کہ لوگوں نے تو ایک ایک رکعت نماز پڑھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں' اور ابن عباس سے روایت کیا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی زبان پر فرض کی جو حضر میں چار رکعت ہے' سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت" اور عطاء طاؤس اور حسن وغیرہم نے اسی بات کو قبول کیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگر خوف بہت زیادہ ہو تو اشارہ سے ایک رکعت پڑھ لے اور اسحاق کہا کرتے کہ میدان کارزار کے وقت تجھے ایک رکعت ہی کافی ہے جو تو اشارہ سے پڑھ لے۔ اس پر قادر نہ ہو تو سجدہ ہی کافی ہے یہ بھی نہ ہو سکے تو تکبیر کہہ لے کیونکہ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے۔

۴۴۹- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «صلاة الخوف ركعة على أي وجه كان». رواه البزار بإسناد ضعيف.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز خوف صرف ایک رکعت ہے جس طرح بھی ادا ہو جائے اسے بزار نے ضعیف سند سے روایت کیا۔

اور نسائی نے روایت کیا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی قرد کے غزوہ میں اسی کیفیت سے نماز پڑھی" اور مصنف نے کہا کہ اسے ابن حبان وغیرہ نے صحیح کہا ہے البتہ شافعی کہتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں اور اس حدیث میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس بات پر دلیل ہے کہ نماز خوف امام اور مقتدی دونوں کے لئے ایک ہی رکعت ہے۔ ثوری اور ایک جماعت اسی بات کے قائل ہیں اور صحابہ میں سے ابوہریرہ اور ابو موسیٰ اسی بات کے قائل ہیں۔

جاننا چاہئے کہ مصنف نے اس کتاب میں نماز خوف کی پانچ کیفیات بیان کی ہیں اور سنن ابی داؤد میں آٹھ کیفیات مذکور ہیں جن میں سے پانچ تو یہی ہیں اور تین زائد ہیں اور مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ نماز خوف کے بارے میں بہت سی کیفیات مروی ہیں اور ابن عبدالبر نے اس کیفیت کو ترجیح دی ہے جو ابن عمر کی حدیث میں مذکور ہے۔ ایک تو اس کی سند قوی ہے دوسرے وہ اس اصول کے موافق ہے کہ امام سے پہلے مقتدی کی نماز پوری نہیں ہوتی اور ابن حزم کہتے ہیں کہ اس کی چودہ کیفتیں صحیح ہیں۔ اور ابن عربی نے کہا کہ اس بارے میں روایات بہت ہیں ان میں سولہ مختلف روایات زیادہ صحیح ہیں اور نووی نے بھی شرح مسلم میں ایسا ہی کہا ہے لیکن اس کی وضاحت نہیں کی۔ حافظ کہتے ہیں ہمارے استاد حافظ ابوالفضل نے شرح ترمذی میں اس کی وضاحت کی ہے اور ایک وجہ بڑھا دی تو یہ سترہ ہو گئیں لیکن ان میں اضافہ ممکن ہے اور الھدی النبوی میں کہا' یہ نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مرتبہ پڑھی ہے اور ابن عربی نے کہا کہ آپ نے چوبیں مرتبہ پڑھی ہے اور خطابی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ایام میں یہ نماز مختلف شکلوں میں پڑھی ہے۔ آپ یہ دیکھتے تھے کہ نماز کے لئے کون سا طریقہ زیادہ محتاط اور نگہبانی کے لحاظ سے اچھا ہے۔ اور ان کی صورتوں کے باوجود سب کا مقصود ایک ہی ہوتا تھا۔

۴۵۰- وعنه مرفوعاً: ليس في صلاة الخوف سهو. أخرجه الدارقطني بإسناد ضعيف.

اور انہی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعا" روایت ہے کہ خوف کی نماز میں سجدہ سہو نہیں ہے اسے دار قطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا۔

جاننا چاہئے کہ نماز خوف کے لئے چند شرائط لگائی گئی ہیں جن میں ایک سفر ہے جس کی ایک جماعت نے شرط لگائی ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا اذا ضربتم فی الارض ...... الایۃ - نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حضر میں یہ نماز نہیں پڑھی۔ لیکن زید بن علی' ناصر' حنفیہ اور شافعیہ اسی بات کے قائل ہیں کہ سفر شرط نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے واذا کنت فیھم اس لئے کہ یہ اللہ کے قول واذا ضربتم فی الارض کا معطوف ہے گویا یہ سفر کی شرط میں نہیں آتا اور غالبا" پہلی دو صورتوں کو علماء نے سفر سے مقید بنایا ہے یعنی جب آپ سفر کی حالت میں صحابہ کے درمیان موجود ہوں (اور کفار سے خطرہ ہو تو انہیں نماز خوف پڑھایئے) اور کتب تفسیر میں اس پر تفصیلی بحث موجود ہے اور ایک شرط یہ کہ وہ نماز کا آخری وقت ہو کیونکہ نماز خوف حالت امن کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نماز کا بدل ہے اور یہ اسی وقت کفایت کرتا ہے جب خطرہ موجود ہو اور اس کے قائلین نے اسے بنیاد بنایا ہے اور وہ ہادویہ ہیں اور دوسرے کہتے ہیں کہ اول وقت بھی درست ہے کیونکہ اوقات کے دلائل میں عموم ہے اور ایک شرط نماز کے وقت مسلح ہونا ہے اور یہ شرط داوٗد نے لگائی ہے۔ مسلح نہ ہو تو نماز خوف درست نہ ہو گی۔ یہ ایسی شرط ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور شافعی اور ناصر نے اسے لازمی قرار دیا ہے کیونکہ آیت میں اس کا حکم ہے پھر ان حضرات نے اسلحہ کی لمبی چوڑی تفصیل دی ہے اور ایک شرط یہ کہ وہ جنگ حرام نہ ہو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ جہاد فرض عین ہے یا کفایہ۔ اور ایک شرط یہ کہ دشمن نماز پڑھنے والے کی تلاش میں ہو' وہ خود دشمن کو تلاش نہ کر رہا ہو' کیونکہ اگر وہ خود طالب ہے تو پوری نماز ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہے یا وہ اس بات سے ڈرتا ہو کہ دشمن پلٹ کر اس پر حملہ نہ کرے اور یہ شرط ان فروع سے پوری ہوتی ہے جو نماز خوف کی مشروعیت کی مختلف حالتوں سے ماخوذ ہیں۔ بظاہر الفاظ یہ شرط نہیں بنتی۔

جاننا چاہیے کہ یہ نماز' نماز باجماعت کی عظمت شان پر بڑے بڑے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیدین کی نماز کا بیان

۴۵۱- عن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: «**الفطر يوم يفطر الناس، والأضحى يوم يضحي الناس**». رواه الترمذي.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عیدالفطر اس دن ہے جب لوگ روزے رکھنا چھوڑ دیں اور عیدالاضحیٰ اس دن ہے جب لوگ قربانی کرتے ہیں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا(۱)۔

(۱) ترمذی نے حدیث ذکر کرنے کے بعد کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور بعض اہل علم نے اس کی تفسیر یہ کی کہ روزہ چھوڑنے اور رکھنے سے مراد مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رکھنا یا چھوڑنا اور لوگوں کو بہت بڑی تعداد کا ساتھ دینا سمجھنا ہے۔ اور اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ عید کے ثبوت میں لوگوں کی موافقت کا اعتبار ہے اور جس کسی نے ذاتی رویت کی بنا پر عید کے دن کو جان لیا اس پر بھی دوسروں کی موافقت واجب ہے۔ اور نماز عید' روزہ چھوڑنے اور قربانیوں میں انہیں کا حکم اس پر لاگو ہو گا۔ نیز ترمذی نے ایسی ہی حدیث ابوہریرہ سے روایت کی اور کہا کہ یہ حسن ہے۔ اور اسی معنی میں ابن عباس کی حدیث ہے کہ انہیں کریب نے کہا کہ اہل شام نے اور معاویہ نے جمعہ کے دن چاند دیکھ کر شام میں روزہ رکھا پھر وہ مہینہ کے آخر میں مدینہ میں آئے اور ابن عباس کو اس بات کی خبر دی۔ ابن عباس کہنے لگے: لیکن ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ لہٰذا ہم روزے رکھتے رہیں گے تا آنکہ تیس روزے پورے ہوں یا ہم چاند دیکھ لیں۔ کریب نے کہا: کیا آپ کے لئے معاویہ اور وہاں کے لوگوں کی رویت کافی نہیں؟ ابن عباس کہنے لگے۔ یہ بات نہیں بلکہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ اور اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ کریب ان لوگوں سے تھا جنہوں نے چاند خود دیکھا تھا تاہم ابن عباس نے اسے یہی حکم دیا کہ وہ اپنا روزہ پورا کرے اگرچہ اسے یقین تھا کہ اس کے نزدیک وہ عید کا دن ہے۔ محمد بن الحسن کا یہی مذہب ہے اس نے کہا کہ اسے لوگوں سے موافقت کرنا چاہئے اگرچہ اس کا اپنا یقین اس سے مختلف ہو۔ اور حج میں بھی یہی صورت ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے "تمہارا عرفہ کا دن وہ ہے جب لوگ عرفات میں جمع ہوں"

اور جمہور نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ اسے اپنے یقین کے مطابق عمل کرنا واجب ہے اور حدیث کو اس کی عدم معرفت پر محمول کیا جو لوگوں سے اختلاف کرتا ہے کیونکہ خطا کے بعد جب بات واضح ہو جائے تو اس نے جو کچھ بھی کیا تھا اسے کفایت کرتا ہے وہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو شک پڑ جائے اس کے لئے ایام موخر ہو جاتے ہیں اور عمل اصل کے مطابق ہو گا۔ اور ابن عباس کی حدیث کی یہ تاویل کی کہ وہ اس حدیث کے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لئے قائل نہ ہوئے کہ شام اور حجاز میں رویت کا اختلاف مطالع کے اختلاف کی بنا پر تھا یا یہ کہ اگر خبر دینے والا ایک شخص ہو تو اس کی شہادت پر عمل نہیں کیا جائے گا اور اس حدیث میں یہ بات مذکور نہیں کہ ابن عباس نے کریب کو اپنے یقین کے خلاف عمل کرنے کا حکم دیا ہو۔ ابن عباس نے تو صرف اہل مدینہ کے متعلق خبر دی کہ وہ انہیں دو باتوں میں سے کسی ایک کی بنا پر اس پر عمل نہیں کریں گے۔

٤٥٢- وعن أبي عمير بن أنس ، عن عمومة له من الصحابة، أن ركباً جاؤوا، فشهدوا أنهم رأوا الهلال بالأمس، فأمرهم النبي ﷺ أن يفطروا، وإذا أصبحوا أن يغدوا إلى مصلاهم. رواه أحمد وأبو داود، وهذا لفظه، وإسناده صحيح.

ابو عمیر(۱) بن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے ایک صحابی چچا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک قافلہ والے آئے اور انہوں نے شہادت دی کہ انہوں نے کل (عید کا) چاند دیکھا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ روزے کھول دیں اور دوسرے دن صبح کو اپنی عیدگاہ کی طرف آجائیں اسے احمد اور ابوداؤد(۲) نے روایت کیا اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے۔

(۱) آپ ابو عمیر بن انس بن مالک انصاری ہیں کہتے ہیں کہ ان کا نام عبداللہ ہے چھوٹے تابعین میں سے ہیں انہوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد طویل زمانہ زندہ رہے۔

(۲) نیز اسے نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور ابن المنذر' ابن السکن اور ابن حزم نے صحیح کہا اور ابن عبدالبر کا قول ہے کہ ابو عمیر مجہول ہے مردود ہے اور وہ اسے بھی جانتے ہیں جس نے اسے صحیح کہا۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اگر عید کی نماز کا وقت نکلنے کے بعد معلوم ہو کہ آج عید تھی تو عید کی نماز دوسرے دن پڑھی جائے گی۔ اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ نماز کے وقت پر نظر ڈالی جائے گی اور اگر وقت باقی ہو تو بھی دوسرے دن پڑھی جائے گی کہ دن کی ابتداء میں یہ بات معلوم نہ ہو سکی۔ ہادی' قاسم اور ابو حنیفہ اسی بات پر عمل کے قائل ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اسے اس وقت معلوم ہو جب وقت نکل چکا ہو گویا نماز عید دوسرے دن اپنے وقت پر ادا کی جائے گی۔ ابو طالب کہتے ہیں کہ اس شرط کے ساتھ کہ وہ شک و شبہ کو ترک کر دے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور دوسرے عذر کو عام سمجھتے ہیں خواہ یہ عذر شک کی بنا پر ہو یا بارش کی وجہ سے اور یہ بات کتب احناف میں صراحت سے مذکور ہے اس قیاس پر جبکہ شک کے علاوہ دوسری وجوہ ہوں۔ پھر اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ دوسرے دن نماز ادا ہی ہو گی قضاء نہیں ہو گی اور مالک کا مذہب یہ ہے کہ یہ قضاء ہرگز نہیں چاہیے کہ اپنے صحیح دن پر قضاء نہ تھی اور شافعیہ دوسری تفاصیل پیش کرتے ہیں جو شرح میں مذکور ہیں اور یہ حدیث عیدالفطر کے بارے میں ہے پھر اسی پر عیدالاضحیٰ کو' شک و شبہ ترک کرنے کو اور دوسرے عذروں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو قیاس کیا گیا اور جب تک مکمل معرفت کا تعین نہ ہو جائے، قیاس محل نظر ہی رہے گا واللہ اعلم۔

۴۵۳- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ لا يغدو يوم الفطر حتى يأكل تمرات. أخرجه البخاري، وفي رواية معلقة - ووصلها أحمد -: ويأكلهن أفراداً.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کے دن کچھ کھجوریں کھانے کے بعد نماز کے لئے جایا کرتے تھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا اور اس کی ایک معلق(۱) روایت بھی ایسی ہی ہے اور احمد نے اسے موصولا" روایت(۲) کیا کہ آپ طاق کھجوریں کھاتے تھے۔

(۱) یعنی جسے بخاری نے انس سے تعلیقا" روایت کیا۔

(۲) نیز اسے بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کیا۔ اور ابن حبان اور حاکم نے عقبہ بن حمید عن انس سے ان الفاظ میں روایت کیا کہ اپ تین یا پانچ یا سات یا ان سے کم و بیش طاق کھجوریں کھایا کرتے تھے۔

اور یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر ہمیشگی پر دلالت کرتی ہے مہلب کہتے ہیں کہ نماز سے پہلے کھجوریں کھانے میں حکمت یہ ہے کہ کسی کو یہ شبہ نہ رہے کہ نماز عید تک روزہ رکھنا لازم ہے اور آپ سد ذریعہ کے طور پر یہ کام کرتے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ جب روزوں کے وجوب کے بعد فطر یا روزہ نہ رکھنا واجب ہے تو اللہ کے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے اس میں جلدی کرنا چاہئے۔ ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اس دن نماز سے پہلے کھانے کے مستحب ہونے میں ہمیں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہو سکا اور مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ کھجوریں کھانے کے استحباب میں حکمت یہ ہے کہ ان کی مٹھاس بصارت کو تقویت دیتی ہے جو روزے سے کمزور ہوتی ہے یا اس لئے کہ مٹھاس ان چیزوں سے ہے جو ایمان کے موافق ہیں اور اس سے خواب کی تعبیر بتلائی جاتی ہے۔ اور دل کو نرم کرتی ہے اسی بناء پر بعض تابعین نے صرف میٹھا کھانے کو مستحب کہا ہے مہلب کہتے ہیں کہ طاق کھجوریں کھانے میں اللہ کی وحدانیت کی طرف اشارہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سب کاموں میں تبرکا" ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

۴۵۴- وعن ابن بريدة، عن أبيه قال: كان رسول الله ﷺ لا يخرج يوم الفطر حتى يطعم، ولا يطعم يوم الأضحى حتى يصلي. رواه أحمد والترمذي، وصححه ابن حبان.

ابن بریدہ اپنے باپ(۱) رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کے دن کھانا کھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر نماز کے لئے جایا کرتے تھے اور عیدالاضحیٰ کے دن نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھاتے تھے۔ اسے احمد(۲) اور ترمذی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا(۳)۔

(۱) ابن بریدہ کے باپ بریدہ بن حصیب ہیں اور ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور ابن بریدہ کا پورا نام ابن بریدہ عبداللہ بن بریدہ بن الحصیب اسلمی ہے ان کی کنیت ابو سہیل ہے۔ مروز کے رہنے والے اور اس کے قاضی تھے۔ مصنف کتاب ہذا نے التقریب میں اسے تیسرے درجے کے ثقات میں لکھا ہے۔

(۲) اور اس میں زیادہ کیا کہ: پھر آپ اپنی قربانی سے کھاتے۔

(۳) نیز اسے ابن ماجہ' دار قطنی' حاکم اور بیہقی نے بھی روایت کیا اور ابن قطان نے صحیح کہا اور بیہقی کی روایت میں یہ زیادہ ہے "اور جب آپ نماز سے واپس آتے تو اپنی قربانی کا جگر کھاتے" ترمذی نے کہا کہ اس بارے میں علی اور انس سے بھی روایت ہے اور ترمذی نے ابن عمر سے بھی روایت کیا اور وہ روایت ضعیف ہے۔

اور یہ حدیث عیدالفطر کے دن نماز سے پہلے اور عیدالاضحیٰ کے دن نماز کے بعد کھانے کی مشروعیت پر دلیل ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ جب قربانی کی مشروعیت سے بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی بزرگی کا اظہار مقصود ہے تو اللہ تعالیٰ کے شکرانہ کے طور پر اپنی قربانی سے کھانا بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ نے قربانی کی مشروعیت سے نوازا جس میں آخرت کا ثواب بھی ہے اور دنیا کی بھلائی بھی۔

۴۵۵- وعن أم عطية رضي الله تعالى عنها قالت: أمرنا أن نخرج العواتق والحيض في العيدين، يشهدن الخير ودعوة المسلمين، وتعتزل الحيض المصلى. متفق عليه.

ام عطیہ(۱) رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہمیں حکم(۲) دیا گیا کہ جوان(۳) لڑکیاں اور حائضہ(۴) عورتیں بھی عیدگاہ میں جائیں تاکہ وہ مسلمانوں کے امور(۵) خیر اور دعاؤں میں شامل ہوں اور حیض والی عورتیں نماز سے الگ رہیں۔ متفق علیہ(۶)۔

(۱) آپ انصاریہ ہیں اور آپ کا نام نسیبہ بنت حارث اور بعض بنت کعب کہتے ہیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتیں۔ زخمیوں کا علاج اور بیماروں کی تیمارداری کرتیں' اہل بصرہ میں شمار ہوتی ہیں۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت اور بصرہ کے علمائے تابعین نے آپ سے غسل میت سیکھا کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کے غسل کے موقعہ پر موجود تھیں' آپ کو اس کا حکم دیا گیا تو آپ نے اسے بخوبی سرانجام دیا' گویا آپ کی حدیث غسل میت کے بارے میں اصل قرار پائی اور یہ حدیث کتاب الجنائز میں آرہی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) علم کی وجہ سے مجہول کا صیغہ آیا ہے اور حکم دینے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور بخاری کی روایت میں امرنا نبینا ؐ ہے۔

(۳) اصل میں لفظ عواتق ہے یعنی بالغ کنواری یا قریب البلوغ لڑکیاں

(۴) اصل لفظ حیض ہے یہ ایک لحاظ سے پہلی صورت سے زیادہ عام ہے۔

(۵) یعنی جن بلا حیض عورتوں نے نماز پڑھی ہے اس فضیلت میں یہ بھی شامل ہو سکیں۔

(۶) لیکن بخاری میں یہ لفظ ہیں "ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم نوجوان پردہ نشیں لڑکیاں نکلیں" یا یوں کہا "نوجوان لڑکیاں اور پردہ نشیں نکلیں" اور حیض والی نماز سے الگ رہیں" اور مسلم کے الفاظ یہ ہیں "ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ نوجوان اور پردہ نشیں نکلیں اور حیض والی عورتوں کو حکم دیا کہ مسلمانوں کی جائے نماز سے الگ رہیں" اور جو الفاظ مصنف لایا ہے وہ ان دونوں میں سے کسی کے بھی نہیں۔

اور یہ حدیث ایسی عورتوں کے عید گاہ جانے کے وجوب پر دلیل ہے اور اس بارے میں تین اقوال ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ واجب ہے تین خلفاء حضرت ابوبکر' عمر اور علی رضی اللہ عنہم اسی کے قائل تھے اور وجوب کی تائید ابن عباس کی اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے جسے ابن ماجہ اور بیہقی نے یوں روایت کیا ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اور بیٹیاں عیدین کے لئے نکلا کرتی تھیں" اس حدیث سے اس بارے میں استمرار ظاہر ہوتا ہے اور یہ بڑی چھوٹی جوان اور بوڑھی عورتوں سب کے لئے عام ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور انہیں نکلنے کے حکم کو استحباب پر محمول کیا گیا ہے ایک جماعت اس کی قائل ہے اور شارح نے اسی کو تقویت دی ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ آپ ؐ نے ان کے نکلنے کی وجہ یہ بتلائی وہ خیر اور مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں اس نے کہا کہ اگر یہ واجب ہوتا تو آپ یہ وجہ بیان نہ فرماتے اور ان کا نکلنا حکم کی بجا آوری کے طور پر ان پر واجب ہوتا۔ میں کہتا ہوں یہ بات بھی قابل غور ہے کیونکہ کبھی تو آپ نے کسی واجب کی وجہ بیان کر دی کہ اس میں کیا فوائد ہیں اور کبھی اس کو ادا کرنے کی وجہ بیان نہیں فرمائی اور شافعی نے "الام" میں بحث کرتے ہوئے خوش شکل عورتوں اور بوڑھیوں میں فرق کیا ہے وہ کہتے ہیں بوڑھیوں اور معمولی شکل والی عورتوں کا نماز میں حاضر ہونا میں پسند کرتا ہوں اور ان کا عیدین میں حاضر ہونا انتہائی مستحب ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ طحاوی نے کہا کہ یہ بات ابتدائے اسلام میں تھی تاکہ ان کے شامل ہونے سے مجمع زیادہ ہو اور اس سے دشمن کو خوفزدہ کرنا مقصود تھا۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اس کا تعاقب یوں کیا گیا کہ یہ تو محض دعویٰ سے نسخ ہے اور اس کی تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ ابن عباس نے عورتوں کو نکلتے دیکھا اور وہ چھوٹے تھے اور یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے حالانکہ اس وقت قوت السلام کے لئے ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورت نہیں تھی اور اس بات سے بھی کہ ام عطیہ کی حدیث میں آپؐ نے جو وجہ بتلائی وہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے امور خیر اور دعا میں شامل ہوں اور اس بات سے بھی کہ ام عطیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی مدت تک یہ فتویٰ دیتی رہیں اور صحابہ میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ رہا حضرت عائشہ کا قول کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے وہ کام دیکھتے جو انہوں نے شروع کر دیئے ہیں تو آپ ضرور انہیں مساجد سے روک دیتے" تو یہ قول نہ عورتوں کے نکلنے کی تحریم پر دلالت کرتا ہے اور نہ حکم کے نسخ پر۔ بلکہ اس میں تو یہ دلیل ہے کہ انہیں منع نہ کیا جائے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع نہیں کیا بلکہ انہیں نکلنے کا حکم دیا ہے اور ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس بات کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو ہم اس سے انہیں روکیں۔

۴۵۶- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: كان رسول الله ﷺ وأبو بكر وعمر يصلون العيدين قبل الخطبة. متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ابوبکر اور عمر عیدین کی نمازیں خطبہ سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔ متفق علیہ (۱)

(۱) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ ایسا کام ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں خلیفوں نے ہمیشگی کی اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ نماز کو خطبہ سے پہلے ادا کرنا واجب ہے۔ نیز ہر دو عیدوں پر خطبہ کے عدم وجوب پر اجماع منقول ہے اور بنائے استدلال عبداللہ بن سائب کی وہ حدیث ہے جسے نسائی' ابن ماجہ اور ابوداؤد نے روایت کیا کہ "میں عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ جب نماز ہو چکی تو آپؐ نے فرمایا: اب ہم خطبہ دیں گے جو خطبہ سننے کے لئے بیٹھنا چاہے وہ بیٹھ جائے اور جو جانا چاہے وہ چلا جائے" لہٰذا یہ غیر واجب ہوا اور اگر کوئی شخص نماز سے پہلے خطبہ دے تو پھر عید کے بعد اعادہ مشروع نہیں اور ایسا کرنے والا خلاف سنت کام کرنے والا ہے۔

اور اس بات میں اختلاف ہے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ مسلم میں ہے کہ وہ مروان تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے سبقت کی تھی جیسا کہ ابن المنذر نے حسن بصری کی صحیح سند سے روایت کیا کہ پہلا شخص جس نے نماز سے پہلے خطبہ دیا عثمان تھا' یعنی عید کی نماز سے پہلے اور مروان نے تو صرف اس بناء پر پہلے خطبہ دیا کہ جب اس پر ابو سعید نے گرفت کی تو کہنے لگا کہ لوگ نماز عید کے بعد ہمارا خطبہ سننے کے لئے بیٹھتے نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ لوگ جان بوجھ کر اس کا خطبہ نہیں سنتے تھے کیونکہ وہ ان لوگوں کو خطبہ میں گالیاں دیتا جو گالی کے مستحق نہیں تھے اور بعض لوگوں کی بے حد مدح کرتا تھا اور عبدالرزاق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ابن جریج سے' زہری سے روایت کیا کہ پہلا شخص جس نے عید کی نماز سے پہلے خطبہ دیا معاویہ تھا' جو بھی صورت ہو بہرحال یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف بدعت ہے۔ اور یہ بھی عذر پیش کیا جاتا ہے کہ مدینہ میں لوگ زیادہ ہو گئے تھے اور ان کے گھر دور دور تھے لہذا خطبہ کو اس لئے مقدم کیا گیا کہ دور والے بھی نماز میں شریک ہو سکیں اور یہ رائے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کے مخالف ہے۔

۴۵۷۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ صلى يوم العيد ركعتين، لم يصلِّ قبلهما ولا بعدهما. أخرجه السبعة.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو رکعت نماز پڑھائی۔ نہ اس سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ بعد میں۔ اسے ساتوں نے روایت کیا۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ عید کی نماز صرف دو رکعت ہے اور اس بات پر اجماع ان لوگوں کے لئے جو امام کے ساتھ کھلے میدان میں نماز ادا کریں۔ اور اگر امام کے ساتھ اس کی نماز رہ جائے تو اکثر کے نزدیک وہ اکیلا بھی دو ہی رکعت پڑھے۔ اور احمد اور ثوری کا مذہب یہ ہے کہ وہ چار رکعت پڑھے اور سعید بن منصور نے ابن مسعود سے روایت کیا کہ "جس شخص کی امام کے ساتھ نماز عید رہ جائے تو وہ چار رکعت پڑھے" اور اس کی سند صحیح ہے اور اسحاق نے کہا کہ اگر کھلے میدان میں پڑھے تو دو رکعت پڑھے ورنہ چار رکعت۔ اور ابو حنیفہ نے کہا کہ جب نماز عید قضا ہو جائے تو اسے اختیار ہے کہ وہ دو رکعت پڑھے یا چار۔

اور نماز عید کی شرعیت پر تو اجماع ہے لیکن اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہ واجب عین ہے ہادی اور ابو حنیفہ اسی بات کے قائل ہیں اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء کی مداومت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عورتوں کو عید کی نماز کے لئے نکلنے کے حکم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح اس حدیث سے بھی جو پہلے گزر چکی ہے کہ آپ نے صحابہ کو دوسرے دن عید گاہ کی طرف جانے کا حکم دیا۔ جبکہ امر اصل میں وجوب کے لئے ہے۔ اس کے دوسرے دلائل میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے فصل لربک وانحر جو اس کے وجوب کے قائل ہیں وہ اس سے قربانی کی نماز مراد لیتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قد افلح من تزکی واذکراسم ربہ فصلی اس کی اکثر مفسرین نے اس کی تفسیر زکوۃ فطرہ (فطرانہ) اور نماز عید سے کی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے کیونکہ یہ ایک علامت ہے اور جہاد کی طرح بعض لوگوں کی شمولیت سے باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے ابو طالب اور پچھلے لوگوں کا یہی مذہب ہے۔

تیسرا یہ کہ یہ سنت موکدہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر مداومت اس سنت کے موکدہ ہونے پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دلیل ہے اور یہ زید بن علی اور ایک جماعت کا قول ہے۔ وہ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے بندوں پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ استدلال عدد کے مفہوم کے لحاظ سے ہے اور اس لئے بھی کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ ہر دن اور رات کی پانچ نمازیں ہیں۔

اور حدیث کے یہ الفاظ کہ "آپ نے نہ نماز عید سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ بعد میں" اس بات پر دلیل ہیں کہ نماز عید سے پہلے یا بعد نوافل مشروع نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو خود یہ کام کیا اور نہ ہی اس کا حکم دیا تو جب یہ بات آپؐ کے حق میں مشروع نہ تھی تو ہمارے لئے بھی مشروع نہ ہوئی اور عنقریب ابو سعید کی حدیث آرہی ہے جس میں اس کے ترک پر دلالت ہے وہ حدیث یوں ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید کے بعد اپنے گھر میں دو رکعت پڑھا کرتے تھے" اسے حاکم نے صحیح کہا ہے یہاں ابن عباس کے قول "اور نہ بعد میں" سے مراد یہ ہے کہ آپؐ عید گاہ میں کچھ نہیں پڑھتے تھے۔

۴۵۸- وعنه رضي الله تعالى عنه أن النبي ﷺ صلى العيد بلا أذان ولا إقامة. أخرجه أبو داود وأصله في البخاري.

اور انہی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز اذان اور تکبیر کے بغیر پڑھی۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی اصل بخاری میں موجود ہے(ا)۔

(ا) یہ حدیث نماز عید میں اذان اور اقامت کے مشروع نہ ہونے پر دلیل ہے۔ لہٰذا یہ دونوں کام بدعت ہیں۔ اور ابن ابی شیبہ نے ابن المسیب سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا کہ "سب سے پہلے جس شخص نے نماز عید کے لئے اذان دی وہ معاویہ ہے" اور شافعی نے بھی ثقہ لوگوں سے ایسا ہی روایت کیا اور یہ زیادہ کیا کہ "جب حجاج کو مدینہ کا گورنر بنایا گیا تو اس نے اسے معمول بنا لیا" اور ابن المنذر نے روایت کیا کہ "سب سے پہلے زیاد نے بصرہ میں یہ نیا کام شروع کیا" اور بعض کہتے ہیں کہ مروان نے سب سے پہلے یہ کام کیا تھا۔ اور ابن ابی حبیب کہتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ کام عبداللہ بن زبیر نے کیا اور اقامت بھی کہی اور شافعی نے ثقہ راوی سے' زہری سے روایت کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن موذن کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ "الصلوة جامعة کہے" شرح میں مصنف نے کہا کہ یہ حدیث مرسل ہے جو اس کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے قیاس کو مضبوط بناتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔

۴۵۹- وعن أبي سعيد رضي الله تعالى عنه قال: كان النبي ﷺ لا يصلي قبل العيد شيئاً، فإذا رجع إلى منزله صلى ركعتين. رواه ابن ماجه بإسناد حسن.

ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز سے پہلے کچھ نہیں پڑھا کرتے تھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر جب اپنے گھر واپس آتے تو دو رکعت پڑھ لیتے۔ اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا(ا)۔

(ا) نیز اسے حاکم اور احمد نے روایت کیا اور ترمذی نے ابن عمر سے اسی طرح روایت کیا اور اسے صحیح کہا حاکم اور احمد میں ہے اور طبرانی کی اوسط میں اس کا دوسرا طریق ہے لیکن اس میں جابر جعفی ہے جو متروک ہے۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ نماز عید کے بعد اپنے گھر میں دو رکعت پڑھنا مشروع ہے۔ البتہ اس سے احمد میں مذکور ابن عمر کی مرفوع حدیث معارض ہے کہ "عید کے دن نماز عید کے علاوہ نہ پہلے کوئی نماز ہے اور نہ بعد میں" اور ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کھلے میدان میں کوئی نماز نہیں۔

٤٦٠- وعنه رضي الله تعالى عنه قال: كان النبي ﷺ يخرج يوم الفطر والأضحى إلى المصلى، وأول شيء يبدأ به الصلاة، ثم ينصرف، فيقوم مقابل الناس - والناس على صفوفهم - فيعظهم ويأمرهم. متفق عليه.

اور انہی ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف نکلتے اور سب سے پہلے نماز پڑھتے پھر منہ پھیر کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور لوگ بدستور اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے۔ آپ انہیں نصیحت کرتے اور احکام سناتے۔ متفق علیہ(ا)۔

(ا) اسی حدیث میں اس بات کی شرعیت پر دلیل ہے کہ عید کے لئے مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ جلد نکلنا چاہئے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عید گاہ ایک معروف مقام تھا جو آپ کی مسجد کے دروازہ سے ایک ہزار ہاتھ کے فاصلہ پر تھا۔ عمر بن شبہ نے اخبار مدینہ میں ایسا ہی کہا ہے۔ نیز اس حدیث میں خطبہ سے پہلے نماز ادا کرنے پر دلالت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا اور اس بات پر بھی کہ نماز سے پہلے کوئی نفل نہیں۔

اور حدیث کے الفاظ کہ "آپ لوگوں کے مقابل کھڑے ہوتے" اس بات پر دلیل ہیں کہ آپ کی عیدگاہ میں منبر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ابن حبان کی ایک روایت میں ہے کہ "آپ نے عید کے دن اپنی سواری پر خطبہ دیا" اور اسے بخاری نے بھی ابوسعید کی روایت کے آخر میں ذکر کیا ہے کہ "پہلا شخص جس نے عید گاہ میں منبر استعمال کیا مروان ہے" البتہ عمر بن شبہ نے یوں روایت کیا کہ "سب سے پہلے عثمان نے عیدگاہ میں منبر پر خطبہ دیا اس نے ایک بار ایسا کیا پھر چھوڑ دیا حتی کہ مروان نے اس کا اعادہ کیا" معلوم ہوتا ہے کہ ابو سعید کو اس کی اطلاع نہیں ہوئی۔

نیز اس حدیث میں خطبہ عید کی مشروعیت پر دلیل ہے اور یہ خطبہ جمعہ کے خطبہ کی طرح امر اور وعظ ہی ہوتا ہے البتہ اس میں جمعہ کی طرح دو خطبے نہیں ہوتے نہ ان کے درمیان بیٹھنا ہے۔ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت نہیں لوگوں نے خطبہ عید کو خطبہ جمعہ پر قیاس کر کے ان باتوں کو شروع کر دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نماز عید میں تکبیرات

۴۶۱- وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده قال: قال نبي الله ﷺ: **«التكبير في الفطر سبع في الأولى، وخمس في الآخرة، والقراءة بعدهما كلتيهما»**. أخرجه أبو داود، ونقل الترمذي عن البخاري تصحيحه.

عمرو بن (۱) شعیب اپنے باپ شعیب سے اور وہ (شعیب) اپنے باپ یعنی عمرو کے دادا سے رضی اللہ عنہم روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیدالفطر کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ تکبیریں ہیں اور یہ دونوں قراءت(۲) سے پہلے ہیں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور ترمذی نے بخاری سے اس کی صحت نقل کی ہے(۳)۔

(۱) آپ ابو ابراہیم عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں۔ آپ نے اپنے باپ سے' ابن المسیب اور طاؤس سے سماعت کی اور ان سے زہری اور ایک جماعت نے روایت کی اور شیخین نے اس سے روایت نہیں کی اور ابیہ اور جدہ کی ضمیر سے مراد اگر اس کا باپ شعیب ہو تو اس نے اپنے دادا محمد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا تو یہ روایت مرسل ہے کیونکہ اس کے دادا محمد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا۔ اور اگر ابیہ کی ضمیر اس کے باپ شعیب کی طرف عائد ہو اور جدہ کی عبداللہ کی طرف تو اس سے مراد شعیب ہے جو اپنے دادا عبداللہ سے روایت کرتا ہے مگر شعیب نے اپنے دادا عبداللہ کو نہیں پایا۔ اسی علت کی وجہ سے شیخین نے اس کی حدیث روایت نہیں کی اور ذہبی کہتے ہیں کہ شعیب کا اپنے دادا عبداللہ سے سماع ثابت ہے۔ چنانچہ چاروں اصحاب سنن' ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اس سے احتجاج کیا ہے۔

(۲) سورہ فاتحہ اور دوسری کسی سورت کی قراءت

(۳) نیز اسے احمد اور علی بن المدینی نے روایت کیا اور دونوں نے اسے صحیح کہا' نیز انہوں نے عائشہ' سعد القرظی' ابن عباس' ابن عمر اور کثیر بن عبداللہ کی حدیثیں روایت کی ہیں مگر ان سب میں ضعیف راوی ہیں نیز یہ علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے موقوفاً" مروی ہے ابن رشد کہتے ہیں کہ انہوں نے اس مسئلہ میں صرف صحابہ کے اقوال قبول کئے ہیں کیونکہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عقیلی نے احمد بن حنبل سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ عیدین کی تکبیر کے بارے میں کوئی حدیث مروی نہیں۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ عید کی دو رکعتوں میں سے پہلی رکعت میں سات تکبیریں کہی جائیں۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ تکبیر تحریمہ اس میں شامل ہو یا نہ ہو۔ واضح تو یہی بات ہے کہ وہ ان میں شامل نہیں اور اس میں اختلاف ہے اور الھدی النبوی میں کہا ہے کہ تکبیر تحریمہ ان میں شامل ہے مگر کوئی دلیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں دی۔ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں ہیں صحابہ کی ایک جماعت وغیرہم کا یہی مذہب ہے اور بعد والوں نے اختلاف کیا اور کہا کہ پہلی رکعت میں پانچ اور دوسری میں چار ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ پہلی میں تین اور دوسری میں دو ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ پہلی میں چھ اور دوسری میں پانچ ہیں میں کہتا ہوں کہ زیر بحث حدیث پر عمل ہی اقرب ہے اور اس کے جتنے بھی طریقے ہیں سب کمزور ہیں تاہم ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں اور اس لئے بھی کہ ان کے سوا اقوال ہی ہیں ان میں سنت نہیں جس پر عمل کیا جا سکے۔

نیز اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ دونوں رکعت میں تکبیروں کے بعد قراء ت ہو۔ شافعی اور مالک اسی بات کے قائل ہیں اور ہادی کا مذہب یہ ہے کہ دونوں رکعتوں میں قراء ت تکبیروں سے پہلے ہو اور اس نے بحر میں ایسا استدلال کیا ہے جس سے دلیل پوری نہیں ہوتی۔ اور باقر اور ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ پہلی رکعت میں تکبیریں قرات سے پہلے ہوں اور دوسری میں بعد میں تاکہ دونوں قراء تیں لگاتار ہو جائیں۔

جاننا چاہئے کہ مصنف نے یہاں کہا کہ ترمذی نے بخاری سے اس کی صحت نقل کی ہے اور تلخیص الحبیر میں کہا کہ بخاری اور ترمذی نے کہا کہ اس بارے میں یہ سب سے زیادہ صحیح چیز ہے' میں نہیں سمجھتا کہ اس نے ترمذی کی یہ بات کہاں سے نقل کی ہے۔ کیونکہ ترمذی نے اپنی سنن میں عمرو بن شعیب کی روایت درج ہی نہیں کی بلکہ کثیر بن عبداللہ سے' اپنے باپ سے' اپنے دادا سے روایت کی ہے اور کہا کہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کثیر کے دادا کی حدیث احسن چیز ہے نیز کہا کہ اس بارے میں عائشہ اور ابن عمر اور عبداللہ بن عمرو سے بھی مروی ہے لیکن بخاری سے کچھ ذکر نہیں کیا اور بیہقی کو سنن کبری میں یہ وہم لاحق ہوا ہے وہ یہ کہ اس نے کثیر کی حدیث روایت کرنے کے بعد کہا کہ ابو عیسیٰ نے کہا کہ میں نے محمد یعنی بخاری سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ اس باب میں اس سے زیادہ صحیح کوئی چیز نہیں۔ بیہقی نے کہا کہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الطائفی کی حدیث جو عمرو بن شعیب سے' اپنے باپ سے' اپنے دادا سے ہے' بھی اس باب میں صحیح ہے۔

اور ہم نے ترمذی میں کوئی چیز نہیں پائی جو اس نے ذکر کی ہو۔ البتہ اس نے تنقیح الانظار میں اس بارے میں ایک چیز پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ابن النحوی نے بیہقی کا جو خلاصہ لکھا ہے اس میں ذکر کیا کہ ترمذی نے کہا کہ میں نے محمد سے اس بارے میں پوچھا ..... الخ۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے بخاری سے' ترمذی کی بات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بیہقی نے نقل کیا ہے۔ لہٰذا عمرو بن شعیب کی حدیث کو ابوداؤد ہی کی طرف منسوب کرنا چاہئے اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا کہ عمرو کی حدیث پر ہی عمل کرنا بہتر ہے اور اس باب میں یہی قابل اطمینان چیز ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر دو تکبیروں کے درمیان تھوڑا سا سکتہ کرتے تھے اور ان کے درمیان کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معین ذکر آپؐ سے محفوظ نہیں لیکن اس وقفہ سے متعلق ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ اللہ کی حمدوثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے تھے۔ اور طبرانی نے کبیر میں ابن مسعود سے روایت کیا کہ "ہر دو تکبیروں کے درمیان دو کلموں کی مقدار وقفہ ہوتا تھا" اور یہ روایت موقوف ہے اس کی سند میں سلیمان بن ارقم ضعیف ہے اور ابن عمر اتباع کے جذبہ سے ہر تکبیر کے وقت اپنے ہاتھ بلند کرتے تھے۔

۴۶۲- وعن أبي واقد الليثي رضي الله تعالى عنه قال: كان النبي ﷺ يقرأ في الأضحى والفطر بـ«ق، واقتربت». أخرجه مسلم.

ابو واقد لیثی(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نماز میں سورہ ق(۲) اور اقتربت(۳) پڑھا کرتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۴)۔

(۱) آپ کا نام حارث بن عوف لیثی ہے ابتداء میں اسلام لائے۔ بعض کہتے ہیں کہ بدر میں حاضر تھے اور بعض کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں سے ہیں اور صحیح پہلی بات ہے آپ کا اہل مدینہ میں شمار ہوتا ہے مکہ کے قریب سکونت اختیار کی اور وہیں ۶۸ھ میں وفات پائی۔

(۲) یعنی پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد

(۳) دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد

(۴) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ نماز عید کی رکعتوں میں قراءت کرنا سنت ہے اور پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ان میں سبح اسم ربک اور الغاشیۃ پڑھتے تھے اور ظاہر یہ ہے کہ آپ کبھی یہ پڑھ لیتے تھے اور کبھی وہ۔ شافعی اور مالک کا یہی مذہب ہے کہ ان میں قراۃ سنت ہے۔

۴۶۳- وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا كان يوم العيد خالف الطريق. أخرجه البخاري،

۴۶۴- ولأبي داود عن ابن عمر نحوه.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن عید گاہ کو جانے اور آنے کا راستہ تبدیل کر لیا کرتے تھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا(۱)۔ اور ابو داؤد میں ابن عمر سے بھی اسی طرح مروی ہے(۲)۔

(۱) یعنی جب آپ عید گاہ سے واپس آتے تو اس راستہ سے نہیں آتے تھے جس راستہ سے جاتے تھے۔ ترمذی نے کہا۔ بعض اہل علم نے اسی بات کو قبول کیا ہے اور اسے امام کے لئے مستحب قرار دیا ہے اور شافعی اسی چیز کے قائل ہیں اور اکثر اہل علم بھی اور امام اور مقتدی دونوں کے لئے یہ مشروع ہے۔

(۲) اور سنن میں ابن عمر کے الفاظ یہ ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن ایک راستہ اختیار کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر واپس آئے تو دوسرا راستہ اختیار کیا" اس حدیث میں بھی وہی دلیل ہے جس پر جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ البتہ اس راستہ تبدیل کرنے کی حکمت میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں تاکہ دونوں راستہ والوں کو سلام کہہ سکے اور بعض کہتے ہیں تاکہ اسے دونوں راستوں کی برکت حاصل ہو اور بعض کہتے ہیں تاکہ ہر راستہ سے اپنی حاجت پوری کر سکے اور بعض کہتے ہیں تاکہ تمام راہوں اور سڑکوں میں اسلام کے شعائر ظاہر ہوں اور بعض کہتے ہیں کہ تاکہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت اور اسلام کے شعائر دیکھ کر منافقوں کا جی جلے۔ تاکہ زمین کے زیادہ سے زیادہ ٹکڑے شہادت دیں کیونکہ جب مسجد کو جانے والا یا نمازی کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور دوسرے سے ایک برائی گرا دی جاتی ہے تا آنکہ وہ اپنے گھر کو واپس آتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ سب باتیں ہی درست ہیں کیونکہ سب امور آپ کے فعل سے خالی نہیں اور ابن عمر جو شدت کے ساتھ سنت کے متبع تھے گھر سے لے کر عیدگاہ تک تکبیریں کہتے جاتے تھے۔

۴۶۵- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة، ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال: قد أبدلكم الله بهما خيراً منهما: يوم الأضحى، ويوم الفطر. أخرجه أبو داود والنسائي بإسناد صحيح.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کے دو دن مقرر تھے جن میں وہ کھیلتے اور خوشی مناتے تھے۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا۔ اللہ نے تمہیں ان دنوں کے بدلے دو بہتر دن دے دیئے ہیں۔ یعنی عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر۔ اسے ابوداؤد اور نسائی نے صحیح سند سے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات مدینہ تشریف لانے کے بعد کہی تھی کیونکہ فا کا لفظ اسی بات کا مقتضی ہے اور کتب سیر میں ہے کہ اسلام میں پہلی عید جو شروع ہوئی وہ عیدالفطر ہے جو ۲ھ میں شروع ہوئی۔ اس حدیث میں یہ بھی دلیل ہے کہ عیدین کے موقعہ پر خوشی کا اظہار کرنا مستحب ہے اور یہ شریعت کا حصہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مشروع کیا ہے جاہلیت کی دو عیدوں کو مذکورہ دو عیدوں میں بدلنا اس بات پر دلیل ہے کہ ان دنوں میں وہی کچھ کیا جا سکتا ہے جو مشرکین جاہلیت میں اپنی عیدوں کے دن کیا کرتے تھے۔ اختلاف ہے تو صرف اوقات میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شرح میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ اور افعال جاہلیۃ سے ایسے افعال مراد نہیں جو ممنوع ہیں یا اللہ کی اطاعت سے غافل کرنے والے ہیں رہا اپنے اہل و عیال کو عید کے دن چھٹی دینا جس سے بدن کو آرام پہنچے، طبیعت عبادت کی کلفت سے کھل جائے تو یہ مشروع ہے اور بعض لوگوں نے یہ استنباط کیا ہے کہ مشرکوں کی عیدوں کے موقعہ پر خوش ہونا اور ان سے مشابہت کرنا مکروہ ہے اور حنفیہ کے ایک بزرگ استاذ نے اس میں اس حد تک مبالغہ کیا اور کہا کہ "جس شخص

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے اس دن مشرکوں کو تعظیماً" ایک انڈہ بھی دیا تو اس نے اللہ سے شرک کیا۔"

۴۶۶- وعن علي رضي الله تعالى عنه قال: من السنة أن يخرج إلى العيد ماشياً. رواه الترمذي، وحسنه.

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سنت یہ ہے کہ عید گاہ کی طرف پیدل چل کر جانا چاہئے اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا(ا)۔

(ا) ترمذی میں اس کا باقی حصہ یہ ہے "اور یہ کہ تو روانہ ہونے سے پہلے کچھ کھا لے" ابو عیسیٰ نے کہا کہ اکثر اہل علم کا اسی حدیث پر عمل ہے۔ وہ عید گاہ کی طرف پیدل چل کر جانا مستحب سمجھتے ہیں۔ نیز یہ کہ جانے سے پہلے کچھ کھا لے۔ ابو عیسیٰ کہتے ہیں مستحب یہ ہے کہ عذر کے سوا عیدگاہ کو سوار ہو کر نہ جائے۔

اور میں نے اس حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جسے ترمذی نے حسن کہا اور نہ میں یہ گمان کرتا ہوں کہ اس نے حسن کہا ہو گا کیونکہ یہ حدیث اس نے حارث اعور کے طریق سے روایت کی ہے اور اس میں محدثین کو کلام ہے البتہ زہری نے اسے مرسلاً" یوں روایت کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید یا جنازہ کے موقع پر کبھی سواری نہیں کی" اور ابن عمر عیدگاہ کی طرف پیدل جاتے اور پیدل ہی واپس آتے اور عیدالفطر کے موقع پر نماز کو روانہ ہونے سے پہلے کھانے کی قید لگانے کی دلیل عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ کی حدیث سے پہلے گزر چکی ہے اور ابن ماجہ نے ابو رافع وغیرہ کی حدیث سے روایت کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کی طرف پیدل ہی جاتے اور پیدل ہی واپس آتے" اور بخاری نے اپنی صحیح میں عیدگاہ کو پیدل جانے اور سوار ہو کر جانے سے متعلق باب قائم کیا جس کا عنوان ہے "عیدگاہ کی طرف جانے اور سوار ہونے کا باب" گویا بخاری نے ان دونوں کاموں کو ایک سطح پر رکھا۔ یعنی جب اس نے کوئی صحیح حدیث نہ دیکھی تو کشادگی اور وسعت کی اصل کی طرف رجوع کیا۔

۴۶۷- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أنهم أصابهم مطر في يوم عيد، فصلى بهم النبي ﷺ صلاة العيد في المسجد. رواه أبو داود بإسناد لين.

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ عید کے دن بارش ہو گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مسجد میں عید کی نماز پڑھائی۔ اسے ابوداؤد نے ضعیف سند سے روایت کیا(ا)۔

کیونکہ اس کی سند میں ایک آدمی مجہول ہے۔ نیز اسے ابن ماجہ اور حاکم نے بھی کمزور سند سے روایت کیا اور اس میں عطاء نے دو اقوال کی بنا پر اختلاف کیا ہے۔ آیا نماز عید کے لئے کھلے میدان کی طرف جانا افضل ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا اگر شہر میں ہی مسجد وسیع موجود ہو تو اس میں جانا افضل ہے یہ دوسرا قول شافعی کا ہے کہ اگر شہر میں وسیع مسجد موجود ہو تو لوگ اس میں نماز پڑھ لیں' باہر نہ نکلیں۔ شافعی کا کلام اس بات کا مقتضی ہے کہ باہر کی اصل وجہ اجتماع کی طلب ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوان اور پردہ نشیں عورتوں کو عیدگاہ جانے کا حکم دیا اور اگر یہ مقصد مسجد میں ہی حاصل ہو جائے تو یہ افضل ہے اور اہل مکہ اسی لئے باہر نہیں جاتے کہ مسجد تو وسیع ہے اور اطراف تنگ ہیں۔ امام یحیٰؒ اور ایک جماعت کا یہی مذہب ہے وہ کہتے ہیں کہ مسجد میں نماز افضل ہے اور پہلا قول ہادویہ اور مالک کا ہے کہ "خواہ مسجد لوگوں کے لئے فراخ ہو تب بھی کھلے میدان کی طرف نکلنا افضل ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کام پر محافظت کی اور بارش کے عذر کے علاوہ کبھی مسجد میں نماز نہیں پڑھی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کام پر محافظت کی ہو وہی افضل ہو سکتا ہے نیز علی رضی اللہ عنہ کے قول کی بنا پر بھی وہ نماز عید کے لئے کھلے میدان کی طرف نکلے اور کہا کہ اگر یہ سنت نہ ہوتی تو میں مسجد میں نماز پڑھتا۔ اور ایک نائب مقرر کیا تاکہ وہ ضعیف لوگوں کو مسجد میں نماز پڑھا دے" وہ کہتے ہیں کہ کھلے میدان میں اگر کوئی مسجد بغیر چھت کے ہو تو وہی افضل ہے اور اگر چھت والی ہو تو اس میں تردد ہے۔

فائدہ - عیدین میں تکبیریں پڑھنا جمہور کے نزدیک مشروع ہے البتہ ناصر نے عیدالفطر کی تکبیروں کو اللہ کے اس قول کے مطابق واجب قرار دیا ہے۔ ولتکبروا اللہ علی ماھداکم اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ تکبیریں کہنا سنت ہے اور تکبیروں کا وقت مجمول ہے اور مختلف فیہ ہے اور اس میں دو قول ہیں اکثر یہ کہتے ہیں کہ اس کا وقت امام کے نماز کے لئے نکلنے کے وقت سے لے کر خطبہ کی ابتداء تک ہے اور بیہقی نے اس سلسلہ میں دو حدیثیں ذکر کیں اور انہیں ضعیف کہا۔ لیکن حاکم نے کہا کہ یہ سنت ہے جسے ائمہ حدیث ایک دوسرے کو بتلاتے آئے ہیں اور ابن عمر اور بعض دوسرے صحابہ کی روایت اس سنت کو صحیح قرار دیتی ہے۔

دوسرا قول ناصر کا ہے کہ تکبیریں شوال کی پہلی رات کی نماز مغرب سے شروع کر کے اس کے دن عصر تک ہر نماز کے بعد کہنی چاہئیں۔ اور شافعی کے اس بارہ میں کئی اقوال ہیں یعنی امام کے نماز عید کو نکلنے تک یا نماز ادا کرنے تک یا خطبہ سے فارغ ہونے تک۔

رہی تکبیر کی صفت کہ اس کے الفاظ کیا ہوں تو بیہقی کی فضائل الاوقات میں ہے جس کی سند سلمان تک ہے کہ آپؐ صحابہ کو تکبیر سکھلاتے اور فرماتے۔ تکبیریوں کہو۔ اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا یا کبیرا کے بجائے کثیرا کہتے۔ اللھم انت الاعلی واجل من ان تکون لک صاحبہ اویکون لک ولد اویکون لک شریک فی الملک اویکون لک ولی من الذل و کبرہ تکبیرا اللھم اغفرلنا وارحمنا

رہی عیدالاضحیٰ کی تکبیر تو ناصر نے اسے بھی اللہ تعالیٰ کے اس قول واذکروا اللہ فی ایام معدودات نیز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس قول کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ماھداکم کے مطابق واجب کہا ہے اور منصور باللہ نے بھی اس کی موافقت کی ہے اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں سب کے لئے سنت موکدہ ہے اور ان میں سے بھی مردوں کی تخصیص کی ہے رہا اس کا وقت تو آیت کریمہ اور صحابہ کے آثار سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے کوئی مقررہ وقت نہیں۔ الایہ کہ علماء نے وقت کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے مطلقاً" ہر نماز کے بعد خاص کیا اور بعض نے نوافل کو چھوڑ کر صرف فرض نمازوں کے بعد خاص کیا اور بعض نے اسے اکیلے اکیلے کو چھوڑ کر جماعت سے خاص کیا۔ بعض نے ادا کردہ نمازوں سے خاص کیا۔ قضاء نمازوں سے نہیں اور مسافر کو چھوڑ کر مقیم سے اور بستیوں کو چھوڑ کر شہروں سے خاص کیا۔

پھر تکبیروں کی ابتداء میں بھی اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن صبح سے شروع کی جائیں بعض ظہر سے اور بعض عصر سے ابتداء کرنے کو کہتے ہیں۔ اور انتہاء کے بارے میں تیسرے دن کی ظہر تک اور بعض کہتے ہیں کہ ایام تشریق کے آخر تک اور بعض ظہر تک اور بعض عصر تک اور اس بارے میں کوئی بھی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں جو اس کی وضاحت کر سکے اور زیادہ صحیح یہی بات ہے جو صحابہ سے علی اور ابن مسعود کا قول وارد ہوا ہے کہ یہ تکبیریں یوم عرفہ کی صبح سے لے کر ایام منیٰ کے آخر تک ہیں ان دونوں اقوال کو ابن المنذر نے روایت کیا ہے۔

رہی اس تکبیر کی صفت تو اس بارے میں زیادہ صحیح وہی روایت ہے جسے عبدالرزاق نے سلیمان سے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ تکبیر اس طرح کہو اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا نیز عبدالرزاق نے اسے سعید بن جبیر' مجاہد اور ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا۔ اور ایک قول شافعی کا ہے جس میں وللہ الحمد زیادہ ہے۔ اور شرح میں کئی اماموں سے ان تکبیروں کے اچھے اچھے بہت سے الفاظ مذکور ہیں اور اس معاملہ میں وسعت پر دلالت کرتے ہیں اور آیت کا اطلاق بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی تکبیروں کی مشروعیت کے بارے میں کچھ فرق نہیں کیونکہ دلائل برابر ہیں۔ اگرچہ لوگوں میں یہی مشہور ہے کہ تکبیریں عیدالاضحیٰ کے دوران ہوتی ہیں چنانچہ آیت میں ایام معدودات اور ایام معلومات میں اللہ کا ذکر کا حکم آیا ہے اس بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایام معدودات اور ایام معلومات الگ الگ ہیں ایام معدودات تو ایام تشریق ہیں اور ایام معلومات دس دن ہیں جن کا بخاری نے ابن عباس سے تعلیقاً" ذکر کیا اور دوسروں نے اسے موصول کیا ہے اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا کہ ایام معلومات تو ایام ترویہ' اور یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) اور یوم عرفہ ہیں اور ایام معدودات ایام تشریق ہیں' اور اس کی سند صحیح ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ عید بھی ایام تشریق میں شامل ہے نیز ابن ابی شیبہ نے بھی ابن عباس سے ایسا ہی روایت کیا ہے کہ "معدودات قربانی کا دن اور اس کے بعد تین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دن ہیں اور طحاوی نے اللہ تعالیٰ کے قول لیذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی مارزقھم من بھیمہ الانعام کے مطابق اسی کو ترجیح دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام معلومات قربانی کے دن ہیں اور یہ اس چیز سے مانع نہیں کہ دس ایام کو معلومات کا نام دیا جائے اور ایام تشریق کو ایام معدودات۔ چنانچہ بخاری نے ابوہریرہ اور ابن عمر سے تعلیقاً" روایت کیا کہ وہ دونوں دس ایام کے دوران بازار کو نکلتے تو تکبیریں کہتے اور لوگ بھی ان کے ساتھ تکبیریں کہتے" اور بغوی اور بیہقی نے بھی اسے ذکر کیا ہے طحاوی کہتے ہیں کہ ان دس ایام میں ہمارے بزرگ مل کر تکبیریں کہا کرتے تھے۔

فائدہ نمبر۲ ۔ حاکم نے حسن السبط کی حدیث سے روایت کیا کہ عیدین کے دن اچھا لباس پہننا اور بہتر سے بہتر خوشبو لگانا مستحب ہے اور اسی طرح قربانی کے دن موٹی تازی قربانی کرنا بھی۔ اس نے کہا' ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم عیدین کے دن اچھے سے اچھے کپڑے پہنیں' اچھی سے اچھی خوشبو لگائیں جو میسر ہو اور موٹی تازی قربانی کریں جو ہمیں میسر آئے۔ گائے سات آدمیوں کی طرف سے اور اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے اور تکبیریں اور سنجیدگی اور وقار ظاہر کریں۔ حاکم نے اسے اسحاق بن برزخ کے طریق سے روایت کرنے کے بعد کہا کہ اگر اسحاق کا مجہول ہونا آڑے نہ آتا تو اس حدیث کے صحیح ہونے کا حکم لگایا جاتا۔

میں کہتا ہوں کہ اسحاق مجہول نہیں۔ اگر ازدی نے اسے ضعیف کہا ہے تو ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے۔ تلخیص میں مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سورج گرہن کی نماز کا بیان

٤٦٨- عن المغيرة بن شعبة رضي الله تعالى عنه قال: انكسفت الشمس على عهد رسول الله ﷺ يوم مات إبراهيم[١]، فقال الناس: انكسفت الشمس لموت إبراهيم، فقال رسول الله ﷺ: **«إن الشمس والقمر آيتان من آيات الله، لا ينكسفان لموت أحد ولا لحياته، فإذا رأيتموهما فادعوا الله وصلّوا، حتى تنكشف»**. متفق عليه، وفي رواية للبخاري: «حتى تنجلي».

٤٦٩- وللبخاري من حديث أبي بكرة: فصلّوا، وادعوا، حتى ينكشف ما بكم.

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورج کو گرہن لگا اور اسی دن (آپؐ کے صاحبزادے) ابراہیم (۱) فوت ہوئے تو لوگ کہنے لگے کہ ابراہیم کی وفات کی وجہ سے سورج کو گرہن لگ گیا ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا(۲) کہ ”سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جنہیں کسی کی زندگی یا موت کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا۔ لہٰذا جب تم سورج یا چاند کو گرہن کی حالت میں دیکھو تو اللہ سے دعا کرو اور نماز(۳) پڑھو تا آنکہ گرہن کھل(۴) جائے“ متفق علیہ(۵)۔ اور بخاری ہی ایک دوسری روایت(۶) میں ہے تا آنکہ روشن(۷) ہو جائے۔ اور بخاری(۸) میں ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ”نماز پڑھو اور دعاء کرو تا آنکہ تم پر پڑی ہوئی یہ افتاد دور ہو جائے۔“

(۱) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ان کی وفات ۱۰ھ میں ہوئی۔ ابوداؤد نے کہا۔ یہ منگل کا دن تھا اور ربیع الاول کے دس دن گزر چکے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بدھ کا دن تھا۔

(۲) یعنی لوگوں کے اس خیال کی تردید کی۔

(۳) یہ مسلم کے الفاظ ہیں جبکہ بخاری میں یوں ہیں ”تو نماز پڑھو اور اللہ سے دعا کرو“۔

(۴) اصل میں تنکشف کا لفظ آیا ہے یہ لفظ بخاری میں نہیں بلکہ مسلم کا ہے۔

(۵) اصل میں کسفت کا لفظ ک کی فتحہ سے ہے اور کبھی کبھی ضمہ سے بھی آتا ہے اور انکسفت اور خسفت میں خ پر فتحہ ہے اور کبھی کبھی ضمہ سے بھی آتا ہے اور اس سے انخسفت آتا ہے۔

اور علماء نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ دونوں لفظ سورج اور چاند میں سے ہر ایک کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں یا ہر ایک کے لئے ان میں سے ایک لفظ مختص ہے؟ قرآن میں چاند کے لئے خسوف کی نسبت ثابت ہے اور حدیث میں خسفت الشمس کا لفظ آیا ہے جیسا کہ ان دونوں کے لئے کسوف کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نسبت ثابت ہے اور ان دونوں کا استعمال ان دونوں کے لئے بھی ثابت ہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ الشمس والقمر ینخسفان وینکسفان البتہ احادیث میں چاند کے لئے انفرادی طور پر کسوف کی نسبت وارد نہیں ہوئی۔ اسی بنا پر فقہاء بالخصوص سورج کے لئے کسوف اور چاند کے لئے خسوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ثعلب نے اسی بات کو اختیار کیا ہے اور جوہری نے کہا ایسا استعمال زیادہ فصیح ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں لفظ سورج اور چاند میں سے ہر ایک کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اور لغوی لحاظ سے کسوف کا معنی سیاہی طرف تبدیلی اور خسوف کا معنی نقصان یا کمی ہے اور اس بارے میں اور بھی کئی اقوال ہیں۔

اور صحابہ نے سورج کے گرہن کو ابراہیم کی وفات کی وجہ سے اس لئے سمجھا کہ یہ گرہن حسب معمول دنوں میں نہیں لگا تھا اور اس گرہن کے متعلق یہ اتفاق نہیں ہو سکا کہ آیا یہ ہجرت کے دسویں سال لگا تھا یا چوتھے سال۔ اسی لئے صحابہ نے کہا کہ یہ گرہن اس عظیم حادثہ کی وجہ سے لگا ہے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے اس خیال کی تردید کی اور انہیں بتلایا کہ سورج اور چاند اللہ کی علامات میں سے دو علامتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت نیز بندوں کو اللہ کی گرفت سے اور اس کی سطوت سے ڈرانے پر دلالت کرتی ہیں اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول ومانرسل بالآیات الاتخویفا سے ماخوذ ہے۔

اور حدیث میں لحیاتہ کا لفظ بھی آیا ہے حالانکہ صحابہ نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ جو اس بات کی وضاحت ہے کہ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں جیسے تم یہ نہیں کہتے کہ فلاں کی زندگی کی وجہ سے گرہن لگا ایسے ہی کسی کی موت سے بھی انہیں گرہن نہیں لگتا یا جیسے حیاتہ سے آپؐ کی مراد ابراہیم کی مرض سے صحت ہو یا ایسی ہی کوئی اور مراد ہو علاوہ ازیں بات تو صرف سورج گرہن کی تھی مگر آپؐ نے ساتھ ہی چاند کا ذکر افادیت میں اضافہ کے لئے کر دیا اور واضح کیا کہ اس معاملہ میں ان دونوں سیاروں کا حکم ایک ہے۔ پھر بندوں کی یہ رہنمائی فرمائی کہ جب گرہن دیکھیں تو ان کے لئے نماز اور دعا مشروع کی گئی ہے اور اس نماز کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اور امر وجوب پر دلیل ہوتا ہے مگر جمہور نے اسے سنت موکدہ پر محمول کیا ہے تا کہ پانچ نمازوں کے وجوب میں انحصار ہی رہے اور ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں اس کے واجب ہونے کی صراحت کی ہے اور ابو حنیفہ سے منقول ہے کہ میں اسے واجب سمجھتا ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گرہن کھلنے تک کا سارا وقت دعاء اور نماز میں گزارا۔ جو اس بات پر دلیل ہے کہ روشن ہونے پر نماز کا وقت فوت ہو جاتا ہے پھر جب سورج روشن ہو جائے اور وہ نماز میں ہو تو اسے پورا نہ کرے بلکہ جتنا عمل کیا ہے اسی پر اکتفا کرے۔ الا یہ کہ مسلم کی روایت میں ہے "پھر آپ نے سلام پھیرا تو سورج روشن ہو چکا تھا" جو اس بات پر دلیل ہے کہ نماز پوری کر لے اگرچہ سورج روشن ہو چکا ہو۔ اور باقی تمام نمازوں پر قیاس اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ قید رکوع کی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور جب رکوع کر چکا تو اسے پورا کر لے۔

علاوہ ازیں اس حدیث میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ نماز کی ادائیگی میں سبب کے حصول کی قید ہے خواہ یہ کوئی بھی وقت ہو اور جمہور کا یہی مذہب ہے جبکہ احمد اور ابو حنیفہ مکروہ اوقات میں اس کی ادائیگی کے قائل نہیں۔

(۶) یعنی مغیرہ سے۔

(۷) یہ تنکشف کا بدل ہے اور دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے۔

(۸) یہ پہلی حدیث ہے جسے بخاری نے باب الکسوف میں بیان کیا ہے اور اس کے لفظ یکشف سے مراد یہ ہے کہ سورج یا چاند کے گرھن سے تم پر جو افتاد نازل ہوئی ہے وہ اٹھ جائے۔

۴۷۰- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ جهر في صلاة الكسوف بقراءته، فصلى أربع ركعات، في ركعتين وأربع سجدات. متفق عليه، وهذا لفظ مسلم. وفي رواية له: فبعث منادياً ينادي «الصلاة جامعة».

عائشہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گرہن کی نماز میں قرات بلند آواز سے کی۔ آپ نے دو رکعتوں میں چار رکوع کئے اور چار سجدے کئے۔ متفق علیہ۔ اور یہ لفظ مسلم کے(۱) ہیں۔ اور مسلم ہی کی ایک روایت(۲) میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منادی مقرر کیا جو یہ ندا کرے کہ "جماعت کی نماز(۳) تیار ہے۔"

(۱) یہ حدیث نماز کسوف میں قراءت بالجہر کی شرعیت پر دلیل ہے اور یہاں مراد سورج گہن ہے جیسا کہ احمد نے خسفت الشمس کے لفظ سے روایت کیا اور کہا "پھر آپ نے بلند آواز سے قرات کی" نیز جہر کو ترمذی' طحاوی اور دار قطنی نے بھی روایت کیا اور ابن خزیمہ سے علی رضی اللہ عنہ سے اسے مرفوعا" روایت کیا ہے کہ نماز کسوف میں قراءت بلند آواز سے ہے اور اس بارے میں چار اقوال ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ اس حدیث اور دوسری حدیثوں کی رو سے سورج گرہن اور چاند گرہن کی نماز میں علی الاطلاق بلند آواز سے قراءت کی جائے یہ بات اگرچہ سورج گرہن کے بارے میں وارد ہے تاہم چاند گرہن بھی اسی کی مثل ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں حکم کو جمع کیا جب فرمایا فاذا رایتموھما یعنی "ان دونوں میں سے کسی کا گرہن دیکھو تو نماز پڑھو اور دعاء کرو" اور اصل یہ ہے کہ دونوں نمازوں کی کیفیت ایک جیسی ہے احمد' اسحاق' ابوحنیفہ' ابن خزیمہ' ابن المنذر اور پچھلوں کا یہی مذہب ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ قراءت سری کی جائے بمطابق حدیث ابن عباس "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بقرہ کے لگ بھگ طویل قیام کیا۔" اگر آپ اتنی قراءت جہر سے کرتے تو اس پر قادر نہ ہو سکتے نیز بخاری نے ابن عباس سے تعلیقاً روایت کیا کہ "ابن عباس نماز کسوف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک پہلو میں کھڑے تھے مگر وہ آپ سے ایک حرف بھی نہ سن سکے" اور بیہقی نے اسے تین طریقوں سے موصول کیا لیکن سب کی سندیں کمزور ہیں لہٰذا اس قول کو کمزور قرار دیا کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ ابن عباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہوں اور آپ کی جہر سے قراءت سن نہ سکے ہوں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اسے اختیار ہے خواہ جہراً پڑھے یا سراً۔ کیونکہ دونوں باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں جیسا کہ آپ کو دونوں اقوال کے دلائل سے معلوم ہو چکا۔
چوتھا قول یہ ہے کہ سورج گرہن میں سراً اور چاند گرہن میں جہراً پڑھے اور یہ ابوحنیفہ کے علاوہ باقی تین اماموں کا قول ہے ان کا یہ قول ابن عباس کی حدیث کے مطابق اور پانچ نمازوں پر قیاس کرنے کی بنا پر ہے اور اہل جہر کی جو علی الاطلاق دلیل پہلے گزر چکی ہے وہ ان کے قول کی تائید کرتی ہے۔
اس حدیث سے نماز کسوف کی کیفیت معلوم ہوتی ہے کہ وہ دو رکعتیں ہیں دو رکوع ہیں اور دو سجدے اور چوتھی حدیث کی شرح میں اس سے اختلاف کا ذکر آرہا ہے۔

(۲) یعنی مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث۔
(۳) اصل میں الصلوۃ جامعہ کے الفاظ ہیں اور یہ دونوں لفظ منصوب ہیں پہلا مفعول ہونے کی بنا پر جس کا فعل احضروا "حاضر ہو جاؤ" اور یہ حدیث اجتماع کے لئے ان الفاظ سے اعلان کرنے کی مشروعیت پر دلیل ہے نیز اس نماز کے علاوہ اور کسی نماز کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے الفاظ وارد نہیں ہوئے۔

۱۷۴۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: انخسفت الشمس على عهد رسول الله ﷺ فصلى، فقام قياماً طويلاً نحواً من قراءة سورة البقرة، ثم ركع ركوعاً طويلاً، ثم رفع، فقام قياماً طويلاً، وهو دون القيام الأول، ثم ركع ركوعاً طويلاً، وهو دون الركوع الأول، ثم سجد، ثم قام قياماً طويلاً، وهو دون القيام الأول، ثم ركع ركوعاً طويلاً، وهو دون الركوع الأول، ثم رفع، فقام قياماً طويلاً، وهو دون القيام الأول، ثم ركع ركوعا طويلا، وهو دون الركوع الأول، ثم رفع رأسه، ثم سجد، ثم انصرف، وقد تجلت الشمس، فخطب الناس.
متفق عليه، واللفظ للبخاري.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وفي رواية لمسلم: صلى حين كسفت الشمس ثماني ركعات في أربع سجدات.

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ سورج کو گرہن لگ گیا تو آپ نے نماز پڑھی اور سورہ بقرہ کی قراءت کے برابر لمبا قیام کیا۔ پھر لمبا رکوع کیا پھر اپنا سر اٹھایا اور لمبا قیام کیا مگر یہ پہلے قیام سے چھوٹا تھا۔ پھر لمبا رکوع کیا مگر یہ پہلے رکوع سے چھوٹا تھا۔ پھر سجدہ کیا' پھر آپ کھڑے ہوئے اور لمبا قیام کیا مگر یہ پہلے قیام سے چھوٹا پھر ایک لمبا رکوع کیا اور یہ پہلے رکوع سے چھوٹا تھا پھر آپ نے سر اٹھایا پھر کھڑے ہوئے اور لمبا قیام کیا مگر یہ پہلے قیام سے چھوٹا تھا۔ پھر آپ نے ایک لمبا رکوع کیا مگر یہ پہلے رکوع سے چھوٹا تھا۔ پھر سجدہ کیا پھر جب نماز سے فارغ ہو چکے تو سورج روشن ہو چکا تھا۔ پھر آپ نے لوگوں کو خطبہ دیا۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں(۱)۔ اور مسلم کی روایت(۲) ہے کہ جس وقت سورج کو گرہن لگا آپ نے نماز پڑھی اور آپ نے چار سجدوں میں آٹھ رکوع کئے(۳)۔

(۱) جاننا چاہئے کہ نماز کسوف سے متعلق کئی طرح بہت روایات آئی ہیں جنہیں شیخین' ابوداؤد وغیرہم نے ذکر کیا ہے اور یہ باتفاق علماء سنت ہے مگر اتفاق کا دعویٰ محل نظر ہے کیونکہ ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں اس کے واجب ہونے کی صراحت کی ہے اور مالک سے بیان کیا کہ وہ اسے جمعہ کے قائم مقام سمجھتے تھے اور ابوحنیفہ سے اس کا وجوب پہلے گزر چکا ہے اور شافعی اور ایک جماعت نماز کسوف باجماعت کو مسنون کہتے ہیں اور دوسرے اکیلے اکیلے پڑھنے کو بھی۔ پہلوں کی دلیل وہ صحیح احادیث ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے باجماعت ادا کرنا مذکور ہے پھر انہوں نے اس کی کیفیت میں اختلاف کیا۔ جمہور یہ کہتے ہیں کہ یہ دو رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو قیام' دو قراءتیں اور دو رکوع ہیں اور ویسے ہی جیسے عام نمازوں میں ہوتے ہیں مالک' شافعی' لیث اور پچھلوں کا یہی مذہب ہے۔

اور حدیث کے الفاظ نحوا من قراءة سورة بقره اس بات پر دلیل ہیں کہ ان میں قرآن پڑھا جائے۔ نووی کہتے ہیں۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پہلی رکعت کے پہلے قیام میں سورہ فاتحہ بھی پڑھی جائے البتہ دوسرے قیام میں اختلاف ہے اور ہمارا اور مالک کا مذہب یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں۔ نیز اس میں رکوع لمبا کرنے پر دلیل ہے مصنف کہتے ہیں کہ میں نے کسی روایت میں یہ نہیں دیکھا کہ رکوع میں آپ نے کیا کچھ پڑھا۔ البتہ اس بات پر اتفاق ہے کہ رکوع میں قراءت نہیں ہوتی کیونکہ رکوع میں صرف ذکر اور تسبیح و تکبیر وغیرہ ہی مشروع ہے۔

اور حدیث کے الفاظ وهودون الاول سے اس بات پر دلیل ہے کہ وہ قیام جو سجدہ کے بعد کیا وہ اتنا لمبا نہیں بلکہ پہلے سے چھوٹا تھا۔ اگرچہ مسلم میں جابر کی حدیث میں آیا ہے کہ "آپ نے اسے بھی لمبا کیا" لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نووی کہتے ہیں کہ یہ روایت شاذ ہے لہٰذا معمول بہا نہیں ہے اور قاضی نے اس بات پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے جو قیام سجدہ کے بعد تھا وہ پہلے جتنا لمبا نہیں تھا اور اس روایت کی یہ تاویل کی کہ اس سے مراد اطمینان کی زیادتی کا ابطال ہے۔ اور اس روایت میں سجدہ کی لمبائی کا ذکر نہیں کیا لیکن اس کی لمبائی بخاری میں ابوموسیٰ کی روایت سے ثابت ہے اور مسلم میں ابن عمر کی حدیث سے۔ نووی کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب میں محققین نے کہا کہ شافعی کے نزدیک اس کی وضاحت یہ ہے کہ صحیح احادیث کی بناء پر سجدہ بھی لمبا کیا جائے۔ چنانچہ ابوداؤد اور نسائی نے سمرۃ کی حدیث سے روایت کیا کہ آپ نماز میں جتنا سجدہ کرتے تھے وہ ان سے لمبا تھا اور مسلم میں جابر کی حدیث میں ہے "اور آپ کا سجدہ بھی رکوع کی طرح تھا" اس حدیث سے اہل علم کو یقین حاصل ہو گیا اور آپ رکوع کے بعد سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تھے پھر اس کے بعد کہتے ربنا لک الحمد ...... الی آخرہ۔ اور دو سجدوں کے درمیان جلسہ بھی لمبا کرتے تھے۔ چنانچہ مسلم میں جابر کی حدیث میں دو سجدوں کے درمیان لمبائی کا برابر ہونا مذکور ہے۔ مصنف کہتے ہیں مجھے صرف اس روایت سے اس کی واقفیت ہوئی اور جو غزالی نے لمبا نہ ہونے پر اتفاق نقل کیا ہے وہ مردود ہے۔

اور حدیث کے الفاظ "پھر آپ کھڑے ہوئے اور لمبا قیام کیا مگر وہ پہلے قیام سے چھوٹا تھا" دوسری رکعت میں قیام کی طوالت پر دلیل ہیں لیکن وہ پہلی رکعت سے کم ہونا چاہئے۔ اور ابوداؤد میں روایت ہے کہ "آپ نے سورہ آل عمران پڑھی" ابن بطال کہتے ہیں اس میں کچھ اختلاف نہیں کہ پہلی رکعت کا قیام اور رکوع دوسری رکعت کے قیام اور رکوع سے لمبا تھا۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا ایک ہی رکعت کے دو قیام اور دو رکوع آپس میں برابر تھے یا دوسرا قیام اور رکوع پہلے قیام اور رکوع سے چھوٹا تھا؟ کہتے ہیں کہ اس اختلاف کا سبب حدیث کے الفاظ وھودون القیام الاول کے معنیٰ کا فہم ہے کہ آیا ہر رکعت کا دوسرا قیام پہلے سے چھوٹا تھا یا ہر قیام اپنے سے پہلے قیام سے چھوٹا ہوتا تھا؟

اور حدیث کے الفاظ فخطب الناس اس بات پر دلیل ہیں کہ نماز کسوف کے بعد خطبہ مشروع ہے۔ شافعی اور اکثر ائمہ اس کے استحباب کے قائل ہیں اور حنفیہ کہتے ہیں کہ کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ وہ منقول نہیں۔ اور ان کا ان احادیث سے تعاقب کیا گیا جو خطبہ کے بارے میں صریح ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ کا ارادہ نہیں تھا بلکہ اس اعتقاد کا رد مقصود تھا کہ گرہن کسی کی موت کے سبب سے لگتا ہے۔ حالانکہ بخاری کی روایت میں ہے کہ "آپؐ نے جنت، دوزخ اور ان کے علاوہ کئی باتوں کے احوال کا ذکر کیا" اور یہی خطبہ کے مقاصد ہوتے ہیں اور فاطمہ عن اسماء کی حدیث جو مسلم میں ہے اس میں اسماء نے کہا "تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا۔ اما بعد "جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیز بھی میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی وہ میں نے اپنی اس جگہ پر دیکھ لی ہے حتیٰ کہ جنت اور جہنم بھی دیکھی۔ نیز یہ کہ میری طرف وحی کی گئی ہے۔ عنقریب قبروں میں تمہاری جانچ پڑتال ہو گی یا اسی طرح مسیح دجال کے فتنہ سے بھی ہو گی" میں نہیں جانتا یہ بات کس نے کہی۔ اسماء کہتی ہیں "تم میں سے ہر شخص کے پاس قبر میں فرشتہ آئے گا اور ہر ایک کو پوچھا جائے گا کہ تو اس شخص کے متعلق کیا جانتا ہے؟ پھر ایمان لانے والا یا یقین رکھنے والا' راوی کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اسماء نے مومن کہا یا موقن کہا، تو کہے گا کہ یہ شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ ہمارے پاس روشن دلائل اور ہدایت لائے تو ہم نے اسے قبول کیا اور آپ کی اطاعت کی۔ وہ تین بار یہ الفاظ کہے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ "سو جا۔ ہم جانتے تھے کہ تو اس پر ایمان لایا تھا لہٰذا میٹھی نیند سو جا" اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں خطبہ کے الفاظ زیادہ ہیں۔

(۲) یہ روایت ابن عباس سے ہے۔

(۳) دو رکعت میں کیونکہ ہر رکعت میں دو سجدے ہوتے ہیں مراد یہ ہے کہ آپ نے ہر رکعت میں چار رکوع کیے تو دو رکعتوں میں آٹھ رکوع ہو گئے اور ایک گروہ کا یہی مذہب ہے۔

۴۷۲- وعن علي رضي الله تعالى عنه مثل ذلك.

اور علی رضی اللہ عنہ(۱) سے بھی ایسا(۲) ہی منقول ہے۔

(۱) جسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

(۲) یعنی ابن عباس کی روایت جیسا۔

۴۷۳- وله عن جابر رضي الله تعالى عنه: صلى ست ركعات بأربع سجدات.

اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے چار سجدوں کے ساتھ چھ رکوع نماز پڑھی۔
یعنی دو رکعت پڑھیں اور ہر رکعت میں تین رکوع اور دو سجدے کیے۔

۴۷۴- ولأبي داود عن أبي بن كعب رضي الله تعالى عنه: صلى، فركع خمس ركعات، وسجد سجدتين، وفعل في الثانية مثل ذلك.

اور ابوداؤد میں ابن ابی کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے نماز پڑھی تو پہلی رکعت میں پانچ رکوع اور دو سجدے کیے اور دوسری رکعت میں بھی ایسا ہی کیا۔

ان سب احادیث کو اکٹھا کرنے سے آپ کو یہ تو معلوم ہو چکا کہ نماز کسوف بالاتفاق دو رکعت ہے۔ اگر اختلاف ہے تو ہر رکعت میں رکوع کی تعداد میں ہے۔ مصنف نے جو روایت بیان کی ہیں انہیں اکٹھا کرنے سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چار صورتیں سامنے آتی ہیں پہلی یہ کہ ہر رکعت میں دو رکوع ہوں۔ شافعی' مالک' لیث' احمد وغیرہم نے اسی بات کو قبول کیا ہے اور اس پر عائشہ' جابر' ابن عباس اور ابن عمر کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس باب میں سب سے صحیح یہی بات ہے اور باقی روایات معلل اور ضعیف ہیں۔

دوسری صورت یہ کہ رکعتیں تو دو ہی ہوں اور ہر رکعت میں چار رکوع ہوں۔ یہی وہ بات ہے جو مسلم میں مروی ابن عباس اور علی رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتی ہے تیسری صورت یہ کہ رکعتیں وہی ہوں اور ہر رکعت میں تین رکوع ہوں اور اس پر جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ اور چوتھی یہ کہ رکعتیں دو ہی ہوں اور ہر رکعت میں پانچ رکوع ہوں۔

اب چونکہ روایات میں اختلاف ہے لہٰذا علماء میں بھی اختلاف ہوا اور جمہور نے پہلی صورت کو ہی قبول کیا ہے جو ابن عبدالبر کا کلام ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔ اور نووی نے شرح مسلم میں کہا کہ بعض صحابہ نے ہر صورت کو قبول کیا ہے۔ اور محققین کی ایک جماعت نے کہا کہ اسے کوئی صورت پسند کرنے کا اختیار ہے جو بھی اختیار کرے وہی اچھی ہے۔ اور یہ اختلاف اس بات پر مبنی ہے کہ کسوف کئی بار ہوا تو آپ نے کبھی ایک طرح کیا اور کبھی دوسری طرح لیکن اس بات کی تحقیق ہو چکی ہے کہ یہ سب روایات ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہیں اور یہ وہ نماز تھی جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کی وفات ہوئی۔ اسی لئے پچھلوں نے ان احادیث کو معلول قرار دیا ہے جن میں باقی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ ابن قیم کہتے ہیں۔ ائمہ کبار اسی لئے تعدد کسوف کو صحیح نہیں سمجھتے جیسے امام احمد' بخاری اور شافعی انہیں غلط سمجھتے ہیں اور حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ دو رکعت بھی ایسے ہی پڑھے' جیسے باقی سب نوافل پڑھے جاتے ہیں۔

٤٧٥- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: ما هبت الريح قط، إلا جثا النبي ﷺ على ركبتيه، وقال: «**اللهم اجعلها رحمة، ولا تجعلها عذاباً**». رواه الشافعي والطبراني.

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جب کبھی بھی تیز ہوا چلتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے(۱) اور کہتے: "یا اللہ! اس ہوا کو رحمت بنا اور عذاب نہ بنانا" اسے شافعی اور طبرانی نے روایت کیا۔

(۱) ایسا بیٹھنا خوف کی وجہ سے ہوتا ہے اور عموماً" وہی شخص اس طرح بیٹھتا ہے جو ڈر رہا ہو۔

ریح بمعنی ہوا کا لفظ اسم جنس ہے اور اس کا استعمال ہر طرح کی ہوا پر ہو سکتا ہے خواہ وہ رحمت لانے والی ہو یا عذاب لائے۔ اور ابوہریرہ کی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ "ہوا اللہ تعالیٰ کی روح سے ہے جو رحمت بھی لاتی ہے اور عذاب بھی لہٰذا اسے گالی نہ دیا کرو" اور ابن عباس کی حدیث کا باقی حصہ یوں ہے "اے اللہ!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے ریاح بنا دے ریح نہ بنانا" جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ لفظ اگر مفرد استعمال ہو تو عذاب کے لئے اور جمع ہو تو رحمت کے لئے آتا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اللہ کی کتاب میں ہے۔ انا ارسلنا علیھم ریحا صرصرا (ہم نے ان پر سخت ٹھنڈی اور تندو تیز آندھی بھیج دی) نیز فرمایا اذ ارسلنا علیھم الریح العقیم (جب ہم نے ان پر ایسی ہوا بھیجی جو خیر سے بالکل خالی تھی) اور اس کے مقابلہ میں فرمایا وارسلنا الریاح لواقح (اور ہم نے بار بردار ہوائیں بھیجیں) نیز فرمایا ومن ایاته ان یرسل الریاح مبشرات (اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خوشخبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے) اسے شافعی نے دعوات کبیر میں روایت کیا اور اس میں یہ وضاحت ہے کہ یہ لفظ اگر جمع کے صیغہ سے آئے تو رحمت اور مفرو آئے تو عذاب کے لئے آتا ہے۔ تو اب اس حدیث میں اشکال پیدا ہو گیا جس میں صیغہ مفرد ہونے کے باوجود رحمت طلب کی گئی ہے اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس ریح سے ہمیں ہلاک نہ کر اور اس ریح کے ساتھ اور ریح بھیج دے تاکہ یہ عذاب کے بجائے رحمت کی شکل بن جائے۔

٤٧٦- وعنه رضي الله تعالى عنه، أنه صلى في زلزلة ست ركعات، وأربع سجدات، وقال: هكذا صلاة الآيات. رواه البيهقي، وذكر الشافعي عن علي ابن أبي طالب رضي الله تعالى عنه مثله، دون آخره.

اور انہی ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے زلزلہ کے وقت نماز پڑھائی جس میں چار سجدے اور چھ رکوع کئے (۱) اور کہا کہ آیات الٰہی کی نماز اسی طرح ہے، اسے بیہقی نے روایت کیا اور شافعی نے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اسی طرح بیان کیا ہے لیکن اس میں آخری حصہ نہیں (۲)۔

(۱) یعنی دو رکعت پڑھیں اور ہر رکعت میں تین رکوع کئے۔

(۲) یعنی اس میں ھکذا صلوۃ الایات کے الفاظ نہیں ہیں۔

اسے بیہقی نے عبداللہ بن حارث کے طریق سے روایت کیا کہ یہ واقعہ بصرہ میں زلزلہ کے وقت کا ہے اور اسے ابن ابی شیبہ نے اسی طریق سے مختصرا روایت کیا کہ "ابن عباس نے لوگوں کو زلزلہ کے وقت نماز پڑھائی جس میں چار سجدے اور چھ رکوع کئے" اور ظاہر لفظ یہی ہے کہ ابن عباس نے باجماعت نماز پڑھائی۔ آل میں سے قاسم کا یہی مذہب ہے اور کہا کہ کسی بھی گھبراہٹ کے وقت نماز کسوف کی طرح نماز پڑھتے اور چاہتے تو دو رکعت پڑھتے۔ اور احمد بن حنبل نے بھی اس سے موافقت کی ہے لیکن کہا کہ یہ نماز کسوف جیسی ہی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کتب حنابلہ میں تو یہ ہے کہ وہ نماز کسوف دو رکعت پڑھتے جب چاہتے۔ اور شافعی وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ نماز باجماعت مسنون نہیں' رہی اکیلے کی نماز تو وہ خوب ہے اس نے کہا یہ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسوف کی نمازوں کے سوا باجماعت نماز کا حکم مروی نہیں ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استسقاء کی نماز کا بیان

یعنی جب بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین خشک اور بنجر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کی نماز۔ ابن ماجہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جس قوم نے بھی ناپ تول کی کمی کی وہ قحط' آفات اور بادشاہوں کے ظلم کا نشانہ بنی اور جنہوں نے اپنے اموال کی زکوۃ ادا نہ کی تو ان پر آسمان سے بارش بند ہو گئی۔

۴۷۷- عن ابن عباس رضي الله تعالى عنه قال: خرج النبي ﷺ متواضعاً، متبذلاً، متخشعاً، مترسلاً، متضرعاً، فصلى ركعتين، كما يصلي في العيد، لم يخطب خطبتكم هذه. رواه الخمسة، وصححه الترمذي وأبو عوانة وابن حبان.

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے بڑی انکساری کے ساتھ معمولی سے کپڑے پہنے ہوئے' ڈرتے ہوئے' دھیمی چال چلتے ہوئے اور زاری کرتے ہوئے نکلے۔ پھر دو رکعت نماز پڑھائی جیسے عید کی نماز پڑھتے تھے اور تمہارے اس خطبہ کی طرح خطبہ نہیں دیا تھا(۱)۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی' ابوعوانہ اور ابن حبان نے صحیح کہا(۲)۔

(۱) ابوداؤد کے الفاظ یوں ہیں کہ آپ دعاء میں' زاری میں اور تکبیریں کہنے میں ہی لگے رہے۔ پھر آپ نے عید کی نماز کی طرح دو رکعت نماز پڑھائی' ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے دعاء کے بعد نماز پڑھی اور مصنف جو الفاظ لایا ہے وہ اس بارے میں صریح نہیں ہیں۔

(۲) نیز اسے حاکم' بیہقی' اور دار قطنی نے روایت کیا۔

یہ حدیث استسقاء کی نماز کی شرعیت پر دلیل ہے اور آل کا یہی مذہب ہے اور ابوحنیفہ نے کہا کہ نماز استسقاء نہ پڑھے کیونکہ مشروع صرف دعاء ہے۔ پھر اس نماز کے مشروع ہونے کے قائلین میں اختلاف ہوا۔ ایک جماعت نے کہا کہ وہ انہی تکبیر اور قراءت کے لحاظ سے عید کی نماز کی طرح ہے اور یہ شافعی کا قول ہے جو ابن عباس کی حدیث کے مطابق عمل کرتے ہیں اور دوسروں نے کہا کہ یہ نماز بس صرف دو رکعت ہے اس سے زائد اس میں کچھ نہیں اور یہ آل کی ایک جماعت کا مذہب ہے۔ اور یہ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور مالک بھی اسی کے قائل ہیں وہ عباد بن تمیم کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے بخاری نے روایت کیا ہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو رکعت نماز پڑھائی" اور جیسا کہ عنقریب آنے والی عائشہ کی حدیث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور ابن عباس کی حدیث کی انہوں نے یہ تاویل کی کہ یہ تشبیہ صرف رکعتوں کی تعداد میں ہے اس کی کیفیت میں نہیں۔ اور اس تاویل کو ابن عباس کی وہ حدیث دور کر دیتی ہے جسے دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ "آپ نے اس میں عیدین کی طرح سات اور پانچ تکبیریں کہیں اور سبح اسم ربک اور ھل اتاک کی قراءت کی" اگرچہ اس کی سند میں کلام ہوا ہے تاہم یہ زیر بحث حدیث کی تائید کرتی ہے۔

رہے ابوحنیفہ تو انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیت کے پتھروں کے پاس بارش کے لئے دعا کی" اور ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگوں نے قحط کا شکوہ کیا تو آپ نے فرمایا: "گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور کہو اے پروردگار اے پروردگار" اور انہیں جواب دیا گیا کہ آپؐ سے دو رکعت نماز ثابت ہے اور بعض دفعہ ترک بھی ثابت ہے تاکہ جواز کی وضاحت ہو جائے۔ اور ابن قیم نے الھدی النبوی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے استسقاء کی اقسام شمار کی ہیں۔ پہلی قسم آپ کا نماز کے لئے باہر عیدگاہ کی طرف نکلنا' نماز پڑھنا اور خطبہ دینا ہے۔ دوسری قسم جمعہ کے دن برسر منبر خطبہ کے دوران' تیسری قسم آپ کا جمعہ کے علاوہ کسی دن مدینہ کے منبر پر اکیلے بارش کے لئے دعا کرنا اور یہ بات محفوظ نہیں کہ اس میں نماز بھی تھی یا نہیں۔ چوتھی قسم آپ نے مسجد میں بیٹھے بیٹھے بارش کے لئے دعا کی اپنے ہاتھ اٹھائے اور اللہ عزوجل کو پکارا۔ پانچویں قسم آپ نے زیت کے پتھروں کے پاس بارش کے لئے دعاء کی اور یہ مقام مسجد کے دروازے سے باہر زوراء کے قریب ہے۔ چھٹی قسم آپ نے بعض غزوات میں بارش کے لئے دعا کی جبکہ مشرک آپ سے پہلے پہنچ کر پانی پر قبضہ جما چکے تھے اور ایسے مواقع پر ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی فریاد سنی اور بارش برسائی۔

نیز نماز استسقاء کے خطبہ میں بھی اختلاف ہوا۔ ہادی کا مذہب یہ ہے کہ بقول ابن عباس لم یخطب اس نماز میں خطبہ نہیں ہے۔ حالانکہ ابن عباس نے صرف ایسے خطبہ کی نفی کی جیسا کہ طویل خطبہ لوگوں نے دینا شروع کر دیا تھا اور وہ بات ذکر کی کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی تھی۔ نیز ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے" اور ظاہر ہے کہ منبر پر چڑھنا خطبہ ہی کے لئے ہوتا ہے اور دوسروں کا مذہب یہ ہے کہ نماز استسقاء میں جمعہ کی طرح خطبہ دے۔ یہ لوگ حضرت عائشہ کی آنے والی اور ابن عباس کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

پھر یہ اختلاف ہوا کہ خطبہ نماز سے پہلے دے یا بعد میں۔ ناصر اور ایک جماعت خطبہ پہلے دینے کی قائل ہے اور شافعی اور دوسرے لوگ بعد میں دینے کے قائل ہیں۔ وہ ابوہریرہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ جسے احمد' ابن ماجہ' ابو عوانہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم استسقاء کے لئے نکلے تو دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر خطبہ دیا" اور پہلے گروہ نے ابن عباس کی اسی حدیث سے استدلال کیا ہے جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے الفاظ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں اور ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کام سے ابتداء کی وہ دعا ہے بعض راویوں نے دعاء کو خطبہ سے تعبیر کیا اور اسی پر اکتفا کیا اور بعد کے خطبہ کا ذکر نہ کیا اور جس راوی نے خطبہ سے پہلے نماز کا ذکر کیا اس نے اسی پر اکتفاء کیا اور نماز سے پہلے دعاء کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ہے دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت رہی یہ بات کہ وہ کیا دعا کرے تو بہتر روش یہی ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہے وہی دعا کرے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعاء کی تھی ان الفاظ کی وضاحت اگلی حدیث میں مذکور ہے۔

۴۷۸۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: شكا الناس إلى رسول الله ﷺ قحوط المطر، فأمر بمنبر، فوضع له في المصلى، ووعد الناس يوماً يخرجون فيه، فخرج حين بدا حاجب الشمس، فقعد على المنبر، فكبّر وحمد الله، ثم قال: إنكم شكوتم جدب دياركم، وقد أمركم الله أن تدعوه، ووعدكم أن يستجيب لكم، ثم قال: الحمد لله رب العالمين، الرحمن الرحيم، مالك يوم الدين، لا إله إلا الله، يفعل ما يريد، اللهم أنت الله، لا إله إلا أنت، أنت الغني، ونحن الفقراء، أنزل علينا الغيث، واجعل ما أنزلت علينا قوة وبلاغاً إلى حين. ثم رفع يديه، فلم يزل حتى رئي بياض إبطيه، ثم حول إلى الناس ظهره، وقلب رداءه، وهو رافع يديه، ثم أقبل على الناس، ونزل، وصلى ركعتين، فأنشأ الله تعالى سحابة، فرعدت، وبرقت، ثم أمطرت. رواه أبو داود، وقال: غريب، وإسناده جيد.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بارش کے قحط(۱) کا شکوہ کیا تو آپ نے حکم دیا کہ آپ کے لئے عید گاہ میں منبر رکھا جائے اور انہیں کسی ایک دن کا وعدہ(۲) دیا کہ وہ اس دن عید گاہ کی طرف نکلیں اور آپؐ خود اس وقت نکلے جب سورج کا کنارہ(۳) ظاہر ہوا۔ آپ منبر پر بیٹھے۔ پھر تکبیر کہی اور اللہ کی تعریف بیان کی پھر فرمایا: ”تم نے اپنے علاقہ میں خشک سالی کی شکایت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اسے پکارو(۴) اور وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہاری دعا قبول(۵) فرمائے گا پھر آپ نے فرمایا: ہر طرح کی تعریف اس کو سزاوار ہے جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے' بڑا رحم کرنے والا ہے مہربان ہے(۶)۔ روز جزا کا بادشاہ ہے اس کے سوا کوئی الہ نہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اے اللہ! تیرے سوا کوئی الہ نہیں تو غنی ہے اور ہم محتاج ہیں ہم پر بارش نازل فرما۔ اور جو کچھ تو ہم پر اتارے اسے ایک وقت تک ہماری قوت اور زندگی کا سبب بنا پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھائے حتیٰ کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی طرف اپنی پشت کر کے کھڑے ہو گئے(۷)۔ اور اپنی چادر کو اٹھایا(۸) اور وہ اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھائے ہوئے تھے پھر لوگوں کی طرف رخ پھیرا اور منبر سے نیچے اتر آئے پھر دو رکعت نماز پڑھی تو اللہ نے ایک بدلی پیدا کی جو گرجی اور چمکی اور برسی(۹)۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث غریب ہے مگر اس کی سند اچھی ہے(۱۰)۔

(۱) اصل میں لفظ قحوط آیا ہے جو قحط کی طرح مصدر ہے۔

(۲) یعنی لوگوں کے لئے دن مقرر کر دیا۔

(۳) اصل میں لفظ حاجب آیا ہے ابن قیم کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ صحیح ہے مگر اس میں کوئی حرف آگے پیچھے ضرور ہوا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم مجھے پکارو' میں تمہاری پکار قبول کروں گا۔"

(۵) جیسا کہ پہلی آیت میں ہے نیز فرمایا: اور جب میرے بندے میرے متعلق آپ سے پوچھیں تو (کہہ دو) میں قریب ہی ہوں' جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو قبول کرتا ہوں۔

(۶) اس حدیث میں خطبہ بسم اللہ کے بجائے الحمد سے شروع کرنے پر دلیل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی کوئی روایت نہیں آئی جس میں آپ نے حمد کے علاوہ کسی اور لفظ سے خطبہ شروع کیا ہو۔

(۷) یعنی قبلہ کی طرف منہ کر لیا۔

(۸) یہاں لفظ قلب آیا ہے جبکہ سنن ابی داؤد میں لفظ حول ہے۔

(۹) سنن ابی داؤد میں باقی حدیث یوں ہے: "اور وہ اللہ کے حکم سے برسی' آپ اپنی مسجد کے دروازہ تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ نالیاں بہنے لگیں پھر جب آپ نے لوگوں کو چھپنے کی جگہوں کی طرف دوڑتے دیکھا تو آپ اتنا ہنسے کہ آپ کی کچلیاں ظاہر ہو گئیں اور فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور میں اس کا بندہ اور رسول ہوں"۔

(۱۰) اس کے بعد ابوداؤد نے کہا کہ اہل مدینہ ملک یوم الدین پڑھتے تھے۔ اور یہ حدیث ان کے لئے دلیل ہے۔ نیز حدیث میں ہے وعدالناس جو لوگوں کے لئے کسی خوش آئند دن کی آمد پر دلالت کرتا ہے تاکہ اس کے لئے تیار ہو جائیں اور مظالم سے نجات حاصل کریں اور پہلے سے توبہ کر لیں اور یہ سب کام مطلقاً" واجب ہیں۔ الا یہ کہ شدت کی موجودگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشادگی کی طلب ان کا دائرہ تنگ کر دیتی ہے۔ اور اسرائیلیات میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں پر ان کے استسقاء کے لئے نکلنے کے بعد بارش روک دی کیونکہ ان میں ایک نافرمان موجود تھا اور الناس کا لفظ مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے عام ہے کہتے ہیں کہ اہل ذمہ کا نکلنا بھی مشروع ہے البتہ وہ نماز سے الگ رہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس حدیث میں دعاء کے وقت ہاتھ اٹھانے کی شریعت پر دلیل ہے وہ انہیں استسقاء میں اتنا اٹھائے کہ وہ اس کے چہرے کے برابر ہو جائیں مگر سر سے اوپر نہ بڑھیں۔ اور دعاء کے وقت ہاتھ اٹھانا کئی احادیث سے ثابت ہے منذری نے اس سلسلے میں ایک جزء تصنیف کی ہے نووی کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں صحیحین میں سے یا اس میں سے کسی ایک سے تیس کے لگ بھگ احادیث جمع ہو گئیں اور شرح المہذب سے نماز کی کیفیت میں ایک باب سب سے آخر میں ذکر کیا اور انس کی حدیث جس میں استسقاء کے علاوہ دعاء میں ہاتھ اٹھانے کی نفی ہے تو اس سے مراد ہاتھوں کو زیادہ اونچا کرتا ہے مطلق ہاتھ اٹھانے کی نفی نہیں۔

رہی چادر اٹھانے کی کیفیت تو بخاری میں ہے کہ آپ نے اس کے دائیں پہلو کو بایاں کر دیا۔ اور ابن ماجہ اور ابن خزیمہ میں یہ زیادہ ہے "اور بائیں کو دائیں پر ڈال دیا" اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ "چادر کے دائیں کنارے کو اپنے بائیں کندھے پر اور بائیں کنارے کو اپنے دائیں کندھے پر ڈالا" اور ابوداؤد کی ایک اور روایت میں ہے کہ "آپ کے اوپر ایک کالی چادر تھی۔ آپ نے اس کے نچلے کنارے کو پکڑ کر اوپر کر دیا۔ پھر جب آپ کو بوجھل معلوم ہوئی تو اسے اپنے کندھے پر موڑ دیا۔ اور لوگوں کو چاہئے کہ وہ بھی امام کے ساتھ اپنی چادر اٹھائیں جیسا کہ احمد نے ان الفاظ میں روایت کیا "اور لوگوں نے بھی آپؐ کے ساتھ اٹھائی۔ لیث اور ابویوسف کہتے ہیں کہ چادر اٹھانا امام سے مختص ہے اور بعض کہتے ہیں کہ عورتیں نہ اٹھائیں۔ اور چادر اس وقت اٹھائی جائے جب قبلہ کی طرف منہ کرے اور مسلم میں ہے کہ: جب آپؐ کے دعا کرنے کا ارادہ کیا تو قبلہ کی طرف منہ کر لیا اور چادر کو اٹھایا" اور بخاری میں بھی ایسا ہی ہے۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ نماز استسقاء دو رکعت ہیں اور یہی جمہور کا قول ہے اور ہادی نے کہا کہ چار رکعتیں ہیں جن میں دو سلام پھیرے جائیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ میں استسقاء کے لئے دعاء کی جیسا کہ اعرابی کے قصہ میں ہے اور جمعہ دو خطبوں سے ہوتا ہے جو بمرلہ چار رکعت ہے اس دلیل میں جتنا وزن ہے وہ مخفی نہیں۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے کہ یہ دو رکعت ہیں جیسا کہ آپ کو اس حدیث سے اور اس سے پہلی حدیث سے معلوم ہو چکا اور حنفیہ اس طرف گئے ہیں کہ چادر اٹھانا مشروع نہیں۔ حالانکہ مصنف نے پہلی حدیث کے بعد اس حدیث کو لا کر تحویل کے ثبوت کو مزید تقویت پہنچائی ہے۔

۴۷۹۔ وقصة التحويل في الصحيح من حديث عبد الله بن زيد، وفيه: فتوجه إلى القبلة يدعو، ثم صلى ركعتين، جهر فيهما بالقراءة.

اور چادر پھیرنے کا قصہ صحیح میں(۱) عبداللہ بن زید(۲) کی حدیث میں ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ: پھر آپؐ نے قبلہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی طرف رخ کیا اور دعاء(۳) کرتے رہے پھر دو رکعت نماز پڑھی اور ان رکعتوں میں بلند آواز سے قراءت کی(۴)۔

(۱) یعنی صحیح بخاری میں۔

(۲) یعنی مازنی اور یہ اذان کا راوی نہیں جیسا کہ بعض حفاظ کو وہم ہوا ہے اور بخاری میں اس کے الفاظ یہ ہیں "پھر آپ نے قبلہ کی طرف رخ کیا اور اپنی چادر کو اٹھایا"

(۳) بخاری میں یدعوا کے بعد وحول رداءہ ہے۔ اور ایک روایت میں قلب رداءہ ہے دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔

(۴) بخاری نے کہا کہ ابوسفیان نے کہا۔ مجھے مسعودی نے ابوبکر سے خبر دی کہ: آپ نے دایاں پہلو بائیں پر ڈال دیا" اور ابن خزیمہ نے یہ زیادہ کیا "اور بایاں دائیں پر" نیز اس چادر اٹھانے کی حکمت میں اختلاف ہے اور مصنف نے درج ذیل حدیث لا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

۴۸۰ - وللدارقطني من مرسل أبي جعفر الباقر : وحوّل رداءه ليتحول القحط.

اور دار قطنی میں ابوجعفر باقر(۱) کی مرسل حدیث میں ہے کہ: "آپ نے اپنی چادر اس لئے اٹھائی کہ قحط کا دور الٹ جائے"(۲)۔

(۱) آپ محمد بن علی بن حسن بن علی بن ابی طالب ہیں۔ اپنے باپ زین العابدین اور جابر بن عبداللہ سے سماعت کی اور آپ سے ان کے بیٹے جعفر صادق وغیرہ نے روایت کی آپ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور بقیع کے اس ٹکڑہ میں دفن ہوئے جہاں ان کے باپ اور باپ کے چچا حسن بن ابی طالب دفن ہوئے تھے اور آپ کا نام باقر اس لئے پڑ گیا کہ دینی علوم میں بڑے وسیع النظر تھے۔

(۲) ابن عربی نے کہا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رب کے درمیان اشارہ تھا۔ آپ سے کہا گیا کہ "تو اپنی چادر اٹھا تاکہ تیرا حال الٹ جائے" اور اس کے قول کا تعاقب یوں کیا گیا کہ اس کے لئے نقلی دلیل کی ضرورت ہے اور ابن عربی نے اس قول پر کہ "یہ تحویل اچھی فال لینے کے طور پر تھی" اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ فال کی تو یہ شرط ہوتی ہے کہ اس کا قصد نہ کیا جائے۔ اور مصنف نے کہا کہ اچھی فال لینے کے متعلق احادیث آئی ہیں جن کے رجال ثقہ ہیں مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ اسے دار قطنی اور حاکم نے جعفر بن محمد عن ابیہ عن جابر کے طریق سے روایت کیا ہے پھر اسے وصل کیا کیونکہ محمد بن علی نے جابر سے ملاقات کی تھی اور اس سے روایت کی الا یہ کہ اس نے کہا کہ دار قطنی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے پھر کہا کہ جو بھی صورت ہو ظنی قول سے یہ روایت بہتر ہے۔

اور پہلی حدیث میں ہے کہ "آپ نے دونوں رکعتوں میں جہر سے قراءت کی" اور بخاری کی بعض روایات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بجھر کا لفظ ہے اور ابن بطال سے منقول ہے کہ نماز استسقاء میں جہر سے تلاوت کرنا مجمع علیہ ہے اس حدیث سے بعض لوگوں نے یہ استنباط کیا کہ یہ نماز ان کو ہی پڑھی جائے اور اگر رات کو پڑھی جائے تو سری قراءت کی جائے اس لئے کہ دن کی نمازوں میں قراءت سری اور رات کی نمازوں میں جہری ہوتی ہے اور اس استنباط میں جتنا بعد ہے وہ مخفی نہیں۔

آنحضور کی نماز استقاء

۴۸۱- وعن أنس رضي الله تعالى عنه، أن رجلاً دخل المسجد يوم الجمعة، والنبي ﷺ قائم يخطب، فقال: يا رسول الله! هلكت الأموال، وانقطعت السبل، فادع الله يغيثنا، فرفع يديه، ثم قال: اللهم أغثنا، اللهم أغثنا، اللهم أغثنا، فذكر الحديث، وفيه الدعاء بإمساكها. متفق عليه.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن ایک آدمی مسجد میں آیا- اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے وہ کہنے لگا یا رسول اللہ ! مویشی تباہ ہو گئے اور راستے بند ہو گئے- اللہ عزوجل سے دعا فرمایئے کہ وہ ہم پر بارش برسائے- آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے(۱) پھر فرمایا: "اے اللہ! ہم پر بارش برسا(۲) اے اللہ! ہم پر بارش برسا پھر ساری حدیث ذکر کی اور اس حدیث میں بارش بند ہونے کی دعاء کا بھی ذکر(۳) ہے- متفق علیہ(۴)-

(۱) بخاری کی روایت میں یہ زیادہ ہے "اور لوگوں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھائے"

(۲) اس حدیث میں اغثنا ہے جبکہ بخاری کی روایت میں اسقنا ہے (دونوں کا معنی ایک ہی ہے)

(۳) یعنی بادل برسنا بند کر دے-

(۴) مسلم میں اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے "انس کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم! ہم نے آسمان میں کوئی بادل یا بدلی(۱) نہیں دیکھی حالانکہ ہمارے اور سلع پہاڑ کے درمیان کوئی گھر یا حویلی بھی نہیں تھی یکایک سلع کے پیچھے سے ڈھال کی طرح کی ایک گول سی بدلی نمودار ہوئی- جب وہ وسط آسمان میں پہنچی تو پھیل گئی اور برسنا شروع کر دیا- انس کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم پھر ہم نے ہفتہ بھر سورج نہیں دیکھا پھر اگلے جمعہ کو اسی دروازہ سے ایک شخص داخل ہوا' اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے- وہ سیدھا آپ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا "یارسول اللہ! مویشی ہلاک ہو گئے اور راستے کٹ گئے لہذا اللہ سے دعا کیجئے کہ ہم سے بارش بند کر دے" چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اٹھائے پھر فرمایا: "اے اللہ! ہمارے ارد گرد بارش برسا ہم پر نہ برسا- یا اللہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر' ٹیلوں پر' وادیوں میں اور جنگلوں میں برسا" چنانچہ بادل چھٹ گیا اور ہم باہر نکلے تو دھوپ میں چلنے لگے" شریک کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک سے پوچھا کہ کیا دوسرے جمعہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آنے والا وہی پہلا شخص تھا؟ انس نے کہا "میں یہ نہیں جانتا"

مصنف کہتے ہیں کہ انس کی حدیث سے اس شخص کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ اور ھلاک الاموال مویشی اور دوسرے جانوروں کے لئے عام ہے اور راستوں کے بند ہونے سے مراد یہ ہے کہ چارہ اور خوراک نہ ملنے کی بنا پر اونٹ کمزور ہو جانے کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتے یا اس لئے کہ لوگوں کے پاس جو طعام تھا وہ ختم ہو گیا تو آپ بازار میں برائے فروخت لانے کے لئے انہیں کچھ نہیں ملتا۔

اور یغیثنا میں حرف مضارع پر فتح بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یہ غاث سے مضارع ہے جس کا مادہ غوث یا غیث ہے اور اس پر ضمہ بھی ہو سکتا ہے جو اغاثہ سے ہے اور حدیث کے الفاظ اللھم اغثنا اسی کو ترجیح دیتے ہیں اور حدیث میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ جب بارش ہو زیادہ ہو تب بھی دعا کرنا چاہئے چنانچہ بخاری نے باب کا عنوان یہ قائم کیا " باب الدعاء اذا کثر المطر " پھر یہی حدیث بیان کی اور شافعی نے اپنی سند میں مطلب بن حنطب کی حدیث سے روایت کیا اور یہ مرسل ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم بارش کے وقت یوں کہا کرتے' یا اللہ! رحمت کی بارش برسا۔ عذاب' آزمائش' مکان کو گرانے والی اور سیلاب والی بارش نہ برسا۔ یا اللہ ٹیلوں اور جنگلوں میں برسا یا اللہ! ہمارے اردگرد برسا' ہم پر نہ برسا"

۴۸۲- وعنه رضي الله تعالى عنه، أن عمر رضي الله تعالى عنه كان إذا قحطوا يستسقي بالعباس بن عبد المطلب ، وقال: اللهم إنا كنا نستسقي إليك بنبينا فتسقينا، وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا، فيسقون. رواه البخاري.

اور انہی سے روایت ہے کہ جب قحط پڑتا تو عمر رضی اللہ عنہ عباس بن عبدالمطلب کو وسیلہ بنا کر بارش کے لئے دعا مانگتے اور کہتے "اے اللہ ہم تجھ سے تیرے نبی کی معرفت بارش کے لئے دعا کرتے تھے تو تو بارش برسا دیتا تھا۔ اب ہم تیری طرف اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں لہٰذا ہم پر بارش برسا دے تو ان پر بارش ہو جاتی۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

اور عباس رضی اللہ عنہ نے یوں دعا کی "اے اللہ! آسمان سے جو آفت بھی نازل ہوتی ہے گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے

---

(۱) اصل میں عبارت میں لفظ قزعۃ ہے جو شجرۃ کے وزن پر ہے بمعنی بادل کا ٹکڑا۔ اور سلع مدینہ کا مشہور پہاڑ ہے یعنی ہمارے اور اس پہاڑ کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ تھی جو بادل دیکھنے میں حائل ہو سکتی اور "سبتا" سے مراد ہفتہ ہے یعنی ایک ہفتہ کے دن سے دوسرے ہفتہ کے دن تک۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وہ توبہ ہی سے دور ہوتی ہے اور میرا تیرے نبی سے جو رشتہ ہے اس کی بنا پر لوگوں نے میری طرف توجہ کی ہے اور ہم گنہگاروں کے تیری طرف ہاتھ اٹھ رہے ہیں اور ہماری پیشانیاں تیرے حضور توبہ کے لئے جھکی ہوئی ہیں۔ سو ہم پر رحمت کی بارش برسا۔ چنانچہ آسمان پہاڑ کی طرف جھک آیا اور اتنی بارش ہوئی کہ زمین سرسبز ہو گئی" اسے زبیر ابن بکار نے انساب میں روایت کیا نیز اس نے اسے ابن عمر کی حدیث سے بھی روایت کیا کہ عام الرمادۃ (ہلاکت کے سال) حضرت عمرؓ نے عباس کو وسیلہ بنا کر استسقاء کے لئے دعاء کی پھر یہ حدیث ذکر کی۔ اور بارزی نے ذکر کیا کہ عام الرمادۃ ۱۸ھ تھا اور اس سال کا یہ نام اس لئے پڑا کہ اس سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین سخت خشک اور غبار آلود ہو گئی تھی۔

اور اس حدیث میں اھل خیر و صلاح اور نبوت(ا) کے گھرانے کو شفیع (سفارشی) بنانے پر دلیل ہے۔ نیز اس میں حضرت عباس کی فضیلت اور حضرت عمر کے تواضع پر دلیل ہے نیز یہ کہ حضرت عمر اہل بیت علیہم السلام کا حق پہچانتے تھے۔

۴۸۳۔ وعنه رضي الله تعالى عنه قال: أصابنا - ونحن مع رسول الله ﷺ - مطر، قال: فحسر ثوبه حتى أصابه من المطر، وقال: إنه حديث عهد بربه. رواه مسلم.

اور انہی سے روایت ہے کہ ایک ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ بارش ہونے لگی۔ آپؐ نے اپنے بدن کے کچھ حصے سے کپڑا اٹھا لیا اور بارش آپ کے جسم پر پڑنے لگی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ اپنے پروردگار سے نئی نئی آرہی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

اور بخاری نے اس باب کا عنوان یہ رکھا "جس شخص پر بارش ہو حتیٰ کہ اس کی داڑھی سے ٹپکنے لگے" پھر انس رضی اللہ عنہ کی پوری کی پوری حدیث بیان کی۔ اور حدیث کے الفاظ حدیث عهدبربه کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس کا رب وجود میں لایا ہے(ا)۔ یعنی بارش رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ابھی ابھی اسے پیدا کیا ہے لہٰذا اس سے تبرک حاصل کرنا چاہئے اور یہ حدیث اس بات کے مستحب ہونے پر دلیل ہے۔

۴۸۴۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ كان إذا رأى المطر قال: اللهم صيباً نافعاً. أخرجاه.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بارش دیکھتے تو فرماتے۔ اے اللہ!

(ا) یعنی ان کی زندگی میں۔ رہا موت کے بعد کا مسئلہ تو یہ اس حدیث سے مستنبط نہیں ہوتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن کا محتاج ہوتا ہے اور موت کی حالت کو زندگی کی حالت پر قیاس کرنا کسی چیز کو اس کی ضد پر قیاس کرنے کے مترادف ہے۔

(مصحح کی طرف سے نوٹ): شارح کا علی الاطلاق یہ بات کہنا اس چیز کا تقاضا کرتا ہے کہ ان میں کچھ فرق نہیں۔ حالانکہ سفارش کے لئے زندگی کی حالت کو خاص کرنے پر کوئی دلیل نہیں۔ بالخصوص جبکہ یہ بھی مراد ہے کہ "میرے منصب سے وسیلہ پکڑو" اور عباس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی آپ کو وسیلہ بنایا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زوردار بارش ہو' لیکن نفع پہنچانے والی ہو- اسے شیخین(۱) نے روایت کیا-

(۱) مصنف نے یہاں اخرجاہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے مراد شیخین (بخاری و مسلم) ہیں- اور یہ مصنف کی عادت کے خلاف ہے کیونکہ وہ ایسے مقام پر متفق علیہ کا لفظ استعمال کرتا ہے اور صیب صاب المطر سے ہے اور نافع جس میں نفع کا پہلو تو ہو مگر ضرر کا کوئی پہلو نہ ہو-

۴۸۵- وعن سعد رضي الله تعالى عنه أن النبي ﷺ دعا في الاستسقاء: **«اللهم جللنا سحاباً كثيفاً، قصيفاً، دلوقاً، ضحوكاً، تمطرنا منه رذاذاً، قطقطاً، سجلاً، يا ذا الجلال والإكرام»**. رواه أبو عوانة في صحيحه.

سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے وقت یہ دعا مانگی- "یا اللہ! ہم پر ایسا بادل بھیج جو تہ بہ تہ ہو' گرجنے والا ہو(۱) برسنے والا ہو(۲) چمکنے والا ہو' پھر اس سے ہم پر پھوہار برسے پھر ذرا بڑے قطرے(۳) اور وہ سیراب(۴) کر دینے والی ہو' اے شان و شوکت اور بزرگی کے مالک(۵)"- اسے ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا-

(۱) اصل میں لفظ قصیفا" ہے بمعنی کڑکنے اور گرجنے والا اور یہ بارش کی قوت کی علامات میں سے ایک علامت ہے-

(۲) اصل میں لفظ دلوقا" ہے کہتے ہیں خیل دلوق بمعنی تیزی سے آگے پیچھے نکلنے والے گھوڑے اور کہتے ہیں دلق السل علی القوم بمعنی لوگوں پر اچانک سیلاب آگیا-

(۳) ابوزید کہتے ہیں کہ پھوہار کے قطرے اگر بالکل چھوٹے چھوٹے ہوں تو وہ قطقط ہے اگر اس سے ذرا بڑے ہوں تو وہ رذاذ ہے اور اگر اس سے ذرا بڑے ہوں تو وہ طش ہے-

(۴) اصل میں لفظ سجلا" ہے جو مصدر ہے یعنی اوپر سے پانی بہانا اور مصدر کا صیغہ مبالغہ کی خاطر استعمال ہوا ہے یعنی بادل کھل کر برسے-

(۵) یا ذالجلال والاکرام - یہ دونوں صفات قرآن میں بھی آتی ہیں یعنی ایسی ذات جو ہر لحاظ سے بے نیاز ہو اور فضل تامہ کی مالک ہو اور اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اللہ کے مخلص بندوں کو اللہ کے ہاں شان و شوکت اور عزت نصیب ہو گی اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی صفات میں سے ہیں اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یا ذالجلال والاکرام کے الفاظ سے دعا کرنے کو لازم بنا لو" اور روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو یا ذالجلال والاکرام کہہ رہا تھا تو آپ نے فرمایا- "تیری دعا قبول ہو گئی"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٤٨٦- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: خرج سليمان عليه السلام يستسقي، فرأى نملة مستلقية على ظهرها، رافعة قوائمها إلى السماء، تقول: اللهم إنا خلق من خلقك، ليس بنا غنى عن سقياك، فقال: **«ارجعوا فقد سقيتم بدعوة غيركم»**. رواه أحمد وصححه الحاكم.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک دفعہ سلیمان علیہ السلام نماز استسقاء کے لئے نکلے تو دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنی پشت کے بل لیٹ کر اور ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھی: یااللہ! ہم بھی تیری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں اور ہم تیری بارش سے بے نیاز نہیں ہیں۔ تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ اب واپس آجاؤ دوسری مخلوق کی دعا سے تم پر بارش ہو جائے گی۔ اسے احمد نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا۔

اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ نماز استسقاء اور اس کے لئے باہر نکلنا قدیم سے مشروع ہے اور استسقاء کے لئے مویشیوں کو بھی لے جانا بہتر ہے کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت کا اس کے ذکر اور اس سے اپنی حاجات طلب کرنے کا ادراک ہوتا ہے اور اس سلسلے میں کئی لمبے چوڑے قصے مذکور ہیں اور اللہ کی کتاب بھی اس پر دلالت کرتی ہے لہٰذا ایسی باتوں میں تاویل کرنے والوں کے لئے تاویل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

٤٨٧- وعن أنس رضي الله تعالى عنه. أن النبي ﷺ استسقى فأشار بظهر كفّيه إلى السماء. أخرجه مسلم.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے لئے دعا مانگی تو اپنی ہتھیلیوں کی پشت کو آسمان کی طرف اٹھا کر دعا مانگی۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ اگر دعاء سے دفع بلاء کا ارادہ ہو تو اپنے ہاتھ اٹھائے اور ہتھیلیوں کی پشت آسمان کی طرف کرے اور جب کسی چیز کے سوال اور حصول کے لئے دعا کرے تو اپنی ہتھیلیوں کا اندرونی حصہ آسمان کی طرف کرے۔ اس بارے میں خلاد بن سائب کی ایک صریح حدیث بھی آئی ہے جسے وہ اپنے باپ

---

(۱) ایسی تاویل مذہب سلف کے خلاف ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے روایت کرتے ہیں کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سوال کرتے تو اپنی ہتھیلیوں کا اندرونی حصہ آسمان کی طرف اٹھاتے اور جب پناہ مانگتے تو ان کی پشت آسمان کی طرف کرتے" اگرچہ ابن عباس کی حدیث میں یوں وارد ہے کہ "اللہ سے اپنی ہتھیلیوں کے اندرونی حصے سے سوال کرو' ان کی پشت سے نہ کرو" یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے تاہم ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ابن عباس کی حدیث کسی چیز کے سوال اور اس کے حصول کے لئے خاص ہے' بلاء کے دفعیہ کے لئے نہیں- اور یہ بات اللہ تعالٰی کے قول ویدعوننا رغبا و رھبا (اور وہ ہمیں رغبت سے اور ڈر سے پکارتے ہیں) کی تفسیر پیش کرتی ہے کہ رغبت اندرونی حصے سے ہوتی ہے اور ڈر پشت یا بیرونی حصہ سے-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لباس کا بیان

یعنی کونسا لباس جائز ہے اور کونسا حرام

۴۸۸- عن أبي عامر الأشعري رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«ليكونن من أمتي أقوام يستحلون الحر والحرير»**. رواه أبو داود، وأصله في البخاري.

ابوعامر اشعری(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری امت میں سے کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو حر(۲) اور ریشم کو حلال بنا لیں گے" اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی اصل بخاری میں بھی(۳) ہے۔

(۱) اطراف میں ہے کہ آپ کے نام میں اختلاف ہے بعض عبداللہ بن ہانی کہتے ہیں۔ بعض عبداللہ بن وہب اور بعض عبید بن وہب' آپ عبدالملک کی خلافت تک زندہ رہے' شام میں سکونت پذیر ہوئے اور یہ ابوموسیٰ اشعری کے چچا نہیں ہیں۔ وہ تو غزوہ حنین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی شہید ہو گئے تھے اور ان کا نام عبید بن سلیم ہے۔

(۲) حر سے مراد زنا کو حلال کر لینا ہے اور یہ لفظ بعض روایات میں خز ہے۔

(۳) بخاری نے اسے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ اور یہ حدیث ریشمی لباس کی حرمت پر دلیل ہے کیونکہ یستحلون کا معنی حرام چیز کو حلال بنا لینا ہے اور عنقریب ایک اور حدیث آرہی ہے جس میں اس بات کی صراحت ہے نیز اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ کسی حرام چیز کو حلال بنا لینے سے اس کا کرنے والا امت سے خارج نہیں ہو جاتا۔ اور اس قول میں کمزوری مخفی نہیں کہ جس نے کسی حرام چیز کو حلال بنا لیا' یعنی اس کے حلال ہونے کا عقیدہ بنا لیا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا جنھوں نے یہ خبردی کہ یہ حرام ہے۔ گویا اس کا اسے حلال کہنا آپؐ کے کلام کا رد ہے اور آپ کو جھٹلانا کفر ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی تاویل ضروری ہے گویا آپؐ کی مراد یہ تھی کہ حلال بنانے سے پیشتر وہ امت سے (یعنی مسلمان) ہی تھا پھر جب اس نے حلال بنا لیا تو امت کے مفہوم سے نکل گیا اور اس مقام پر امت سے امت دعوت مراد لینا صحیح نہیں کیونکہ ایسے لوگ ہر اس چیز کو حلال بنا لیتے ہیں جسے آپ نے حرام قرار دیا ہو۔ صرف اس حز یا ریشم کی خصوصیت نہیں۔ نیز اس حدیث میں لفظ حر کے ضبط میں علماء نے اختلاف کیا ہے اس حدیث کو باب اللباس میں لانے سے مصنف کی یہی مراد ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے اسے خز اختیار کیا ہے جس کی اسی حدیث میں حمیدی اور ابن الاثیر نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صراحت کی ہے اور خز یا ابریشم کی خصوصیت نہیں۔ نیز اس حدیث میں لفظ حر کے ضبط میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اس حدیث کو باب اللباس میں لانے سے مصنف کی یہی مراد ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے اسے خز اختیار کیا جس کی اسی حدیث میں حمیدی اور ابن الاثیر نے صراحت کی ہے اور خز ابریشم کی ایک معروف قسم ہے اور ابوموسیٰ نے اس لفظ کو حر ضبط کیا ہے۔ ابن الاثیر نہایہ میں کہتے ہیں۔ اس حدیث کے طریقوں میں اختلاف ہے تاہم پہلا ہی مشہور ہے اور اگر اس حدیث میں یہی مراد ہو تو وہ خالص ریشم ہے اور حریر کا اس پر عطف ہے جو خاص پر عام کا عطف ہے کیونکہ خز ریشم ہی کی ایک قسم ہے اور خز کا استعمال ایسے کپڑوں کے لئے ہوتا ہے جو ریشم اور اون سے بنے ہوئے ہوں۔ مگر یہاں یہ مراد نہیں کیونکہ یہ معلوم ہو چکا کہ یہ کپڑا حلال قسم سے ہے اور اسی پر وہ حدیث محمول ہے جسے ابوداؤد نے عبداللہ ابن سعد الدشتکی سے، اپنے باپ سے روایت کیا کہ میں نے بخاری کے ساتھ ایک آدمی کو سفید خچر پر سوار دیکھا جس کے سر پر سیاہ خز کا عمامہ تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنایا ہے۔ نیز اسے نسائی نے روایت کیا اور بخاری نے ذکر کیا ہے اور عنقریب عمرؓ کی حدیث آرہی ہے جس میں یہ وضاحت ہے کہ غیر خالص ریشم سے کیا کچھ حلال ہے۔

٤٨٩- وعن حذيفة رضي الله تعالى عنه قال: نهى رسول الله ﷺ أن نشرب في آنية الذهب والفضة، وأن نأكل فيها، وعن لبس الحرير والديباج، وأن نجلس عليه. رواه البخاري.

حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سونے اور چاندی کے برتنوں میں پانی پینے سے، ان میں کھانا کھانے سے(۱)، ریشم کے باریک اور موٹے کپڑے پہننے سے اور ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا(۲) ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

(۱) حذیفہ کی یہ حدیث پہلے ان الفاظ میں گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سونے اور چاندی کے برتنوں میں مت پیو" الحدیث۔ اور یہاں وہی بات نہی کے صیغہ میں بیان ہوئی ہے اور اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔

(۲) یعنی ریشم پہننے سے منع فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نہی تحریم کے لئے ہے اور جمہور کا یہی مذہب ہے کہ ریشم پہننا اس امت کے مردوں پر حرام ہے عورتوں پر نہیں اور قاضی عیاض نے کچھ لوگوں سے اس کا مباح ہونا بیان کیا ہے اور بحر نے اس اباحت کو ابن عطیہ کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا کہ بعد میں اس کی تحریم پر اجماع ہو گیا مگر مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ صحابہ کی ایک جماعت وغیرہم سے ریشم پہننا ثابت ہے۔ ابوداؤد نے کہا کہ بیس سے زائد صحابہ نے ریشم پہنا۔ انہیں ابن ابی شیبہ نے یکجا کر کے روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمار بن ابی عمار کے طریق سے روایت کیا کہ، مروان بن حکم کے پاس نقش و نگار والی چادریں آئیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے پہنا" اس نے کہا کہ خز کی تفسیر میں صحیح بات یہ ہے کہ اس کا تانا تو ریشم کا ہوتا ہے اور بانا کسی دوسری چیز کا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ ریشم اور اون کو مخلوط کر کے یا کسی اور طرح بنا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ اصل میں یہ ایک جانور کا نام ہے اور اس کپڑے میں چونکہ اس کے بال ہوتے ہیں تو بالوں کے ملائم ہونے کی وجہ سے اس کپڑے کا نام بھی خز پڑ گیا۔ اگرچہ عبارت کا ظاہر اس بات کو قبول نہیں کرتا اور اگر خز کے بجائے قز (خ کی جگہ ق) ہو تو وہ ائمہ کے نزدیک ریشم ہی ہے لہٰذا انہوں نے اسے بھی مردوں پر حرام قرار دیا ہے اور جمہور عورتوں کے لئے ریشم کے حلال ہونے کے قائل ہیں مگر ابن زبیر جن سے مسلم نے روایت کی کہ انہوں نے خطبہ دیا تو کہا: "اپنی عورتوں کو ریشم نہ پہناؤ۔ کیونکہ میں نے عمر بن خطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ریشم مت پہنو" تو انہوں نے اس حکم کو عام سمجھا حالانکہ عورتوں کے لئے ریشم کی حلت پر اجماع ہو چکا ہے رہے لڑکے تو وہ بھی ذکور ہی ہیں لہٰذا اکثر کے نزدیک ان پر بھی حرام ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول "میری امت کے ذکور پر حرام ہے" میں عمومیت ہے۔ اور محمد بن حسن لڑکوں کے لئے ریشم پہننا جائز قرار دیتے ہیں اور شافعی کے اصحاب اس بات کے قائل ہیں کہ عید کے دن لڑکوں کو ریشم کا لباس اور زیور پہننا جائز ہے کیونکہ وہ مکلف نہیں ہیں اور عید کا دن نہ ہو تو ان کے لئے تین صورتیں ہیں اور صحیح صورت اس کا جواز ہی ہے۔

رہا دیباج تو وہ ریشم کے موٹے کپڑوں کو کہتے ہیں اور اس پر عطف عام پر خاص کا عطف ہے۔ نیز اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ریشمی کپڑوں پر بیٹھنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ الا یہ کہ مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ بخاری اور مسلم نے حذیفہ کی حدیث کے علاوہ دوسرے طریق سے جو روایت کی ہے اس میں یہ زیادتی نہیں وان نجلس علیہ کے الفاظ نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ ریشمی کپڑوں پر بیٹھنے کی ممانعت کے قائل نہیں ہیں ان کے لئے یہ قوی حجت ہے اور یہی جمہور کا قول ہے جس سے ابن ماجشون، کوفیوں اور بعض شافعیہ نے اختلاف کیا ہے اور بعض حنفیہ نے ریشم پر بیٹھنے کی عدم تحریم پر یہ دلیل دی کہ یہ نہی تحریم کے حکم میں صریح نہیں ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ پہننے اور بیٹھنے کے مجموعی کام کے لئے یہ نہی ہو۔ صرف بیٹھنے سے نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات مخفی نہیں کہ یہ قائل کا تکلف اور بلا ضرورت ظاہر سے نکالنے کے مترادف ہے اور بعض حنفیہ کہتے ہیں اس حدیث میں جواز اور تحریم کا حکم پہننے کے گرد ہی گھومتا ہے اور بیٹھنا پہننا نہیں ہوتا۔ جبکہ جمہور اس چیز پر احتجاج کرتے ہیں کہ بیٹھنے کو پہننے کا نام دیا گیا ہے جیسا کہ صحیح میں انس کی حدیث ہے "پھر میں اپنی ایک چٹائی پر کھڑا ہو گیا جو کافی مدت نہ پہننے کی بنا پر سیاہ ہو گئی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ ہر چیز کا پہننا

محکم دلائل سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے استعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ رہا عورتوں کا ریشم کو مفروش بنانا تو اس کی اصل اس کا جواز ہے جبکہ ان کے لئے تو اس کا پہننا بھی جائز ہے اور مفروش بنانا بھی اسی کا حصہ ہے اور جو شخص ان کے لئے مفروش بنانے کی ممانعت کا قائل ہے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں اور ریشم کی حرمت کی علت کے بارے میں بھی اختلاف ہے اور اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی علت خود پسندی اور غرور ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی علت فاخرانہ لباس اور زینت ہے جو عورتوں ہی کے لائق ہے اور یہ بات مردوں کی مردانگی سے فروتر ہے۔

۴۹۰۔ وعن عمر رضي الله تعالى عنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن لبس الحرير، إلا موضع إصبعين أو ثلاث أو أربع. متفق عليه، واللفظ لمسلم.

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا۔ الا یہ کہ دو انگل یا تین چار انگل مقدار کی جگہ میں ہو۔ متفق علیہ' اور یہ لفظ مسلم کے ہیں(۱)۔

(۱) مصنف نے کہا کہ دو یا تین یا چار میں اختیار دیا گیا ہے یا یہ موقع کی مناسبت سے ہے اور ابن ابی شیبہ نے یہی حدیث اسی طریق سے ان الفاظ میں روایت کی ہے: "ریشم جائز نہیں مگر اتنا اور اتنا" یعنی دو انگلیاں یا تین یا چار انگلیاں۔ اور جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ وہ ہر آستین میں دو انگل استعمال کر سکتا ہے تو نسائی کی یہ روایت اس کی تردید کرتی ہے کہ "آپ نے دیباج میں ایک مقام پر چار انگل کے علاوہ رخصت نہیں دی۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ چار انگل کی رخصت ہے اور مالک کی ایک روایت میں اس نے اس سے بھی منع کیا ہے۔ اور اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ کپڑا بنا ہوا ہو یا ملا ہوا ہو اور اسی پر بیٹھنے کو قیاس کیا جائے گا۔ اور ہادویہ نے تین انگل مقدار کی رخصت دی ہے جبکہ یہ حدیث چار انگل پر بالکل واضح ہے۔

۴۹۱۔ وعن أنس رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ رخص لعبد الرحمن ابن عوف والزبير في قميص الحرير، في سفر، من حكة كانت بهما. متفق عليه.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمن بن عوف اور زبیر بن عوام کو ایک سفر کے دوران خارش کی بنا پر ریشم کی قمیض پہننے کی رخصت دی تھی۔ متفق علیہ(۱)۔

(۱) اور ایک روایت میں ہے کہ "ان دونوں (عبدالرحمن بن عوف اور زبیر بن عوام) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں جوؤں کی شکایت کی تو آپ نے انہیں اس غزوہ میں ریشم کی قمیض پہننے کی اجازت دی" مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ ان میں تطبیق یوں ممکن ہے کہ خارش جوؤں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی تو گویا علت کی نسبت کبھی سبب کی طرف کی گئی اور کبھی سبب السبب کی طرف۔ اور خارش وغیرہ کے بارے میں ریشم کے استعمال کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ طبری نے کہا کہ خارش کے لئے ریشم پہننے کی رخصت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص خارش سے بھی کسی بڑی تکلیف کو دفع کرنے کے لئے ریشم استعمال کرے تو جائز ہے جیسے اسلحہ جنگ اتار دینا وغیرہ۔ اور جواز کے قائلین اسے سفر سے مخصوص نہیں کرتے اور شافعیہ میں سے بعض نے کہا کہ یہ رخصت سفر سے مختص ہے اور قرطبی نے کہا کہ یہ حدیث ان لوگوں پر حجت ہے جو بہرحال ریشم کی حرمت کے قائل ہیں الایہ کہ زبیر اور عبدالرحمٰن کا معاملہ خصوصی تھا اور یہ دعویٰ صحیح نہیں اور مالکؒ اور ابوحنیفہ اس بات کے قائل ہیں کہ مطلقاً جائز نہیں اور شافعی اس بات کے قائل ہیں کہ ضرورت کے تحت جائز ہے اور شارح نے نوویؒ کی اتباع کرتے ہوئے اپنی بحث میں کہا کہ خارش کے لئے ریشم پہننے میں حکمت یہ ہے کہ اس میں ٹھنڈک ہوتی ہے اور اس کا تعاقب یوں کیا گیا کہ ریشم تو گرم ہوتا ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ ریشم میں یہ خصوصیت ہے کہ جو خارش جوؤں کی وجہ سے پیدا ہو اسے یہ دور کر دیتی ہے۔

۴۹۲۔ وعن علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه قال: كساني النبي ﷺ حلّة سيراء، فخرجت فيها، فرأيت الغضب في وجهه، فشققتها بين نسائي. متفق عليه، وهذا لفظ مسلم.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک عمدہ(۱) ریشمی حلہ پہنایا۔ پھر ایک دن میں یہ حلہ پہن کر باہر نکلا تو آپؐ کے چہرہ پر غصے کے آثار دیکھے۔ لہٰذا میں نے اسے پھاڑ کر گھر کی عورتوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ متفق علیہ۔ اور یہ لفظ مسلم کے ہیں(۲)۔

(۱) سیراء خلیل نے کہا کہ عربی زبان میں فعلاء کے وزن پر سیراء کے علاوہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس کے پہلے حرف پر کسرہ ہو اور الف ممدودہ ہو اور یہ وہ پانی ہے جو مولود کے سر پر نکلتا ہے اور حولاء اور غباء انگور کے لئے لغت ہیں۔ اور لفظ حلہ پر تنوین ہے کیونکہ سیراء اس کی صفت ہے اور اس کے علاوہ اضافت کی بنا پر تنوین آسکتی ہے اور اس کا معنی عمدہ اور نفیس ہے جیسا کہ شرح مسلم میں ہے۔

(۲) ابوعبید کہتے ہیں کہ حلہ تہبند اور چادر ہے اور ابن الاثیر کہتے ہیں کہ جب یہ دونوں چیزیں ایک ہی جنس سے ہوں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایسا دھاری دار کپڑا جس کے پہلوؤں پر ریشم لگا ہو اور بعض کے نزدیک اس کا معنی خالص ریشم ہے اور یہی اقرب ہے۔

اور حدیث کے الفاظ ہیں کہ "میں نے آپؐ کے چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھے" اور مسلم کی ایک روایت میں زیادہ ہے "پھر آپ نے فرمایا: میں نے تمہیں یہ حلہ اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تم خود اسے پہن لو بلکہ اس لئے تجھے بھیجا تھا کہ تو اسے پھاڑ کر اپنی عورتوں کے لئے دوپٹے بنا لے۔ اسی لئے میں نے اسے پھاڑ کر فواطم کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوپٹے بنا لئے" اور خمرا" ' خمار کی جمع ہے ۔بمعنی وہ کپڑا جس سے عورت اپنا سر ڈھانپتی ہے۔ اور فواطم سے مراد فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' فاطمہ بنت اسد علی رضی اللہ عنہ کی والدہ اور تیسری فاطمہ بنت حمزہ ہے ان کے علاوہ ایک چوتھی فاطمہ عقیل بن ابی طالب کی بیوی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ کسی خطاب کی وضاحت بعد میں بھی کسی وقت جائز ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حلہ بھیجا اور بھیجنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس غرض کے لئے وہ چیز بنائی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور وہ پہننا ہی ہو سکتا ہے بعد میں آپ نے وضاحت فرمائی کہ اس کا پہننا علی رضی اللہ عنہ کے لئے مباح نہیں۔

۴۹۳- وعن أبي موسى رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: **«أحلّ الذهب والحرير لإناث أمتي. وحرم على ذكورهم»**. رواه أحمد والنسائي والترمذي وصححه.

ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت کی عورتوں کے لئے سونے اور ریشم کا استعمال حلال اور مردوں (۱) پر حرام ہے" اسے احمد' نسائی اور ترمذی (۲) نے روایت کیا اور ترمذی نے اسے صحیح کہا۔

(۱) یعنی ان چیزوں کا پہننا اور ریشم کا بستر بنانا جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

(۲) ترمذی نے اسے سعید بن ابی ہند عن ابی موسیٰ کے طریق سے روایت کیا اور ابو حاتم نے اسے معلول کہا ہے کیونکہ اس سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں ایسا ہی کہا ہے کہ سعید بن ابی ہند عن ابی موسیٰ معلول ہے صحیح نہیں۔ البتہ ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ نیز یہ روایت اس طریق کے علاوہ آٹھ طریقوں سے آٹھ صحابہ سے مروی ہے کوئی طریق بھی کلام سے بچا ہوا نہیں ہے تاہم وہ سب ایک دوسرے کو قوت دیتے ہیں۔

اس حدیث میں مردوں کے لئے سونا اور ریشم پہننے کی حرمت پر اور عورتوں کے پہننے کے جواز پر دلیل ہے مگر بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ عورتوں کے لئے بھی سونا پہننے کی حلت کا حکم منسوخ ہے۔

۴۹۴- وعن عمران بن حصين رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ قال: **«إن الله يحب إذا أنعم على عبده نعمة، أن يرى أثر نعمته عليه»**. رواه البيهقي.

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا ہے کہ جب وہ اپنے بندے کو نعمت عطا کرے تو اس پر اپنی نعمت کا اثر بھی دیکھے- اسے بیہقی نے روایت کیا(ا)-
(ا) نیز اسے نسائی نے ابوالاحوص کی حدیث سے اور ترمذی اور حاکم نے ابوعمر کی حدیث سے یوں روایت کیا کہ "اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو اپنی عطا کردہ نعمت کا اثر دیکھ کر خوش ہوتا ہے" اور جو روایت نسائی نے ابوالاحوص سے، اپنے باپ سے روایت کی وہ یوں ہے "جب اللہ تعالیٰ تجھے مال عطا کرے تو چاہئے کہ تجھ پر اپنی نعمت اور کرامت کا اثر بھی دیکھے" ایسی احادیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے یہ بات پسند کرتا ہے کہ وہ اپنی خوراک اور اپنی پوشاک میں اللہ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار کرے کیونکہ یہ نعمت کا فعلی شکر ہے اور اس لئے بھی کہ جب کوئی محتاج اسے اچھی حالت میں دیکھتا ہے تو اس کا قصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس پر صدقہ کرے اور شکستہ حالی زبان حال سے سوال اور فقر کا اظہار ہے- اسی لئے کہا گیا ہے کہ میری زبان حال میرے بولنے سے زیادہ شکوہ کر رہی ہے نیز کہا گیا ہے کہ میری ظاہری شکل و صورت تیرے لئے میرے بتلانے سے زیادہ شاہد ہے-

۴۹۵- وعن علي رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ نهى عن لبس القسي والمعصفر. رواه مسلم.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی(ا) اور گیرورنگ(۲) کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے- اسے مسلم نے روایت کیا-

(ا) اصل میں لفظ قسی استعمال ہوا ہے جو قاف کی فتحہ سے ہے- اور بعض کہتے ہیں کہ محدثین تو قاف پر زیر (کسرہ) پڑھتے ہیں اور اہل مصر فتحہ- اور اس کی نسبت قس نامی شہر سے ہے اور حدیث میں قسی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ وہ ایسے دھاری دار کپڑے تھے جو مصر اور شام سے لائے جاتے تھے یہ مسلم میں ہے اور بخاری میں یوں ہے کہ اس میں اترج کی طرح زرد ریشم ہوتا تھا-

(۲) جو گیرورنگ سے رنگا گیا ہو- پہلی چیز یعنی قسی میں نہی تحریم کے لئے ہے اکثر اس میں ریشم زیادہ ہو ورنہ یہ تنزیہی ہے یا مکروہ ہے اور دوسری چیز میں بھی اصل تحریم ہی ہے اور ہادویہ کا یہی مذہب ہے جبکہ جمہور صحابہ اور تابعین گیرورنگ کا کپڑا پہننے کے جواز کے قائل ہیں اور احمد کے علاوہ باقی فقہاء بھی اسی بات کے قائل ہیں اور بعض اسے مکروہ تنزیہی سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ رنگ کا جوڑا پہنا تھا اور صحیحین میں ابن عمر کی حدیث میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زرد رنگ سے رنگتے دیکھا اور ابن قیم نے اس کا جواب یہ دیا کہ وہ جوڑا سخت سرخ تھا اور کہا کہ یہ سرخ جوڑا دو یمانی چادریں تھیں جن میں سرخ اور کالی دھاریاں بنی ہوئی تھیں اور وہ ان دھاریوں کی وجہ سے اسی نام سے مشہور تھا- رہے سخت سرخ کپڑے تو ان سے سختی سے منع کیا گیا ہے چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ نشانات سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی منع فرمایا۔

۴۹۶- وعن عبد الله بن عمرو رضي الله تعالى عنهما قال: رأى على النبي ﷺ ثوبين معصفرين، فقال: أملك أمرتك بهذا؟. رواه مسلم.

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو گیرو رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "کیا یہ تجھے تیری ماں نے ایسا حکم دیا تھا؟" اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہ حدیث گیرو رنگ کے کپڑوں کی تحریم پر دلیل ہے جو نہی کو مضبوط بناتی ہے اور دلیل کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ مسلم میں اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے: "میں نے پوچھا یا رسول اللہ اس رنگ کو دھو ڈالوں؟ آپ نے فرمایا: بلکہ انہیں جلا دو" اور ایک روایت میں ہے کہ "یہ کپڑے کافروں کے تھے لہٰذا انہیں مت پہن" اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا۔

اور حدیث کے الفاظ "کیا تیری ماں نے تجھے حکم دیا تھا؟" میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایسا لباس پہننا عورتوں کی زینت اور ان کی فطرت ہے۔ نیز یہ حدیث مال کو تلف کرنے کی سزا پر دلیل ہے کیونکہ آپ نے ابن عمرو کو انہیں جلا دینے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے معارض ہے جس میں آپ نے جوڑے کو پھاڑ کر اپنی عورتوں میں تقسیم کر دینے کا حکم دیا تھا جیسا کہ یہ روایت ہم پہلے پیش کر چکے ہیں ان میں تطبیق کی صورت دیکھئے۔ سنن ابی داؤد میں عبداللہ بن عمرو سے یوں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے گیرو رنگ سے رنگی ہوئی ایک پٹ کی چادر پہنے دیکھا تو فرمایا: "تجھ پر یہ چادر کیسی ہے؟" عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں آپ کی ناپسندیدگی کو پہچان گیا۔ پھر میں اپنے گھر آیا تو گھر والے تنور گرم کر رہے تھے میں نے وہ چادر تنور میں ڈال دی پھر دوسرے دن جب میں آپ کے پاس آیا تو آپؐ نے پوچھا: "عبداللہ! تم نے اس چادر کو کیا کیا؟ میں نے آپ کو خبر دی تو آپ نے فرمایا: تو نے وہ اپنی بیوی کو کیوں نہ پہنا دی؟ کیونکہ اس میں عورتوں کے لئے تو کوئی حرج نہیں" یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عبداللہ نے وہ چادر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نہیں جلائی تھی اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس میں اور علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تعارض زائل ہو جاتا ہے البتہ ابن عمرو کی دونوں روایتوں کا تعارض باقی رہ جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عبداللہ کو "استحبابا" چادر کو جلانے کا حکم دیا تھا پھر جب عبداللہ نے جلا دی تو آپ نے فرمایا اگر گھر کی کسی عورت کو پہنا دیتے تو اچھا تھا اور یہ اس پر آگاہی تھی کہ اگر وہ ایسا کرتے تو جلانے کی ضرورت نہیں تھی اور یہ حکم استحباب کے طور پر تھا۔ اور قاضی عیاض نے شرح مسلم میں کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چادر کو جلانے کا حکم دینا سختی یا سزا کے طور پر تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٤٩٧- وعن أسماء بنت أبي بكر رضي الله تعالى عنهما، أنها أخرجت جبة رسول الله ﷺ، مكفوفة الجيب والكمين والفرجين بالديباج. رواه أبو داود، وأصله في مسلم، وزاد: كانت عند عائشة رضي الله تعالى عنها حتى قبضت، فقبضتها، وكان النبي ﷺ يلبسها، فنحن نغسلها للمرضى، نستشفي بها. وزاد البخاري في الأدب المفرد: وكان يلبسها للوفد والجمعة.

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ نکال کر دکھایا' جس کی دونوں کفوں' دونوں چاکوں' اور دامن پر دیباج کا حاشیہ(۱) چڑھا ہوا تھا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی اصل مسلم میں بھی ہے اور اس میں اتنا زیادہ(۲) ہے کہ یہ جبہ حضرت عائشہ کی وفات تک عائشہ کے پاس رہا۔ پھر یہ جبہ میں نے لے لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ جبہ پہنا کرتے تھے اور ہم اسے پانی میں ڈال کر وہ پانی مریضوں کو پلاتے ہیں تاکہ انہیں شفا حاصل ہو(۳)۔ اور بخاری نے ادب مفرد میں یہ زیادہ لکھا(۴) ہے۔ کہ آپؐ یہ جبہ جمعہ کے دن اور وفود کی آمد کے دن پہنا کرتے تھے۔

(۱) اصل میں لفظ مکفوفہ آیا ہے یعنی جس پر حاشیہ یا پٹی لگائی گئی ہو اور یہ حاشیہ دیباج یعنی ریشم کے کپڑے کا تھا۔

(۲) یعنی اسماء کی روایت میں۔

(۳) مسلم میں اس حدیث کا ایک سبب بیان ہوا ہے جو یہ ہے کہ "اسماء نے ابن عمر کی طرف پیغام بھیجا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ کپڑوں میں علامت یا اثر کو حرام سمجھتے ہیں تو ابن عمر نے یہ جواب دیا کہ میں نے عمرؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "ریشم تو صرف وہ لوگ پہنتے ہیں جن میں کوئی اچھی صفت نہ ہو۔ تو میں ڈرا کہ یہ بھی ایک علامت ہے۔ تب اسماء نے وہ جبہ نکالا۔

(۴) یعنی اسماء کی روایت میں۔

نووی نے شرح مسلم میں مکفوفہ کا معنی یہ لکھا کہ کفہ بنایا جائے یعنی اس کی اطراف میں پٹی لگائی جائے یعنی دامن پر' دونوں چاکوں اور دونوں کفوں پر اور یہ اس بات پر محمول ہے کہ یہ پٹی چار انگل یا اس کے لگ بھگ ہو۔ اور یہ پٹی پوری کی پوری ریشم کی نہ ہو بلکہ اوپر پٹی کا حاشیہ لگایا ہو دلائل میں تطبیق کی یہی صورت ہے اور اس حدیث میں اتنی مقدار ریشم کے جواز پر دلیل ہے نیز ایسا جبہ پہننے کے جواز پر بھی جس کے دو چاک ہوں اور اس میں کوئی کراہت نہیں۔

نیز اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور ہر اس چیز سے جس نے آپ کے جسم مبارک کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوا ہو شفا حاصل کرنے پر دلیل ہے۔ نیز یہ قول کہ "آپ اسے جمعہ کے دن اور وفد کے لئے پہنتے تھے" اس بات پر دلیل ہے کہ وفود کے لئے زینت اور اچھے کپڑے پہننا مستحب ہے ہاں یہ بات مخفی نہ رہے کہ یہ صحابیہ کا قول ہے جو دلیل نہیں بن سکتا۔

رہا کپڑوں میں ریشمی دھاگے کا استعمال اور اسے پہننا، تسبیح میں ریشمی دھاگہ ڈالنا، دوات میں ریشمی صوف، قرآن کریم اور دوسری کتابوں کے ریشمی غلاف تو ان کے عدم جواز کی بات ہی نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ نہی انہیں شامل نہیں ہے۔

نیز لباس کے کچھ آداب ہیں ایک یہ پگڑی کا شملہ چھوٹا ہونا چاہئے کہ دونوں کندھوں کے درمیان لٹکتا رہے اور اصلا" اس کا ترک جائز ہے قمیض کی کفیں چھوٹی ہونی چاہئیں جیسا کہ ابوداؤد میں اسماء کی حدیث ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کفیں ہاتھوں کے گٹ تک ہوتی تھیں۔" ابن عبدالسلام نے کہا کہ کپڑوں کو زیادہ کشادہ کرنے اور کفیں لمبی رکھنے میں اسراف بھی ہے اور یہ بدعت ہے۔ نیز تہبند اور اس طرح لباس اور قمیض نصف پنڈلی تک ہونا چاہئے اور اگر ٹخنوں سے تجاوز کرے تو یہ حرام ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنازوں کا بیان

جنائز جنازہ کی جمع ہے اور ج پر فتح اور کسرہ دونوں درست ہیں۔ جنازہ کا معنی میت ہے اور یہ فتحہ اور کسرہ دونوں سے جائز ہے اور اگر فتحہ سے ہو تو اس کا معنی جنازہ کی چارپائی ہے یا اس کے برعکس یا کسرہ ہے اور اس کا معنی میت چارپائی سمیت ہے۔

۴۹۸- عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «أكثروا ذكر هاذم اللذات: الموت». رواه الترمذي والنسائي، وصححه ابن حبان.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لذتوں کو توڑنے والی یعنی موت کا بکثرت ذکر کیا کرو" اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا۔

اور حاکم' ابن السکن اور ابن طاہر نے بھی اسے صحیح کہا اور دار قطنی نے ارسال کی وجہ سے اسے معلول کہا ہے اور اس سلسلے میں عمرو اور انس کی روایات ہیں جو گفتگو سے خالی نہیں۔ مصنف نے سہیلی سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ ھاذم کا لفظ اگر ذ سے ہو تو اس کا معنی قاطع یا کاٹنے والا ہے اور اگر د سے ہو تو اس کا معنی کسی چیز کو زائل کر دینے والا اور یہاں یہ مراد نہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ اس میں "نہیں" کی بات بھی محل نظر ہے جیسا کہ واضح ہے میں کہتا ہوں کہ د سے معنی بھی صحیح ہیں کیونکہ موت لذات کو زائل کر دیتی ہے جیسا کہ انہیں قطع کر دیتی ہے لیکن اعتماد اسی روایت پر ہے۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ نصیحت دینے والی چیز یعنی موت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہئے اور اس ذکر کا فائدہ ایک دوسری حدیث میں یوں آیا ہے۔ جب تم اسے زیادتی کے ساتھ یاد رکھو گے تو اللہ اسے کم کر دے گا۔ اگر تم کم کرو گے تو زیادہ کر دے گا۔ اور دیلمی میں ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ "موت کا کثرت سے ذکر کیا کرو" جو بندہ بھی اس کا کثرت سے ذکر کرتا ہے اللہ اس کے دل کو زندہ کر دیتا ہے اور موت اس پر آسان ہو جاتی ہے" اور ابن حبان کے اور شعب الایمان میں بیہقی کے الفاظ یہ ہیں کہ لذات کو توڑنے والی کا ذکر بکثرت کیا کرو۔ جو بندہ بھی تنگی میں اس کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس پر کشادہ ہو جاتی ہے اور جو فراخی میں یاد کرتا ہے وہ اسے تنگ کر دیتی ہے اور ابن لال کے ہاں مکارم اخلاق میں انس کی حدیث ہے کہ "موت کو بکثرت یاد کیا کرو کیونکہ یہ گناہوں سے پاک صاف کرتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے" اور بزار میں ہے "لذات کو توڑنے والی کو بکثرت یاد کرو۔ جو شخص بھی تنگدستی کے دور میں اسے یاد کرے گا یہ اس میں کشادگی پیدا کر دے گی اور جو خوشحالی میں یاد کرے تو یہ اس کو تنگ کر دے گی۔" اور ابن ابی الدنیا میں ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ "موت کو بکثرت یاد کرو کیونکہ وہ گناہوں کو مٹاتی اور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے اگر تم بے نیازی کے وقت اسے یاد کرو گے تو اس کو زائل کر دے گی اور اگر محتاجی کے وقت یاد کرو گے تو تمہاری معیشت پر تمہیں راضی کر دے گی"

۴۹۹- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «لا يتمنين أحدكم الموت لضر نزل به، فإن كان لا بد متمنياً، فليقل: اللهم أحيني ما كانت الحياة خيراً لي، وتوفني ما كانت الوفاة خيراً لي». متفق عليه.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے کوئی شخص کسی مصیبت کی وجہ سے موت کی آرزو نہ کرے اور اگر آرزو کرنا ضروری ہو تو اسے(۱) یوں کہنا چاہئے "یا اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لئے بہتر ہے اور جب میرے لئے موت بہتر ہو تو مجھے فوت کر دے"(۲)۔ متفق علیہ۔

(۱) یعنی تمنا کے بجائے دعا کرنا چاہئے اور یہ معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہئے۔

(۲) اس حدیث میں موت کی آرزو کرنے کی ممانعت پر دلیل ہے یعنی جو شخص ابتلاء میں پڑنے اور محنت کرنے سے' یا دشمن کے خوف سے یا مرض سے یا فاقہ سے یا دنیا کی دوسری مشقتوں سے گھبرا کر موت کی آرزو کرے۔ کیونکہ اس میں جزع اور اللہ کی تقدیر اور بے صبری اور عدم رضا پائی جاتی ہے۔

اس حدیث کے الفاظ لضر نزل بہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آرزو کی وجہ مصیبت میں پڑنے کے علاوہ کچھ اور ہو یا کوئی دوسرا خوف یا دین میں فتنہ کا خوف ہو تو ایسی آرزو کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس بات پر دعا کی یہ حدیث دلالت کرتی ہے "اے اللہ! جب تو اپنے بندوں کو فتنہ میں ڈالنا چاہے تو اس فتنہ سے پہلے ہی مجھے اپنی طرف بلا لے" یا وہ شہادت کی تمنا کرے جیسے سلف میں سے عبداللہ بن رواحہ وغیرہ' کے بارے میں آیا ہے اور جیسا کہ حضرت مریم نے کہا تھا کہ یالیتنی مت قبل ھذا کیونکہ مریم نے صرف ایسے خوفزدہ کرنے والے کام کی وجہ سے موت کی آرزو کی تھی جس کی وجہ سے کوئی تو کافر ہو گیا اور کوئی بدبخت بن گیا۔

اور حدیث کے لفظ ہیں "اگر اسے ایسی آرزو کرنا ہی پڑے" یعنی جب اس کا دل گھٹ جائے اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تو اس دعاء کی طرف رخ موڑ لے ورنہ بہتر یہی ہے کہ وہ ایسا نہ کرے۔

۵۰۰- وعن بريدة رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: «المؤمن يموت بعرق الجبين». رواه الثلاثة، وصححه ابن حبان.

بریدہ(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کے وقت مومن کی پیشانی پر پسینہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آجاتا ہے۔ اسے تینوں نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا(۲)۔

(۱) بریدۃ ابن الحصیب

(۲) نیز اسے احمد' ابن ماجہ اور ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور طبرانی نے ابن مسعود کی حدیث سے روایت کیا۔

اور اس حدیث میں دو وجوہ ہیں ایک وجہ تو موت کے شدائد کو برداشت کرنے سے عبارت ہے کہ نزع کی حالت میں اس کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے یعنی اس کے بقیہ گناہوں کی صفائی اور تطہیر اس پر دوبھر بن جاتی ہے دوسری وجہ یہ کہ یہ مومن کی اس کدوکاوش سے کنایہ ہے جو وہ رزق حلال کی طلب میں یا نماز اور روزے کی پابندی سے اپنے نفس کو مجبور کرنے پر کرتا ہے تا آنکہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملتا ہے اس طرح یہ الفاظ گویا حال کی بنا پر محل نصب میں جار مجرور ہوتے ہیں پہلی وجہ کی صورت میں اس کا معنی یہ ہو گا کہ موت کی حالت اور جان کنی اس پر شدید ہو جاتی ہے اور یہ مومن پر موت آنے کی کیفیت اور شدت کا بیان ہے اور دوسری وجہ کی صورت میں اس کا معنی یہ ہو گا کہ موت اسے اس وقت آتی ہے جب اس حالت کی شدت کی بنا اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے گویا یہ اس حالت کا بیان ہے جو موت کی وجہ سے یک لخت اس پر آپڑتی ہے۔

۵۰۱- وعن أبي سعيد وأبي هريرة رضي الله تعالى عنهما قالا: قال رسول الله ﷺ: **«لقنوا موتاكم لا إله إلا الله»**. رواه مسلم والأربعة.

ابوسعید اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہا دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے قرب المرگ آدمی کو لاالہ الااللہ یاد دلایا کرو۔ اسے مسلم نے اور چاروں نے روایت کیا۔

اور یہ مسلم کے الفاظ ہیں ابن حبان نے اسے ان الفاظ اور زیادتی سے روایت کیا "جس نے مرتے دم آخری قول لا الہ الا اللہ کہا وہ کسی نہ کسی دن ضرور جنت میں داخل ہو گا' خواہ اس سے پہلے وہ کئی مصایب بھگت چکا ہو" اور اس نے اس روایت کی نسبت شیخین یا بخاری کی طرف کرنے میں غلطی کی ہے اور ابن ابی الدنیا نے حزیفہ سے ان الفاظ میں روایت کی۔ "اپنے قریب المرگ لوگوں کو لا الہ الا اللہ یاد دلایا کرو کیونکہ یہ کلمہ خطاؤں کو ختم کر دیتا ہے" اور اس بارے میں اور بھی کئی احادیث ہیں۔

اور لقنوا سے مراد کسی کو مرتے دم یہ کلمہ جلیلہ یاد دلانا ہے تاکہ وہ اسے کہے اور یہ کلمہ اس کا آخری کلام بن جائے اور وہ جنت میں داخل ہو جائے جیسا کہ پہلے گزر چکا(۱)۔ اور حدیث میں تلقین کا یہ حکم ہر مسلمان کے لئے عام ہے جو قریب المرگ ہو اور یہ حکم استحباب کے طور پر ہے اور علماء نے اس کلمہ کو بکثرت یاد دلانے اور سب لوگوں کے کہنے کو ناپسند کیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرنے والا اپنی گھبراہٹ' تنگی اور شدت کی وجہ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دل میں اسے برا سمجھے اور کوئی نازیبا کلمہ کہہ ڈالے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک نے یہ کلمہ ایک بار بول کر یاد دلا دیا تو پھر اشارہ سے اس کو دہرا دیا جائے تاکہ یہ مرنے والے کا آخری کلام بن جائے اور لا الہ الا اللہ کہنے سے مراد ساتھ محمد رسول اللہ کہنا بھی ہے کیونکہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر قابل قبول نہیں جیسا کہ معلوم ہو چکا۔ اور موتاکم سے مراد قریب المرگ مسلمان ہیں رہے غیر مسلم تو ان پر اسلام پیش کیا جائے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کی وفات پر پیش کیا تھا اور اپنے اس خادم پر بھی جس کی آپ نے عیادت کی اور اسلام پیش کیا تو وہ مسلمان ہو گیا اور اس حدیث میں بالخصوص مسلمان مرنے والوں کا اس لئے ذکر کیا گیا کہ وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کی ان کے پاس موجودگی سے ان سے اغلب یہی توقع ہے۔ بخلاف مرنے والے کافروں کے کہ ان کے پاس موجود لوگ بھی کافر ہوتے ہیں۔

فائدہ: بہتر یہ ہے کہ مریض کو اللہ کی رحمت کی وسعت اور اس کا لطف و کرم یاد دلایا جائے تاکہ وہ اپنے رب سے اچھا گمان رکھے۔ اس لئے کہ مسلم نے جابر کی حدیث سے روایت کیا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفات سے پیشتر یہ کہتے سنا ہے کہ "تم میں سے ہر شخص کو اس حال میں مرنا چاہئے کہ وہ اپنے رب سے اچھا گمان رکھتا ہو" اور صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً" مروی ہے کہ: آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "میں اپنے بندے سے ویسا ہی سلوک کرتا ہوں جیسا وہ مجھ سے گمان رکھتا ہے" اور ابن ابی الدنیا نے ابراہیم سے روایت کیا کہ: لوگوں کو چاہئے کہ وہ کسی کی موت کے وقت اس کے اچھے اعمال کا ذکر کریں تاکہ وہ اپنے رب سے اچھا گمان رکھے" اور بعض ائمہ علم نے کہا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ مریض کے پاس امید والی چالیس احادیث پڑھی جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اس کا حسن ظن بڑھ جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس کے ظن کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ اور اگر مرتے دم امید کے ساتھ خوف بھی مل جائے تو یہ اچھی بات ہے ترمذی نے انس کی حدیث کو عمدہ سند سے روایت کیا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان کے پاس آئے جو قریب المرگ تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ "تجھے کیا معلوم ہو رہا ہے؟" وہ کہنے لگا: میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کسی بندے کے دل میں اس حالت میں یہ دونوں باتیں اکٹھی ہو جائیں تو جو وہ امید رکھتا ہے اللہ اسے ضرور عطا کرتا ہے اور جس چیز سے ڈرتا ہے اس سے امن دیتا ہے"

فائدہ نمبر ۲: قریب المرگ آدمی کا چہرہ قبلہ کی طرف پھیر دینا چاہئے جیسا کہ حاکم نے ابو قتادہ کی حدیث روایت کی اور اسے صحیح کہا کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو براء بن معرور سے متعلق پوچھا۔ لوگوں نے کہا: وہ تو فوت ہو چکا اور اپنے تہائی مال کی آپ کے حق میں وصیت کر گیا ہے اور یہ بھی وصیت کی کہ مرتے دم میرا چہرہ قبلہ کی طرف پھیر دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے فطرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق درست کام کئے۔ اور میں اس کے مال کا تیسرا حصہ اس کی اولاد کو لوٹاتا ہوں۔ پھر آپ نے جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھی اور دعا کی کہ "اے اللہ! اسے بخش دے اور اسے اپنی جنت میں داخل کر اور تو نے ایسا کر ہی دیا ہے" حاکم نے کہا کہ میں مرنے والے کو قبلہ رخ کرنے کی اس روایت کے علاوہ اور کوئی توجیہہ نہیں جانتا۔

٥٠٢- وعن معقل بن يسار رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ قال: «اقرؤوا على موتاكم يس». رواه أبو داود والنسائي، وصححه ابن حبان.

معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے قریب المرگ(۱) لوگوں کے پاس سورہ یاسین پڑھا کرو۔ اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا(۲) اور ابن حبان نے صحیح کہا۔

(۱) ابن حبان نے کہا کہ اس سے مراد موت کا حاضر ہونا ہے' یہ نہیں کہ اسے مرے ہوئے پر پڑھا جائے۔

(۲) نیز اسے احمد اور ابن ماجہ نے سلیمان تیمی عن ابی عثمان عن ابیہ عن معقل بن یسار کی حدیث سے روایت کیا۔ عثمان سے مراد نہدی نہیں ہے اور نسائی اور ابن ماجہ نے اس کے باپ سے کچھ نقل نہیں کیا اور ابن قطان نے اس روایت کو اضطراب اس کے موقوف ہونے اور ابو عثمان اور اس کے باپ کا حال معلوم نہ ہونے کی بنا پر معلول کہا ہے اور دار قطنی سے نقل کیا کہ یہ حدیث سند میں مضطرب اور متن میں مجہول ہے لہٰذا صحیح نہیں اور احمد نے اپنی مسند میں کہا کہ ہمیں صفوان نے بتلایا کہ بزرگ لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر موت کے وقت یاسین پڑھی جائے تو مرنے والے کی سختی کم ہو جاتی ہے۔ اور صاحب الفردوس نے ابوالدرداء اور ابوذر دونوں سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب بھی کسی مرنے والے کے پاس یاسین پڑھی جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرما دیتا ہے" اور یہ ابن حبان کے اس قول کی تائید کرتی ہے کہ میت سے مراد قریب المرگ آدمی ہے اور اس بارے میں برائے استدلال یہ دونوں صریح ہیں اور ابوالشیخ نے فضائل قرآن میں اور ابوبکر مروزی نے کتاب الجنائز میں ابوشعثاء ابن عباس کے صاحب سے روایت کیا کہ سورہ رعد پڑھنا مستحب ہے اور یہ الفاظ زیادہ کئے کہ اس سے میت کی سختی میں تخفیف ہو جاتی ہے اور اسی میں شعبی سے مروی ہے کہ انصار اپنے مرنے والوں کے پاس سورہ البقرہ پڑھنا پسند کرتے تھے۔

ے(۱) لیکن شرط یہ ہے کہ اس نے یہ کلمہ صدق دل سے کہا ہو۔ اور توحید کے تقاضوں کے مطابق اس پر عمل پیرا رہا ہو جیسا کہ نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥٠٣ ـ وعن أم سلمة رضي الله تعالى عنها قالت: دخل رسول الله ﷺ على أبي سلمة ، وقد شق بصره، فأغمضه، ثم قال إن الروح إذا قبض اتبعه البصر، فضج ناس من أهله، فقال: لا تدعوا على أنفسكم إلا بخير، فإن الملائكة تؤمن على ما تقولون، ثم قال: اللهم اغفر لأبي سلمة، وارفع درجته في المهديين، وافسح له في قبره، ونور له فيه، واخلفه في عقبه. رواه مسلم.

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو سلمہ کے پاس اس وقت آئے جب اس کی نگاہ پھٹ(۱) چکی تھی۔ آپ نے اس کی آنکھوں کو بند کیا پھر فرمایا: "جب روح نکل جاتی ہے تو نظر اس کے پیچھے چلی جاتی ہے تب اس کے گھر کے لوگ چیخنے چلانے لگے تو آپ نے فرمایا: اپنے لوگوں کے لئے کوئی اچھی بات کہنا کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو' فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔ پھر آپ نے دعا کی کہ "اے اللہ! ابو سلمہ کو بخش دے اور اس کے درجے بلند فرما' اسے ہدایت یافتہ لوگوں میں شمار کر۔ اس کی قبر کو فراخ اور روشن کر دے اور اس کے پچھلوں میں خود ابوسلمہ کا قائم مقام بن" اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اصل میں شق بصرہ سے شرح مسلم میں شق کے ش پر فتحہ اور بصرہ کی ر پر رفع ہے جو شق کا فاعل ہے اور ہم نے اسی طرح درج کیا ہے اور مشہور بھی یہی ہے اور بعض لوگوں نے بصرہ کی ر پر فتحہ کہا ہے اور یہ بھی صحیح ہے اور شق کا ش بلا اختلاف مفتوح ہے۔

کہتے ہیں شق المیت بصرہ' یعنی جب موت قریب آجائے اور مرنے والا کسی چیز کی طرف دیکھے اور اس کی نگاہ اس کی طرف نہ لوٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنکھیں بند کرنا اس کے مستحب ہونے پر دلیل ہے اور اس پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے اور اس حدیث میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نظر روح کا پیچھا کرتی ہے یعنی دیکھتی ہے کہ روح کہاں جاتی ہے اور یہ حدیث ان لوگوں کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ارواح اجسام لطیفہ ہیں جو بدن میں تحلیل ہوئی ہوتی ہیں اور روح کے نکل جانے سے بدن سے زندگی نکل جاتی ہے اور اس میں کچھ تعارض نہیں جو دوسرے کہتے ہیں۔ نیز یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ موت کے وقت مرنے والے کے لئے اس کے گھر والوں اور پچھلوں کے لئے دنیا و آخرت کے امور میں دعا کرنا چاہئے نیز اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ میت کو قبر میں عذاب و ثواب ہوتا ہے۔

٥٠٤ ـ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ حين توفي، سجى ببرد حبرة. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو انہیں ایک دھاری دار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چادر سے ڈھانپ(۱) دیا گیا۔ متفق علیہ۔

(۱) اصل میں لفظ سجی ہے اور تسجیہ کا معنی تغطیہ ہے یعنی ڈھانپ دینا اور برد یعنی چادر کی نسبت حبرۃ کی طرف ہے اور اسی سے موصوف ہے۔ اور حبرۃ وہ چیز جس کی کوئی خاص علامت ہو اور یہ چادر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لباس سے بہت پسند تھی۔ اور یہ ڈھانپنے کا عمل غسل سے پہلے ہے۔ نووی نے شرح مسلم میں کہا کہ یہ مجمع علیہ ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ میت کی تبدیل ہونے والی صورت ننگی نہ رہے اور نظروں سے محفوظ رہے۔ علماء کہتے ہیں کہ نزع کے بعد میت کے کپڑے اتار کر اسے ڈھانپ دینا چاہیئے تاکہ اس سبب سے میت کا بدن متغیر نہ ہو۔

٥٠٥- وعنها أن أبا بكر الصديق رضي الله تعالى عنه قبّل النبي ﷺ بعد موته. رواه البخاري.

اور انہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات کے بعد بوسہ دیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ میت کو اس کی موت کے بعد بوسہ دینا جائز ہے اور میت کو ڈھانپ دینا مستحب ہے اور یہ افعال آپ کی وفات کے بعد صحابہ کے ہیں ان میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس پر چار دلائل شرعیہ میں سے انحصار کیا جائے یہ ضرور ہے کہ ہر چیز کی اصل اباحت ہونے کی بنا پر یہ افعال جائز ہیں۔ البتہ ترمذی نے عائشہ کی حدیث کو یوں روایت کیا کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کو ان کی وفات کے بعد بوسہ دیا اور آپ رو رہے تھے یا یہ کہا کہ آپ کی آنکھیں بہ رہی تھیں۔ ترمذی نے کہا کہ عائشہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

٥٠٦- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: «نفس المؤمن معلقة بدينه، حتى يقضى عنه». رواه أحمد والترمذي، وحسنه.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ مومن کی روح قرضہ کی وجہ سے لٹکی رہتی ہے تا آنکہ اس کی طرف سے ادائیگی کی جائے۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے حسن کہا۔

قرضہ کے بارے میں احادیث میں بہت سخت احکام آئے ہیں حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میت کا جنازہ پڑھنا چھوڑ دیا جس کے سر پر قرضہ ہو تا آنکہ کوئی شخص اس کے قرضہ کا بار نہ اٹھا لے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہید کے بارے میں خبر دی کہ شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرنے کے ساتھ ہی وہ بخش دیا جاتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مگر قرضہ معاف نہیں ہوتا اور یہ حدیث ان دلائل سے ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موت کے بعد میت اپنے قرضہ میں پھنسی رہتی ہے اور اس حدیث میں اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ موت سے پہلے قرضہ سے گلوخلاصی کرائی جائے۔ نیز یہ کہ یہ نہایت اہم حق ہے یہ تو اس قرضہ کی بات ہے جو قرضہ دینے والا اپنی خوشی سے دیتا ہے پھر اس شخص کا کیا حال ہو گا جس نے مال غصب اور لوٹ مار سے لیا ہو۔

٥٠٧ - وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ قال في الذي سقط عن راحلته، فمات: اغسلوه بماء وسدر، وكفنوه في ثوبيه. متفق عليه.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں ' جو اپنی اونٹنی سے گر کر(۱) مر گیا تھا فرمایا کہ اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اسی کے دو کپڑوں میں کفنا دو(۲)۔ متفق علیہ۔

(۱) بخاری میں ہے کہ یہ اس شخص کا واقعہ ہے جو عرفہ کے دن اپنی سواری پر کھڑا تھا۔

(۲) اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے کہ "نہ اسے خوشبو لگاؤ اور نہ اس کا سر ڈھانپو" اس کے بعد بخاری میں ہے کہ "وہ قیامت کے دن تلبیہ کہتے ہوئے اٹھے گا۔ یہ حدیث غسل میت کے وجوب پر دلیل ہے نووی نے کہا۔ اس بات پر اجماع ہے کہ غسل میت فرض کفایہ ہے۔ مصنف نے فتح الباری میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد کہا کہ یہ سخت بھول ہے کیونکہ مالکیہ کا اس بارے میں اختلاف مشہور ہے حتیٰ کہ قرطبی نے اس کے سنت ہونے کو ترجیح دی ہے جیسا کہ مسلم میں ہے لیکن جمہور ان کے وجوب کے قائل ہیں اور جو شخص وجوب کا قائل نہیں اس کا رد کرتے ہوئے ابن عربی نے کہا۔ جب پاک آدمی کے غسل سے دینے سے متعلق کئی قولی اور عملی روایات آئی ہیں تو اس کا کیا حال ہے جو اسے ایسا نہ سمجھے۔ اور کتنی بار دھونا چاہئے یہ کیفیت عنقریب ام عطیہ کی حدیث میں آ رہی ہے۔

اور حدیث کے الفاظ بماء وسدر کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ جتنی بار دھونا ہو ہر بار بیری کو پانی سے مخلوط کر لیا جائے بعض کہتے ہیں کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میت کا غسل صفائی کے لئے ہے پاکیزگی کے لئے نہیں کیونکہ بیری کے پتوں سے ملا ہوا پانی پاک کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ بیری پانی کے وصف کو تبدیل نہ کرتی ہو اور پانی مخلوط نہ ہوتا ہو اور یہ اس طرح کے پہلے ہر بار بیری سے ملا جائے پھر پانی سے دھویا جائے۔ اور قرطبی نے کہا کہ بیری کو پانی میں ڈالا جائے۔ پھر پانی کو ہلایا جائے تا آنکہ اس کا جھاگ نکل آئے اور اس سے میت کے جسم کو ملا جائے پھر اس کے دھونے کے بعد خالص پانی بہایا جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ بیری کو پانی میں نہ ڈالا جائے تاکہ پانی میں ایسی آمیزش نہ ہو جس سے اس کے مطلق پانی ہونے کا وصف بدل جائے اور بعض مالکیوں نے حدیث کے ظاہری مفہوم کو ہی اپنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ غسل میت محض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صفائی ہے لہٰذا اس کے لئے مخلوط پانی کفایت کر جاتا ہے جیسے گلاب والا پانی اور اسی طرح کا دوسرا پانی۔ وہ کہتے ہیں کہ بیری کے پتوں کو کیڑا کھا جاتا ہے لہٰذا یہ مکروہ ہے۔ اور جمہور کے نزدیک مشہور بات یہ ہے کہ یہ غسل تعبدی ہے اور اس میں وہی شرط پائی جاتی ہے جو فرض اور واجب غسل میں پائی جاتی ہے اور حدیث میں اسے خوشبو لگانے کی ممانعت ہے جسے مصنف نے ذکر نہیں کیا جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔ اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ وہ تلبیہ کہتے ہوئے اٹھے گا جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ وہ احرام کی حالت میں فوت ہوا۔ پھر جب علت کی نفی ہو گئی تو ممانعت کی بھی نفی ہو گئی اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ میت کو خوشبو لگانا ان کا دستور تھا۔ نیز اس حدیث میں سر کو ڈھانپنے کی بھی ممانعت ہے جس کی وجہ احرام ہے اور جو شخص محرم نہ ہو اسے خوشبو بھی لگائی جا سکتی ہے اور سر بھی ڈھانپا جا سکتا ہے اور یہ قول کہ موت کے ساتھ احرام کا حکم منقطع ہو جاتا ہے' جیسا کہ حنفیہ اور بعض مالکیہ اس کے قائل ہیں' حدیث کے ظاہر کے خلاف ہے۔ اور مصنف نے شرح میں ان کا اختلاف اور ان کے دلائل بھی ذکر کئے ہیں مگر وہ ظاہر حدیث کی مخالفت پر قائم نہیں رہ سکتے لہٰذا انہیں تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور حدیث کے الفاظ "اور اسے اسی کے دونوں کپڑوں میں دفنا دو" تکفین کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور اس میں یہ شرط نہیں کہ کپڑے طاق تعداد میں ہوں اور بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ دو کپڑوں پر ہی اکتفا کیا گیا ہو کیونکہ وہ اس اعلیٰ عبادت کے وقت یہی دو کپڑے پہنے ہوئے فوت ہوا تھا اور ممکن ہے کہ اس کے لئے کوئی اور کپڑا مل ہی نہ سکا ہو کیونکہ یہی اس کا سرمایہ تھا۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا حکم دیا اور یہ تفصیل نہ پوچھی کہ آیا اس کے سر پر کچھ قرضہ ہے یا نہیں؟ اور اس روایت میں مطلق دو کپڑوں کا ذکر ایا ہے اور بخاری کی روایت میں "اس کے دونوں کپڑوں میں" کے الفاظ میں ہے اور نسائی میں "اس کے دونوں کپڑوں میں جن میں اس نے احرام باندھا تھا" کے الفاظ ہیں۔ مصنف نے کہا کہ میت کی اس کے احرام کے کپڑوں میں تکفین مستحب ہے نیز یہ کہ اس کا احرام باقی ہے اور اسے سلے ہوئے کپڑوں میں نہ کفنایا جائے۔

اور حدیث کے الفاظ "تلبیہ پکارتے ہوئے اٹھے گا" اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو شخص طاعت کا کوئی کام شروع کر دے پھر وہ کام اختتام پذیر ہونے سے پہلے اس میں موت حائل ہو جائے تو اس کے متعلق امید رکھی جا سکتی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اسے ایسا ہی عمل کرنے والوں میں لکھے گا۔

٥٠٨- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: لما أرادوا غسل النبي ﷺ، قالوا: والله ما ندري نجرد رسول الله ﷺ كما نجرد موتانا أم لا؟ الحديث. رواه أحمد وأبو داود.

عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو کہنے لگے: اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی قسم! ہمیں یہ سمجھ نہیں آرہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے بھی ایسے ہی کپڑے اتار لیں جیسے اپنے مردوں کے اتارتے ہیں یا نہ اتاریں؟ پھر ساری حدیث ذکر کی۔ اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا۔

اور ابو داؤد میں اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے "جب صحابہ نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کر دی حتیٰ کہ ہر ایک کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جا لگی پھر گھر کی ایک جانب سے کسی کلام کرنے والے نے کلام کیا جسے وہ جان نہ سکے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں سمیت غسل دے دو۔ چنانچہ صحابہ نے غسل دیا جبکہ قمیض آپ کے بدن پر تھی۔ وہ قمیض پر پانی بہاتے پھر اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ قمیض سے آپ کے جسم کو رگڑتے۔ اور حضرت عائشہ کہا کرتیں۔ جو کچھ مجھے اب معلوم ہوا ہے اگر پہلے معلوم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی بیویاں ہی غسل دیتیں۔ اور ابن حبان کی روایت میں ہے کہ: جس شخص نے آپ کو اپنی گود میں بٹھایا وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ اور حاکم نے روایت کیا کہ: علی رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیا۔ علی کے ہاتھ میں ایک کپڑے کا ٹکڑا تھا جسے وہ قمیض کے نیچے داخل کر کے بدن دھوتے اور قمیض آپ کے اوپر ہی رہی۔ اور شافعی نے یہ حدیث مالک سے' جعفر بن محمد سے' اپنے باپ سے روایت کی ہے۔

نیز اس قصہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ آپ کی میت عام لوگوں کی میت کی طرح نہیں تھی۔

۵۰۹- وعن أم عطية رضي الله تعالى عنها قالت: دخل علينا النبي ﷺ ونحن نغسل ابنته، فقال: اغسلنها ثلاثاً أو خمساً أو أكثر من ذلك، إن رأيتن ذلك، بماء وسدر، واجعلن في الأخيرة كافوراً، أو شيئاً من كافور، فلما فرغنا آذناه، فألقى إلينا حقوه، فقال: أشعرنها إياه. متفق عليه. وفي رواية: ابدأن بميامنها، ومواضع الوضوء منها. وفي لفظ للبخاري: فضفرنا شعرها ثلاثة قرون، فألقيناه خلفها.

ام عطیہ (۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہمارے پاس آئے جب ہم آپ کی بیٹی کو(۲) غسل دے رہی تھیں اور فرمایا کہ اسے پانی اور بیری سے تین بار یا پانچ بار یا اگر مناسب خیال کرو تو اس سے زیادہ بار غسل دو اور آخری غسل میں کافور یا کافور کا کچھ(۳) حصہ ملا لینا۔ پھر جب ہم اس کام سے فارغ ہوئیں تو ہم نے آپ کو اطلاع دی(۴)۔ آپ نے ہماری طرف اپنا تہبند(۵) پھینکا اور فرمایا اس میں اسے کفنا(۶) دو۔ متفق علیہ اور ایک روایت میں ہے کہ وضوء کے اور دوسرے مقامات سب کو دائیں جانب سے شروع کرنا اور بخاری کی روایت کے الفاظ(۷) یہ ہیں۔ پھر ہم نے اس کے بالوں کو تین لڑیوں میں گوندھا اور ان لڑیوں کو پشت کی طرف ڈال دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) آپ انصاریہ ہیں۔ آپ کا نام اور اس میں اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) بخاری کی کسی روایت میں اس کا نام مذکور نہیں مشہور یہ ہے کہ زینب تھیں جو ابوالعاص کی بیوی تھیں۔ ان کی وفات ۸ھ کے آغاز میں ہوئی۔ اور بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ ام کلثوم تھیں۔ اور بخاری میں ابن سیرین سے مذکور ہے "میں نہیں جانتا کہ وہ آپ کی کونسی بیٹی تھی"۔

(۳) یہ راوی کا شک ہے کہ آپؐ نے کونسا لفظ بولا تھا۔ پہلا لفظ نکرہ آیا ہے اور اسے دوسرے پر محمول کیا جا سکتا ہے لہٰذا ہر لفظ درست ہے۔

(۴) بخاری میں ہے کہ "جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے اطلاع دینا" اور بخاری کی ایک دوسری روایت ہے فرغنا کے بجائے فرغن ہے۔

(۵) بخاری میں ہے کہ "پھر آپ نے ہمیں تہبند دیا۔ اصل عبارت میں لفظ حقوۃ ہے جو ح کی فتح اور کسرہ دونوں طرح درست ہے اس کا اصل معنی تو کمر ہے جہاں تہبند باندھا جاتا ہے۔ اور یہاں مجازاً تہبند کے معنوں میں آیا ہے۔

(۶) اصل عبارت میں لفظ اشعرنہا آیا ہے یعنی اس تہبند کو اس کا شعار بنا دو یعنی وہ کپڑا بناؤ جو بدن سے ملا رہے۔

(۷) یہ روایت بھی ام عطیہ ہی سے مروی ہے۔

حدیث کے لفظ "اسے تین بار دھوؤ" میں حکم ہے جو تین بار دھونے کے وجوب پر دلالت کرتا ہے اور اجماع سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار دھونا کافی ہے گویا زیادہ بار کو مستحب پر محمول کیا گیا ہے رہا اصل غسل تو اس کا وجوب دوسرے مقام سے معلوم ہو جاتا ہے اور بعض تین بار دھونا واجب سمجھتے ہیں اور پانچ بار کا معاملہ اختیاری ہے یہ ترتیب ظاہر نہیں کرتا۔ نیز حدیث میں "اور اکثر" بھی آیا ہے اور ایک روایت میں اس کے بجائے "یا سات بار یا اس سے زیادہ" بھی آیا ہے۔ احمد اسی کے قائل ہیں اور سات سے زیادہ کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں میں نہیں جانتا کہ کوئی سات سے زیادہ بار دھونے کا قائل ہو الا یہ کہ ابوداؤد میں "یا سات یا اس سے زیادہ" کے الفاظ ہیں۔ جس کا ظاہر یہ ہے کہ سات پر زیادتی بھی مشروع ہے۔

اور بیری سے دھونے کی کیفیت پر بحث پہلے گزر چکی ہے علماء کہتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ میت کے جسم کو ملائم کر دیتی ہے رہا کافور سے غسل دینا تو اس کا ظاہر یہ ہے کہ کافور کو پانی میں ڈال دیا جائے اس سے پانی میں کوئی مضر تغیر واقع نہ ہو گا اور اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ اس جگہ کو خوشبودار بناتا ہے جہاں فرشتے وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بدن کو خشک اور ٹھنڈا کرتا اور میت کے جسم میں نفوذ کر کے اسے سخت بناتا اور فضلات کو باہر نکلنے سے اور حلیہ میں بگاڑ پیدا ہونے سے روکتا ہے اور اس میں خوشبو بڑی تیز ہوتی ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہی وہ اسرار ہیں جن کی بناء پر کافور سے غسل آخری بار رکھا گیا ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو پانی اس کے اثر کو بہا لے جاتا۔

نیز اس حدیث میں دائیں جانب سے دھونے کی ابتداء کرنے پر دلیل ہے یعنی وہ اعضاء جو دائیں جانب ہوتے ہیں اور حدیث کے لفظ "وضوء کے مقامات سے" اس کے منافی نہیں ہیں۔ ان دونوں کو ایک ساتھ شروع کیا جا سکتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ پہلے وہ مقامات دھوئے جائیں جو وضو کے مقام نہیں ہیں پھر سب کو متصلا دھویا جائے کہ وضوء کی تجدید کے حکم میں حکمت یہ ہے کہ اس کے وضوء کے مقامات پر روشنی اور چمک کے اثرات ظاہر ہوں اور ظاہر ہے کہ وضوء کے مقامات میں کلی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے۔

اور حدیث کے لفظ "ہم نے اس کے بال گوندھ دیئے" سے میت کے بال گوندھنے پر استدلال کیا گیا ہے اور حنفیہ نے کہا کہ عورت کے بال اس کے پیچھے اور منہ پر کھلے ڈال دیئے جائیں۔ قرطبی کہتے ہیں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام ام عطیہ نے خود کیا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نہیں کیا تھا۔ لیکن مصنف کہتے ہیں کہ یہ روایت سعید بن منصور سے ان الفاظ میں ہے کہ ام عطیہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسے طاق تعداد میں غسل دو اور اس کے بال گوندھ کر لڑیاں بناؤ" اور صحیح ابن حبان میں ہے "اسے تین یا پانچ یا سات بار غسل دو اور اس کی تین لڑیاں بناؤ" اور قرن (جمع قرون) سے یہاں مراد بالوں کی گوندھی ہوئی لڑیاں ہیں۔ اور بخاری کی ایک روایت کے یہ لفظ ہیں ناصیتها وقرنیها یعنی اس کی پیشانی کے بال اور اس کی دو لڑیاں بناؤ" اور تین لڑیوں کے لفظ میں تغلیب ہے اور یہ سب روایات حنفیہ کے خلاف حجت ہیں اور بالوں کو دھونا اور گوندھنا سر کے بالوں کو کھولنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور بخاری میں یہ بات صریح ہے نیز اس حدیث میں بالوں کو عورت کے پیچھے ڈالنے پر دلالت ہے۔ اور ابن دقیق العید سے یہ بھول ہوئی کہ یہ الفاظ بخاری میں ہیں لہٰذا اس نے یہ قول شافعیہ کی طرف منسوب کر دیا اور اس نے اس بارے میں اس حدیث کے غریب ہونے پر اعتماد کیا ہے۔

۵۱۰۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كفن رسول الله ﷺ في ثلاثة أثواب بيض سحولية من كرسف، ليس فيها قميص ولا عمامة. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سحولی' سوتی' سفید رنگ کے تین کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا اور ان میں نہ قمیص تھی اور نہ پگڑی(۱)۔ متفق علیہ(۲)۔

(۱) بلکہ ایک تہبند' ایک چادر اور ایک لفافہ تھا جیسا کہ طبقات ابن سعد میں شعبی سے اس کی صراحت مذکور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

(۲) اس میں یہ دلیل ہے کہ تین سفید کپڑوں پر مشتمل کفن ہی افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے افضل کے علاوہ اور کچھ پسند نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اہل السنن نے ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا کہ "سفید لباس پہنا کرو کیونکہ خوشگوار اور پاکیزہ ہوتا ہے اور اپنے مردوں کو انہیں سے کفن دیا کرو" اور ترمذی اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور سمرہ کی حدیث سے اس کا ایک شاہد بھی ہے جسے انہوں نے روایت کیا ہے اور اس کی بھی سند صحیح ہے اور وہ جو عائشہ کی حدیث میں پہلے مذکور ہوا کہ: "آپ" کو دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا اور یہ چادر یمانی دھاری دار اور بہت قیمتی تھی" تو ان میں کچھ تعارض نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چادر میں کفنایا گیا تھا بلکہ اس سے صرف آپ کو ڈھانپا گیا تھا تاکہ اس میں آپ کا بدن خشک ہو جائے پھر اسے کھینچ لیا۔ جیسا کہ مسلم نے روایت کیا ہے اور یہ تو واضح ہے کہ یہ ڈھانپنا غسل سے پہلے تھا۔ ترمذی نے کہا کہ جو کچھ آپ کے کفن کے بارہ میں آیا ہے ان میں سے صحیح تر بات یہی ہے کہ آپ کو تین سفید کپڑوں میں کفنایا گیا تھا۔ رہی وہ روایت جسے احمد' ابن ابی شیبہ اور بزار نے علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سات کپڑوں میں کفنایا گیا" تو یہ عبداللہ بن محمد بن عقیل کی روایت ہے جس کا حافظہ خراب تھا۔ اس کی حدیث کو متابعات میں تو قبول کیا جا سکتا ہے مگر جب وہ منفرد ہو تو یہ بات درست نہیں۔ پھر جب اس موجودہ روایت کے مخالف ہو تو قبول نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو عائشہ کی حدیث سے اس کی تطبیق کی یہی صورت ہے کہ حضرت عائشہ نے وہ کچھ روایت کیا جس کی انہیں اطلاع دی گئی اور دوسروں نے وہ روایت کیا جو انہیں معلوم ہوا۔ اور اگر علی کی روایت کو صحیح سمجھا جائے تو وہ غسل کے وقت کی بات ہو گی۔

جاننا چاہئے کہ کفن ایسا ہونا چاہئے جو میت کے پورے بدن کو ڈھانپ سکے اور اگر چھوٹا ہو تو پہلے مقامات سر کو ڈھانپا جائے' اس سے زیادہ ہو تو سر کی جانب ڈھانپا جائے اور پاؤں پر گھاس پھوس ڈال دیا جائے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حمزہ اور مصعب بن عمیر کے بارے میں کیا تھا۔ اور اگر ایک کپڑے سے زائد ہو تو مستحب یہ ہے کہ طاق ہوں اور دو پر بھی اکتفا جائز ہے جیسا کہ محرم کی حدیث میں گزرا جو مر گیا تھا اور شعبی کی روایت سے آپ کو تین کپڑوں کی کیفیت معلوم ہو چکی کہ وہ تہبند' چادر اور لفافہ ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ پاجامہ اور زرجان ہیں (بدن کو لپیٹنے والے دو کپڑے) اور بعض کہتے ہیں کہ ایک ان سلی قمیض ہو اور تہبند جو اس کی ناف سے ٹخنوں تک ہو اور لفافہ جو اسے چوٹی سے لے کر قدموں تک ملفوف کر دے اور عائشہ کا قول کہ "اس میں نہ قمیض تھی اور نہ پگڑی" کی ان لوگوں نے یہ تاویل کی کہ اس سے حضرت عائشہ کی مراد دونوں کی ایک ساتھ نفی ہے صرف قمیض کی نفی نہیں یا یہ کہ مذکورہ تین کپڑے قمیض اور پگڑی سے خارج ہیں۔ یعنی میت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر پہلے قمیض اور عمامہ پہنے ہو تو یہ تین کپڑے زائد ہیں اور یہ تاویل بہت بعید ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ کفن میں قمیض کا ہونا نہ ہونا دونوں ایک جیسے مستحب ہیں کیونکہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کو کفن میں اپنی قمیض پہنائی تھی" جسے بخاری نے روایت کیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو وہی کام کرتے تھے جو بہتر تھا اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ میت کی قمیض زندہ کی قمیض کی طرح ہے جس کے کف بھی تھے اور بٹن بھی لگے ہوئے تھے اور محمد بن سیرین نے اسی کو پسند کیا ہے جیسا کہ بیہقی نے خلافیات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے شرح میں کہا کہ اس میں اس شخص کا رد ہے جو قمیض کو صرف اس صورت میں مشروع سمجھتا ہے جب اس کی اطراف میں کف نہ ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات قمیض کی اطراف کی کف پر موقوف ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کا دستور تھا۔

٥١١- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، قال: لما توفي عبد الله بن أبي جاء ابنه إلى رسول الله ﷺ فقال: أعطني قميصك أكفنه فيه، فأعطاه إياه. متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جب عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) مرا تو اس کا بیٹا(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے اپنی قمیض عطا کیجئے تاکہ میں اس میں اپنے باپ کو کفنا دوں۔ چنانچہ آپ نے وہ قمیض اسے دے دی(۲)۔ متفق علیہ۔

(۱) یعنی عبداللہ بن عبداللہ۔

(۲) یہ اس بات پر دلیل ہے کہ کفن میں قمیض پہنانا مشروع ہے جیسا کہ قریب ہی پہلے گزر چکا اور روایت کا ظاہر یہ ہے کہ عبداللہ بن عبداللہ نے تکفین سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قمیض طلب کی تھی الا یہ کہ بخاری میں مذکور جابر کی حدیث اس سے معارض ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی کے پاس اس وقت آئے جب اسے دفن کیا جا چکا تھا آپ نے اسے نکالا اس کے منہ میں اپنی تھوک ڈالی اور اسے اپنی قمیض پہنائی۔ یہ حدیث واضح طور پر بتلا رہی ہے کہ آپ کا قمیض عطا کرنا اور اسے پہنانا کفن کے بعد کی بات ہے اور ابن عمر کی حدیث اس کے مخالف ہے۔ ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ابن عمر کی حدیث میں فأعطاه سے مراد یہ ہے کہ آپ نے یہ انعام کے طور پر دی تھی اور اس پر لفظ عطیہ کا اطلاق مجازاً ہے۔ اسی طرح جابر کی حدیث میں بعدما دفن سے مراد اسے قبر کے گڑھے میں رکھنا ہے یعنی آپ اس وقت پہنچے جب اس کو قبر میں رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے نکال کر آپ نے اس کے منہ میں اپنا تھوک ڈالا اور قمیض پہنائی گئی ان دونوں باتوں کو اکٹھا بیان کرنا اس بات پر دلیل نہیں کہ دونوں باتیں ایک ساتھ واقع ہوئی تھیں کیونکہ لفظ "و" نہ جمع کا تقاضا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا ہے اور نہ ترتیب کا شاید جابر کی مراد یہ تھی کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کی تکریم کے بارے میں کیا اسے ترتیب کے ارادہ کے بغیر ذکر کر دیا جائے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قمیض دی تھی اور جب اسے دفن کیا جانے لگا تو اس کے بیٹے عبداللہ کے سوال پر اسے دوسری دے دی۔ اور حاکم کی کتاب الاکلیل میں ایسی روایت ہے جو اس کی تائید کرتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ آپؐ نے عبداللہ بن عبداللہ کو قمیض اس لئے دے دی کہ وہ ایک صالح آدمی تھا اور اس لئے بھی کہ اس نے سوال کیا تھا اور آپ کسی سائل کے سوال کو رد نہیں کرتے تھے۔ ورنہ اس کا باپ جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیض پہنائی تھی اور وہ اس میں کفنایا گیا رئیس المنافقین تھا جو نفاق کی حالت پر مرا اور اللہ تعالیٰ نے اسی کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔ ولاتصل علی احدمنھم مات ابدا اور بعض کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لئے قمیض پہنائی تھی کہ اس نے آپ کے چچا عباسؓ کو قمیض پہنائی تھی جب وہ جنگ بدر میں قید ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلہ اتارنے کی خاطر اسے یہ قمیض دی تھی۔

۵۱۲- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ قال: **«البسوا من ثيابكم البياض فإنها من خير ثيابكم، وكفنوا فيها موتاكم»**. رواه الخمسة إلا النسائي، وصححه الترمذي.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سفید کپڑے پہنا کرو کیونکہ وہ تمہارے بہترین کپڑے ہیں اور انہی میں اپنے مردوں کو کفنایا کرو۔ اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی نے صحیح کہا۔

بخاری میں مذکور عائشہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین سفید کپڑوں میں کفنایا گیا تھا اور امر (حکم) کا ظاہر یہی ہے کہ سفید کپڑوں میں کفنانا اور سفید کپڑے پہننا واجب ہے الا یہ کہ پہننے میں حکم اس لئے بدل جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر سفید کپڑے بھی پہنے تھے۔ رہا تکفین کا معاملہ تو اس میں تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں الا یہ کہ سفید کپڑے مل ہی نہ سکیں۔ جیسا کہ شہدائے احد کی تکفین کے وقت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی آدمیوں کو ایک دھاری دھار چادر میں کفنایا جیسا کہ یہ حدیث آرہی ہے تو مجبوری کے تحت ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ رہی ابن عباس کی حدیث جسے ابن عدی نے روایت کیا ہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سرخ چادر میں کفنایا گیا" تو اس کی سند میں قیس بن ربیع ضعیف ہے گویا اس پر یہ حدیث مشتبہ ہو گئی کہ "آپ کی قبر میں سرخ چادر رکھی گئی" اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کو دھاری دار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چادر میں کفنایا گیا تھا اور اس پر کلام پہلے گزر چکا ہے کہ اس سے آپ کو صرف ڈھانپا گیا تھا پھر وہ اتار لی گئی تھی۔

۵۱۳- وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا كفن أحدكم أخاه فليحسن كفنه». رواه مسلم.

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو کفنائے تو اچھا کفن دے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(ا)۔

(ا) نیز اسے ترمذی نے بھی ابو قتادہ کی حدیث سے روایت کیا اور کہا کہ یہ حسن غریب ہے۔ پھر کہا کہ ابن المبارک کہتے ہیں کہ سلام بن مطیع نے ولیحسن کفنه کے بارے میں کہا کہ اچھے کفن سے مراد کھلا ڈھلا کفن ہے اور اچھا کفن دینے میں اس اختیار پر دلالت ہے کہ وہ کپڑا اپنی ذات میں اچھا ہو' اس کی صفت اچھی ہو اور میت کو کپڑے پہنانے کی کیفیت بھی اچھی ہو۔ ذات میں اچھا ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی طرح بھی زیادہ مہنگے کپڑوں میں نہ شمار ہو سکے جیسا آگے اس کی ممانعت آ رہی ہے اور کپڑے کی صفت اس سے پہلے ابن عباس کی حدیث میں بیان ہو چکی (یعنی وہ سفید ہونے چاہئیں) رہی میت کو کپڑے پہنانے کی کیفیت تو وہ بھی پہلے بیان ہو چکی۔ چنانچہ کئی احادیث میں کفن میں احسان اور اس کی وجہ بھی مذکور ہے۔ دیلمی نے جابر سے مرفوعاً" روایت کیا کہ: "اپنے مردوں کو اچھا کفن پہناؤ کیونکہ وہ اپنی قبروں میں ایک دوسرے کی زیارت کرتے اور ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں" نیز دیلمی نے ام سلمہ کی حدیث سے روایت کیا کہ: "تکفین اچھی طرح کرو۔ اور اپنے مردوں کو گریہ و زاری کر کے' ان کی بے جا تعریف کر کے' وصیت میں تاخیر کر کے اور قطع رحمی کر کے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ اور اس کا قرضہ جلد ادا کرو اور اپنے برے ہمسایوں سے انصاف کرو اور جب تم قبر کا گڑھا کھودو تو گہرا اور کھلا کھودو" اور میت پر احسان اس حدیث میں ہے جسے احمد نے عائشہ کی حدیث سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ: جس نے میت کو غسل دیا تو اس نے اپنی امانت ادا کر دی اور اگر اس کے پاس میت کی کوئی راز کی بات ہو تو اسے فاش نہ کرے وہ اپنے گناہوں سے اس طرح صاف ہو جاتا ہے جیسے آج ہی اسے اس کی ماں نے جنا ہے" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تمہیں معلوم ہو سکے تو اس کا ولی وہ بنے جو تم میں زیادہ قریبی ہے اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے تو پھر جسے تم پرہیزگار اور امانتدار سمجھو۔ اسے احمد نے روایت کیا۔ اور شیخین نے ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا" اور عبداللہ بن احمد نے ابی بن کعب کی حدیث کو یوں روایت کیا' آدم علیہ السلام کی فرشتوں نے روح قبض کی' اسے غسل دیا' اسے کفنایا اور خوشبو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لگائی' اس کے لئے گڑھا کھودا اور لحد بنائی' اس پر نماز پڑھی' اور قبر میں داخل کیا اور اس پر اینٹیں رکھیں۔ پھر قبر سے باہر نکلے۔ پھر اس پر مٹی ڈالی پھر کہا: "اے بنی آدم! یہ تمہاری سنت ہے"

۵۱۴۔ وعنه قال: كان النبي ﷺ يجمع بين الرجلين من قتلى أحد في ثوب واحد، ثم يقول: أيهم أكثر أخذاً للقرآن؟ فيقدمه في اللحد، ولم يغسلوا، ولم يصلّ عليهم. رواه البخاري.

اور انہی جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہدائے احد کے دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں اکٹھا کفناتے پھر پوچھتے ان میں سے قرآن کسے زیادہ یاد تھا۔ اسے آپ لحد(۱) میں آگے کر دیتے۔ انہیں نہ غسل دیا گیا اور نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اسے بخاری نے روایت کیا(۲)۔

(۱) لحد اس شگاف کو کہتے ہیں جو قبر میں درمیان سے ہٹ کر ایک طرف بنایا جاتا ہے اور الحاد کا لغوی معنی صرف میلان ہے۔

(۲) یہ حدیث مندرجہ ذیل کئی احکام پر دلالت کرتی ہے۔

پہلا یہ کہ ضرورت کے تحت ایک کپڑے میں دو میتیں جمع کرنا جائز ہے اور یہ دو احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان دونوں کو جدا جدا کفنایا جائے اور آمنے سامنے رکھا جائے۔ بہت سے لوگوں کا یہی مذہب ہے۔ بلکہ بعض کہتے ہیں کہ پہلے احتمال کا کوئی بھی قائل نہیں کیونکہ اس طرح دونوں میتوں کی جلدیں مل جاتی ہیں مخفی نہ رہے کہ جابر کی حدیث کا آخری حصہ یہ ہے "پھر آپ نے میرے باپ اور میرے چچا کو ایک ہی چادر میں کفنایا" اور یہ پہلے احتمال پر دلیل ہے البتہ شارح رحمہ اللہ نے کہا کہ واضح تو دوسرا احتمال ہے جیسا کہ آپ نے حمزہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ جابر کی حدیث ان دونوں کا کپڑا الگ الگ نہ کرنے میں بہت واضح ہے لہٰذا دو جائز کاموں میں سے ایک یہ ہے اور الگ الگ کرنا اصل کے لحاظ سے جائز ہے۔

دوسرا حکم ۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن کی فضیلت کی بنا پر جسے قرآن زیادہ یاد ہو اسے دوسرے پر مقدم رکھا جائے اور جب ایک لحد میں کئی میتوں کو اکٹھا کیا جائے تو فضیلت کے باقی پہلوؤں کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا۔

تیسرا حکم ۔ مجبوری کے تحت ایک قبر میں متعدد میتیں اکٹھی رکھی جا سکتی ہیں بخاری کے باب کا عنوان یہ ہے۔"دو اور تین آدمیوں کو ایک قبر میں دفن کرنا" اور یہ جابر کی حدیث میں آیا ہے اگرچہ جابر کی روایت دو آدمیوں کے بارے میں ہے تاہم عبدالرزاق کی روایت میں تین کا ذکر بھی آیا ہے کہ "آپ دو دو اور تین تین آدمیوں کو ایک قبر میں دفن کرتے تھے" اور اصحاب سنن نے ہشام بن عامر انصاری سے روایت کیا کہ "احد کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ون انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگے کہ ہمیں بہت زخم اور مشقت پہنچی ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ "کھلے کھلے گڑھے کھودو اور قبر میں دو اور تین آدمی رکھو" اسے ترمذی نے صحیح کہا۔ اسی طرح دو اور تین عورتیں بھی رکھی جا سکتی ہیں رہا مرد اور عورت کا ایک قبر میں دفن کرنا تو اس سلسلے میں عبدالرزاق نے واثلہ بن اسقع سے اچھی سند سے روایت کیا کہ آپ نے مرد اور عورت کو ایک ہی قبر میں دفن کیا۔ مرد کو آگے کرتے اور عورت کو اس کے پیچھے۔ گویا ان دونوں کے درمیان مٹی سے آڑ بنا دیتے۔

چوتھا حکم ۔ یہ ہے کہ شہید کو غسل نہ دیا جائے اور یہی جمہور کا مذہب ہے اور اہل مذہب کی اس بارے میں لمبی چوڑی تفصیل ہے۔ اور سعید بن مسیب، حسن اور ابن شریح سے مروی ہے کہ اس کا غسل واجب ہے۔ اور یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے نیز احمد نے جابر کی حدیث روایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کے بارے میں فرمایا: "انہیں غسل نہ دو کیونکہ ان کا ہر ایک زخم اور بہتا ہوا خون قیامت کے دن کستوری ہو گا" گویا اس روایت میں اس کی حکمت کی وضاحت کر دی۔

پانچواں حکم ۔ شہید پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف مشہور ہے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ میت پر نماز جنازہ کے دلائل کے عموم پر عمل کرتے ہوئے شہید پر بھی نماز جنازہ پڑھنا چاہئے اور اس لئے بھی کہ بخاری نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد پر نماز جنازہ پڑھی اور ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ جابر کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے جنازہ نہ پڑھنا چاہئے۔ شافعی کہتے ہیں کہ کئی طریقوں سے متواتر احادیث آئی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "شہدائے احد پر نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی" اور یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے حمزہ پر نماز جنازہ پڑھی اور سات تکبیروں کے ساتھ پڑھی یہ صحیح نہیں اور جو شخص ان صحیح احادیث سے معارضہ کرتا ہے اسے اپنے آپ پر شرم آنا چاہئے۔ رہی عقبہ بن عامر کی حدیث تو یہ بات اس حدیث میں ہی مذکور ہے کہ آٹھ سال بعد کا واقعہ ہے یعنی مخالف یہ کہتا ہے کہ قبر پر نماز جنازہ نہ پڑھی جب مدت لمبی ہو جائے تو اس کا استدلال پورا نہیں ہوتا۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کے لئے اس وقت دعا کی اور ان کے لئے بخشش طلب کی جب آپ کو اپنی وفات کے قریب ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ ایک ثابت حکم کے نسخ پر دلیل نہیں بن سکتا۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے شہدائے احد کے لئے دعا کی تو صحابہ کی جماعت کے ساتھ نہیں کی۔ اگر یہ نماز جنازہ ہوتی تو آپ اپنے اصحاب کو بتلاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے جیسا کہ آپ نے نجاشی کی نماز جنازہ کے بارے میں کیا تھا کیونکہ جماعت یقیناً افضل ہے۔ اور شہدائے احد اس افضل کام کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ اور اس لئے بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وارد نہیں ہوا کہ آپ نے اکیلی اکیلی قبر پر نماز پڑھی ہو۔ اور عطیہ کی حدیث کو بخاری نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسلم نے شہدائے احد پر آٹھ سال بعد نماز پڑھی۔ اور ابن حبان نے یہ زیادہ کیا کہ "پھر آپ اپنی وفات تک اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے"

۵۱۵- وعن علي رضي الله تعالى عنه قال: سمعت النبي ﷺ يقول: «**لا تغالوا في الكفن، فإنه يسلب سريعاً**». رواه أبو داود.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کفن میں مہنگے کپڑے استعمال نہ کرو کیونکہ وہ بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔

ابوداؤد نے یہ روایت شعبی سے، علی رضی اللہ عنہ سے کی ہے اور اس کی سند میں عمرو بن ہشام جنبی ہے جو مختلف فیہ ہے نیز اس میں شعبی اور علی کے درمیان انقطاع بھی ہے چنانچہ دار قطنی نے کہا کہ شعبی نے علی سے ایک حدیث کے سوا کچھ نہیں سنا۔

اور یہ حدیث کفن میں مہنگا کپڑا استعمال کرنے کی ممانعت پر دلیل ہے اور حدیث کے الفاظ فانہ یسلب سریعا میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بہت جلد بوسیدہ ہو جاتا ہے جیسا کہ عائشہ کی حدیث میں ہے کہ: "ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی مرض الموت میں اپنے پہنے ہوئے کپڑے کو دیکھا جس میں زعفران کی خوشبو لگی ہوئی تھی تو کہنے لگے۔ میرے اسی کپڑے میں مجھے غسل دے دینا اور اس کے اوپر دو زائد کپڑے ڈال کر مجھے کفنا دینا۔ میں نے کہا۔ یہ کپڑا تو پرانا ہو چکا ہے تو کہنے لگے۔ نئے کپڑے کے زندہ لوگ میت سے زیادہ حقدار ہیں اور یہ کپڑا تو صرف فالتو رطوبتوں(۱) کے لئے ہے" اسے بخاری نے مختصرا روایت کیا۔

۵۱۶- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ قال لها: لو متِّ قبلي لغسلتك، الحديث. رواه أحمد وابن ماجه، وصححه ابن حبان.

عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ "اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو گئی تو میں تجھے غسل دوں گا"۔ اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا۔

اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ مرد اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے اور یہی جمہور کا قول ہے لیکن ابوحنیفہ نے کہا کہ مرد عورت کو غسل نہ دے کیونکہ نکاح اٹھ جاتا ہے اور مرد پر عدت بھی نہیں۔ البتہ بیوی اپنے مرد کو غسل دے سکتی ہے (کیونکہ وہ عدت میں ہے اور اس کی بیوی ہے) اس حدیث کے الفاظ زوجین کے بارے میں اس کی تردید کر رہے ہیں رہا اجانب کا مسئلہ تو ابوداؤد نے مراسیل میں ابوبکر بن عیاش سے محمد بن ابی سہل سے، مکحول سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب مردوں کے ساتھ کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عورت فوت ہو جائے اور اس کے علاوہ کوئی عورت نہ ہو، اور عورتوں کے ساتھ کوئی مرد فوت ہو جائے اور کوئی دوسرا مرد نہ ہو تو وہ تیمم کرائیں اور دفن کریں" اور اس کی صورت وہی ہے جسے پانی نہ ملے تو تیمم کرلے۔

محمد بن ابی سہل کو ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور بخاری نے کہا کہ اس کی حدیث کا کوئی تابع نہیں ہے۔ اور علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنی ران کو ننگا نہ کر اور نہ ہی کسی زندہ یا میت کی ران کی طرف دیکھ" اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔ اور اس کی سند میں اختلاف ہے۔

٥١٧- وعن أسماء بنت عميس رضي الله تعالى عنها، أن فاطمة رضي الله تعالى عنها أوصت أن يغسلها علي رضي الله تعالى عنه. رواه الدارقطني.

اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ وصیت کی کہ انہیں صرف علی رضی اللہ عنہ ہی غسل دیں۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا۔

یہ حدیث اسی بات پر دلالت کرتی ہے جس پر پہلی حدیث کرتی ہے۔ رہا عورت کا اپنے خاوند کو غسل دینا تو اس کا استدلال حضرت عائشہ کی اس حدیث سے کیا گیا ہے ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ "اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا جو بعد میں معلوم ہوا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بیویوں کے سوا کوئی غسل نہ دیتا" اور اسے حاکم نے صحیح کہا اگرچہ یہ صحابیہ کا قول ہے اسی طرح فاطمہ کی حدیث ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معروف تھی اور اس کی تائید بیہقی کی اس روایت سے ہوتی ہے۔ کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی اسماء بنت عمیس کو وصیت کی کہ وہ آپ کو غسل دے اور اس نے اپنی کمزوری کی وجہ سے اس معاملہ میں عبدالرحمٰن بن عوف سے مدد لی۔ اور کام کو کسی نے ناگوار نہ سمجھا اور جمہور اسی کے قائل ہیں البتہ اس میں احمد بن حنبل نے نکاح اٹھ جانے کی بناء پر اختلاف کیا جیسا کہ شرح میں ہے نیز حنابلہ کی کتب میں سے دلیل المطالب میں ہے کہ آدمی اپنی بیوی اور اپنی کنیز اور سات برس سے کم عمر کی بیٹیوں کو غسل دے سکتا ہے اور عورت اپنے خاوند، اپنے مالک اور سات برس سے کم عمر کے بیٹے کو غسل دے سکتی ہے۔

---

(۱) اصل میں مھلہ کا لفظ ہے جس کا معنی وہ پیپ یا کچلہو ہے جو جسم سے بہ نکلتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥١٨- وعن بريدة رضي الله تعالى عنه - في قصة الغامدية، التي أمر النبي ﷺ برجمها في الزنا - قال: ثم أمر بها، فصلى عليها، ودفنت. رواه مسلم.

بریدہؓ سے اس غامدیہ(۱) عورت کے قصہ میں روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کی وجہ سے رجم کرنے کا حکم دیا۔ پھر آپؐ نے حکم دیا تو اس پر نماز جنازہ پڑھی گئی اور اسے دفن کیا گیا(۲)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) غامد قبیلہ کی طرف نسبت ہے اور اس کا قصہ باب الحدود میں آرہا ہے۔

(۲) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص حد میں مارا جائے اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے لیکن اس میں یہ دلیل نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس پر نماز پڑھی تھی۔ چنانچہ مالک نے کہا کہ حد میں مرجانے والے پر امام نماز نہ پڑھے کیونکہ فضلاء سرزنش کے طور پر فاسقوں پر نماز نہیں پڑھتے۔

میں کہتا ہوں کہ شرح میں بھی ایسا ہی ہے لیکن اس غامدیہ عورت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر سب اہل مدینہ پر تقسیم کی جائے تو سب کو پوری ہو جائے" یا اسی سے ملتے جلتے الفاظ فرمائے۔

اور علماء کا فساق پر، حد میں مرنے والے پر، محاربہ کرنے والے پر اور ولدالزنا پر نماز جنازہ پڑھنے میں اختلاف ہے اور ابن عربی نے کہا کہ علماء کا مذہب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر جنازہ پڑھا جائے خواہ وہ حد میں مرے یا رجم میں یا اس نے خود کشی کی ہو یا وہ ولدالزنا ہو۔ اور خود کشی کرنے والے سے متعلق درج ذیل حدیث آئی ہے۔

٥١٩- وعن جابر بن سمرة رضي الله تعالى عنهما قال: أتي النبي ﷺ برجل قتل نفسه بمشاقص، فلم يصلّ عليه. رواه مسلم.

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ایسے شخص کو لایا گیا جس نے نیزہ کے چوڑے(۱) پھل سے خود کشی کی تھی۔ آپ نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اصل عبارت میں لفظ مشاقص آیا ہے جو مشقص کی جمع ہے بمعنی چوڑا پھل یا پھلٹا۔ خطابی کہتے ہیں کہ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھنے کا معنی یہ ہے کہ اسے اس کام کی سزا ملے اور دوسروں کو ایسا کام کرنے سے عبرت حاصل ہو۔ نیز لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ اور عمر بن عبدالعزیز خودکشی کرنے والے پر نماز نہ پڑھنے کے قائل تھے اور اوزاعی نے بھی ایسا ہی کہا ہے اور اکثر فقہاء اس پر نماز پڑھنے کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ نے اس پر نماز پڑھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی صورت وہی ہے کہ آپ نے ابتداء" اس شخص کی نماز جنازہ نہ پڑھی جس پر قرضہ تھا مگر صحابہ کو حکم دیا کہ اس پر نماز جنازہ پڑھیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خودکشی کرنے والے پر نماز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھنے کا صحابہ کو حکم دیا تھا تو یہ قول پورا ہو جاتا ہے ورنہ عمر بن عبدالعزیز کی رائے حدیث سے زیادہ موافق ہے الا یہ کہ نسائی کی روایت یوں ہے کہ "رہا میرا معاملہ' تو میں اس پر نماز نہیں پڑھوں گا" اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسروں نے اس پر نماز پڑھی تھی۔

٥٢٠ - وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه - في قصة المرأة التي كانت تقم المسجد - قال: فسأل عنها النبي ﷺ، فقالوا: ماتت، فقال: أفلا كنتم آذنتموني؟ فكأنهم صغروا أمرها، فقال: دلوني على قبرها، فدلوه، فصلى عليها. متفق عليه.

وزاد مسلم: «ثم قال: إن هذه القبور مملوءة ظلمة على أهلها، وإن الله ينورها لهم بصلاتي عليهم».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس عورت کے بارے میں روایت ہے جو مسجد میں(۱) جھاڑو دیا کرتی تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق پوچھا تو صحابہ نے کہا کہ وہ تو مر گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تو پھر تم نے مجھے کیوں اطلاع نہ دی؟ گویا صحابہ نے اسے معمولی بات سمجھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔ صحابہ آپؐ کو وہاں لے گئے تو آپؐ نے اس پر نماز پڑھی۔ متفق علیہ۔ اور مسلم میں اتنا (۲) زیادہ ہے کہ پھر آپؐ نے فرمایا۔ یہ قبریں اہل قبور پر تاریکی سے بھری ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان پر میری نماز سے ان کی قبریں منور کر دیتا ہے(۳)۔

(۱) اصل عبارت میں لفظ تقم آیا ہے ۔ یعنی قمامه نکال دیتی تھی اور قمامه بمعنی کوڑا کرکٹ ہے۔

(۲) یہ روایت بھی ابوہریرہ سے ہے۔

(۳) اس اضافہ کو بخاری نے روایت نہیں کیا کیونکہ یہ ثابت کی مراسیل سے ہے جیسا کہ احمد نے کہا ہے۔

اور مصنف نے وثوق سے کہا کہ یہ عورت کا قصہ ہے اور بخاری کے یہ لفظ ہیں کہ "کوئی کالا مرد یا کالی عورت" یہ شک ثابت راوی کو ہے۔ لیکن بخاری میں ہی ثابت سے ایک دوسری روایت میں صراحت موجود ہے کہ "میں اسے عورت ہی سمجھتا ہوں" اور یہی بات ابن خزیمہ نے ابوہریرہ سے ایک دوسرے طریق سے روایت کی تو "کالی عورت" کہا۔ اور بیہقی نے بھی اسے حسن سند سے روایت کیا اور اس عورت کا نام ام محجن بتلایا۔ اور یہ بھی بتلایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کا جواب دینے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ اور بخاری میں اس کے بجائے "عورت کے بارے میں پوچھا" کے لفظ ہیں۔ آپ نے پوچھا: اس انسان کو کیا ہوا؟ صحابہ نے کہا: یارسول اللہ! وہ تو مر گیا۔ الحدیث۔

اور یہ حدیث دفن کے بعد میت پر علی الاطلاق نماز جنازہ پڑھنے کی صحت پر دلیل ہے خواہ دفن سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں اور شافعی کا یہی مذہب ہے اور اس پر یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسلم نے براء بن معرور کی قبر پر نماز پڑھی۔ کیونکہ جب براء فوت ہوئے اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ پھر جب مدینہ آئے تو اس کی قبر پر نماز پڑھی اور یہ واقعہ براء کی وفات سے ایک ماہ بعد کا ہے۔ نیز یہ روایت بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انصاری لڑکے پر نماز پڑھی جسے رات کو دفن کر دیا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی موت کی خبر دی گئی تھی۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ نیز اس پر وہ احادیث بھی دلالت کرتی ہیں جو اس بارے میں نو صحابہ سے آئی ہیں اور مصنف نے شرح میں ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

اور ہادی کے مذہب کے مطالعہ کے بعد ابوطالب بھی اس طرف گئے ہیں کہ قبر پر نماز جنازہ نہیں ہوتی۔ اور بحر میں ایسی حدیث سے استدلال کیا ہے جو ان بکثرت اور صحیح احادیث سے معارضہ کی قوت نہیں رکھتی اور جو قبر پر نماز کے قائل ہیں ان میں یہ اختلاف ہوا کہ کتنی مدت تک قبر پر نماز مشروع ہے۔ بعض کہتے ہیں دفن کے ایک ماہ بعد تک اور بعض کہتے ہیں کہ میت کے بوسیدہ ہونے تک کیونکہ جب میت بوسیدہ ہو گئی تو باقی کیا رہا جس پر نماز پڑھی جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ہمیشہ پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ نماز سے مراد میت کے لئے دعا ہے اور وہ ہر وقت کی جا سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی بات درست ہے کیونکہ مدت کی تحدید پر کوئی دلیل نہیں۔ رہی یہ بات کہ قبر پر نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے تھی تو یہ کوئی دلیل نہیں کیونکہ خصوصیت کا دعویٰ اصل کے خلاف ہے۔

٥٢١- وعن حذيفة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ كان ينهى عن النعي. رواه أحمد والترمذي، وحسنه.

حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موت کی خبر دینے سے منع کیا کرتے تھے۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے حسن کہا(ا)۔

(ا) گویا نہی کا صیغہ وہ ہے جسے ترمذی نے عبداللہ کی حدیث سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ "ایاکم والنعی" یعنی موت کی خبر دینے سے بچو کیونکہ یہ دور جاہلیت کا کام ہے" کیونکہ تحذیر کا صیغہ (ایاکم) نہی کے معنوں میں ہے اور حذیفہ کی حدیث روایت کی جس میں یہ قصہ ہے۔ اس نے اس کی سند حذیفہ تک بیان کی کہ حذیفہ نے اپنے پاس حاضر لوگوں سے کہا: "جب میں مرجاؤں تو کسی کو نہ اطلاع دی جائے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یہ کام نعی نہ ہو جائے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ موت کی خبر دینے سے منع کیا کرتے تھے۔" ترمذی نے ان الفاظ کو حسن کا نام نہیں دیا۔ پھر ترمذی نے نعی کی یہ تفسیر کی کہ وہ لوگ منادی کرتے تھے کہ فلاں مرگیا تاکہ لوگ اس کے جنازہ میں شریک ہوں۔ اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ قرابتداروں اور بھائی بندوں کو خبر دینے میں کچھ حرج نہیں اور ابراہیم سے بھی مروی ہے وہ کہتے تھے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرابتداروں کو بتلانے میں کچھ حرج نہیں۔

علماء کہتے ہیں کہ دور جاہلیت میں لوگ آدمی بھیج کر میت کی موت کی خبر گھروں کے دروازوں اور بازاروں میں پہنچاتے تھے یہ بات حرام ہے اور نہایہ میں ہے۔ عرب میں یہ مشہور بات تھی کہ جب ان کا کوئی شریف آدمی فوت ہوتا یا مارا جاتا تو وہ سوار قبائل کی طرف بھیجتے جو انہیں اس کی موت کی خبر دے تو وہ یوں کہتا۔ نعاء فلانا" یا نعاء العرب فلاں شخص مرگیا یا فلاں کی موت سے عرب مرگیا۔ اور میرے نزدیک یہی بات اقرب ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بلند و بالا عمارات سے اعلانات کرنا نعی ہی کی قسم ہے جیسا کہ آج کل بعض بڑے لوگوں کی موت پر کیا جاتا ہے۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ ان تمام احادیث کو جمع کرنے سے تین حالتیں سامنے آتی ہیں پہلی یہ کہ اپنے اہل کو' دوستوں کو اور اہل صلاح کو موت کی خبر دی جائے' یہ سنت ہے۔ دوسری یہ کہ فخر و مباہات کے طور پر بہت سا مجمع اکٹھا کر لینے کے لئے پکارا جائے۔ یہ مکروہ ہے' تیسری یہ کہ چیخ و پکار اور بین وغیرہ کر کے لوگوں کو مطلع کیا جائے تو یہ حرام ہے۔

گویا پہلی حالت کے سنت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ غسل اور نماز جنازہ اور دفن وغیرہ کے لئے جماعت ہونے کے بغیر چارہ نہیں اور اسی بات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ "تم نے مجھے کیوں اطلاع نہ دی" اور ایسی ہی دوسری روایات' اور درج ذیل حدیث بھی اس پر روشنی ڈالتی ہے۔

۵۲۲- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ نعى النجاشي في اليوم الذي مات فيه، وخرج بهم إلى المصلى، فصف بهم، وكبّر عليه أربعاً. متفق عليه.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس دن نجاشی(۱) (شاہ حبشہ) کا انتقال ہوا اسی دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اطلاع دی۔ پھر صحابہ کو لے کر جنازگاہ(۲) کی طرف گئے ان کی صفیں بنائیں اور اس پر چار تکبیروں سے جنازہ پڑھا۔ متفق علیہ۔

(۱) کہتے ہیں کہ یہ ہر شاہ حبشہ کا لقب ہے اور اس کا نام اصحمہ تھا۔

(۲) اصل عبارت میں لفظ مصلی آیا ہے۔ ممکن ہے یہ عید گاہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنازگاہ ہو۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اطلاع کی خاطر کسی کی موت کی خبر دینا جائز ہے نیز اس میں غائبانہ نماز جنازہ پر دلیل ہے۔ اور اس میں کئی اقوال ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ یہ علی الاطلاق مشروع ہے۔ احمد' شافعی وغیرہ اسی بات کے قائل ہیں۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ سلف میں کسی سے اس میں اختلاف منقول نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرا یہ کہ یہ علی الاطلاق منع ہے ہادویہ' حنفیہ اور مالک اسی کے قائل ہیں۔
تیسرا یہ کہ جس دن کوئی فوت ہو اس دن جائز ہے یا چند دن بعد تک۔ لمبی مدت گزر جائے تو ناجائز ہے۔
چوتھا یہ کہ یہ اس صورت میں ہے کہ میت قبلہ کی سمت ہو اور آخری دو اقوال کی وجہ تفصیل قصہ نجاشی کو ہی خاص سمجھنا ہے۔

اور جو علی الاطلاق ممانعت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ نجاشی کی نماز پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ اصل عدم خصوصیت ہے۔ اس کے قائلین یہی عذر پیش کرتے ہیں۔
پانچواں یہ کہ غائبانہ نماز اس وقت جائز ہے جب مرنے والے کے علاقہ میں کوئی اس پر نماز پڑھنے والا نہ ہو جیسے نجاشی ایسے علاقہ میں فوت ہوا کہ اس کے گھر والے اور ساتھی مسلمان نہیں تھے۔ امام ابن تیمیہ نے اسے اختیار کیا اور مصنف نے اسے خطابی سے فتح الباری میں نقل کیا۔ نیز یہ کہ رویانی نے اسے ہی اچھا سمجھا ہے پھر کہا کہ یہ بھی کئی پہلو رکھتا ہے۔ الا یہ کہ مجھے ایسی کوئی خبر نہیں ملی کہ کسی بھی شہر میں غائبانہ نماز نہ پڑھی گئی ہو۔

نیز اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے تھے۔ اور حنفیہ اور مالکیہ اس کے مکروہ ہونے کے قائل ہیں وہ بھی اس لئے کہ وہ میت کو مسجد میں لے جانے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف نجاشی کی شان کی وجہ سے تعظیما باہر نکلے تھے نیز اس لئے کہ اس پر نماز پڑھنے والی جماعت زیادہ ہو جائے۔
نیز اس حدیث میں نماز جنازہ کی صفیں بنانے کی شریعت مذکور ہے کیونکہ بخاری نے اس قصہ میں جابر کی حدیث روایت کی اور وہ خود دوسری یا تیسری صف میں تھے اور بخاری نے اس باب کا عنوان یہ قائم کیا "جو شخص جنازہ پر امام کے پیچھے دو یا تین صفیں بنائے" نیز یہ حدیث علامات نبوت میں سے ایک علامت یا معجزہ ہے کیونکہ آپ نے نجاشی کی فوتیدگی کی اسی دن اطلاع دے دی جب وہ فوت ہوا۔ حالانکہ مدینہ اور حبشہ کے درمیان طول طویل فاصلہ ہے۔

۵۲۳- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: سمعت النبي ﷺ يقول: ما من رجل مسلم يموت، فيقوم على جنازته أربعون رجلاً، لا يشركون بالله شيئاً، إلا شفعهم الله فيه. رواه مسلم.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے' جو بھی مسلمان فوت ہو اور اس کے جنازہ میں چالیس آدمی شریک ہو جائیں جو اللہ کے ساتھ ذرہ بھر بھی شرک نہ کرتے ہوں تو اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میت کے متعلق ان کی سفارش ضرور قبول کرتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) اس حدیث میں میت پر جماعت کے زیادہ ہونے کی فضیلت پر دلیل ہے نیز یہ کہ مومن کی سفارش اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: "کوئی ایسا مسلمان نہیں جس پر نماز جنازہ پڑھنے والی تعداد سو تک پہنچ جائے پھر وہ اس کے حق میں سفارش کریں تو اللہ ان کی سفارش قبول نہ کرے" اور ایک روایت میں "تین صفوں" کا ذکر ہے جسے اصحاب سنن نے روایت کیا۔ قاضی عیاض نے کہا کہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث سوال کرنے والوں کے جواب میں بیان ہوئی ہے جو اس کے متعلق سوال کرتے تھے تو اس میں ہر ایک کو اس کے سوال کا جواب دے دیا گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اعداد میں سے ہر ایک کو سفارش قبول ہونے کی خبر دی اور ان میں کچھ منافات نہیں کیونکہ نص کی موجودگی میں مفہوم عدد کی کچھ حیثیت نہیں اور یہ تمام احادیث معمول بہا ہیں اور کم سے کم عدد پر بھی سفارش قبول ہو گی۔

۵۲۴- وعن سمرة بن جندب رضي الله تعالى عنه، قال: صليت وراء النبي ﷺ على امرأة ماتت في نفاسها، فقام وسطها. متفق عليه.

سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک عورت کی نماز جنازہ پڑھی جو نفاس کی حالت میں فوت ہو گئی۔ آپ اس کے وسط میں کھڑے ہوئے۔ متفق علیہ(۱)۔

(۱) یہ حدیث عورت کے وسط میں کھڑا ہونے کی مشروعیت پر دلیل ہے اور یہ مستحب ہے اور واجب صرف یہ ہے کہ میت کے کسی بھی حصہ کے سامنے کھڑا ہو خواہ میت مرد ہو یا عورت اور مرد و عورت کے سامنے کھڑا ہونے کے حکم میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں برابر ہیں۔ اور ہادویہ کہتے ہیں کہ امام مرد کی ناف کے سامنے کھڑا ہو اور عورت کے پستانوں کے سامنے' کیونکہ اہل بیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی روایت ہے اور قاسم نے کہا کہ عورت کے سینہ کے سامنے اور مرد کے سینہ اور ناف کے درمیان جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس عورت کے سینہ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اور ضروری ہے کہ اس میں اور مرد میں اختلاف ہو اور شافعی سے مروی ہے کہ وہ مرد کے سر کے مقابل اور عورت کی سرین کے مقابل کھڑے ہوئے۔ جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی نے انس کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے مرد پر نماز جنازہ پڑھی تو اس کے سر کے پاس کھڑے ہوئے اور عورت پر پڑھی تو اس کی سرین کے پاس کھڑے ہوئے' علاء بن زیاد نے انس سے پوچھا' کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے؟ تو کہنے لگے' ہاں۔ الا یہ کہ مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ بخاری نے سمرہ کی حدیث لا کر انس کی حدیث کی تضعیف کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۲۵- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: والله لقد صلى رسول الله ﷺ على ابني بيضاء في المسجد. رواه مسلم.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دونوں(۱) بیٹوں کا جنازہ مسجد میں پڑھا تھا(۲)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) یہ سہل اور سہیل تھے ان کا باپ وہب بن ربیعہ اور ماں بیضاء جس کا اصل نام دعد تھا اور بیضاء اس کی صفت تھی۔

(۲) حضرت عائشہ نے یہ حدیث اس شخص کے جواب میں بیان فرمائی جو مسجد میں نماز جنازہ کا منکر تھا اور وہ سعد بن وقاص تھے۔ عائشہ نے کہا "نہ تو اتنا زمانہ گزرا ہے اور نہ لوگ بھولے ہیں۔ اللہ کی قسم! آپ نے نماز پڑھی تھی" الحدیث۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ مکروہ نہیں جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے۔ اور ابوحنیفہ اور مالک کا مذہب یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ حنفیہ کی قدوری میں ہے مسجد میں میت پر باجماعت نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور ان دونوں نے گزشتہ حدیث سے استدلال کیا کہ نجاشی پر نماز جنازہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھلے میدان میں گئے تھے۔ اور اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے اور اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ "جس نے مسجد میں جنازہ پر نماز پڑھی اس کے لئے کچھ نہیں" اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ احمد نے اس کے ضعف کی صراحت کر دی ہے کیونکہ اس کی سند میں صالح مولی التوامہ منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے اس لئے کہ سنن ابی داؤد کی روایت کے یہ الفاظ "اس کے لئے کچھ نہیں" کا نسخ مشہور ہے۔ نیز یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوبکر کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی اور صہیب نے حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی۔ اور ہادویہ کے نزدیک میت کو مسجد میں لانا مکروہ تنزیہی ہے۔ انہوں نے اور حنفیہ اور مالکیہ نے عائشہ کی حدیث کی یہ تاویل کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے بیٹوں پر نماز تو مسجد میں پڑھی لیکن ان کے جنازے مسجد سے باہر ہی رہے اس تاویل میں جتنا بعد ہے وہ مخفی نہیں اور حضرت عائشہؓ کے احتجاج کے قطعاً مطابق نہیں۔

۵۲۶- وعن عبد الرحمن بن ابي ليلى قال: كان زيد بن أرقم يكبّر على جنائزنا أربعاً، وإنه كبّر على جنازة خمساً، فسألته، فقال: كان رسول الله ﷺ يكبّرها. رواه مسلم. والأربعة.

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ(۱) سے روایت ہے کہ زید بن ارقم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہوں نے ایک جنازہ پر پانچ تکبیریں پڑھیں۔ میں نے ان سے پوچھا تو کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانچ بھی پڑھا کرتے تھے(۲)۔ اسے مسلم نے اور چاروں نے روایت کیا۔

(۱) آپ ابو عیسیٰ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہیں آپ اس وقت پیدا ہوئے جب خلافت عمر میں ابھی چھ سال باقی تھے۔ اپنے باپ، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور صحابہ کی ایک جماعت سے سماعت کی۔ آپ ۸۲ھ میں فوت ہوئے اور آپ کی وفات کے سبب میں کئی اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ گم ہو گئے تھے، بعض کہتے ہیں کہ مارے گئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ بصرہ کی نہر میں غرق ہو گئے تھے۔

(۲) پہلے ابوہریرہ کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے جنازہ میں چار تکبریں کہیں۔ اور چار تکبیریں ابن مسعود، ابوہریرہ، عقبہ بن عامر، براء بن عازب اور زید بن ثابت سے مروی ہیں اور صحیحین میں ابن عباس سے مروی ہے کہ "انہوں نے قبر پر چار تکبیریں کہیں" اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ سے روایت کیا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی تو چار تکبیریں کہیں" ابوداؤد نے کہا کہ اس بارے میں اس سے زیادہ صحیح کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ سلف سے جمہور اور خلف سے فقہائے اربعہ کا یہی مذہب ہے کہ تکبیریں چار ہی ہیں اور زید بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ایسی ہی ہے اور اکثر ہادویہ کا مذہب یہ ہے کہ پانچ تکبیریں کہنا چاہئیں۔ انہوں نے ان روایات سے احتجاج کیا ہے کہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ پر چار تکبیریں پڑھیں اور حسن نے اپنے باپ پر پانچ تکبیریں کہیں اور ابن حنفیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس پر پانچ تکبیریں کہیں۔ یہ حضرات چار تکبیر والی روایات کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مراد تکبیر افتتاح کے علاوہ چار تکبیریں ہیں اور یہ بات بعید ہے۔

۵۲۷۔ وعن علي رضي الله تعالى عنه، أنه كبّر على سهل بن حنيف ستاً، وقال: إنه بدري. رواه سعيد بن منصور. وأصله في البخاري.

علی رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ آپ نے سہل بن حنیف کے جنازہ پر چھ تکبیریں کہی تھیں اور کہا کہ یہ بدری ہیں۔ اسے سعید بن منصور نے روایت کیا اور اس کی اصل بخاری(۲) میں بھی ہے۔

(۱) یعنی ان لوگوں سے ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ بدر میں حصہ لیا تھا۔

(۲) بخاری میں یوں ہے کہ "علی نے سہل بن حنیف پر تکبیر کہی" برقانی نے اپنی مستخرج میں "چھ" کا لفظ زیادہ کیا۔ اسی طرح بخاری نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر کیا۔

جنازہ کی تکبیروں کی تعداد سے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بیہقی نے سعید بن مسیب سے روایت کیا کہ عمرؓ نے کہا: کبھی یہ چار ہوتی تھیں اور کبھی پانچ تو ہم نے چار پر اتفاق کر لیا" اور ابن المنذر نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سعید سے ایک دوسرے طریق سے روایت کیا۔ اور بیہقی نے بھی ابووائل سے روایت کیا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تکبیریں چار بھی کہتے تھے، پانچ بھی، چھ بھی اور سات بھی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو جمع کیا۔ ہر ایک نے جو دیکھا تھا اس کی خبر دی تو حضرت عمرؓ نے انہیں چار تکبیروں پر متفق کر دیا" اور ابن عبدالبر نے استذکار میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنازوں پر کبھی چار، کبھی پانچ، کبھی چھ، کبھی سات اور کبھی آٹھ تکبیریں کہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ نجاشی کی موت کا واقعہ پیش آیا۔ آپ جنازہ گاہ کی طرف نکلے، لوگوں نے صفیں بنائیں اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم چار تکبیروں پر ہی ثابت رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی" اگر یہ روایات صحیح ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر اور آپ کے ساتھی چار تکبیروں پر اس کام کا برقرار رہنا نہیں پہچانتے تھے تا آنکہ صحابہ نے اس بارے میں مشورہ کیا اور چار تکبیروں پر ان کا اجماع ہو گیا۔

٥٢٨ - وعن جابر رضي الله تعالى عنه، قال: كان رسول الله ﷺ يكبر على جنائزنا أربعاً، ويقرأ بفاتحة الكتاب في التكبيرة الأولى. رواه الشافعي بإسناد ضعيف.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہتے اور پہلی تکبیر میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ اسے شافعی نے ضعیف سند سے روایت کیا(١)۔

(١) شرح کے نسخہ میں اس حدیث کو حذف کر دیا گیا ہے لہٰذا شارح نے اس کے متعلق کچھ کلام نہیں کیا۔ مصنف نے فتح الباری میں کہا۔ ترمذی کی شرح سے اس کے استاد کو معلوم ہوا کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ اور تلخیص میں ہے کہ شافعی نے اسے ابراہیم بن محمد سے، محمد بن عبداللہ بن عقیل سے، جابر سے روایت کیا اور ابن عقیل کو ضعیف کہا گیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ علماء نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے میں اختلاف کیا ہے۔ ابن المنذر نے ابن مسعود، حسن بن علی اور ابن زبیر سے اس کی مشروعیت نقل کی ہے اور شافعی احمد اور اسحاق اسی کے قائل ہیں اور ابوہریرہ اور ابن عمر سے یہ منقول ہے کہ اس میں قرات نہیں ہے مالک اور کوفیین اسی کے قائل ہیں۔ پہلے فریق نے اسی سے استدلال کیا ہے جو گزر چکا۔ اگرچہ وہ ضعیف ہے تاہم درج ذیل حدیث اس کی شاہد ہے۔

٥٢٩ - وعن طلحة بن عبد الله بن عوف ، قال: صليت خلف ابن عباس على جنازة، فقرأ فاتحة الكتاب، فقال لتعلموا أنها سنة. رواه البخاري.

طلحہ بن عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک جنازہ پر ابن عباس کے پیچھے نماز پڑھی تو ابن عباس نے اس میں فاتحہ الکتاب پڑھی پھر کہنے لگے۔ میں نے یہ اس لئے پڑھی ہے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنت ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا(۱)۔

(۱) نیز اسے ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اور نسائی نے ان الفاظ میں روایت کیا "میں نے ابن عباس کا ہاتھ پکڑ کر اس بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے "ہاں میرے بھتیجے! یہ حق ہے اور سنت ہے"۔ اور نسائی نے ایک دوسرے طریق سے ان الفاظ میں روایت کیا۔ "تو ابن عباس سورہ فاتحہ اور کوئی اور سورت بلند آواز سے ہمیں پڑھ کر سنائی۔ پھر جب فارغ ہوئے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ سنت ہے اور حق ہے۔" اور ترمذی نے ابن عباس سے یوں روایت کیا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر فاتحہ الکتاب پڑھی" پھر ترمذی نے کہا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے بلکہ صحیح ابن عباس کا من السنہ والا قول ہے اور حاکم نے کہا کہ اس بات پر اجماع ہے کہ اگر صحابی من السنہ کہے تو وہ حدیث مسند ہوتی ہے مصنف کہتے ہیں کہ اجماع کیسے نقل کیا حالانکہ اہل الحدیث اور اصولیوں کے درمیان اختلاف مشہور ہے۔

یہ حدیث نماز جنازہ میں قرات فاتحہ کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ سنت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جانا پہچانا طریقہ ہے۔ اس سے مراد وہ عرفی اصطلاح نہیں جو فرض کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے اور ابن عباس کے قول "حق" یعنی ثابت سے اس کے وجوب میں تاکید مزید ہو جاتی ہے۔ اور ابن ماجہ نے ام شریک کی حدیث سے روایت کیا کہ "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم جنازہ پر فاتحہ الکتاب پڑھا کریں اور اس کی سند میں تھوڑا سا ضعف ہے جسے ابن عباس کی حدیث درست کر دیتی ہے۔

نیز امر وجوب کے دلائل سے ہے۔ شافعی' احمد اور سلف و خلف سے کئی لوگ اس کے وجوب کے قائل ہیں اور بعض دوسرے ابن مسعود کے اس قول کی بناء پر اس کی عدم مشروعیت کی طرف گئے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے نماز جنازہ میں قرات کا کوئی وقت نہیں بتایا بلکہ فرمایا: جب امام تکبیر کہے تو بھی کہہ جو اچھا کلام تو چاہے وہی اختیار کر" لیکن اس نے کسی حدیث کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا کہ اس کی صحت یا عدم صحت معلوم ہو سکے۔ پھر یہ ایک صحابی کا قول ہے جو نفی کر رہا ہے اور ابن عباس کا قول مثبت ہے لہٰذا یہ مقدم ہوا۔ اور ہادی اور آل کی ایک جماعت نے کہا کہ بموجب قول ابن عباس نماز جنازہ میں قرات سنت ہے اور اس لفظ سے جو مراد ہے وہ آپ کو معلوم ہو چکا۔ اس کے وجوب کا یوں بھی استدلال کیا گیا ہے کہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہ نماز ہے اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ "فاتحہ الکتاب کے بغیر نماز نہیں ہوتی" گویا یہ اس کے عموم کے تحت داخل ہے اور اس سے اسے نکالنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے رہی یہ بات کہ فاتحہ کس وقت پڑھی جائے تو یہ پہلی تکبیر کے بعد پڑھی جائے گی پھر تکبیر کہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے پھر تکبیر کہے اور میت کے لئے دعا کرے اور دعاء کی کیفیت درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥٣٠- وعن عوف بن مالك رضي الله تعالى عنه قال: صلى رسول الله ﷺ على جنازة، فحفظت من دعائه «اللهم اغفر له، وارحمه، وعافه، واعف عنه، وأكرم نزله، ووسع مدخله، واغسله بالماء، والثلج، والبرد، ونقه من الخطايا، كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس، وأبدله داراً خيراً من داره، وأهلاً خيراً من أهله، وأدخله الجنة، وقه فتنة القبر، وعذاب النار». رواه مسلم.

عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی اور میں نے آپ کی وہ دعاء یاد کر لی: یا اللہ اسے بخش دے' اس پر رحم کر' اس کی نیکیوں کا پورا اجر دے اور اس کی برائیاں معاف فرما- اس کی مہمانی اچھی کر اور اس کی قبر کو فراخ کر دے اور اسے پانی' برف اور اولوں سے دھو ڈال اور اسے خطاؤں سے ایسا صاف کر دے جیسے سفید کپڑا میل کچیل سے صاف ہو جاتا ہے اور اسے اس کے گھر سے بہتر گھر اور اہل سے بہتر اہل عطا فرما اور اسے جنت میں داخل کر اور اسے قبر کی آزمائش اور دوزخ کے عذاب سے بچا- اسے مسلم نے روایت کیا(۱)-

(۱) اس میں یہ احتمال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بلند آواز سے پڑھی ہو اور عوف بن مالک نے یاد کر لی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ عوف نے آپ سے پوچھا ہو کہ آپ نے کیا پڑھا تھا پھر یاد کر لی ہو- فقہاء کہتے ہیں- سراً پڑھنا مستحب ہے بعض کہتے ہیں کہ اسے اختیار ہے اور بعض کہتے ہیں دن کو سری پڑھے اور رات کو جہری- اور میت کے لئے دعاء میں اخلاص ہونا چاہئے- کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے- "میت کے لئے خلوص سے دعا کرو" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ سری بہتر ہے یا جہری- اس بارے میں جو صحیح تر حدیث وارد ہے وہ درج ذیل ہے-

٥٣١- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، قال: كان رسول الله ﷺ إذا صلى على جنازة، يقول: «**اللهم اغفر لحينا، وميتنا، وشاهدنا، وغائبنا، وصغيرنا، وكبيرنا، وذكرنا، وأنثانا، اللهم من أحييته منا فأحيه على الإسلام، ومن توفيته منا فتوفه على الإيمان، اللهم لا تحرمنا أجره، ولا تفتنا بعده**». رواه مسلم والأربعة.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جنازہ پر نماز پڑھتے تو یہ دعاء فرماتے: "اے اللہ! ہمارے زندوں کو اور مرے ہوؤں کو' جو حاضر ہیں ان کو اور جو غائب ہیں ان کو' ہمارے چھوٹوں(۱) کو اور بڑوں کو' ہمارے مردوں کو اور عورتوں کو سب کو بخش دے- اے اللہ! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے ایمان پر زندہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھ اور جسے موت دے اسے ایمان پر موت دے۔ اے اللہ! ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کر' نہ ہی اس کے بعد ہمیں کسی آزمائش میں ڈالنا(۲)۔ اسے مسلم اور چاروں نے روایت کیا۔

(۱) یعنی جب ان پر شرعی احکام لاگو ہونے کا وقت آجائے تو انہیں اعمال صالحہ پر ثابت رکھ۔ ورنہ چھوٹوں کا کوئی گناہ ہوتا ہی نہیں۔

(۲) میت کے لئے دعا کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ پر نماز میں یوں دعا کی "اے اللہ! تو ہی اس میت کا رب ہے' تو نے اسے پیدا کیا اور اسلام کی ہدایت دی تو نے ہی اس کی روح قبض کی اور تو ہی اس کے چھپے اور ظاہری احوال کو خوب جانتا ہے ہم اس کے لئے سفارشی بن کر آئے ہیں سو تو اس کے گناہ معاف کر دے" اور ابن ماجہ میں واثلہ بن اسقع کی حدیث یوں ہے "ایک مسلمان کے جنازہ پر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی تو میں نے آپ کو یوں کہتے سنا "اے اللہ! فلاں بن فلاں تیرے حوالے اور تیرے پاس پہنچ رہا ہے اسے قبر کی آزمائش اور دوزخ کے عذاب سے بچالے' تو پورا پورا دینے والا ہے اور ہر طرح کی تعریف تیرے ہی لئے سزاوار ہے۔ اے اللہ! اسے بخش دے اور اس پر رحم فرما کیونکہ تو بخشنے والا ہے' رحم کرنے والا ہے" اور روایات کا اختلاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس معاملہ میں بڑی گنجائش ہے اور یہ کسی ایک معین دعاء پر منحصر نہیں ہے۔ چنانچہ ہادویہ نے دوسری دعائیں پسند کی ہیں اسی طرح شافعی نے بھی اور دعاؤں کو اختیار کیا ہے اور یہ سب کچھ شرح میں مذکور ہے۔ رہا الحمد کے ساتھ کوئی سورہ پڑھنا تو یہ ثابت ہے جیسا کہ آپ کو نسائی کی روایت سے معلوم ہو چکا لیکن اس میں تعین وارد نہیں اور میت کے لئے دعا میں خلوص اتنی اہم چیز ہے کہ اسی کے لئے یہ نماز مشروع ہوئی ہے اور جو کچھ اس بارے میں حدیث میں وارد ہے وہ یہ ہے۔

۵۳۲- وعنه أن النبي ﷺ قال: «**إذا صليتم على الميت فأخلصوا له الدعاء**». رواه أبو داود، وصححه ابن حبان.

اور انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میت پر نماز پڑھو تو اس کے لئے خلوص کے ساتھ دعا کرو" اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا(۱)۔

(۱) کیونکہ وہ سب سفارش کرنے والے ہیں اور سفارشی کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کی سفارش قبول ہو جائے۔ اور طبرانی نے روایت کیا کہ "ابن عمر جب کوئی جنازہ دیکھتے تو فرماتے: یہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا۔ اے اللہ! ہمارے ایمان اور فرمانبرداروں کو اور زیادہ کر" پھر اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: "جو شخص جنازہ دیکھے وہ یوں کہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ بہت بڑا ہے' اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا۔ یہی اللہ اور اس کے رسول کا وعدہ ہے۔ اے اللہ ہمارے ایمان اور فرمانبرداری میں اضافہ کر" تو اس کے لئے بیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

۵۳۳ - وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ، قال: «أسرعوا بالجنازة، فإن تك صالحة، فخير تقدمونها إليه، وإن تك سوى ذلك، فشر تضعونه عن رقابكم». متفق عليه.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنازہ دفن کے لئے جلدی لے جایا کرو۔ اگر وہ(۱) نیک ہے تو تم اسے جلدی بھلائی(۲) کی طرف لے جاؤ۔ اور وہ ایسا نہیں تو اس برائی کو اپنی گردنوں سے جلد اتار پھینکو(۳)۔ متفق علیہ۔

(۱) یعنی میت

(۲) اصل عبارت میں خیر کا لفظ پہلے آیا ہے جو مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی فھو خیر ہے۔ اسی طرح شر کا ذکر آرہا ہے۔

(۳) ابن قدامہ سے منقول ہے کہ مردہ کو جلد لے جانے کا حکم استحباب کے طور پر ہے اور اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں۔ اور ابن حزم سے پوچھا گیا تو اس نے وجوب کا جواب دیا اور اس سے مراد پیدل چلنے کی سختی ہے اور بعض سلف نے اسے اسی چیز پر محمول کیا ہے اور شافعی اور جمہور اسراع یا جلدی کرنے سے مراد عام چال سے ذرا تیز چال مراد لیتے ہیں لیکن دوڑنا مکروہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ صرف جلدی چلنا مستحب ہے لیکن اتنا بھی تیز نہ چلا جائے کہ میت کو کوئی حادثہ پیش آجائے یا جنازہ اٹھانے والوں اور ساتھ چلنے والوں کو مشقت ہو۔ قرطبی کہتے ہیں کہ حدیث کا مقصود یہ ہے کہ میت کے دفن میں دیر نہ کی جائے اور اس لئے بھی کہ دیر کرنا کبھی کبھی فخر اور خودپسندی کی طرف لے جاتا ہے اور یہ اس صورت میں ہے جب اس سے مراد جنازہ کو قبر کی طرف لے جانا ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد میت کی تیاری میں جلدی کرنا ہے اور یہ پہلے قول سے زیادہ عمومیت رکھتا ہے۔ نووی نے کہا کہ یہ بات حدیث کے الفاظ "اپنی گردنوں سے اس کا بوجھ اتارو" کے لحاظ سے باطل مردود ہے اور اس کا تعاقب یوں کیا گیا کہ گردن پر بوجھ اٹھانے سے مراد معنوی بوجھ بھی ہوتا ہے جیسے آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنی گردن پر قرضوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تمام لوگ تو میت نہیں اٹھاتے۔ مصنف نے فتح الباری میں یہ نقل کرنے کے بعد کہا کہ ابن عمر کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "تم میں سے جب کوئی شخص مر جائے تو اسے روکے نہ رکھو اور قبر کی طرف لے جانے میں جلدی کرو" اسے طبرانی نے حسن سند سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایت کیا اور ابوداؤد میں مرفوعاً" مروی ہے کہ: مسلمان کی میت اس کے گھر والوں کے سامنے پڑھی نہ رہنی چاہئے" اور یہ حدیث میت کی تیاری اور دفن میں جلدی کرنے پر دلیل ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب میت کی پھٹی نہ ہو ورنہ اس معاملہ میں آہستگی اور مشورہ سے کام لینا چاہئے۔

۵۳۴- وعنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من شهد الجنازة حتى يصلي عليها فله قيراط، ومن شهدها حتى تدفن فله قيراطان»، قيل: وما القيراطان؟ قال: «مثل الجبلين العظيمين». متفق عليه، ولمسلم: حتى توضع في اللحد.

وللبخاري: من تبع جنازة مسلم إيماناً واحتساباً، وكان معه حتى يصلى عليها ويفرغ من دفنها، فإنه يرجُع بقيراطين، كل قيراط مثل جبل أحد.

اور انہی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نماز جنازہ پڑھنے تک جنازہ پر حاضر رہے اس کے لئے ایک قیراط ہے اور جو دفن ہونے تک وہاں رہے اس کے لئے دو قیراط ہیں۔ لوگوں نے(۱) پوچھا کہ یہ دو قیراط کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا' دو بڑے پہاڑوں کے برابر' متفق علیہ۔ اور مسلم میں یہ لفظ ہیں کہ جو میت کو قبر میں (۲) اتارنے تک وہاں رہے۔ اور بخاری میں بھی ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے جنازہ کے ساتھ جائے پھر اس کے ساتھ ہی رہے تا آنکہ اس پر نماز پڑھی جائے اور دفن ہونے تک وہیں رہے وہ دو قیراط اجر لے کر آتا ہے اور ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے۔

(۱) ابوعوانہ نے تصریح کی کہ یہ پوچھنے والے ابوہریرہؓ ہی تھے۔

(۲) یہ بھی ابوہریرہ ہی کی حدیث میں ہے۔

گویا اس حدیث کے پہلے حصہ میں تو شیخین متفق ہیں پھر آگے ہر ایک کے الگ الگ الفاظ ہیں اور اس حدیث کو بارہ صحابہ نے روایت کیا ہے اور اس حدیث میں اجر کو "ایمان اور احتساب" سے مقید بنایا گیا ہے کیونکہ اس کا عمل ثواب پہلے سے کی ہوئی نیت پر مرتب ہوتا ہے اگر کوئی شخص صرف بدلہ اتارنے یا دوستی کا حق سمجھ کر شامل ہو گا تو اسے یہ اجر نہیں ملے گا جیسا کہ مصنف نے فتح الباری میں کہا ہے۔

اور حدیث کے لفظ ہیں "احد کے برابر" اور نسائی کی روایت میں آیا ہے کہ "اس کا اجر دو قیراط ہے اور ہر قیراط احد پہاڑ سے بڑا ہے" اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "ان دونوں میں سے چھوٹا احد کے برابر ہے" اور ابن عدی میں واثلہ کی روایت میں ہے "اس کے لئے دو قیراط اجر لکھا جاتا ہے جن میں سے ہلکا قیامت کے دن اس کی میزان میں احد پہاڑ سے بھاری ہو گا"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور شہود کا معنی حاضر ہونا ہے' اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جنازہ نکلنے کے وقت سے اس کے ساتھ رہے چنانچہ مسلم میں یہ الفاظ آئے ہیں "جو شخص جنازہ کے ساتھ اس کے گھر سے نکلا پھر اس کے پیچھے رہا یہاں تک کہ وہ دفن کیا گیا اس کے لئے اجر کے دو قیراط ہیں اور ہر قیراط احد جتنا ہے' اور جو جنازہ کی نماز پڑھ کر واپس آگیا اس کے لئے ایک قیراط ہے" اور روایات کو جب ایک دوسری پر پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ مذکورہ اجر کا حقدار وہی ہے جس نے نماز پڑھی پھر اس کے ساتھ رہا۔ مصنف رحمہ اللہ نے کہا "مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو اجر مل جائے گا جو نماز پڑھ لے اگرچہ بعد میں ساتھ نہ رہے کیونکہ یہ نماز کی طرف وسیلہ ہے لیکن اسے صرف ایک قیراط اجر ملے گا اور دو اسے ملیں گے جو نماز پڑھنے کے بعد ساتھ جائے" اور سعید بن منصور نے عروہ سے' زید بن ثابت سے روایت کیا کہ "جب تو نے جنازہ پر نماز پڑھ لی تو وہ حق ادا کر دیا جو تجھ پر تھا" اسے ابن ابی شیبہ نے ان الفاظ میں روایت کیا "جب تم نے نماز ادا کر لی" اور آخر میں زیادہ ہے "تو پھر اس کے گھر والوں سے الگ ہو جاؤ" اور اس کا معنی یہ ہے کہ تو نے میت کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر تو ساتھ جائے گا تو تیرے لئے زیادہ اجر ہے اور بخاری نے حمید بن بلال کا قول تعلیقاً ذکر کیا "ہم جنازہ پر اذن کی بات نہیں جانتے البتہ جس نے نماز پڑھی اور لوٹ آیا اس کے لئے ایک قیراط ہے" رہی ابوہریرہ کی حدیث کہ "حکم دینے والے دو ہیں جبکہ وہ شخص جو جنازہ کے ساتھ رہے اس پر نماز پڑھے لہٰذا اس کا حق نہیں کہ میت کے ولی سے اذن لئے بغیر واپس چلا آئے" اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے تو یہ حدیث منقطع اور موقوف ہے اور اس بارے میں مرفوع احادیث بھی مروی ہیں جو سب کی سب ضعیف ہیں اور جو آخرت میں اعمال کا وزن ہو گا تو اسے پہچاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں اور اس کی حقیقت صرف اللہ ہی جانتا ہے ہمیں تو صرف ایسی تشبیہ سے ہی بتلایا جا سکتا ہے جن کی مقداروں کے احوال کو ہم پہچانتے ہیں قیراط بھی اسی قسم سے ہے تاکہ محسوس صورت میں ہماری عقل میں کوئی بات آجائے۔ اور چونکہ ہم اپنی دانست کے مطابق اس دنیا میں قیراط کو ایک حقیری چیز سمجھتے ہیں لہٰذا آپؐ نے اس مقدار کی پہچان یوں کرائی کہ وہ مدینہ کے مشہور پہاڑ احد کے برابر ہو گا۔

اور حدیث کے لفظ حتی تدفن سے مطلق دفن کرنا ظاہر ہوتا ہے خواہ پوری طرح فراغت نہ ہوئی ہو اور الفاظ "یہاں تک کہ لحد میں رکھ دیا جائے" بھی ایسے ہی ہیں۔ الا یہ کہ مسلم کی دوسری روایت میں ہے "یہاں تک کہ اس کے دفن سے فارغ ہو جائے" ان الفاظ میں وہ وضاحت اور تفسیر ہے جو دوسری روایات میں نہیں۔

اور اس حدیث میں میت کے پاس جانے' اس پر نماز پڑھنے اور اس کے دفن کی رغبت دلائی گئی ہے نیز اس میں اللہ کے بہت بڑے فضل پر' میت کی تکریم پر اور تکریم کرنے والے کے لئے بہت بڑے ثواب پر دلیل ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یعنی اس شخص کے لئے جو اس کی موت کے بعد اچھی طرح یہ کام کرے۔

تنبیہ : جنازہ کو اٹھانے کے بارے میں بیہقی نے سنن الکبری میں اپنی سند سے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص جنازہ کے ساتھ چلے تو اسے چاہئے کہ چارپائی کا کوئی پایہ پکڑ لے پھر چاہے تو پکڑے رکھے اور چاہے تو چھوڑ دے کیونکہ یہ سنت ہے" نیز انہی سند سے روایت کیا کہ "عثمان بن عفان نے اپنی والدہ کی چارپائی کے دونوں ستونوں کے درمیان کندھا دیا" نیز روایت کیا "ابن زبیر نے مسور بن مخرمہ کی چارپائی کے دونوں ستونوں کے درمیان کندھا دیا" اور یوسف بن ماہک کی حدیث سے روایت کیا "میں رافع بن خدیج کے جنازہ میں شریک تھا اور اس میں ابن عمر اور ابن عباس بھی تھے۔ ابن عمر آگے بڑھے اور چارپائی کے پایوں میں سے اگلا پایہ پکڑ لیا پھر ان کے درمیان اپنی پشت کے بالائی حصہ پر اٹھایا پھر چلنے لگے"

٥٣٥- وعن سالم عن أبيه، أنه رأى النبي ﷺ وأبا بكر وعمر، يمشون أمام الجنازة. رواه الخمسة، وصححه ابن حبان، وأعله النسائي وطائفة بالإرسال.

سالم(۱) اپنے باپ(۲) رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو' ابوبکرؓ کو اور عمرؓ کو جنازہ کے آگے آگے چلتے دیکھا ہے۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا' نسائی نے اسے معلول کہا ایک جماعت نے مرسل(۳) کہا۔

(۱) آپ ابوعبداللہ یا ابو عمرو سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب ہیں مدینہ کے فقہاء میں سے ایک ہیں۔ بڑے بڑے تابعین اور نامور علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنے باپ اور دوسروں سے روایت کیا۔ ۱۰۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۲) آپ عبداللہ بن عمر ہیں۔

(۳) اس کے وصل اور ارسال میں اختلاف ہے احمد نے کہا یہ زہری سے مرسل ہے اور سالم کی حدیث ابن عمر کے اپنے فعل پر موقوف ہے۔ ترمذی نے کہا۔ اہل حدیث کی رائے یہ ہے کہ مرسل احادیث میں سے یہ صحیح تر ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں زہری سے' سالم بن عبداللہ بن عمر سے روایت کیا کہ: "آپ' اور ابوبکرؓ' عمرؓ اور عثمانؓ میت کے ساتھ ساتھ چلتے تھے" زہری نے کہا کہ یہی سنت ہے اور دار قطنی نے "العلل" زہری سے بہت سے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ صحیح قول وہی ہے جو زہری سے' سالم سے' اپنے باپ سے مروی ہے کہ "وہ چل رہے تھے" اس نے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ابوبکرؓ اور عمر رضی اللہ عنہا سامنے چل رہے تھے اور یہ مرسل ہے۔ اور بیہقی نے کہا کہ اس کا موصول ہونا راجح ہے کیونکہ یہ ابن عیینہ کی روایت ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وہ ثقہ حافظ ہے علی بن المدینی سے مروی ہے کہ ”میں نے ابن عیینہ سے کہا: ابو محمد! لوگوں نے آپ سے اس حدیث میں اختلاف کیا ہے‘ کہنے لگے۔ زہری کو پختہ یقین ہو گیا اس نے مجھ سے اتنی بار یہ حدیث بیان کی کہ میں گن بھی نہیں سکتا وہ اسے دہراتے رہے کہ میں نے اسے اس کے منہ سے‘ سالم سے‘ اس کے باپ سے سنا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ یہ بات وہم کی نفی نہیں کرتی کیونکہ اس نے یہ یاد رکھا کہ اس نے اس سے‘ سالم سے‘ اس کے باپ سے سنا ہے اور یہ بات درست ہے مگر یہ حدیث مدرج ہے اور زہری نے اسے صحیح کہا اور ابن عیینہ نے اس سے حدیث بیان کی اور حدیث میں اختلاف کی وجہ سے علماء میں بھی اختلاف ہوا اور ان کے درج ذیل پانچ اقوال ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ جنازہ کے آگے چلنا افضل ہے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ایسا فعل وارد ہے اور خلفاء نے بھی ایسا کیا اور جمہور اور شافعی اسی طرف گئے ہیں۔

دوسرا ہادویہ اور حنفیہ کا قول ہے کہ جنازہ کے پیچھے چلنا افضل ہے جیسا کہ اسے ابن طاؤس نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تا حین حیات جنازہ کے پیچھے ہی چلتے رہے“ اور جیسا کہ سعید بن منصور نے علی رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی کہ ”جنازہ کے پیچھے چلنا آگے چلنے سے اتنا زیادہ افضل ہے جتنی باجماعت نماز اکیلے کی نماز سے افضل ہے“ اس کی سند حسن ہے اور یہ موقوف ہے تاہم اس کا حکم رفع کا ہے اور اثرم نے بیان کیا کہ احمد نے اس کی سند میں کلام کیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ساتھ ساتھ‘ پیچھے اور دائیں بائیں چلے اسے بخاری نے انس سے تعلیقاً“ اور ابن ابی شیبہ نے اور اسی طرح عبدالرزاق نے موصولاً“ روایت کیا اور اس میں ساتھ چلنے والوں کے لئے بہت آسانی اور وسعت ہے اور یہ جنازہ کو جلد لے جانے کی سنت کے موافق بھی ہے یہ حضرات چلنے کے لئے کسی خاص جگہ کو لازم نہیں سمجھتے تاکہ چلنے والوں پر یا ان میں سے کسی پر تنگی نہ ہو۔

چوتھا قول ثوری کا ہے کہ پیدل چلنے والا جہاں چاہے چلے مگر سوار پیچھے چلے جیسا کہ اصحاب سنن نے مغیرہ کی حدیث مرفوعاً“ بیان کی اور اسے ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا کہ سوار تو جنازہ کے پیچھے چلے اور پیدل جہاں چاہے چلے۔

پانچواں قول نخعی کا ہے کہ اگر جنازہ کے ساتھ عورتیں بھی ہوں تو آگے چلے ورنہ پیچھے چلے۔

٥٣٦ - وعن أم عطية رضي الله تعالى عنها قالت: نهينا عن اتباع الجنائز، ولم يعزم علينا. متفق عليه.

ام عطیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم عورتوں کو جنازہ کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا اور اس معاملہ میں ہم پر سختی نہیں کی گئی۔ متفق علیہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہور اصولیین اور محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی صحابہ نھینا اور امرنا بصیغہ مجہول ذکر کرے اور فاعل کا ذکر نہ کرے تو وہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے کیونکہ یہ تو واضح ہے کہ حکم دینے والے یا منع کرنے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں۔ رہی یہ حدیث تو اس کا مرفوع ہونا ویسے بھی ثابت ہے اور اسے بخاری نے باب الحیض میں ام عطیہ سے ان الفاظ روایت کیا ہے "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا .... الحدیث" الا یہ کہ یہ مرسل ہے کیونکہ ام عطیہ نے آپؐ سے سماعت نہیں کی جیسا کہ طبرانی نے ان سے روایت کیا وہ کہتی ہیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ میں تم سے ان باتوں پر بیعت لوں کہ تم چوری نہ کرو گی...." الحدیث۔ اور اسی حدیث میں ہے کہ "ہمیں آپؐ نے اس بات سے منع کیا کہ ہم جنازہ کے ساتھ جائیں" اور ام عطیہ کے قول ولم یعزم علینا سے واضح ہے کہ یہ نہی کراہت کے لئے ہے تحریم کے لئے نہیں۔ گویا عطیہ نے قرینہ سے یہی سمجھا ورنہ اس کی اصل تحریم ہی ہے اور جمہور اہل علم اسے مکروہ سمجھتے ہیں اور اس پر ابو ہریرہ کی وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تھے کہ عمرؓ نے ایک عورت کو دیکھا تو زور سے چلا کر بولے۔ آپؐ نے فرمایا: عمر! جانے دو" الحدیث۔ نیز اسے نسائی اور ابن ماجہ نے بھی دوسرے طریق سے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

۵۳۷- وعن أبي سعيد، أن رسول الله ﷺ قال: «إذا رأيتم الجنازة فقوموا، فمن تبعها فلا يجلس حتى توضع». متفق عليه.

ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنازہ دیکھو تو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ پھر جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے وہ میت کے نیچے رکھنے تک نہ بیٹھے۔ متفق علیہ(۱)۔

امر سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنازہ کے لئے کھڑا ہونا واجب ہے جب وہ کسی مکلف کے پاس سے گزرے' اگرچہ اس کا ساتھ جانے کا ارادہ نہ ہو نیز اس کا ظاہر یہ ہے کہ اس کا عموم ہر جنازہ کو شامل ہے خواہ مومن کا ہو یا دوسرا ہو۔ اور اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک یہودی کے جنازہ کے لئے کھڑا ہونا جو آپ کے پاس سے گزرا تھا" اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ موت سراپا گھبراہٹ ہے اور ایک روایت میں ہے کہ "ہم تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں جو جانوں کو قبض کرتا ہے" اور ابن حبان کے لفظ ہیں "اللہ کی تعظیم کے لئے" اور ان دونوں وجوہ میں کوئی منافات نہیں۔ البتہ یہ حکم مسلم میں علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معارض ہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کے لئے کھڑے ہوئے پھر بیٹھ گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ اس وقت بیٹھے ہوں جب جنازہ دور ہو گیا ہو تو اس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے۔ کہ علی نے لوگوں کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹھ جائیں پھر انہیں یہ حدیث بتلائی اور چونکہ دونوں حدیثوں میں تعارض ہے تو علماء میں بھی اس بارے میں اختلاف ہوا۔ شافعی اس طرف گئے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی حدیث قیام کے حکم کی ناسخ ہے اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ علی کی حدیث نسخ میں واضح نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹھنا جواز کی وضاحت کے لئے ہو۔ اسی لئے نووی نے کہا کہ پسندیدہ یا اختیار کردہ بات یہی ہے کہ یہ مستحب ہے رہی عبادہ بن صامت کی یہ حدیث کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کے لئے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک یہودی عالم وہاں سے گزرا تو کہنے لگا کہ ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ تب آپؐ نے فرمایا کہ بیٹھو اور ان کی مخالفت کرو" اسے احمد' نسائی کے سوا اصحاب سنن' ابن ماجہ' بزار اور بیہقی نے روایت کیا' تو یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس سے بشر بن رافع ہے جس کے متعلق بزار نے کہا: "بشر منفرد اور حدیث میں کمزور ہے"۔

اور حدیث کے الفاظ ہیں "جو شخص جنازہ کے ساتھ چلے وہ میت کے رکھنے تک نہ بیٹھے" توضع سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ میت کو زمین پر رکھا جائے اور یہ بھی کہ اسے لحد میں اتارا جائے اور یہ حدیث دونوں طرح کے الفاظ میں مروی ہے۔ الا یہ کہ بخاری اور دوسروں نے "زمین پر رکھنے" کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ سلف کھڑا رہنے کے وجوب کی طرف گئے ہیں تا آنکہ میت نیچے رکھ دی جائے جیسا کہ یہاں نہی سے معلوم ہوتا ہے اور نسائی میں ابوہریرہ اور ابوسعید کی حدیث کی وجہ سے بھی کہ: "جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنازہ میں حاضر ہوئے تو ہم نے یہی دیکھا کہ جب تک میت رکھ نہ دی جاتی آپ بیٹھتے نہیں تھے" اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے اور بیہقی نے ابوہریرہ وغیرہ سے حدیث روایت کی کہ کھڑا ہونے والا اجر کے لحاظ سے اٹھانے والے کی طرح ہے"

۵۳۸- وعن أبي إسحاق ، أن عبد الله بن يزيد رضي الله تعالى عنه أدخل الميت من قبل رجل القبر، وقال: هذا من السنة. أخرجه أبو داود.

ابو اسحاق(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن یزید(۲) نے میت کو پاؤں کی طرف(۳) سے قبر میں داخل کیا۔ پھر کہا کہ سنت یہی ہے۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا(۴)۔

(۱) آپ سبیعی ہمدانی کوفی ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کو دیکھا۔ مشہور تابعی اور کثیر الروایات ہیں۔ خلافت عثمانی کے اختتام سے دو سال پہلے پیدا ہوئے۔ اور ۱۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) آپ خطمی اوسی کوفی ہیں حدیبیہ میں حاضر ہوئے اور وہ اس وقت سترہ برس کے تھے کوفہ کے امیر رہے جنگ جمل اور صفین میں علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ عبداللہ ابن البر نے الاستیعاب میں ان کا ذکر کیا ہے۔

(۳) یعنی وہ طرف جدھر سے میت کے پاؤں کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے جیسی بھی صورت ہو۔

(۴) نیز علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالمطلب کی اولاد میں سے کسی شخص کے جنازہ پر نماز پڑھی۔ آپ نے حکم دیا کہ میت کی چارپائی کو لحد کے پاؤں کی طرف رکھا جائے پھر میت کو آہستہ آہستہ قبر میں اتارنے کا حکم دیا۔ شارح نے اس کا ذکر کیا مگر سند بیان نہیں کی۔ اور اس مسئلہ میں تین قول ہیں۔ پہلا یہی جس کا ذکر ہوا۔ ہادویہ' شافعی اور احمد کا یہی مذہب ہے دوسرا یہ کہ میت کو اس کے سر کی جانب سے قبر میں اتارا جائے جیسا کہ شافعی نے ابن عباس کی مرفوع حدیث ثقہ لوگوں سے روایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت کو اس کے سر کی جانب سے اتارا۔ اور شافعی کے دو اقوال میں سے ایک قول یہی ہے۔ تیسرا ابو حنیفہ کا قول ہے کہ میت کو قبلہ کی جانب سے چوڑائی کے رخ اتارا جائے جب یہ صورت آسان ہو۔ مین کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں واضح حکم موجود ہے جو جابر کی حدیث کی شرح میں آرہا ہے اور جس میں رات کو دفن کرنے کی ممانعت ہے اسے ترمذی نے ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا ہے جو قبلہ کی طرف سے میت کو داخل کرنے میں نص ہے اور یہ حدیث حسن ہے ان تمام روایات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس معاملہ میں ہر طرح سے اختیار ہے۔

فائدہ: میت کو چھپانے کے وقت قبر کو کپڑے سے ڈھانپنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے ڈھانپا جا سکتا ہے خواہ مدفون مرد ہو یا عورت جیسا کہ بیہقی نے روایت کیا کہ ابن عباس کی حدیث کے علاوہ مجھے یہ کسی سے یاد نہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعید کی قبر کو کپڑے سے ڈھانپ دیا" بیہقی نے کہا کہ مجھے یہ صرف یحییٰ بن عقبہ بن ابی العیزار کی حدیث سے یاد ہے اور وہ ضعیف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ قبر کو ڈھانپنا صرف عورتوں سے مخصوص ہے جیسا کہ بیہقی نے ہی ابو اسحاق کی حدیث روایت کی کہ: "حارث اعور کا جنازہ آیا تو عبداللہ بن زید نے اس بات کو تسلیم نہ کیا کہ اس پر کپڑا بچھایا جائے اور کہا کہ یہ تو مرد ہے" بیہقی نے کہا۔ اگرچہ یہ روایت موقوف ہے مگر اس کی سند صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے بیہقی نے ہی اہل کوفہ میں سے ایک آدمی سے روایت کیا کہ: "حضرت علی بن ابی طالب کے پاس وہ آدمی آیا۔ وہ مردوں کو دفن کرتا تھا تو اس نے اس کی قبر پر کپڑا پھیلا دیا۔ آپ نے وہ کپڑا قبر پر سے کھینچ لیا اور کہا کہ: "ایسا کام تو عورتوں سے کیا جاتا ہے"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥٣٩- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، عن النبي ﷺ، قال: «**إذا وضعتم موتاكم في القبور، فقولوا: بسم الله، وعلى ملة رسول الله**». أخرجه أحمد وأبو داود والنسائي، وصححه ابن حبان، وأعله الدارقطني بالوقف.

ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: جب تم اپنے مردوں کو قبروں میں رکھو تو یوں کہا کرو "اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے رسول کے دین پر (اسے دفن کرتے ہیں)" اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا اور دار قطنی نے موقوف ہونے کی بنا پر اسے معلول کہا ہے(۱)۔

(۱) اور نسائی نے بھی ابن عمر پر اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے الا یہ کہ اس کے شواہد مرفوع ہیں جسے مصنف نے شرح میں ذکر کر دیا ہے اور حاکم اور بیہقی نے ضعیف سند سے روایت کیا کہ: "جب ام کلثوم بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں رکھا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى' بسم الله و فى سبيل الله و على مله رسول الله" اور شافعی نے کسی اور دعاء کو بہتر کہا ہے۔ ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ دفن کرنے والے کو اختیار ہے کہ جونسی دعا چاہے' کرے۔ اس میں کوئی قید یا حد نہیں۔

٥٤٠- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن رسول الله ﷺ قال: «**كسر عظم الميت ككسره حيا**». رواه أبو داود بإسناد على شرط مسلم، وزاد ابن ماجه من حديث أم سلمة: «في الإثم».

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کی ہڈی توڑنا۔ اسے ابوداؤد نے مسلم کی شرائط کی سند سے روایت کیا۔ اور ابن ماجہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے یہ الفاظ(۱) زیادہ ذکر کئے۔"گناہ میں"(۲)

(۱) یعنی اسی ہڈی توڑنے کے بارے میں

(۲) اس میں مثلیت کی وضاحت ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جس طرح زندہ کا احترام واجب ہے اسی طرح میت کا بھی احترام واجب ہے فرق یہ ہے کہ زندہ کی ہڈی توڑنے پر ضمان یا دیت واجب ہے جبکہ میت کی ہڈی توڑنے پر اسی کے بقدر گناہ ہوتا ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ جس طرح ہڈی توڑنے سے زندہ کو دکھ پہنچتا ہے میت کو بھی دکھ پہنچتا ہو اور ایسی حدیث بھی آئی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥٤١- وعن سعد بن أبي وقاص رضي الله تعالى عنه، قال: الحدوا لي لحداً وانصبوا علي اللبن نصباً، كما صنع برسول الله ﷺ. رواه مسلم.

سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ انہوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میرے لئے لحد(۱) بنانا اور اس میں کھڑی اینٹیں لگانا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ(۲) میں کیا گیا تھا۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) سعد بن ابی وقاص نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کے لئے کوئی لکڑی کا صندوق بنا لیں؟ تو آپ نے یہ جواب دیا اور لحد اس گڑھے کو کہتے ہیں جو قبر میں قبلہ کی جانب کھودا جاتا ہے۔

(۲) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لحد بنائی گئی تھی چنانچہ احمد اور ابن ماجہ نے حسن سند سے روایت کیا کہ "مدینہ میں دو آدمی تھے ایک لحد بناتا تھا اور دوسرا شق کرتا (درمیان میں گڑھا بناتا) تھا۔ صحابہ نے انہیں بلانے کے لئے آدمی بھیجا۔ صحابہ نے ان سے کہا تم میں سے کون ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق کام کرتا ہے چنانچہ وہ آدمی آیا جو لحد بناتا تھا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لحد بنائی" اور احمد اور ترمذی نے ابن عباس سے ایسی ہی حدیث روایت کی کہ "جو لحد بناتا تھا وہ ابو طلحہ انصاری تھے" اور اس کی سند کمزور ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ لحد افضل ہے۔

٥٤٢- وللبيهقي عن جابر رضي الله تعالى عنه نحوه، وزاد: ورفع قبره عن الأرض قدر شبر. وصححه ابن حبان.

٥٤٣- ولمسلم عنه: نهى رسول الله ﷺ، أن يجصص القبر، وأن يقعد عليه، وأن يبنى عليه.

بالشت بھر اونچی رکھی گئی تھی۔ اسے ابن حبان نے صحیح کہا۔ اور مسلم(۲) میں جابر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے، ان پر مجاور بن کر بیٹھنے اور ان پر عمارت بنانے سے منع کیا ہے۔

(۱) یعنی بیہقی نے سعد کی حدیث جیسی حدیث جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔

اس حدیث کو بیہقی، اور ابن حبان نے جعفر بن محمد سے، اپنے باپ سے، جابر سے روایت کیا ہے اور اس بارے میں قاسم بن محمد کی حدیث بھی ہے جو کہتے ہیں کہ "میں حضرت عائشہؓ کے پاس آیا اور کہا: مجھے رسول اللہ

اور بیہقی میں جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی(۱) طرح مروی ہے اور اس میں اتنا زیادہ ہے کہ آپؐ کی قبر زمین سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے دونوں صاحبوں کی قبریں دکھلا دو۔ چنانچہ انہوں نے مجھے تینوں قبریں دکھلائیں۔ وہ نہ زمین سے بہت زیادہ اونچی تھیں اور نہ زمین سے ملی ہوئی تھیں اور ان پر سرخ وادی کے کنکر بچھائے گئے تھے" اسے ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا اور اتنا زیادہ کہا کہ: "میں نے دیکھا کہ آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر تھی اور ابوبکر کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کندھوں کے درمیان تھا اور عمرؓ کا سر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کے پاس تھا۔" نیز ابوداؤد نے مراسیل میں صالح بن ابی صالح سے روایت کیا کہ: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر دیکھی۔ وہ زمین سے ایک بالشت یا اس کے لگ بھگ اونچی تھی" اور اس سے سفیان التمار کی حدیث معارض ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے کہ: "میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کوہان نما تھی" یعنی اونٹ کی کہان کی طرح بلند تھی۔ اور بیہقی نے ان دونوں روایتوں میں یوں تطبیق دی کہ پہلے وہ ہموار تھی۔ پھر جب ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں اس کی دیوار گر گئی تو اسے درست کیا اور کوہان نما بنا دیا۔

فائدہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۱۲ ربیع الاول بروز پیر سورج ڈھلنے کے وقت ہوئی۔ اور موطا کی روایت کے مطابق منگل کے دن دفن کئے گئے اور ایک جماعت نے کہا کہ بدھ کے دن دفن ہوئے۔ آپ کے غسل اور تدفین کا اہتمام علی' عباس اور اسامہ کر رہے تھے۔ اسے ابوداؤد نے شعبی کی حدیث سے روایت کیا اور یہ زیادہ کہا: "اور مجھ سے مرحب نے حدیث بیان کی" شرح میں ایسا ہی ہے اور تلخیص میں یوں ہے "مرحب یا ابو مرحب" یعنی شک کے ساتھ "کہ یہ حضرات عبدالرحمٰن بن عوف سمیت اندر آئے" اور بیہقی کی روایت میں علی اور عباس کے ساتھ فضل بن عباس اور صالح جسے شقران بھی کہتے ہیں کا ذکر ہے اور اس نے ابن عوف کا ذکر نہیں کیا اور اس کی ایک روایت اور ابن ماجہ کی روایت میں علی' فضل قثم اور شقران کا ذکر ہے اور اتنا زیادہ ہے "ایک انصاری نے آپ کی لحد درست کی" اور ان روایات میں تطبیق یوں ہے کہ جس نے ابتداء میں کم آدمی دیکھے تو کم کا ذکر کر دیا اور جس نے آخر میں زیادہ دیکھے تو زیادہ کا ذکر کر دیا۔

(۲) یہ حدیث مذکورہ تین کاموں کے حرام ہونے پر دلیل ہے کیونکہ نہی کی اصل تحریم ہے اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ قبر کو پختہ کرنے اور اس پر عمارت بنانے کی نہی تو تنزیہی ہے اور قبروں پر بیٹھنے کی نہی تحریمی ہے گویا اس طرح حقیقت اور مجاز کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ ان تینوں کاموں کو حقیت پر محمول کرنے سے پھیرنے والی کون سی چیز ہے جبکہ اصل نہی ہے چنانچہ قبروں پر تعمیر کرنے' ان پر کتبہ لگانے اور ان پر چراغ جلانے کی ممانعت میں بہت سی احادیث آئی ہیں اور ان میں اتنا زیادہ ہے کہ انہیں روندا نہ جائے۔ اور ابوداؤد' ترمذی او نسائی نے ابن مسعود کی حدیث کو مرفوعاً" روایت کیا: "اللہ تعالیٰ قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر' قبروں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر مسجدیں بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر لعنت کرے" اور نسائی کے الفاظ یہ ہیں: "آپؐ نے قبر پر تعمیر کرنے یا اس پر اضافہ کرنے یا اسے پختہ کرنے یا اس پر کتبہ لگانے سے منع فرمایا ہے" اور بخاری نے عائشہؓ کی حدیث روایت کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس مرض میں جس سے وہ اٹھ نہ سکے' فرمایا: اللہ تعالٰی یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا" اور ترمذی نے روایت کیا کہ: "علی رضی اللہ عنہ نے ابوالہیاج اسدی سے کہا: "میں تمہیں اسی کام پر بھیجتا ہوں جس کام پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا کہ تجھے جو قبر بھی اونچی نظر آئے اسے برابر کر دو اور جو مجسمہ یا تصویر نظر آئے اسے مٹا ڈالو" ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے اور بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے وہ زمین سے اوپر قبر کو بلند کرنا مکروہ سمجھتے تھے شارح رحمہ اللہ نے کہا۔ ان احادیث میں لعنت بھی کی گئی ہے اور تشبیہ بھی دی گئی ہے جیسے فرمایا: "میری قبر کو آستانہ نہ بنا لینا کہ اللہ کو چھوڑ کر پوجا جانے لگے" اس حدیث سے کئی کاموں کی حرمت معلوم ہوتی ہے مثلاً قبروں پر عمارت بنانا' ان کو سجانا' انہیں پختہ بنانا' وہاں مرصع صندوق رکھنا' قبروں پر اور ان کی چھتوں پر پردے لٹکانا' قبر کی دیواروں کو تبرکاً چھونا اور ہاتھ پھیرنا وغیرہ اور یہ سب کام آپ کے عہد کے بعد کے ہیں۔ جو جہالت پھیلاتے اور اسی حالت کی طرف لے جاتے ہیں جو سابقہ امتوں میں بتوں کے پجاریوں کی تھی۔ لہٰذا سد ذریعہ کے طور پر اس کام سے منع کر دیا گیا جو ایسے بگاڑ کی طرف لے جاتا ہو۔ اور مصالح کے حصول اور مفاسد کے دفعیہ کی خاطر شرعی احکام میں ایسی حکمت کار فرما نظر آتی ہے خواہ وہ کام بذات خود برے ہوں یا برائی کی طرف لے جانے والے ہوں ان سب سے شریعت نے روک دیا ہے۔ اور یہ اچھی بحث ہے جسے ہم نے ایک مستقل مسئلہ میں زیر بحث لا کر اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

۵۴۴- وعن عامر بن ربيعة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ صلى على عثمان بن مظعون ، وأتى القبر، فحثى عليه ثلاث حثيات، وهو قائم. رواه الدارقطني.

عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کی نماز جنازہ پڑھائی پھر اس کی قبر پر آئے۔ اور کھڑے کھڑے (دفن کے بعد) قبر پر تین مٹھیاں مٹی ڈالی۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا(۱)۔

(۱) نیز اسے بزار نے روایت کیا اور وھو قائم کے بعد عند راسہ (اس کے سر کے پاس) کا اضافہ کیا۔ اور اس بات کا بھی کہ "آپ نے حکم دیا کہ قبر پر پانی چھڑکا جائے" اور ابو الشیخ نے مکارم الاخلاق میں ابوہریرہ سے مرفوعاً" روایت کیا: "جس نے کسی مسلمان پر ثواب کی نیت سے مٹی ڈالی تو ہر مٹی کے عوض اس کے لئے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نیکی لکھی جاتی ہے" اور اس کی سند کمزور ہے اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ کی حدیث روایت کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کی جانب تین مٹھیاں مٹی ڈالی" مگر ابو حاتم نے اس حدیث کو باطل کہا ہے اور بیہقی نے محمد بن زیاد کے طریق سے ابو امامہ سے روایت کیا کہ ایک آدمی مر گیا جس کی سوائے ایک قبر پر تین مٹھیاں مٹی ڈالنے کے اور کوئی نیکی نہ تھی تو اس کے گناہ معاف کر دیئے گئے(ا)۔ لیکن یہ ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔

اور اس حدیث میں قبر پر تین مٹھیاں مٹی ڈالنے کی مشروعیت پر دلیل ہے لیکن یہ ایک ساتھ دونوں ہاتھوں سے ہونی چاہئیں جیسا کہ عامر بن ربیعہ کی حدیث میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے مٹی ڈالے اور اصحاب شافعی کے نزدیک اس وقت یہ کہنا مستحب ہے۔ منہا خلقنکم و فیہا نعیدکم--- الایہ

۵۴۵- وعن عثمان رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه، وقال: استغفروا لأخيكم، وسلوا له التثبيت، فإنه الآن يسأل. رواه أبو داود، وصححه الحاكم.

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہو جاتے تو اس پر کھڑے ہو کر فرماتے: اپنے بھائی کے لئے بخشش طلب کرو اور اسے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اس وقت اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا(ا)۔

(ا) اس حدیث میں زندہ کے استغفار سے میت کو فائدہ پہنچ جانے پر دلیل ہے اسی بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول آیا ہے۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان--- نیز فرمایا واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات اور ایسی ہی دوسری آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قبر میں میت سے سوال کیا جاتا ہے اور اس بارے میں کئی احادیث آئی ہیں جنہیں شیخین نے روایت کیا ہے انہی میں سے ایک انس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میت کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس آتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے" اور مسلم نے یہ زیادہ کیا کہ "جب وہ لوٹتے ہیں تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں" اور ابن حبان اور ترمذی میں یہ زیادہ ہے کہ "وہ نیلی آنکھوں والے اور سیاہ رنگ ہوتے ہیں ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے" اور طبرانی نے اوسط میں زیادہ کیا کہ "ان کی آنکھیں تانبے کی ہنڈیوں جیسی ہوتی ہیں اور نوکیلے دانت گائے کے سینگوں جیسے اور ان کی آواز رعد کی طرح گرجدار ہوتی ہے۔" اور عبدالرزاق نے زیادہ کیا کہ وہ اپنے نوکیلے دانتوں سے اور ان کے بال گوندھے ہوئے ہوتے ہیں اور

(ا) اس حدیث پر وضع کا اثر خوب واضح ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے ساتھ اپنے بھاری لوہے کے سلاخ ہوتے ہیں کہ اہل منیٰ مل کر انہیں اٹھا نہ سکیں" اور بخاری نے براء کی حدیث سے یہ زیادہ کیا "پھر میت کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے" ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میت سے سوال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو کس کی عبادت کرتا رہا ہے پھر جسے اللہ نے ہدایت دی ہو گی وہ کہے گا "میں اللہ کی عبادت کرتا رہا" پھر وہ کہیں گے۔ تو اس شخص یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کیا کہتا رہا؟ تو مومن یہ کہے گا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں" اور ایک روایت میں ہے کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں" اسے کہا جائے گا کہ تو نے سچ کہا۔ اس کے علاوہ اس سے اور کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا "تو یقینی بات پر رہا۔ اسی پر مرا اور انشاء اللہ اسی بات پر تو اٹھے گا" اور ایک روایت کے لفظ یہ ہیں آسمان سے ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا کہ "میرے بندے نے سچ کہا لہٰذا اس کے لئے جنت سے بستر بچھا دو اور جنت کی طرف دروازہ کھول دو اور اسے جنت کا لباس پہنا دو۔ پھر اسے جنت کی ہوا اور خوشبو آنے لگے گی اور اس کی قبر کو حد نگاہ تک کھول دیا جائے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا آگ میں اپنے ٹھکانے کی طرف دیکھ۔ اللہ نے تیرا ٹھکانہ جنت سے بدل دیا ہے۔ پھر وہ دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا پھر کہے گا: مجھے چھوڑو تاکہ میں جا کر اپنے گھر والوں کو خوشخبری سناؤں تو اسے کہا جائے گا۔ چپ رہو' پھر اس کی قبر کو ستر ہاتھ تک کھول دیا جائے گا اور تا روز قیامت سبزہ سے بھر دیا جائے گا" اور ایک روایت میں ہے کہ اسے کہا جائے گا کہ اب سو جا۔ تو وہ نئی نویلی دلہن کی سی نیند سو جائے گا اور اسے صرف وہی جگا سکے جو اس کے اہل سے اسے سب سے زیادہ محبوب ہو"

اور کافر اور منافق کا یہ حال ہو گا کہ فرشتے اس سے پوچھیں گے "تیرا رب کون ہے؟ وہ کہے گا: افسوس! میں نہیں جانتا۔ پھر وہ کہیں گے تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہے گا: افسوس! میں نہیں جانتا۔ پھر وہ پوچھیں گے "جو شخص تم میں بھیجا گیا تھا کون ہے؟" وہ کہے گا: افسوس! میں نہیں جانتا۔ اسے کہا جائے گا کہ تو نے نہ تو خود کچھ سمجھا اور نہ ہی ان کے پیچھے لگا جنہوں نے سمجھا تھا۔ پھر لوہے کے ہتھوڑوں سے اسے پھل مارا جائے گا کہ اگر اس ہتھوڑے کی ایک ضرب احد پہاڑ پر پڑے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ پھر وہ چیخنا چلانا شروع کر دے گا۔ جسے انسانوں اور جنوں کے سوا سب آس پاس والے سنتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ سابقہ امتوں کو چھوڑ کر بالخصوص اس امت کے بارے میں' ایسی احادیث آئی ہیں جو قبر میں سوال ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ اس میں راز یہ ہے کہ پہلی امتوں کے ہاں رسول آئے۔ اگر وہ لوگ اطاعت کر لیتے تو فبہا اور اگر نافرمانی کرتے تو ان پر جلدی عذاب لا کر انہیں ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ پھر جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان سے عذاب بند کر دیا گیا اور لوگ اسلام لائے جنہوں نے اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غالب کیا خواہ وہ اپنے اسلام لانے میں مخلص تھے یا نہیں تھے۔ اللہ نے ان کے لئے یہ دستور مقرر کیا کہ قبروں میں ان سے سوال کیا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کی بات ان کے منہ سے نکلوائے اور خبیث کو طیب سے ممیز کر دے۔ ابن قیم اس مسئلہ کے عموم کی طرف گئے ہیں اور کتاب الروح میں خوب تفصیل سے لکھا ہے۔

۵۴۶۔ وعن ضمرة بن حبيب - أحد التابعين - قال: كانوا يستحبون إذا سوي على الميت قبره، وانصرف الناس عنه، أن يقال عند قبره: يا فلان! قل: لا إله إلا الله، ثلاث مرات، يا فلان! قل: ربي الله، وديني الإسلام، ونبيي محمد ﷺ. رواه سعيد بن منصور موقوفاً، وللطبراني نحوه من حديث أبي أمامة مرفوعاً مطولاً.

ضمرہ بن حبیب جو ایک تابعی(۱) ہیں' نے روایت کیا کہ لوگ(۲) اس بات کو پسند کرتے تھے کہ جب میت پر اس کی قبر درست کر دی جائے اور لوگ واپس چلے جائیں تو اس کی قبر کے پاس یوں کہا جائے۔ اے فلاں! کہو اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں۔ تین مرتبہ کہا جائے۔ اے فلاں کہو میرا رب اللہ ہے اور میرا دین اسلام ہے اور میرا نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ اسے سعید بن منصور نے موقوفاً" (۳) روایت کیا اور طبرانی میں ابوامامہ کی طویل مرفوع حدیث بھی اسی طرح(۴) ہے۔

(۱) آپ حمصی ہیں ثقہ ہیں شداد بن اوس وغیرہ سے روایت کیا۔

(۲) یعنی وہ صحابہ کرام جنہیں آپ نے پایا۔

(۳) ضمرہ بن حبیب پر۔

(۴) ابو امامہ کے الفاظ یہ ہیں: جب میں مرجاؤں تو میرے ساتھ وہی کچھ کرنا جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ ہم اپنے مردوں سے کیا کریں۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور کہا: "جب تمہارا کوئی بھائی فوت ہو جائے اور تم اس کی قبر کی مٹی درست کر لو تو کوئی شخص قبر کے سرہانے کھڑا ہو کر کہے: اے فلاں بن فلانہ 'کیونکہ وہ اسے سنتا ہے لیکن جواب نہیں دے سکتا۔ پھر کہے اے فلاں ابن فلانہ! تو وہ کہتا ہے اللہ تجھ پر رحم فرمائے ہماری رہنمائی کر' لیکن تم اس کی بات سمجھ نہیں سکتے' لہٰذا اسے یہ کہنا چاہئے کہ تو دنیا میں شہادت دیا کرتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں اور تو اللہ کے رب ہونے پر' اسلام کے دین ہونے پر' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر اور قرآن کے امام ہونے پر راضی تھا۔ پھر منکر اور نکیر میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر کہے گا۔ ہمیں اس شخص کے پاس لے چل جو ہمیں ایسے شخص کے پاس بٹھائے جسے اس کی حجت تلقین کی گئی ہے۔ ایک شخص کہنے لگا: "یا رسول اللہ! اگر وہ اس میت کی ماں کا نام نہ جانتا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ اپنی ماں حوا کی طرف نسبت کر دے۔ اے فلاں ابن حوا۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصنف نے کہا کہ اس کی سند صالح ہے نیز اس نے اپنی کتاب الاحکام میں بھی مضبوط کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہیثمی نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد کہا: اسے طبرانی نے کبیر میں روایت کیا اور اس کی سند میں ایک جماعت ہے جنہیں میں نہیں جانتا اور اس کے حاشیہ میں ہے اس میں عاصم بن عبداللہ ضعیف ہے پھر کہا کہ ابو امامہ سے پہلا راوی سعید ازدی ہے۔ جس نے ابوحاتم نے بیاض لکھا ہے اثرم کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے کہا کہ جب میت دفن ہو جائے تو تم ایسا کرتے ہو کہ ایک آدمی کھڑے رہے اور کہے: "اے فلاں ابن فلانۃ؟ اس نے کہا کہ میں نے اہل شام کے سوا کسی کو ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ اہل شام نے یہ کام اس وقت کیا جب ابو مغیرہ فوت ہوا۔ اور اس بارے میں ابوبکر بن ابی مریم سے' اس کے استادوں سے مروی ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے۔ شافعیہ اسی طرف گئے ہیں اور المنار میں کہا کہ اہل معرفت کو اس میں کوئی شک نہیں کہ تلقین کی یہ حدیث وضعی ہے اور یہ کہ اسے سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حمزہ بن حبیب سے' اہل حمص میں اپنے استادوں سے روایت کیا ہے گویا یہ مسئلہ حمصیہ ہے۔

• رہی یہ بات کہ یہ حدیث "میت کو ثابت قدم رہنے کے لئے دعا کرو کیونکہ اس وقت اس سے سوال کیا جاتا ہے" اس کی شاہد ہے۔ تو اس میں کوئی شہادت نہیں اسی طرح عمرو بن عاص نے اپنی قبر کے پاس اتنی دیر کھڑا رہنے کا حکم دیا جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت بنایا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کی واپسی کے بعد اپنے رب کے بھیجے ہوئے فرشتوں سے مانوس ہو جائیں' اس میں تلقین پر کوئی شہادت نہیں۔ اور ابن قیم نے الھدی النبوی میں پورے وثوق سے وہی بات کہی ہے جو المنار میں ہے۔ رہا کتاب الروح میں ابن قیم کا موقف تو وہاں وہ حدیث التقلین کو ان دلائل میں لائے ہیں جو مردوں کے زندوں کا کلام سن لینے پر دلالت کرتے ہیں۔ اور بلا کراہت حدیث التقلین کو عمل سے ملا دیا ہے کہ وہ عمل میں کافی ہے اور اس کی صحت کا حکم نہیں لگایا بلکہ کتاب الروح میں صاف کہہ دیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور جو کچھ محققین کی بحث سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس پر عمل کرنا بدعت ہے۔ لہٰذا ایسا کام کرنے والوں کی کثرت سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔

٥٤٧- وعن بريدة بن الحصيب الأسلمي رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «كنت نهيتكم عن زيارة القبور، فزوروها». رواه مسلم. زاد الترمذي: «فإنها تذكر الآخرة».

٥٤٨- زاد ابن ماجه من حديث ابن مسعود: «وتزهد في الدنيا».

بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا۔ اب تم ان کی زیارت کر سکتے ہو۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور ترمذی میں اتنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ(۱) ہے کہ قبروں کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے۔ ابن ماجہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث(۲) میں اتنا زیادہ ہے کہ قبروں کی زیارت دنیا سے بے رغبت(۳) بناتی ہے۔

(۱) یعنی بریدہ کی حدیث سے۔

(۲) اور وہ حدیث نمبر ۵۰ ہے جس کے الفاظ پہلے گزر چکے ہیں۔

(۳) اور اس بارے میں مسلم میں ابوہریرہ سے کئی احادیث مروی ہیں نیز ابن مسعود سے ابن ماجہ اور حاکم میں ابوسعید سے احمد اور حاکم میں، علیؓ سے احمد میں اور عائشہؓ سے ابن ماجہ میں مروی ہیں اور یہ سب قبروں کی زیارت کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں اور ان میں جو حکمت بیان ہوئی ہے وہ عبرت دلانے کے لئے ہے۔ چنانچہ ابن مسعود کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "کیونکہ قبریں عبرت اور آخرت کی یاد دلاتی ہیں اور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہیں"۔ اور جب زیارت ان باتوں سے خالی ہو تو وہ شرعاً" مراد نہ ہو گی اور بریدہ کی حدیث میں دونوں قسم کے احکام کی تطبیق ہے۔ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قبروں کی زیارت کی ممانعت کا ذکر ہے اور بعد میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔

اور حدیث کے لفظ "فزوروھا" میں مردوں کو زیارت کا حکم ہے اور یہ امر بالاتفاق استحباب کے لئے ہے اور اس میں پچھلوں کو والدین کی قبروں کی زیارت کی تاکید کی گئی ہے رہی یہ بات کہ زائر قبر پر پہنچ کر کیا کہے تو اسے یہ کہنا چاہئے السلام علیکم دیار قوم مومنین ورحمته الله وبرکاته اور ان کے لئے مغفرت کی دعا کرے اور عنقریب اس بارے میں مسلم کی حدیث آرہی ہے۔ رہا قبر کے پاس قرآن پڑھنا تو اس کے متعلق بھی بحث آگے آرہی ہے۔

۵۴۹- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ لعن زائرات القبور. أخرجه الترمذي، وصححه ابن حبان.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا(۱)۔

(۱) اور ترمذی نے یہ روایت کرنے کے بعد کہا۔ یہ حدیث حسن ہے اور اس بارے میں ابن عباس اور حسان سے بھی مروی ہے اور بعض اہل علم نے کہا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبروں کی زیارت کی رخصت دینے سے پہلے کی بات ہے پھر جب آپ نے رخصت دے دی تو اس رخصت میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ آپ نے عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت کو اس لئے ناپسند فرمایا کہ ان میں صبر کم اور جزع فزع زیادہ ہوتی ہے پھر اس واقعہ کی سند بیان کی کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر (حبشہ میں) فوت ہوئے اور مکہ میں دفن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہوئے۔ حضرت عائشہؓ آپ کی قبر پر آئیں پھر (تمیم کے یہ شعر) کہے۔

وکنا کندمانی جذیمه برهه من الدهر حتی قیل لن یتصدعا

ہم جذیمہ کے دو صاحبوں کی طرح ایک طویل زمانہ اکٹھے رہے حتیٰ کہ کہا گیا کہ یہ کبھی جدا نہ ہوں گے

وعشنا بخیر فی الحیاه وقبلنا اصاب المنایا رهط کسری وتبعا

ہم زندگی بخیروعافیت گزارتے رہے جبکہ ہم سے پہلے کسریٰ اور اس کے بعد آنے والے موت سے دوچار ہوتے رہے

ولما تفرقنا کانی ومالکا لطول اجتماع لم نبت لیله معا

اور جب ہم جدا ہوئے تو گویا میں اور مالک عرصہ دراز اکٹھا رہنے کے باوجود یوں لگتا تھا کہ ایک رات بھی اکٹھے نہیں رہے

اور جو کچھ اہل علم نے کہا اس پر عائشہ کی یہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے مسلم نے روایت کیا کہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: "یارسول اللہ! جب میں قبروں کی زیارت کروں تو کیا کہوں؟ فرمایا یوں کہو: مومنوں اور مسلمانوں کے گھروں پر سلامتی ہو' اللہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں سب پر رحم فرمائے اور ہم انشاء اللہ آپ سے ملنے والے ہیں" اور جو حاکم نے علی بن حسین کی حدیث سے روایت کیا کہ: "فاطمہ رضی اللہ عنہ ہر جمعہ کو اپنے چچا حمزہ کی قبر کی زیارت کرتیں پھر نماز پڑھتیں اور قبر کے نزدیک رویا کرتیں" میں کہتا ہوں یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ علی بن حسین نے فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا ہی نہیں اور جو کچھ بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا اس کا زیادہ حصہ مرسل ہے۔ "جس نے ہر جمعہ کو اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کی قبر کی زیارت کی وہ بخش دیا جاتا ہے اور نیک اطوار لکھا جاتا ہے"

٥٥٠- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال: لعن رسول الله ﷺ النائحة والمستمعة. أخرجه أبو داود.

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ(۱) کرنے والی اور نوحہ سننے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔

(۱) نوح ٭معنی میت کے اچھے اعمال اور خوبیاں گن گن کر بلند آواز سے بتلانا۔ اور یہ حدیث نوحہ کی حرمت پر دلیل ہے اور یہ مسئلہ مجمع علیہ ہے۔

٥٥١- وعن أم عطية رضي الله تعالى عنها قالت: أخذ علينا رسول الله ﷺ أن لا ننوح. متفق عليه.

ام عطیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے عہد لیا کہ ہم نوحہ نہیں کریں گی۔ متفق علیہ(۱)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عہد عورتوں سے اسلام پر بیعت کرتے وقت لیا تھا اور یہ دونوں حدیثیں نوحہ کرنے اور نوحہ سننے کی تحریم پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ لعنت حرام کام پر ہی ہوتی ہے اور اس باب میں ابن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے اپنے رخسار پیٹے یا گریبان پھاڑا یا جاہلیت کی پکار بلند کی وہ ہم سے نہیں" متفق علیہ۔ نیز شیخین نے ابوموسیٰ کی حدیث روایت کی کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں اس شخص سے بری ہوں جس نے سر منڈایا اور چیخا چلایا اور کپڑے(ا) پھاڑے" اور اس باب میں اور بھی احادیث ہیں اور یہ اس حدیث سے معارض نہیں جسے احمد اور ابن ماجہ نے ابن عمر سے روایت کیا اور اسے حاکم نے صحیح کہا ہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابن عبدالاشہل کی عورتوں کے پاس سے گزرے تو وہ احد کے دن اپنے شہید ہونے والوں پر رو رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا: لیکن حمزہ پر تو کوئی رونے والا نہیں۔ چنانچہ انصار کی عورتیں آئیں اور حمزہ کے لئے رونے لگیں" الحدیث۔

تو یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ اس کے آخری الفاظ یہ ہیں "آج کے بعد کوئی عورت اپنے مرنے والے پر نہ روئے" اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں رونے سے مراد نوحہ کرنا ہے کیونکہ رونے کی کوئی ممانعت نہیں جیسا کہ اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے نسائی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل سے کوئی شخص فوت ہو گیا تو عورتیں جمع ہو کر اس پر رونے لگیں۔ حضرت عمرؓ اٹھے کہ انہیں منع کریں اور دور ہٹا دیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ سے فرمایا: عمر! انہیں چھوڑ دو۔ آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمزدہ ہے اور وقت تھوڑا ہی گزرا ہے" اور یہ میت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی زینب کی تھی جیسا کہ ابن عباس کی حدیث میں اس کی صراحت ہے جسے احمد نے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آپؐ نے ان عورتوں کو کہا۔ "دیکھو شیطان کی آواز نہ نکالنا۔ کیونکہ جو کچھ آنکھ سے اور دل سے ہوتا ہے یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی رحمت ہے اور جو کچھ ہاتھ اور زبان سے ہو وہ شیطان سے ہوتا ہے" گویا یہ حدیث رونے کے جواز پر دلیل ہے اور ممانعت صرف آواز سے ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل مغموم ہے لیکن ہم وہی بات کہیں گے جو پروردگار کو پسند ہو" یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات کے وقت کہی تھی اور بخاری نے ابن عمر کی حدیث یوں روایت کی کہ "اللہ نہ آنکھ کے آنسوؤں پر عذاب کرتا ہے اور نہ دل کے مغموم ہونے پر، بلکہ وہ اس پر عذاب کرتا ہے، اور اپنی زبان کی طرف اشارہ کیا، یا (چاہے تو) رحم کر دے" رہی وہ حدیث عائشہؓ جسے شیخین نے روایت کیا ہے کہ جعفر

(ا) یعنی کسی مصیبت کے لئے اپنے بال منڈا دیئے، مصیبت کے وقت دھاڑیں مارنے لگا یا گریبان اور کپڑے پھاڑنے شروع کر دیئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بن ابی طالب کی وفات پر عورتیں اکٹھی ہو کر رونے لگیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کرنے کے لئے کسی کو حکم دیا کہ "ان کے منہ میں مٹی ڈالے" تو اس میں یہ احتمال ہے کہ اس رونے کے ساتھ نوحہ کی آواز بھی شامل تھی۔ اسی لئے آپ نے ان کو روکنے کا حکم دیا خواہ ان کے منہ میں مٹی بھی ڈالنا پڑے۔

۵۵۲ - وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، عن النبي ﷺ قال: «الميت يعذب في قبره بما نيح عليه». متفق عليه، ولهما نحوه عن المغيرة بن شعبة رضي الله تعالى عنه.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "میت کو نوحہ کرنے والوں کے سبب سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔ متفق علیہ۔ نیز بخاری و مسلم دونوں میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی(ا) ہی روایت ہے۔

(ا) یعنی جیسی ابن عمر کی حدیث ہے۔

اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں جو نوحہ کرنے کے سبب میت کو عذاب دیئے جانے پر دلالت کرتی ہیں۔ اب اس میں اشکال یہ پیش آتا ہے کہ یہ عذاب کسی دوسرے کے فعل کی بنا پر ہوتا ہے لہٰذا اس کے جوابات میں اختلاف ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے عمرؓ اور ان کے بیٹے عبداللہ کی حدیث کا انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے قول ولاتزر وازرۃ وزر اخری (کوئی نفس کسی دوسرے کے بار گناہ نہیں اٹھائے گا) سے احتجاج کیا۔ اسی طرح ابوہریرہ نے بھی اس کا انکار کر دیا اور قرطبی نے عائشہؓ کے انکار کو عجب اور بعید سمجھا اور بتلایا کہ اس حدیث کو کئی صحابہؓ نے روایت کیا ہے لہٰذا اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں جبکہ اس کی تاویل کا امکان بھی موجود ہے۔ پھر قرطبی نے اس آیت اور تعذیب والی حدیث میں تطبیق کرتے ہوئے کہا کہ برزخ کا حال دنیا کے احوال سے ملتا ہے کہ دنیا میں دوسرے کے گناہ کے سبب سزا ملنے کا دستور جاری ہے جس کی طرف درج ذیل آیت اشارہ کر رہی ہے۔ واتقوافتنه لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصه اور اس فتنہ سے بچ جاؤ جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی نہیں پہنچے گا لہٰذا تعذیب کی حدیث اس آیت ولاتذر وازرۃ وزر اخری سے معارض نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد آخرت سے حال کی اطلاع دینا ہے اور شارح نے اسی کی تائید کی ہے اور اکثر لوگوں نے اس کی کئی تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً

پہلی تاویل بخاری نے یہ کی ہے کہ میت کو اس صورت میں عذاب ہو گا جبکہ اس کی زندگی میں اس کا اور اس کے گھر والوں کا یہی دستور رہا ہو اور اگر اس کا ایسا طریقہ نہ ہو تو اسے عذاب نہیں ہو گا۔ اس صورت میں مراد یہ ہو گی کہ اس کے گھر میں سے کچھ لوگوں کے رونے سے اسے عذاب ہو گا خلاصہ یہ ہے کہ بندے کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے کے فعل سے عذاب اس وقت ہوتا ہے جب اس کا کوئی سبب موجود ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میت خود یہ وصیت کر جائے کہ اس پر رویا جائے اور یہی جمہور کی تاویل ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دستور پہلے لوگوں میں معروف تھا جیسا کہ طرفہ بن عبد نے کہا۔

اذا مت فابکینی بما انا اھلہ و شقی علی الجیب یا ام معبد

اے ام معبد جب میں مرجاؤں تو مجھ پر گریبان چاک کرنا اور اتنا زیادہ رونا جتنا کہ میں اس کا مستحق ہوں۔

اور یہ ضروری نہیں میت کو عذاب اس صورت میں ہو کہ وہ وصیت کر جائے اور اس کے گھر والے اس کی وصیت کو پورا کریں۔ بلکہ اگر نہ روئیں تو بھی اسے محض وصیت کی بنا پر عذاب ہو گا کیونکہ اسے دو باتوں کی وجہ سے عذاب ہو گا ایک وصیت کرنے پر کیونکہ یہ اس کا اپنا فعل ہے اور دوسرا نوحہ سے کیونکہ وہ خود اس کا سبب بنا ہے۔

تیسری تاویل یہ ہے کہ یہ عذاب کافر سے خاص ہے مومن کو دوسرے کے گناہ کی بنا پر عذاب نہیں ہو گا اور اس تاویل کا بعید ہونا واضح ہے۔ کیونکہ کافر بھی اللہ کے اس قول ولاتزر وازرۃ وزر اخری کے مطابق دوسرے کا بار گناہ نہیں اٹھائے گا۔

چوتھی تاویل ۔ فرشتوں کی میت کو ڈانٹ ڈپٹ ہے جو اس کے گھر والے اس کی خوبیاں بیان کرتے ہیں جیسا کہ احمد نے ابو موسیٰ کی مرفوع حدیث روایت کی کہ میت کو زندہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے جب نوحہ کرنے والی کہتی ہے کہ اے میرے بازو، اے میرے مددگار، اے میری شرافت اور بزرگی تو فرشتے میت کو کوڑے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کیا تو اس عورت کا بازو ہے اس کا مددگار ہے اور اس کی شرافت اور بزرگی ہے" نیز اسی معنی کی حدیث ابن ماجہ اور ترمذی نے بھی روایت کی ہے۔

پانچویں تاویل یہ ہے کہ تعذیب کا معنی وہ دکھ ہے جو میت کو اس کے گھر والوں اور دوسروں کے نوحہ سے پہنچتا ہے کیونکہ اسے ان کی وجہ سے دکھ ہوتا ہے۔ محمد بن جریر وغیرہ اسی تاویل کی طرف گئے ہیں۔ قاضی عیاض کہتے ہیں یہ سب اقوال سے بہتر ہے اور اس بارے میں انہوں نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو اپنے بیٹے پر رونے سے منع کیا اور فرمایا: جب تم میں سے کوئی روتا ہے تو جس پر روتا ہے وہ آنسو بہاتا ہے۔ اے اللہ کے بندو! اپنے بھائیوں کو دکھ نہ پہنچایا کرو" نیز اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ بندوں کے اعمال ان کے مردوں پر پیش کئے جاتے ہیں اور یہ حدیث صحیح ہے اس حدیث کی اور بھی کئی تاویلیں کی گئی ہیں اور اس بارے میں جو ہم نے ذکر کی ہیں وہ کافی ہیں۔[1]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥٥٣- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: شهدت بنتاً للنبي ﷺ تدفن، ورسول الله ﷺ جالس عند القبر، فرأيت عينيه تدمعان. رواه البخاري.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کے دفن کے وقت موجود تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے پاس بیٹھے تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

واقدی وغیرہ نے اپنی روایت میں وضاحت کی کہ یہ بیٹی ام کلثوم تھی اور جو شخص اس بات کا قائل ہے وہ رقیہ تھیں بخاری نے ان کا رد کیا ہے کہ وہ اس وقت فوت ہوئی تھیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدان بدر میں تھے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے دفن کے وقت موجود نہیں تھے۔

اور یہ حدیث موت کے بعد میت پر رونے کے جواز پر دلیل ہے۔ اور وہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے مگر اس سے یہ حدیث معارضہ کرتی ہے کہ "جب کوئی فوت ہو جائے تو کوئی رونے والی اس پر نہ روئے" اور ان میں تطبیق کی یہ صورت ہے کہ اس رونے کو بلند آواز سے رونے پر محمول کیا جائے گا۔ یا وہ رونا جو عورتوں سے مخصوص ہے کیونکہ ان کا رونا نوحہ کی طرف چل نکلتا ہے گویا یہ حدیث سد ذریعہ سے تعلق رکھتی ہے۔

٥٥٤- وعن جابر رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ قال: **«لا تدفنوا موتاكم بالليل إلا أن تضطروا إليه»**. أخرجه ابن ماجه، وأصله في مسلم، لكن قال: زجر أن يقبر الرجل في الليل حتى يصلَّى عليه.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مردوں کو رات کے وقت دفن نہ کیا کرو۔ الا یہ کہ تم اس بات پر مجبور ہو جاؤ۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا اور اس کی اصل مسلم میں ان الفاظ میں ہے کہ آپ نے رات کو نماز جنازہ پڑھ کر میت کو دفن کرنے سے منع فرمایا ہے(۱)۔

(۱) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ مجبوری کے بغیر میت کو رات کو دفن نہ کرنا چاہیے حسن کا یہی مذہب ہے اور اس نہی کی وجہ اس حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ دن کے فرشتے رات کے فرشتوں کی نسبت رحم دل ہوتے ہیں شارح نے اسے صحیح کہا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حدیث کے الفاظ ہیں کہ "اس کی اصل مسلم میں ہے" تو مسلم میں یہ حدیث ان الفاظ میں ہے "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا جس میں اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کا ذکر کیا کہ وہ فوت ہوا اور اسے تنگ سے کفن میں کفنایا گیا اور رات کو دفن کر دیا گیا۔ اور آپ نے رات کو نماز جنازہ پڑھنے اور دفن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے سے منع کر دیا۔ الا یہ کہ انسان اس بات پر مجبور ہو جائے" اس سے صاف واضح ہے کہ یہ نہی صرف اس صورت میں ہے جب یہ گمان ہو کہ نماز چھوڑنے سے میت کے حق میں کمی رہ جائے گی یا اسے ٹھیک طرح سے کفنایا نہ جا سکے گا مگر جب دن تک تاخیر کرنے سے جنازہ پڑھنے والوں کی کثرت یا ایسے شخص کی حاضری مطلوب ہو جس کی دعاء کا بھی وہ توقع رکھتا ہے تو تاخیر بہتر ہے اور ان باتوں کی وجہ سے دن کے وقت بھی تجہیز و تکفین میں دیر کی جا سکتی ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رات کے وقت دفن کیا اور صحابہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت دفن کیا نیز ترمذی نے ابن عباس سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو ایک قبر پر آئے' اس کے لئے چراغ جلایا گیا۔ آپ قبلہ کی طرف کھڑے ہوئے۔ پھر فرمایا: "اللہ تجھ پر رحم فرمائے تو بڑا نرم دل اور قرآن کی بہت تلاوت کرنے والا تھا" الحدیث۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے نیز کہا کہ اکثر اہل علم نے رات کو دفن کرنے کی رخصت دی ہے۔ اور ابن حزم نے کہا کہ مجبوری کے بغیر رات کو دفن نہ کیا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے جس کو یا اپنی بیویوں کو رات کو دفن کیا تو ایسا کرنا مجبوری کے تحت ضروری ہو گیا تھا مثلاً لوگوں کے ہجوم کا خطرہ' یا آنے والوں کے لئے گرمی کا خطرہ یا میت کی حالت بگڑنے کا خطرہ یا ایسی ہی کوئی اور بات جس کی وجہ سے رات کو دفن کرنا مباح ہے اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق اس کے خلاف گمان رکھے۔

تنبیہ: اوقات کے متعلق پہلے عقبہ بن عامر کی حدیث گزر چکی ہے کہ: تین گھڑیاں ایسی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھنے اور اپنے مردے دفن کرنے سے منع فرمایا ہے: "جب سورج نکل رہا ہو تا آنکہ وہ بلند ہو جائے اور جب سورج سر پر ہو تا آنکہ ڈھل جائے اور جب سورج غروب ہونے کے لئے جھک گیا ہو تا آنکہ غروب ہو جائے" مصنف کو چاہئے تھا کہ یہ حدیث بھی یہاں ذکر کر دیتا۔

۵۵۵- وعن عبد الله بن جعفر رضي الله تعالى عنه قال: لما جاء نعي جعفر ، حين قتل، قال رسول الله ﷺ: «اصنعوا لآل جعفر طعاماً، فقد أتاهم ما يشغلهم». أخرجه الخمسة إلا النسائي.

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جعفر کے شہید ہونے کی خبر آئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو۔ کیونکہ انہیں ایسی مصیبت آئی ہے جو انہیں کھانا پکانے سے باز رکھے گی۔ اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہ حدیث میت کے اہل خانہ سے ہمدردی پر دلیل ہے کہ چونکہ انہیں کھانا پکانے کی فرصت نہیں ہوتی لہٰذا ان کے لئے کھانا پکایا جائے لیکن احمد نے جریر بن عبداللہ بجلی سے روایت کیا کہ "ہم میت کو دفن کرنے کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے گھر میں جمع ہونا اور کھانا تیار کرنا نوحہ کرنے کے برابر سمجھتے تھے" تو جریر کی حدیث سے مراد یہ ہے کہ میت کے گھر والے کھانا تیار کریں اور ان کو کھلائیں جو جمع ہوتے ہیں جیسا کہ آس پاس کے علاقوں کا یہ دستور معروف تھا اور اہل میت سے احسان یہ ہے کہ کھانا پکا کر انہیں پہنچایا جائے اس صورت میں کچھ حرج نہیں اور یہی جعفر کی حدیث کا مطلب ہے۔ رہا موت کے بعد اس کی قبر کے قریب جانور ذبح کرنا تو یہ حرام ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ احمد اور ابو داؤد نے انس سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام میں عقر (ذبح کرنا) جائز نہیں" عبدالرزاق نے کہا کہ وہ لوگ قبر کے پاس گائے' بکری' ذبح کرتے تھے۔ خطابی نے کہا کہ دور جاہلیت میں لوگ کسی سخی آدمی کی قبر پر اونٹ ذبح کرتے اور کہتے کہ چونکہ یہ شخص اپنی زندگی میں اونٹ ذبح کر کے مہمانوں کو کھلاتا تھا تو اب ہم اس کی طرف سے اونٹ ذبح کر کے اس کا حق ادا کرتے ہیں کہ اسے درندے اور پرندے کھائیں اور یہ ان کی خوراک بنے۔ اور کچھ لوگوں کا یہ مذہب تھا کہ اگر اس کی قبر کے پاس اس کی سواری کو ذبح کیا جائے تو قیامت کے دن سوار کی حالت میں اس کا حشر ہو گا اگر ذبح نہ کیا جائے تو پیدل حشر ہو گا۔ یہ ان لوگوں کا مذہب تھا جو ان میں سے بعث بعدالموت کے قائل تھے گویا یہ کام دور جاہلیت کا کام ہے اور حرام ہے۔

۵۵۲- وعن سليمان بن بريدة ، عن أبيه قال: كان رسول الله ﷺ يعلمهم إذا خرجوا إلى المقابر، أن يقولوا: السلام على أهل الديار من المؤمنين والمسلمين، وإنا إن شاء الله بكم للاحقون، نسأل الله لنا ولكم العافية. رواه مسلم.

سلیمان بن بریدہ(۱) اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو قبرستان جا کر یہ دعا پڑھنا سکھلایا کرتے تھے: "اے مومنوں اور مسلمانوں کے گھرانو! اور گھر والو! تم پر سلامتی ہو' اور ہم بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔ ہم اپنے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔" اسے مسلم نے روایت کیا(۲)۔

(۱) آپ اسلمی ہیں اپنے باپ عمران بن حصین اور ایک جماعت سے روایت کی۔ ۱۱۵ھ میں فوت ہوئے۔

(۲) نیز اسے عائشہ کی حدیث سے بھی روایت کیا اور اس میں یہ جملہ زیادہ ہے "اور اللہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں پر رحم فرمائے"

یہ حدیث زیارت قبور اور وہاں کے فوت شدہ لوگوں پر سلام کہنے کے جواز پر دلیل ہے اور یہ کہ سلام یا سلامتی کا لفظ زندوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خطابی کہتے ہیں کہ دار کا اطلاق قبروں یا قبرستان پر ہوا ہے اور یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درست ہے اور لغوی لحاظ سے دار کا لفظ اس جگہ پر بھی استعمال ہوتا ہے جو آباد ہو اور ویران جگہ پر بھی جہاں کوئی آباد نہ ہو اور انشاء اللہ کی قید تبرک اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کی بجا آوری کے طور پر ہے۔ ولاتقولن بشئی انی فاعل ذلک غدا الا ان یشاء اللہ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مشیت بعینہ اس قبر کی طرف لوٹتی ہے اور عافیت طلب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ عافیت ہی وہ اہم اور اشرف چیز ہے جس کا سوال کیا جانا چاہئے اور میت کے لئے عافیت سے مراد عذاب سے حساب کی سختی سے سلامتی ہے۔ اور زیارت قبور سے مقصود ان کے لئے دعا کرنا' ان کے لئے احسان' آخرت کی یاد اور دنیا سے عدم دلچسپی ہے لیکن عامتہ الناس نے اس کے برعکس جو نئے نئے کام شروع کر دیئے ہیں کہ فوت شدہ لوگوں کو پکارتے' ان سے فریاد کرتے' ان سے فریاد رسی چاہتے اور ان کے حق کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے اور حاجات طلب کرتے ہیں تو یہ سب بدعت اور جہالت کے کام ہیں اور ان کا کچھ ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے۔

۵۵۷- عن ابن عباس رضي الله تعالى عنه قال: مر رسول الله ﷺ بقبور المدينة فأقبل عليهم بوجهه، فقال: السلام عليكم، يا أهل القبور! يغفر الله لنا ولكم، أنتم سلفنا، ونحن بالأثر. رواه الترمذي، وقال. حسن.

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قبرستان کے پاس سے گزرے تو آپ نے قبروں کی طرف منہ کر کے فرمایا: اے اہل قبور! تم پر سلامتی نازل ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی معاف فرمائے اور تمہیں بھی۔ تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا(ا)۔

(ا) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص قبرستان پر گزرے تو ان پر سلامتی کی دعا کرے خواہ اس کا قبروں کی زیارت کا ارادہ ہو نہ ہو۔ نیز یہ کہ اہل قبور گزرنے والوں اور ان کے سلام کو جانتے ہیں ورنہ یہ فضول کام ہے اور اس کا اور اس سے پہلی دو حدیثوں کا ظاہر یہ ہے کہ سب کو سلام کہے اور دعا کرے۔ نیز اس حدیث میں یہ بھی دلیل ہے کہ انسان جب کسی کے لئے دعاء یا استغفار کرے تو اس کی ابتداء اپنے آپ سے کرے اور قرآنی دعائیں بھی اسی کے مطابق آئی ہیں۔ جیسے ربنا اغفرلنا ولاخواننا اور فاستغفر لذنبک وللمؤمنین اور ان کے علاوہ دوسری دعائیں ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور ایسی دعائیں بلا اختلاف میت کے لئے نفع بخش ہیں رہا دعاؤں کے علاوہ قرآن پڑھنا تو شافعی اس بات کے قائل ہیں کہ اس کا فائدہ میت کو نہیں پہنچتا۔ اور اہل سنت کی ایک جماعت اور حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے کسی عمل جیسے نماز' حج' صدقہ' تلاوت قرآن' ذکر اور اذکار یا کسی بھی تقرب کے ذریعہ کو دوسرے کے لئے کر سکتا ہے اور یہی قول دلیل کے لحاظ سے راجح(ا) تر ہے۔ چنانچہ دار قطنی نے روایت کیا کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ وہ اپنے والدین کی وفات کے بعد ان سے کیسے بھلائی کر سکتا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ اپنی نماز کے ساتھ ان کے لئے بھی نماز پڑھے اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لئے بھی روزہ رکھے" اور ابوداؤد نے معقل بن یسار کی حدیث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ "اپنے مرنے والوں پر سورہ یاسین پڑھا کرو" اور یہ فوت شدہ کو بھی شامل ہے بلکہ اس بارے میں یہ حقیقت ہے اور شیخین نے روایت کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مینڈھے کی اپنی طرف سے قربانی دیتے تھے اور ایک کی امت کی طرف سے" اور اس میں اشارہ ہے کہ دوسرے کا عمل بھی انسان کو فائدہ دے سکتا ہے اور ہم نے ضوء النہار کے حواشی میں تفصیل سے بحث کی ہے جس سے اس مذہب والوں کی قوت واضح ہو جاتی ہے۔

٥٥٨ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: «لا تسبوا الأموات، فإنهم قد أفضوا إلى ما قدموا». رواه البخاري،

٥٥٩ وروى الترمذي عن المغيرة نحوه، لكن قال: «فتؤذوا الأحياء».

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فوت شدہ لوگوں کو برا بھلا نہ کہا کرو جو اعمال انہوں نے آگے بھیجے تھے ان تک وہ پہنچ چکے۔ اسے بخاری نے روایت کیا(۱)۔ اور ترمذی میں مغیرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی(۲) ہی روایت ہے لیکن اس میں یہ لفظ بھی ہے "تو تم زندوں کو دکھ پہنچاتے(۳) ہو"

(۱) اس حدیث میں فوت شدہ لوگوں کو گالی دینے کی تحریم پر دلیل ہے اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ اس میں مسلم اور کافر سب شامل ہیں اور شرح میں ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ کافروں کو برا بھلا کہنے کا جواز مختص ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں کافروں کی مذمت کی ہے جیسے عاد، ثمود اور اسی قبیل کے دوسرے لوگ۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث کے الفاظ "وہ بھیجے ہوئے اعمال تک پہنچ گئے" میں وجہ دونوں فریقین کے لئے عام ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں برا بھلا کہنے اور ان کی غیبت کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ رہا اللہ تعالیٰ کا گزشتہ گمراہ امتوں کا ذکر کرنا تو اس سے مقصود ان کی مذمت نہیں بلکہ ایسے افعال سے امت کو ڈرانا ہے جو اس کے کرنے والے کو وبال کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور ان حرام کاموں کا بیان ہے جو وہ کرتے رہے۔ اور فاجر آدمی کی کسی غرض کے تحت بری خصلتوں کا ذکر کرنا جائز ہے اور یہ اس "سب" میں شامل نہیں جس سے منع کیا گیا ہے لہذا اس میں کفار کی کوئی تخصیص نہیں۔ البتہ یہ حدیث بعض مومنوں کے لئے ضرور مخصص ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے جنازہ پر گزرے جس کی لوگ برائی بیان کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کچھ نہیں کہا بلکہ فرمایا: "وجبت" یعنی آگ اس پر واجب ہو گئی۔ پھر فرمایا: "تم لوگ اللہ کے گواہ ہو" اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس کی لوگ برائی بیان کر رہے تھے وہ مومن نہیں تھا کیونکہ حاکم نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی کی مذمت میں روایت کیا کہ "وہ بہت برا آدمی تھا، فحش گالیاں بکا کرتا تھا" اور یہ تو واضح ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ پھر جب وہ ہو ہی کافر تو اس کے کفر کے علاوہ باقی باتوں کی کیوں نہ مذمت کی جائے۔ اور قرطبی نے اپنے ایک قریبی کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان لوگوں کو کچھ نہ کہنے میں یہ احتمال ہے کہ وہ علی الاعلان برے کام کرتا ہو کہ وہ کسی فاسق کی غیبت کے باب میں نہ آئے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ برا بھلا کہنے کی ممانعت دفن کے بعد ہو۔ میں کہتا ہوں کہ مناسب یہی ہے کہ وہ اپنے کئے ہوئے اعمال کو پہنچ گئے۔ کیونکہ حقیقی رسائی دفن کے بعد ہی ہوتی ہے۔

(۲) یعنی مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت میں عائشہ کی حدیث کی طرح۔

(۳) یہ "وہ اپنے کئے ہوئے اعمال کو پہنچ گئے" کے عوض کہا۔

ابن رشید نے کہا کہ جب کسی کافر کو برا بھلا کہنے سے کسی زندہ مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہو تو اسے بھی برا بھلا کہنا حرام ہے اور جب کسی کو اذیت نہ پہنچے تو جائز ہے۔ رہا مسلم تو اسے برا بھلا کہنا حرام ہے الا یہ کہ کوئی مجبوری اس کا تقاضا کرتی ہو جیسے اس میں میت کی کوئی مصلحت ہو جب کہ اس کی کسی زیادتی سے نجات کا ارادہ کیا جائے۔ ایسی صورت میں اسے برا بھلا کہنا اچھا ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جو زندہ آدمیوں کی جماعت کے لئے کئی وجوہ کی بناء پر غیبت کے جواز میں مستثنیٰ کی گئی ہے۔

تنبیہ: احمد کی روایت کے مطابق قبر پر بیٹھنے سے میت کو تکلیف ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے عمرو بن حزم انصاری کی حدیث صحیح سند کے ساتھ روایت کی کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک قبر سے تکیہ لگائے ہوئے دیکھا تو فرمایا: صاحب قبر کو تکلیف نہ دو " اور مسلم نے ابو ہریرہ کی حدیث روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی شخص کا ایک آگ کے انگارے پر بیٹھنا جس سے اس کے کپڑے جل جائیں اور وہ جلد تک منتقل ہو جائے، قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے" اور مسلم نے ابو مرثد سے مرفوعا" روایت کیا کہ: قبروں پر نہ بیٹھو اور نہ ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔ اور نہی کا تحریم کے لئے ہونا ظاہر ہے" اور مصنف نے نووی سے نقل کرتے ہوئے کہا۔ جمہور قبر پر بیٹھنے کے مکروہ ہونے کے قائل ہیں اور مالک نے کہا کہ بیٹھنے سے مراد حدث

---

(۱) یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کے قول

وان لیس للانسان الا ماسعی اور من تزکی فانما یتزکی لنفسہ سے کچھ تصادم نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل شرح میں دیکھئے۔ یہ مسئلہ نصوص اور اعتماد کے قابل ہے (صحیح) اور یہ احادیث ان آیات سے معارضہ کی قوت نہیں رکھتیں۔ بالخصوص اس صورت میں کہ ان میں کلام ہوا ہے خاص کر یاسین والی حدیث کہ اس کی عدم صحت کے متعلق پہلے قول گزر چکا ہے اور علماء ان کی کئی تاویلیں کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(پیشاب، پاخانہ کے لئے بیٹھنا) ہے اور یہ تاویل کمزور اور باطل ہے اور مالک کے قول ہی کی طرح ابو حنیفہ کا قول ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ دلیل قبر پر بیٹھنے اور اس پر چلنے کی تحریم کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ آپ نے فرمایا: قبر والے کو تکلیف نہ دو" اس میں کسی مومن کی مدفون میت کو تکلیف دینے کی ممانعت ہے۔ اور مومن کو تکلیف پہنچانا قرآن کی نص کے مطابق حرام ہے۔ جیسے فرمایا:

والذین یوء ذون المؤمنین والمومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا (۵۸:۳۳) جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو ان کے کسی قصور کے بغیر دکھ پہنچاتے ہیں تو انہوں نے بہتان اور بہت بڑے گناہ کا بار اٹھا لیا)

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتاب الزکوۃ

زکوۃ کا لغوی معنی بڑھنا (پھلنا پھولنا) بھی ہے اور پاکیزگی حاصل کرنا بھی اور اس لفظ کا اطلاق فرضی اور مستحب صدقہ اور خرچ کرنے اور معاف کرنے اور حق سب پر ہوتا ہے۔ اور یہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے' اس پر امت کا اجماع ہے اور یہی کچھ دین کی بنیادی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اس بات میں اختلاف ہے کہ زکوۃ کون سے سال فرض ہوئی۔ اکثر یہی کہتے ہیں کہ یہ ۲ ھ میں رمضان سے پہلے فرض ہوئی۔ یہ کب فرض ہوئی اس کی وضاحت اس باب میں آ رہی ہے۔

٥٦٠- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ بعث معاذاً رضي الله تعالى عنه إلى اليمن، فذكر الحديث، وفيه: أن الله قد افترض عليهم صدقة في أموالهم، تؤخذ من أغنيائهم، فترد على فقرائهم. متفق عليه، واللفظ للبخاري.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ (بن جبل) کو یمن کی طرف (گورنر بنا کر) بھیجا اور ساری حدیث ذکر کی اور اس میں یہ بھی ہے کہ اللہ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے اغنیاء سے وصول کی جائے اور فقراء کو دی جائے گی۔ متفق علیہ۔ اور یہ لفظ بخاری کے ہیں (ا)۔

(ا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کی طرف ۱۰ھ میں حجتہ الوداع سے پہلے بھیجا تھا جیسا کہ بخاری نے کتاب المغازی کے آخر میں ذکر کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ ۹ھ کے آخر میں بھیجا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تھا اور بعض کہتے ہیں کہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد بھیجا تھا۔ حضرت معاذ وہاں ابوبکر کی خلافت تک بحال رہے۔ اور جو حدیث بخاری میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ کو یمن کی طرف بھیجا تو اسے فرمایا: تم اہل کتاب لوگوں کے پاس جا رہے ہو لہٰذا سب سے پہلے انہیں اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دینا۔ پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیں تو انہیں بتلانا کہ اللہ نے ان پر ایک دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پھر جب وہ نمازیں ادا کرنے لگیں تو انہیں بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال میں ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے اغنیاء سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کو دی جائے گی۔ پھر جب وہ تمہاری یہ بات تسلیم کر لیں تو ان سے زکوۃ وصول کرو اور لوگوں کے عمدہ عمدہ مال سے بچنا"

اور تؤخذ من اموالھم سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ امام ہی وہ شخص ہے جو زکوۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم کا ذمہ دار ہوتا ہے خواہ وہ خود یہ کام کرے یا اس کا کوئی نائب کرے۔ اور حدیث کے لفظ تؤخذ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استدلال کیا گیا ہے کہ جو شخص زکوۃ نہ دے اس سے جبرا" وصول کی جائے گی۔ اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت فرمائی کہ آپ اپنے محصل بھیجا کرتے تھے۔

اور حدیث کے الفاظ " ان کے فقراء کو دی جائے " سے استدلال کیا گیا ہے کہ ایک ہی قسم (فقراء) میں زکوۃ تقسیم کر دینا کافی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ فقراء کا بالخصوص اس لئے ذکر کیا کہ زیادہ تر یہی لوگ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں اور شاید فقیر سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو زکوۃ دینا جائز ہے۔ پھر ان میں مسکین بھی شامل ہو جاتے ہیں کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مسکین فقیر سے بہتر حالت میں ہوتا ہے اور کچھ اس کے برعکس کہتے ہیں۔ گویا معاملہ واضع ہے۔

٥٦١- وعن أنس رضي الله تعالى عنه، أن أبا بكر الصديق رضي الله تعالى عنه كتب له: هذه فريضة الصدقة، التي فرضها رسول الله ﷺ على المسلمين، والتي أمر الله بها رسوله: «في كل أربع وعشرين من الإبل فما دونها الغنم: في كل خمس شاة، فإذا بلغت خمساً وعشرين، إلى خمس وثلاثين، ففيها بنت مخاض أنثى، فإن لم تكن فابن لبون ذكر. فإذا بلغت ستاً وثلاثين، إلى خمس وأربعين، ففيها بنت لبون أنثى. فإذا بلغت ستاً وأربعين، إلى ستين، ففيها حقة طروقة الجمل. فإذا بلغت واحدة وستين، إلى خمس وسبعين، ففيها جذعة. فإذا بلغت ستاً وسبعين، إلى تسعين، ففيها بنتا لبون. فإذا بلغت إحدى وتسعين، إلى عشرين ومائة، ففيها حقتان طروقتا الجمل. فإذا زادت على عشرين ومائة، ففي كل أربعين بنت لبون، وفي كل خمسين حقة. ومن لم يكن معه إلا أربع من الإبل، فليس فيها صدقة، إلا أن يشاء ربها. وفي صدقة الغنم، في سائمتها: إذا كانت أربعين، إلى عشرين ومائة شاة، شاة. فإذا زادت على عشرين ومائة إلى مائتين، ففيها شاتان. فإذا زادت على مائتين، إلى ثلاث مائة، ففيها ثلاث شياه. فإذا زادت على ثلاثة مائة، ففي كل مائة، شاة. فإذا كانت سائمة الرجل ناقصة من أربعين شاة، شاة واحدة، فليس فيها صدقة، إلا أن يشاء ربها، ولا يجمع بين متفرق، ولا يفرق بين مجتمع، خشية الصدقة. وما كان من خليطين، فإنهما يتراجعان بينهما بالسوية. ولا يخرج في الصدقة هرمة، ولا ذات عوار، ولا تيس، إلا أن يشاء المصدق. وفي الرقة: في مائتي

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درهم، ربع العشر، فإن لم تكن إلا تسعين ومائة، فليس فيها صدقة، إلا أن يشاء ربها. ومن بلغت عنده من الإبل صدقة الجذعة، وليست عنده جذعة، وعنده حقة، فإنها تقبل منه الحقة، ويجعل معها شاتين إن استيسرتا له، أو عشرين درهماً. ومن بلغت عنده صدقة الحقة، وليست عنده الحقة، وعنده الجذعة. فإنها تقبل منه الجذعة، ويعطيه المصدق عشرين درهماً، أو شاتين. رواه البخاري.

انس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ تحریر (۱) لکھ دی کہ یہ فرض (۲) زکوۃ کی تفصیل ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر (۳) فرض کیا جس کا اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے۔ کہ چوبیس یا ان سے کم اونٹوں کی زکوۃ بکریوں میں ہوگی۔ ہر پانچ اونٹوں کی زکوۃ ایک بکری (۴) ہے۔ پھر جب اونٹوں کی تعداد پچیس سے لے کر پینتیس تک پہنچ جائے تو ان میں زکوۃ بنت مخاض (۵) (ایک سالہ اونٹنی) ہے اور اگر بنت مخاض نہ ہو تو ابن لبون(۶) (دو سالہ نر بچہ) ہو گا اور جب تعداد ۳۶ سے ۴۵ تک ہو تو ان کی زکوۃ بنت لبون (دو سالہ بوتی) ہے اور جب یہ تعداد ۴۶ سے ۶۰ تک ہو تو اس میں زکوہ ایک حقہ (۷) (تین سالہ جوان اونٹنی) ہے جو اونٹ کی جفتی کے قابل ہو پھر جب یہ تعداد ۶۱ سے ۷۵ تک پہنچ جائے تو اس میں زکوہ ایک جزعۃ (۸) (چار سالہ اونٹ) ہے اور جب ۷۶ سے ۹۰ تک ہو تو اس میں دو بنت لبون (دو سال کی دو بوتیاں) زکوۃ ہے اور جب یہ تعداد ۹۱ سے ایک سو بیس تک پہنچ جائے تو اس کی زکوۃ دو حقہ ہیں جو نر سے جفتی کے قابل ہوں پھر اگر ۱۲۰ سے زیادہ (۹) ہوں تو ہر چالیس اونٹوں میں ایک بنت لبون (دو سالہ بوتی) اور ہر پچاس میں ایک حقہ زکوۃ ہے اور جس کے پاس صرف چار اونٹ ہوں اس پر کوئی زکوۃ نہیں الا یہ کہ ان کا (۱۰) مالک اپنی خوشی سے کچھ دے دے۔ اور چرنے والی (۱۱) بکریوں میں زکوۃ اس طرح ہے کہ جب چالیس سے لے کر ۱۲۰ تک بکریاں (۱۲) ہوں تو ان میں ایک بکری زکوۃ ہے اور جب ۱۲۰ سے زیادہ ۲۰۰ تک پہنچ جائیں تو ان میں دو بکریاں ہیں اور جب ۲۰۰ سے بڑھ کر ۳۰۰ تک پہنچ جائیں تو ان میں تین بکریاں زکوۃ ہو گی اور جب تین سو سے بڑھ جائیں تو ہر سو میں ایک بکری زکوۃ(۱۳) ہے۔ پھر اگر کسی شخص کے پاس چرنے والی بکریوں میں چالیس سے ایک بھی کم بکری ہو تو اس پر کوئی زکوۃ نہیں الا یہ کہ اس کا مالک کچھ دے دینا چاہے۔

اور زکوۃ ادا کرنے کے خوف سے نہ تو متفرق بکریوں کو اکٹھا کیا جائے اور نہ اکٹھے ریوڑ کو جدا (۱۴) کیا جائے اور جو ریوڑ دو شریک کارکنوں کا ہو (۱۵) وہ زکوۃ میں برابر (۱۶) کے حصہ دار ہوں گے اور زکوۃ میں کوئی بوڑھی (۱۷) یا کانی (۱۸) بکری قبول نہیں کی جائے گی اور نہ سانڈ بکرا لیا جائے گا الا یہ کہ زکوۃ (۱۹) لینے والا اس کی ضرورت محسوس کرے۔ اور چاندی (۲۰) میں زکوۃ یوں ہے کہ دو سو درہم میں چالیسواں (۲۱) حصہ ہے اور اگر دو سو سے ایک بھی کم یعنی ۱۹۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درہم ہوں تو ان میں زکوۃ نہیں الا یہ کہ ان کا مالک کچھ دینا چاہے (۲۲) - اور کسی کے اونٹوں کی زکوۃ ایک جذعہ (۲۳) (چار سالہ اونٹ) بنتی ہو اور اس کے پاس جذعہ نہ ہو بلکہ حقہ ہو تو اس سے ایک حقہ اور دو بکریاں اگر اسے میسر آئیں، لی جائیں گی ورنہ حقہ اور بیس(۲۴) درہم لئے جائیں گے - اور جس کی زکوۃ حقہ ہو اور اس کے پاس حقہ نہ ہو بلکہ جذعہ ہو تو وہ اس سے (۲۵) قبول کیا جائے گا - اور زکوۃ وصول کرنے والا اسے بیس درہم یا دو بکریاں (۲۶) دے دے گا - اسے بخاری نے روایت کیا (۲۷) -

(۱) جب حضرت انس کو بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا -

(۲) اصل عبارت میں الفاظ ہیں ھذہ فریضہ الصدقہ یعنی فریضہ صدقہ کا نسخہ - مضاف معلوم ہونے کی وجہ سے حذف ہے اس حدیث میں زکوۃ کے لئے صدقہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ بعض لوگ اس کے قائل نہیں - جاننا چاہئے کہ بخاری میں اس تحریر کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن بھی ہے -

(۳) یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے اور فرضھا سے مراد اس کی مقادیر ہیں کیونکہ ان کا وجوب نص قرآنی سے ثابت ہے جیسا کہ والتی امر اللہ بھا رسولہ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں یعنی اللہ تعالی نے یہ حکم دیا کہ کس نوع یا کس جنس سے کتنی زکوۃ نکالی جائے گی -

(۴) احمد اور مالک اسی کے قائل ہیں کہ اگر اونٹ زکوۃ میں دے گا تو کفایت نہیں کرے گا اور جمہور کہتے ہیں کہ کرسکتا ہے - وہ کہتے ہیں کہ اصل یہی چیز ہے زکوۃ مال کی جنس سے واجب ہے اور یہ تو مالک سے نرمی کا سلوک ہے کہ اس سے بکریوں کی صورت میں کم زکوۃ کا مطالبہ کیا گیا پھر جب اپنے اختیار سے اصل کی طرف لوٹے تو اونٹ کفایت کرتا ہے اور اگر اونٹ کی قیمت چار بکریوں سے کم ہو تو اس میں شافعیہ وغیرہ کا اختلاف ہے - مصنف نے فتح الباری میں کہا قیاس غالب یہی ہے کہ وہ کفایت نہیں کرتا -

(۵) بنت مخاض کے ساتھ انثی کا لفظ صرف تاکید مزید کے لئے آیا ہے یعنی وہ اونٹنی جو ایک سال پورا کر کے دوسرے میں داخل ہوئی ہو - اور اس کے آخر میں ذکر کا نام آیا ہے یعنی خواہ نر ہو یا مادہ کیونکہ اس کی ماں مخاض سے تھی اور مخاض کا معنی حوامل یعنی حمل والیاں ہوں اور اس لفظ مخاض کا واحد نہیں آتا - اور ماخض وہ اونٹنی ہے جو حمل کے قابل ہو چکی ہو اگرچہ اسے حمل نہ ہوا ہو اور فیھا میں ضمیران پچیس اونٹوں کی طرف ہے جن میں بنت مخاض واجب ہوتی ہے حتیٰ کہ ان کی تعداد ۳۵ تک ہو جائے اور جمہور اسی کے قائل ہیں اور علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایک مرفوع حدیث کی بنا پر ۲۵ اونٹوں میں ۵ بکریاں واجب سمجھتے ہیں اور یہ حدیث حضرت علی پر موقوف ہے لیکن جو مرفوع حدیث ہے وہ ضعیف ہے اور موقوف حجت نہیں ہوتی اسی لئے جمہور اس کے قائل نہیں -

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۶) ابن لبون ۔ اونٹ کا وہ بچہ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے میں داخل ہو چکا ہو تیسرا سال پورا کرنے تک وہ ابن لبون ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی ماں لبن (دودھ) والی تھی یہاں ذکر کا لفظ تاکید مزید کے لئے آیا اور بنت لبون مادہ کے لئے آتا ہے۔

(۷) حقہ ۔ وہ اونٹنی جو تین سال مکمل کر کے چوتھے سال میں داخل ہو چکی ہو اور چوتھا سال پورا ہونے تک وہ حقہ ہے اور ایسے نر کے لئے حق کا لفظ آتا ہے اس کی وجہ تسمیہ ہے کہ اس عمر میں اونٹنی اس قابل ہوتی ہے کہ اس سے نر جفتی کرے اور وہ حاملہ ہو ۔ اسی بات کی وضاحت کے لئے ساتھ طروقۃ الجمل کا لفظ آیا ہے۔

(۸) جذعۃ ۔ جو چار سال پورے کر کے پانچویں میں داخل ہو چکا ہو۔

(۹) یعنی ایک بھی زیادہ ہو جائے جیسا کہ جمہور کا قول ہے اور اس پر عمر رضی اللہ عنہ کی تحریر بھی دلالت کرتی ہے کہ "جب ایک سو اکیس ہو جائیں" تو ان میں تین بنت لبون ہیں ۱۲۹ تک اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ اس پر جو تعداد زیادہ ہو تو ان کی زکوۃ اونٹوں میں ہو گی اور جب یہ تعداد ۱۳۰ ہو جائے تو اس میں دو بنت لبون اور ایک حقہ واجب ہوں گے اور جب ۱۴۰ ہو جائے تو اس میں دو بنت لبون اور ایک حقہ واجب ہوں گے اور جب ۱۴۰ ہو جائیں تو دو بنت لبون اور دو حقہ۔ اور ابو حنیفہ سے یہ مروی ہے کہ جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو آگے زکوۃ بکریوں کی طرف لوٹ آئے گی ۔ یعنی ۱۲۵ میں تین بنت لبون اور ایک بکری۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث میں تو حکم صرف ہر چالیس اور پچاس کا ہے جبکہ تعداد ۱۲۱ ہو جائے تو ہر چالیس میں ایک بنت لبون کے حساب سے تین بنت لبون بنتی ہیں اور اس میں پانچ اور بیس وغیرہ میں حکم کی کچھ وضاحت نہیں لہٰذا ابو حنیفہ کا قول محتمل ہے ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وقص (یعنی وہ فرض مقداروں کے درمیان کی تعداد جیسے پانچ سے اوپر نو تک (نہایہ) ہو حتیٰ کہ ان کی تعداد ۱۳۰ ہو جائے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں واللہ اعلم۔

(۱۰) یعنی بطور نفلی صدقہ ورنہ اس پر کچھ بھی واجب نہیں ۔ اور یہ استثناء منقطع ہے جو فلیس فیھا صدقۃ کی تائید مزید کے طور پر آیا ہے اور اس حدیث جلیلہ میں اونٹوں کی زکوۃ کا تفصیلی ذکر آگیا ہے اس کا ظاہر تو یہی ہے کہ جن چیزوں کا نام آیا ہے زکوۃ میں بعینہ وہی دی جائیں تاہم اگر وہ نہ مل سکیں تو ان کے عوض کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

(۱۱) سائمہ ۔ وہ بکریاں جنہیں خود چارہ نہ ڈالنا پڑے بلکہ چر چگ کر پیٹ بھر لیں ۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بکریوں کی زکوۃ تب ہی واجب ہے جب وہ چرنے والی ہوں اور یہی جمہور کا قول ہے اور مالک اور ربیعہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی شرط نہیں اور داؤد نے کہا کہ اس حدیث کی رو سے بکریوں کی زکوۃ میں یہ شرط ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم کہتے ہیں کہ اونٹوں سے متعلق بہز بن حکیم کی حدیث کو ابو داؤد اور نسائی نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے " ہر چرنے والے اونٹ میں " اور یہ حدیث بھی آ رہی ہے۔ البتہ گائے بیل سے متعلق چرنے کا ذکر نہیں آیا۔ تاہم علماء نے انہیں بھی اونٹوں اور بکریوں پر قیاس کیا ہے۔

(۱۲) اصل عبارت میں شاۃ کا لفظ آیا ہے جو نر اور مادہ چھترے اور بکرے سب کے لئے عام ہے۔

(۱۳) اس کا ظاہر یہی ہے کہ جب تک چار سو پوری نہ ہوں چوتھی بکری واجب نہ ہو گی اور یہی جمہور کا قول ہے اور احمد اور بعض کوفیوں کی روایت میں ہے کہ تین سو سے ایک بکری بھی بڑھ جائے تو چار بکریاں واجب ہوں گی

(۱۴) الگ الگ و اکٹھا کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تین آدمیوں میں سے ہر ایک کے پاس چالیس چالیس بکریاں ہیں تو ان میں سے ہر ایک بکری کی زکوۃ واجب ہے پھر جب محصل ان کے پاس جاتا ہے تو وہ تینوں اپنا ریوڑ اکٹھا کر لیتے ہیں تاکہ انہیں (۱۲۰ بکریوں پر) ایک ہی بکری زکوۃ دینا پڑے۔ اس بات سے منع کر دیا گیا۔ اور اکٹھے ریوڑ کو الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو شریکوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک سو ایک بکریاں ہیں جن پر تین بکریاں زکوۃ واجب ہے اور جب محصل ان کے پاس جاتا ہے تو وہ اپنی اپنی بکریاں الگ کر لیتے ہیں اس طرح ان پر ایک ایک بکری واجب ہے۔ اس بات سے منع کر دیا گیا۔ ابن الاثیر کہتے ہیں کہ میں نے اس بارے میں یہی سنا ہے اور خطابی کہتے ہیں کہ شافعی نے کہا کہ اس حدیث میں محصل اور ریوڑ کے مالک دونوں کو خطاب ہے اور ڈر بھی دونوں کا ڈر ہے محصل کو ڈر یہ ہے کہ اسے زکوۃ کم وصول ہو گی اور مالک کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ اس کا مال کم ہو جائے گا۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک کو یہ حکم دیا کہ وہ زکوۃ کے ڈر سے اکٹھے اور الگ الگ مال میں کوئی نئی کارروائی نہ کریں۔

(۱۵) دو شریکوں کے درمیان تراجع یا حصہ رسدی یوں ہے کہ مثلاً ایک کے پاس چالیس گائے ہیں اور دوسرے کے پاس تیس اور ان کا مال اکٹھا ہے تو زکوۃ وصول کرنے والا چالیس میں سے مسنہ اور تیس میں سے تبیعہ زکوۃ لے گا تو مسنہ دینے والے اپنے شریک کو ۷ / ۴ لوٹا دے کیونکہ ان میں سے ہر ایک پر حصہ رسدی واجب ہے گویا مال ایک ہی شخص کی ملکیت ہے۔

(۱۶) یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اگر محصل کسی ایک پر زیادتی کرے تو اصل زکوۃ سے زائد اس سے وصول کیا جائے گا اور وہ اس کے شریک کو واپس نہیں کیا جائے گا اور اسے صرف اتنی ہی رقم دینا ہو گی جو زیادتی کو چھوڑ کر اس کے ذمہ واجب ہے شرح میں ایسا ہی ہے اور اگر مثلاً یوں کہا جائے کہ دونوں شریک حق میں اور ظلم میں برابر کے شریک ہوں گے تو اس حدیث سے ایسا معلوم نہیں ہوتا اور یہ اس حدیث سے بعید ہے۔

(۱۷) اصل میں لفظ ھرمہ ہے یعنی اتنی بوڑھی جس کے دانت گر چکے ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱۸) اس میں ولا ذات عوار کے لفظ ہیں یعنی آنکھ سے کانی اور یہ مرض میں داخل ہے اور بہتر یہ ہے کہ عوراء کے ع پر فتحہ ہو تاکہ اس میں عیب دار بھی شامل ہو جائے۔ جیسا کہ ابو داؤد کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ ھرمہ (بوڑھی) دی جائے نہ خارش زدہ اور نہ ناقص قسم کی دی جائے' وہ تمہارا درمیانہ درجہ کا مال ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ تو تم سے اچھا مال مانگتا ہے اور نہ برا۔ اس حدیث میں درنقہ سے مراد ایسی بکری ہے جو میل کچیل اور غلاظت کی وجہ سے خارش زدہ ہو اور شرطاء اللئیمہ سے مراد رذیل قسم کا مال ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا شریر قسم کا ہو (النہایۃ ابن الاثیر۔

(۱۹) اصل عبارت میں لفظ مصدق آیا ہے اس لفظ کے اعراب میں اختلاف ہے اکثریہ کہتے ہیں کہ ص مشدد ہے۔ یہ اصل میں متصدق ہے' تاص سے بدل کر اس میں مدغم ہو گئی اور اس سے مراد مالک ہے اور استثناء تیس (سانڈ' نر) کی طرف راجع ہے اور یہ اس صورت میں جب کہ وہ بکرا ان میں شمار نہ ہوتا ہو جن سے جفتی کرائی جاتی ہے گویا مالک اس معاملہ میں صاحب اختیار ہے اور مالک کو چاہئے کہ اچھا مال زکوۃ میں دے اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ سب کی طرف پھرتا ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مالک کو یہ حق ہے کہ زکوۃ میں بوڑھی یا کانی بکری دے جب کہ کہ وہ موٹی تازی ہو اور اس کی قیمت اوسط درجہ کے مال سے زیادہ ہو۔ اور اس بارے میں فروع میں جانے والوں میں اختلاف ہے اور بعض یہ کہتے ہین کہ مصدق کا ص مشدد نہیں اور اس سے مراد محصل یا زکوۃ وصول کرنے والا ہے گویا یہ اس بات پر دلیل ہے کہ محصل کو خود سوچنا چاہئے کہ فقراء کے حق میں کونسی چیز بہتر ہے گویا وہ وکیل کی طرح ہے لہذا اس کی مرضی پر مصلحت کی قید لگائی گئی۔ تو اس صورت میں یہ استثناء سب کی طرف لوٹتا ہے اور یہ اس صورت میں ہے جب کہ بکریاں مختلف قسم کی ہوں اور اگر سب ہی عیب دار ہوں یا سانڈ ہوں اور انہی میں ایک بطور زکوۃ ادا کرنا کفایت کر جائے گا۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اس کے عوض ایک بکری خرید کر دے تاکہ حدیث کے ظاہر پر عمل ہو جائے۔ یہ تو بکریوں کی زکوۃ کا ذکر ہے اور اونٹوں کی زکوۃ کا ذکر گذر چکا اور گائے کی زکوۃ کا ذکر آگے آ رہا ہے رہا چاندی کا تو یہ آگے مذکور ہے۔

(۲۰) اصل میں لفظ (رقہ) آیا ہے' جس کا معنی خالص چاندی ہے۔

(۲۱) یعنی چاندی سے چالیسواں حصہ زکوۃ نکالنا واجب ہے اور سونے کے متعلق حکم آگے آ رہا ہے۔

(۲۲) ایک سو نوے سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک سو نوے سے زائد ہوں مگر ۲۰۰ پورے نہ ہوں تو بھی ان میں زکوۃ ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ بلکہ یہ صرف سو سے پہلے آخری دہائی کا ذکر ہوا ہے اور حساب جب اکائیوں سے زائد ہو تو اس کی ترکیب عقود جیسے دہائیاں' سینکڑے اور ہزاروں سے ہوتی ہے۔ اسی لئے نوے کا ذکر کیا گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر اس کے بعد اونٹوں کی زکوۃ کے احکام میں سے ایک حکم ذکر کیا گیا جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

(۲۳) اونٹوں کی جتنی تعداد میں جذعہ واجب ہوتا ہے وہ اس حدیث کے آغاز میں آپ کو معلوم ہو چکا۔

(۲۴) اور یہ بیس درہم بکریوں کا عوض اس کی قیمت ہے۔ اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ یہ وہ مقدار ہے جو حقہ اور جذعۃ کی قیمت کے تفاوت میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

(۲۵) حالانکہ یہ اس مال سے زائد ہے جو اس پر واجب ہے اور اسے ایسی چیز کی تکلیف نہیں دی جائے گی جو اس کے پاس موجود نہیں۔

(۲۶) یعنی محصل نے جو زائد قیمت کا مال لیا ہے اس کے عوض وہ بکریاں یا بیس درہم مالک کو ادا کرے۔

(۲۷) عمر میں سالوں کے تفاوت کی بنا پر قیمت کی مقدار میں اختلاف کیا گیا ہے شافعی کا مذہب یہی ہے کہ ہر ایک سال کے فرق پر قیمت میں تفاوت کی مقدار وہی ہو گی جو حدیث میں مذکور ہے اور ہادویہ کا مذہب یہ ہے کہ واجب صرف یہ بات ہے کہ زائد قیمت مال کے مالک سے وصولی کی جائے گی ' اور محصل سے واپس لی جائے۔ لیکن اس کی مقدار کا تعین ہر دور کے مطابق ہو گا ان کی دلیل یہ ہے کہ اس حدیث میں دس درہم کے مقابلہ میں ایک بکری ہے۔ اور یہ اندازہ زمان و مکان کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے لہٰذا تقویم کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔ چنانچہ بخاری نے بھی اس طرف اشارہ کر دیا ہے وہ زکوۃ میں سامان لینے کے بارے میں ابو بکرؓ سے ایک حدیث لائے ہیں اور اس میں اہل یمن کے لئے حضرت معاذؓ کا قول ذکر کیا ہے کہ " زکوۃ میں جو اور دانوں کے بدلے میرے پاس اپنے کپڑے ' جبے اور پوشاکیں لے آؤ۔ اس میں تمہارے لئے آسانی ہے اور مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے لئے بہتری ہے " اور زکوۃ کے عوض کا ذکر بھی آگے آ رہا ہے۔

۵۶۲- وعن معاذ بن جبل رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ بعثه إلى اليمن، فأمره أن يأخذ من كل ثلاثين بقرة تبيعاً أو تبيعة، ومن كل أربعين مسنة، ومن كل حالم ديناراً، أو عدله معافرياً. رواه الخمسة، واللفظ لأحمد، وحسنه الترمذي، وأشار إلى اختلاف في وصله، وصححه ابن حبان والحاكم.

معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کی طرف (گورنر بنا کر) بھیجا اور حکم دیا کہ ہر تیس گائیوں میں ایک سالہ بچھڑی (۱) یا بچھڑا وصول کیا جائے اور ہر چالیس میں دو سالہ بچھڑی یا بچھڑا لیا جائے اور جوان (۲) آدمی سے جزیہ میں ایک دینار یا اس کی قیمت کے برابر معافری (۳) کپڑے لئے جائیں اسے پانچوں نے روایت کیا اور یہ لفظ احمد کے ہیں اور ترمذی نے اسے حسن کہا اور اس کے موصول ہونے میں اختلاف کی (۴) طرف اشارہ کیا اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح (۵) کہا۔

(۱) یعنی ان میں کوئی بھی لینے کا اختیار ہے اور تبیع ایک سالہ بچھڑے کو کہتے ہیں خواہ نر ہو یا مادہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) اصل میں حالم کا لفظ آیا ہے جو محتلم کے معنوں میں ہے اور ابوداؤد نے محتلم کے لفظ سے ہی روایت کیا ہے - اور اس سے مراد غیر مسلموں سے جزیہ لینا ہے -

(۳) معافر' مساجد کے وزن پر ہے اور یہ یمن کا ایک قبیلہ ہے اسی کی طرف نسبت سے وہاں کے کپڑے معافری کہلاتے ہیں -

(۴) روایت کرنے کے بعد ترمذی کے الفاظ یہ ہین "بعض لوگوں نے اس حدیث کو اعمش سے 'ابو وائل سے ' مسروق سے روایت کیا ہے کہ : صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن کی طرف بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ وصول کرے"ترمذی نے کہا کہ یہی صحیح تر ہے یعنی اس روایت سے جسے مسروق سے،معاذ سے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے -

(۵) ترمذی نے مرسل روایت کو صرف اس لئے ترجیح دی ہے کہ اس میں اتصال ہے جب مسروق والی روایت پر اعتراض یہ ہے کہ اس نے معاذ سے ملاقات نہیں کی - اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے - کہ مسروق ہمدانی النسب ہے اور ان یمانی لوگوں سے ہے جو وہاں سے چلے آئے تھے اور ایام معاذ میں وہ یمن میں ہی تھا للذا ان میں ملاقات ممکن ہے - گویا جمہور کی رائے کے مطابق یہ روایت موصول کے حکم میں ہے - میں کہتا ہوں کہ جو رائے ترمذی کی ہے وہی بخاری کی ہے کہ ملاقات کا ثبوت لازمی چیز ہے -

اور یہ حدیث گائے بیل میں زکوۃ کے وجوب پر دلیل ہے اور اس کا نصاب وہی ہے جو ذکر ہوا - اور یہ دونوں باتوں میں مجمع علیہ ہے ابن عبدالبر نے کہا کہ اس بات میں علماء کے درمیان اختلاف نہیں کہ گائے بیل کی زکوۃ میں سنت وہی ہے جو معاذ کی حدیث میں مذکور ہے اور اس میں مذکورہ نصاب مجمع علیہ ہے - اور اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ اگر تیس سے کم گائیں ہوں تو ان میں کچھ زکوۃ نہیں ہے - اور اس میں زہری کو اختلاف ہے اس نے اونٹ کی زکوۃ پر قیاس کرتے ہوئے کہا کہ ہر پانچ گائے میں ایک بکری واجب ہو گی - اور اس کا جمہور نے یہ جواب دیا کہ نصاب قیاس سے ثابت نہیں ہو سکتا اور اس لئے بھی کہ ایک روایت یوں بھی ہے کہ " اگر تیس سے کم گائے ہوں تو ان میں کچھ واجب نہیں " اس روایت کی اگرچہ سند مجہول ہے تاہم یہ معاذ کی حدیث کے مفہوم کی تائید کرتی ہے -

۵۶۳- وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده قال: قال رسول الله ﷺ: «تؤخذ صدقات المسلمين على مياههم». رواه أحمد. ولأبي داود: ولا تؤخذ صدقاتهم إلا في دورهم.

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے ' دادا سے (رضی اللہ عنہما) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمایا: مسلمانوں سے زکوۃ ان کے پانی پلانے کی جگہ پر لی جائے ۔ اسے احمد نے روایت کیا(۱) ۔ اور ابو داؤد نے بھی اسے یوں روایت کیا: مسلمانوں سے زکوۃ موقع پر پہنچ کر وصول (۲) کی جائے ۔

(۱) عمرو بن شعیب کی حدیث کو

(۲) نیز نسائی اور ابو داؤد میں عمرو کی حدیث کے یہ الفاظ بھی ہیں " نہ ریوڑ اپنے پاس بلایا جائے اور نہ ایک طرف کیا جائے ۔ اور نہ زکوۃ ان کے مقامات پر پہنچ کر ہی وصول کی جائے " یعنی مویشیوں کو ہانک کر محصل کے پاس نہ لایا جائے بلکہ محصل کو ہی مالک کے پاس پہنچنا چاہئے اور اس حدیث میں لفظ لا جنب کا معنی یہ ہے کہ محصل صدقہ دینے والوں کے مقامات سے کسی دور جگہ پر بیٹھا رہے تو اس سے منع کیا گیا اور اس کی دوسری تفسیر بھی کی گئی ہے جو اسے اس باب سے خارج کر دیتی ہے ۔

اور یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ محصل کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مال کے مالک کے پاس خود جائے اور زکوۃ وصول کرے اور احمد کے الفاظ مویشیوں کی زکوۃ سے خاص ہیں اور ابو داؤد کے الفاظ ہر قسم کی زکوۃ کے لئے عام ہیں ۔

نیز ابو داؤد نے جابر بن عتیک سے مرفوعاً روایت کیا کہ " عنقریب تمہارے پاس (زکوۃ وصول کرنے کے لئے) سوار آئیں گے جو تمہیں ناگوار محسوس ہوں گے جب وہ آئیں تو تم انہیں مرحبا کہو ۔ اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں انہیں کرنے دو ۔ اگر وہ انصاف کریں گے تو اپنے ہی لئے کریں گے اور اگر زیادتی کریں گے تو اس کا بار انہیں پر ہے ۔ مگر تم انہیں راضی رکھو کیونکہ تمہاری زکوۃ کی تکمیل ان کی رضا میں ہے " یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ زکوۃ وصول کرنے والے خود مال والوں کے ہاں جاتے تھے اور مال والوں کو حکم تھا کہ وہ محصل کو راضی رکھیں خواہ وہ ان سے زیادتی کریں ۔

اور احمد میں انس کی حدیث یوں ہے کہ " بنی تمیم کا ایک شخص آیا اور کہنے لگا " یا رسول اللہ ! اگر میں آپ کے فرستادہ کو زکوۃ ادا کر دوں تو کیا میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہو جاؤں گا ؟ آپ نے فرمایا: اور تیرے لئے اس کا اجر ہے اور بار گناہ اس پر جس نے کوئی تبدیلی کی ۔ "

اور مسلم نے جابر کی حدیث مرفوعاً روایت کی ۔ " اپنے صدقہ وصول کرنے والوں کو خوش رکھو " یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اعرابیوں کے جواب میں فرمائی تھی جنہوں نے کہا تھا کہ ہمارے پاس زکوۃ وصول کرنے والے لوگ آتے ہیں جو ہم پر ظلم کرتے ہیں مگر بخاری میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر کوئی محصل اس سے زیادہ کا مطالبہ کرے جو اس پر واجب ہے تو وہ زکوۃ وصول کرنے والے کو نہ دے اور ان میں تطبیق کی یہ صورت ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہز بن حکیم (۱) اپنے باپ سے ' اپنے دادا سے (۲) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر چالیس (۳) چرنے والے اونٹوں میں ایک دو سالہ بوتی زکوۃ ہے اونٹوں کو اس کے حساب (۴) سے متفرق نہ کیا جائے جس شخص نے ثواب کی نیت سے زکوۃ ادا کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور جس نے نہ دی تو ہم اس سے جبراً" وصول کریں (۵) گے اور کچھ مال بطور جرمانہ بھی لیں گے ۔ کیونکہ زکوۃ ہمارے رب کے حقوق میں سے ایک فرضہ ہے ۔ اس میں سے محمد اور آل محمد کیلئے کوئی چیز بھی حلال نہیں ۔ اسے احمد ' اور نسائی نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا اور شافعی نے اپنے قول کو اس کے ثبوت پر معلق رکھا (۶) ۔

(۱) بہز ابن حکیم بن معاویہ ابن حیدہ القشری ۔ بہز تابعی ہیں اور ان سے استدلال میں اختلاف ہے یحیی بن معین نے کہا کہ اس بیان میں سند صحیح ہے بہز کے بغیر ہی باقی سب ثقہ ہیں ۔ اور ابوحاتم نے کہا وہ ایک شیخ ہے جسکی احادیث لکھی جاتی ہین لیکن وہ ثقہ نہیں ہے اور شافعی نے کہا وہ حجت نہیں اور ذہبی نے کہا کسی عالم نے اسے نہیں (۱) چھوڑا ۔

۵۶۵ ۔ وعن بهز بن حكيم، عن أبيه ، عن جده قال: قال رسول الله ﷺ: «في كل سائمة إبل: في أربعين بنت لبون، لا يفرق إبل عن حسابها، من أعطاها، مؤتجراً بها، فله أجرها، ومن منعها، فإنا آخذوها وشطر ماله، عزمة من عزمات ربنا، لا يحل لآل محمد منها شيء». رواه أحمد وأبو داود والنسائي، وصححه الحاكم، وعلق الشافعي القول به على ثبوته.

کہا ' کسی عالم نے اسے نہیں (۱) چھوڑا ۔

(۲) وہ معاویہ بن حیدہ صحابی ہیں ۔

(۳) پہلے انس کی حدیث میں گذر چکا ہے کہ بنت لبون ۳۶ سے لے کر ۴۵ تک اونٹوں میں واجب ہے اور یہ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ چالیس اونٹوں میں بنت لبون واجب ہے اور عدد کی کمی اور بیشی کو یہاں نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ اس سے صراحت والی حدیث معارض ہے اور وہ انس کی حدیث ہے ۔

(۴) یعنی مالک اپنی ملکیت کو غیر کی ملکیت سے الگ نہ کرے جب کہ دو شریک ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ۔

(۵) اصل میں غرمہ کا لفظ آیا ہے اس پر رفع بھی جائز ہے اگر اس کا مبتدا محذوف مانا جائے ' اور مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور ایسا مصدر فی نفسہ موکد ہوتا ہے ۔ لہ علی الف درھم اعترافا (مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس کا ہزار درہم دینا ہے) اور اس کا ناصب فعل ہے جو جملہ وان اخذوھا پر دلالت کرتا ہے اور غرمہ کا معنی کسی کام میں کوشش کرنا ہے یعنی وصول کرنے میں پوری کوشش کی جائے گی کیونکہ یہ واجب فریضہ ہے ۔

(۶) شافعی نے کہا کہ حدیث کے عالموں کے ہاں یہ حدیث ثابت نہیں ہو سکی اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو ہم اس کے قائل ہیں ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ابن حبان نے کہا کہ بہز اکثر خطا کرتا تھا اور اگر اس کی یہ حدیث نہ ہوتی تو میں اسے ثقات میں شامل کرتا اور وہ ان لوگوں سے ہے جن میں سے ہم اللہ سے بھلائی طلب کرتے ہیں۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص زکوۃ نہ دے امام اس سے جبراً" وصول کر سکتا ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ یہ مجمع علیہ ہے نیز یہ کہ امام کی نیت ہی کافی ہے اور امام اس کی طرف سے زکوۃ ادا بھی کر سکتا ہے جس پر یہ واجب ہے۔ اگرچہ اسے اجر نہیں ملے گا تاہم اس سے وجوب ساقط ہو جائے گا۔

ارر حدیث کا یہ لفظ شطر مالہ اخذوھا میں ضمیر منصوب پر عطف ہے اور شطر سے مراد کچھ حصہ ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ مال لینا زکوۃ نہ نکالنے کی سزا کے طور پر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے یا نسخ کا مدعی نسخ پر کوئی دلیل قائم نہیں کر سکتا بلکہ اس کے نہ ہونے پر دوسری احادیث دلالت کرتی ہیں جس کا مصنف نے شرح میں ذکر کیا ہے رہا مصنف کا یہ قول کہ : بہز کی حدیث میں مالی تاوان کے جواز پر کوئی دلیل نہیں کیونکہ شطر مالہ ش کے ضمہ سے مجہول کا صیغہ ہے یعنی اس کے مال کے دو حصے کئے جائیں۔ اب محصل کو اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے اچھا حصہ زکوۃ میں وصول کرے اور یہ اس کے زکوۃ روکنے کی سزا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نہایہ میں یہ الفاظ ہیں : حربی نے کہا۔ راوی نے روایت کے لفظ میں غلطی کی اور اصل الفاظ شطر مالہ یعنی اس کے مال کے دو حصے کئے جائیں ...... آخر تک جیسے مصنف نے ذکر کیا ہے اور صاحب ضوء النہار بھی اس میں اور اپنے دوسرے رسائل میں اسی طرف میلان رکھتے ہیں اور ہم نے اس کے حواشی میں ذکر کیا ہے کہ اس روایت کی بنا پر بھی مالی سزا کے جواز پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ دو حصوں میں سے اچھا لے لینا ایسی سزا ہے جو واجب پر زیادہ وصول کی جاتی ہے جب کہ واجب درمیانہ درجہ کا مال ہے اور اس میں محصل کو اختیار بھی نہیں۔ پھر میں نے شارح کو دیکھا اس نے ضوء النہار میں اپنی بحث ختم کرنے سے پیشتر اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہم نے کی ہے۔ پھر میں نے طویل مدت بعد نووی کو دیکھا تو اس نے بھی بعینہ وہی کچھ ذکر کیا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے اور اس شخص کا رد کیا ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ اس روایت میں مالی سزا کے جواز پر کوئی دلیل نہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں : جب محصل کو اختیار مل گیا اور اس نے دو حصوں میں سے بہتر لے لیا تو اس نے واجب سے زیادہ لیا اور یہی مالی سزا ہے۔ الا یہ کہ اگر بہز کی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہ اس سزا کے علاوہ اور کسی بات پر دلالت نہیں کرتی اور یہ سزا صرف زکوۃ روکنے والے سے خاص ہے اور کسی سے نہیں۔ اور یہ وصول شدہ حصہ سارے کا سارا ہی زکوۃ ہوگا۔ یعنی جو حکم زکوۃ کی وصولی اور اس

ــ(۱) اور آخر میں کہا : اس سے احتجاج کرنے میں سب نے توقف کیا ہے۔ المیزان)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مصرف کا ہے وہی حکم اس مال کا ہو گا اور اس کے علاوہ کوئی ایسی دلیل نہیں جو ظن غالب کا فائدہ دے اور بالخصوص معمول بہا بن سکے ۔ اور میں نے یقینی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ مسلم کے مال کی حرمت ایسے ہی ہے جیسے اس کے خون کی ہے ۔ للذا یقینی دلیل کے بغیر اس کے مال سے کچھ لینا جائز نہیں ۔ اور ایسی کوئی دلیل نہیں بلکہ جو کچھ بہز کی حدیث میں آیا ہے یہ خبر واحد ہونے کی بنا پر صرف ظن کا فائدہ دیتا ہے ۔ پھر مال کیسے لیا جا سکتا ہے اور اسے یقینی دلائل پر مقدم کیا جا سکتا ہے ؟

آج کے زمانہ میں حکام نے سزا کے طور پر لوگوں کا مال ہتھیانے میں بڑا نرم رویہ اختیار کر رکھا ہے جسے عقل اور شرح دونوں ناپسند کرتے ہیں اور امور سلطنت ایسے جاہلوں کے ہاتھ آ گئے ہیں جو نہ شرع کو کچھ سمجھتے ہیں اور نہ دین کے احکام سے واقف ہیں اور جن پر ان کی حکومت ہے ان سے مال ہتھیانے میں ہی ان کی ساری ہمت صرف ہوتی ہے پھر وہ ایسے جرمانوں کو ادب اور تادیب کا نام دیتے ہیں اور اسے اپنی ضرورتوں پر ' اپنی خوراک پر ' عمارتیں بنانے اور انہیں پلستر کرانے پر اور مختلف شہروں میں اپنی رہائش گاہیں تعمیر کرنے پر صرف کرتے ہیں ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے چوری کی حد کو ضائع کر دیا یا نشہ آور چیزیں پیتے ہیں اور ایسی چیزوں پر مال وصول کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو دونوں کام کرتے جاتے ہیں حد بھی قائم کرتے ہیں اور مال بھی ہتھیاتے ہیں اور ان سب چیزوں کا حرام ہونا دینی ضرورت ہے لیکن بڑے بوڑھے انہیں چیزوں پر جوان بنتے اور چھوٹے انہی پر پروان چڑھتے ہیں اور علماء نے ناپسندیدگی کا اظہار اور گرفت چھوڑ دی اور اس خطرناک کام میں برائی کو فروغ حاصل ہو گیا ۔

اور حدیث کے الفاظ ہیں " یہ آل محمد پر حلال نہیں " اس حکم سے متعلق تفصیلی بحث انشاء اللہ آگے آ رہی ہے ۔

٥٦٦- وعن علي رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«إذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء، حتى يكون لك عشرون ديناراً، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك، وليس في مال زكاة، حتى يحول عليه الحول».** رواه أبو داود، وهو حسن، وقد اختلفوا في رفعه.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تیرے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان میں پانچ(۱) درہم زکوۃ ہے۔ اور اگر تیرے پاس بیس دینار سے کم(۲) ہوں تو ان پر کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زکوۃ نہیں اور جب بیس ہو جائیں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان میں نصف دینار زکوۃ ہے۔ اور جو زیادہ ہو تو اس کا بھی یہی حساب ہو گا۔ اور مال میں اس وقت تک زکوۃ نہیں جب تک کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اور اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف کیا گیا ہے(۳)۔

(۱) یعنی چالیسواں حصہ

(۲) یہ سونے کی زکوۃ کا ذکر ہے۔

(۳) اس حدیث کو ابوداؤد نے حارث اعور سے مرفوعاً" روایت کیا ہے۔ مگر اس جملہ "اور جو زیادہ ہو تو اس کا یہی حساب ہو گا" کے متعلق میں نہیں جانتا کہ یہ علی کا قول ہے یا اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے؟ مگر یہ قول: "مال میں اس وقت تک زکوۃ نہیں ..... تا آخر" کی بھی یہی صورت ہے۔ گویا ابوداؤد کے کلام سے معلوم ہوا کہ ان دونوں جملوں کے رفع میں اختلاف ہے اور مصنف نے تلخیص میں متنبہ کیا کہ یہ معلول ہے اور اس کی علت بھی بیان کی۔ لیکن دار قطنی نے آخری جملہ ابن عمر کی حدیث سے مرفوعاً" روایت کیا ہے کہ: "کسی شخص کے مال میں زکوۃ نہیں حتیٰ کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے" نیز عائشہؓ سے بھی مرفوعاً" روایت کیا کہ مال میں زکوۃ نہیں جب تک اس پر سال نہ گزر جائے لیکن عائشہؓ سے اس کا طریق اور ہے۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے اور اس پر اجماع ہے۔ اختلاف اگر ہے تو درہم کی مقدار میں ہے۔ چنانچہ اس میں بہت اختلاف ہوا، جسے شرح میں پورے کا پورا درج کر دیا ہے لیکن کسی مقدار سے بھی دل کو تسلی حاصل نہیں ہوتی، اور دمیری کی شرح میں ہے کہ درہم میں چھ دوانیق ہوتے ہیں اور دس درہم سات مثقال کے برابر ہوتے ہیں اور مثقال جو جاہلیت میں تھا وہی اسلام میں رہا اس میں تغیر نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ مسلمان اس بات پر متفق ہیں اور المنار میں طویل بحث کے بعد یہی بات ثابت کی ہے کہ ہادویہ کی رائے کے مطابق موجودہ قرشوں میں چاندی کا معیار تیرہ قرش ہے، شافعیہ کی رائے کے مطابق چودہ اور حنفیہ بیس قرش سے تھوڑا زائد کے قائل ہیں۔ اور سونے کا نصاب ہادویہ کے نزدیک پندرہ احمر (سرخ) ہے اور حنفیہ کے نزدیک بیس اور یہ تقریباً ہے۔

نیز اس حدیث میں دو سو درہم زکوۃ کی مقدار چالیسواں حصہ ہے اور اس پر سب کا اجماع ہے اور حدیث کے لفظ ہیں۔ "جو زیادہ ہو اس کا یہی حساب ہو گا" یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ اس کے رفع میں اختلاف ہے اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو اس بات پر دلیل ہے کہ زائد میں زکوۃ واجب ہے اور علماء کی ایک جماعت اسی بات کی قائل ہے۔ اور علی اور ابن عمر دونوں سے روایت ہے کہ: "سونے اور چاندی کے نصاب سے جو زائد ہو اس میں بھی" یعنی زائد میں بھی چالیسواں حصہ۔ خواہ یہ زائد اس کا نصاب کا تھوڑا حصہ ہو یا زیادہ۔ اور ان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درمیان وقص (کسور یا اکائیاں) نہیں اور غالبا" وہ اسے جابر کی آنے والی حدیث پر محمول کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں۔ "اور پانچ اوقیہ سے کم میں زکوۃ نہیں" اس بات پر کہ جب دونوں میں سے کسی ایک کا نصاب یہ نہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے میں ملا کر اتنی مقدار بن جائے۔ سونے اور چاندی میں یہی اختلاف ہے۔ رہے دانے تو نووی نے شرح مسلم میں کہا کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو پانچ وسق سے زائد ہو تو اس کے حساب سے اس میں زکوۃ واجب ہے اور ان میں کسور کا لحاظ نہیں ہو گا۔ اور ابوسعید کی حدیث' جو آرہی ہے' اس کے الفاظ کہ: "کھجوریں اور غلہ اگر پانچ وسق سے کم ہو تو اس میں زکوۃ نہیں" اس بات پر محمول کیا ہے کہ وہ پانچ وسق میں ملائے نہ جائیں۔ اور یہی بات علی اور ابن عمر کے مذہب کو قوی بناتی ہے جو ہم سونے اور چاندی کے سلسلے میں پیش کر چکے ہیں۔ اور حدیث کے الفاظ "جب تک بیس دینار نہ ہوں ان میں زکوۃ نہیں" میں سونے کے نصاب کا حکم ہے اور زکوۃ کی مقدار کا بھی کہ وہ بیس دینار ہے اور اس میں زکوۃ نصف دینار ہے اور یہ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ اور یہ سونے اور چاندی کے لئے عام ہے خواہ وہ ڈھلے ہوئے ہوں یا ان ڈھلے ہوں۔ اور ابوسعید کی مرفوع حدیث میں ہے جسے دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ "چاندی جب تک پانچ اوقیہ نہ ہو جائے اس میں زکوۃ جائز نہیں"۔ نیز جابر کی مرفوع حدیث یوں روایت کی کہ: "چاندی اگر پانچ اوقیہ سے کم ہو تو اس میں زکوۃ نہیں" رہا سونا تو اس کے بارے میں یہ حدیث ہے اور مصنف نے اسے شافعی سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی میں زکوۃ فرض کی ہے"۔ پھر بعد میں مسلمانوں نے سونے میں بھی قبول کر لی اور اس کی وجہ یا تو کوئی ایسی حدیث ہے جو ہم تک نہیں پہنچی یا پھر قیاس ہے۔ اور ابن عبدالبر نے کہا کہ ثقہ راویوں کے خبر واحد نقل کرنے کی جہت سے سونے کے بارے میں کوئی چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہوتی۔ پھر یہی حدیث ذکر کی جسے ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے اور دار قطنی نے بھی۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: والذین یکنزون الذھب والفضہ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ --- الایہ یہ آیت اس بات پر متنبہ کرتی ہے کہ سونے میں اللہ کا حق ہے۔ نیز بخاری' ابوداؤد' ابن المنذر' ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابوہریرہ کی حدیث روایت کی کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس بھی سونا یا چاندی ہو اور وہ اس کا حق نہ ادا کرے تو قیامت کے دن ان کے لئے چوڑی تختیاں بنائی جائیں گی اور ان پر انہیں تپایا جائے گا"۔ الحدیث۔ اور سونے چاندی کا حق اس کی زکوۃ ہی ہے۔ اور اس بارے میں کئی احادیث ہیں جو ایک دوسرے کو مضبوط کرتی ہیں اور انہیں در منثور میں جمع کر دیا گیا ہے۔ نیز سونے اور چاندی کے نصاب کے لئے ضروری ہے کہ وہ خالص اور آمیزش سے پاک ہوں۔ اور المنہاج پر دمیری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی شرح میں ہے۔ جب سونے یا چاندی کے ساتھ دوسری اشیاء مٹی وغیرہ لگی ہوں تو انہیں ڈھالنے' یا خالص کرنے میں وزن کی کمی اور اجرت کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اور ان چیزوں کے نکالنے پر لوگوں کا یہی عمل رہا ہے۔

نیز یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مال میں اس وقت تک زکوۃ نہیں جب تک کہ اس پر سال نہ گزر جائے اور یہی جمہور کا قول ہے۔ ؟ اس میں صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے' آل میں سے بعض نے اور داؤد نے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیث مطلق ہونے کی بنا پر اس میں سال کی شرط نہیں جو یہ ہے کہ "چاندی میں چالیسواں حصہ ہے"۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ مطلق حدیث اس حدیث سے اور اس کے شواہد سے مقید ہے۔ اور اس کے شواہد میں سے درج ذیل حدیث بھی ہے۔

٥٦٧ـ وللترمذي عن ابن عمر: من استفاد مالاً، فلا زكاة عليه، حتى يحول عليه الحول. والراجح وقفه.

اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت (۱) ہے کہ جو مال سال کے دوران حاصل ہو اس پر زکوۃ نہیں تا آنکہ اس پر سال نہ گزر جائے اور راجح بات یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے(۲)۔

(۱) اسے مرفوعا" روایت کیا۔

(۲) الا یہ کہ اس کا حکم رفع کا ہے کیونکہ یہ اجتہاد کا میدان نہیں۔ اور خلفائے اربعہ وغیرہم سے آثار اس کی تائید کرتے ہیں۔ پھر جب سال گزر جائے تو زکوۃ ادا کرنے میں جلدی کرنا چاہئے۔ چنانچہ شافعی نے اور بخاری نے تاریخ میں عائشہؓ سے مرفوعا" روایت کیا کہ: "جو مال زکوۃ کو خلط ملط کر دے وہ ضرور تجھے ہلاک کر دے گا" اور حمیدی نے اسے روایت کیا اور یہ زیادہ کیا: "جو زکوۃ تجھ پر واجب ہو چکی اگر وہ تو نے ادا نہ کی تو حرام مال حلال کو بھی تباہ کر دے گا"۔ ابن تیمیہ نے منتقی میں کہا کہ: "جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ زکوۃ اسی مال سے ادا کی جائے وہ اس حدیث سے احتجاج کرتے ہیں۔

٥٦٨ـ وعن علي رضي الله تعالى عنه قال: ليس في البقر العوامل صدقة. رواه أبو داود والدارقطني، والراجح وقفه أيضاً.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کام کرنے والے بیلوں میں زکوۃ نہیں ہے۔ اسے ابوداؤد اور دار قطنی نے روایت کیا اور راجح یہی بات ہے کہ یہ حدیث بھی موقوف ہے(۱)۔

(۱) مصنف کہتے ہیں کہ بیہقی نے کہا: اس کے وقف کے بارے میں نفیلی نے زہیر سے شک کے ساتھ روایت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا ہے اور اسے رفع کیا ہے- الا یہ کہ مصنف نے اسے ان الفاظ میں ذکر کیا: "کام کرنے والے بیلوں میں کچھ نہیں"- اور اسے اسی حدیث کے الفاظ میں ابن عباس سے روایت کیا اور اس کی نسبت دار قطنی کی طرف کی اور اس کی سند میں ایک راوی متروک ہے- اور دار قطنی نے علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا- نیز اسے جابر کی حدیث سے روایت کیا- مگر اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: "ہل کھینچنے والے بیلوں میں زکوۃ نہیں" اور بیہقی نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے-

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ کام کرنے والے بیلوں میں کچھ نہیں- اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ خواہ وہ بیل چرنے والے ہوں یا انہیں چارہ ڈالا جاتا ہو- جبکہ بکریوں کے بارے میں چرنے کی شرط بخاری میں ثابت ہے اور اونٹوں کے بارے میں ابوداؤد اور نسائی میں بہز کی حدیث میں یہ شرط ثابت ہے- دمیری کہتے ہیں کہ گائے بیل کو بھی انہیں سے ملایا جائے گا-

٥٦٩- وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده عبد الله بن عمرو، أن رسول الله ﷺ قال: **«من ولي يتيماً له مال، فليتجر له، ولا يتركه حتى تأكله الصدقة»**. رواه الترمذي والدارقطني، وإسناده ضعيف، وله شاهد مرسل عند الشافعي.

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے، اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی یتیم کا والی بنے جس کے پاس مال ہو تو اسے چاہئے کہ وہ یتیم کے مال کو پڑا نہ رہنے دے بلکہ اسے تجارت میں لگائے تاکہ زکوۃ اس کے مال کو نہ کھاتی رہے- اسے ترمذی اور دار قطنی نے روایت کیا اور اس کی سند ضعیف(۱) ہے- اور شافعی کی ایک مرسل حدیث اس کی شاہد(۲) بھی ہے-

(۱) کیونکہ ترمذی کی روایت میں مثنی بن صباح ہے اور مثنی ضعیف ہے- اور دار قطنی کی روایت میں مندل بن علی ضعیف اور عزرمی متروک ہے-

(۲) یعنی عمرو بن شعیب کی حدیث کا شاہد شافعی کے نزدیک یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یتیموں(۱) کے اموال میں کوشش کرو تاکہ اسے زکوۃ نہ کھا جائے"- اسے شافعی نے ابن جریج سے، یونس بن مالک سے مرسلا" روایت کیا ہے- اور شافعی نے زکوۃ کے مطلق واجب ہونے میں صحیح احادیث کے عموم کی بناء پر اس کی تاکید کی ہے- نیز اس نے عمرو کی حدیث جیسی انس اور ابن عمر سے موقوف اور علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے کہ دار قطنی نے ابو رافع کی حدیث سے روایت کیا کہ: علی کے پاس بنو رافع کی آل کے اموال تھے- جب علی رضی اللہ عنہ نے وہ اموال واپس لئے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ کم ہیں- پھر جب زکوۃ سمیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حساب جوڑا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ پورے ہیں۔ پھر وہ علیؓ کے پاس آئے تو علی رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: "تمہارا کیا خیال تھا کہ میرے پاس مال ہو اور میں اس کی زکوۃ ادا نہ کرتا؟"۔ اور مالک نے موطا میں عائشہؓ سے روایت کیا کہ وہ اپنے زیر کفالت یتیموں کی زکوۃ ادا کیا کرتی تھیں۔ ان سب روایات میں اس بات پر دلالت ہے کہ مکلف کی طرف بچوں کے اموال میں بھی زکوۃ واجب ہے اور زکوۃ ادا کرنا یتیم کے ولی پر واجب ہے اور یہی جمہور کی رائے ہے۔ اور ابن مسعود سے روایت کی گئی ہے کہ وہ لڑکوں کے اموال کی زکوۃ ان کے مکلف ہونے کے بعد نکالتے تھے۔ اور ابن عباس اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اس کے مال سے دسواں حصہ نکالنا لازم ہے کیونکہ اس کے دلائل میں عموم ہے جو دوسروں کے دلائل میں نہیں جیسا کہ رفع القلم میں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات مخفی نہیں کہ اس میں کوئی دلالت نہیں اور جو عشر میں عموم ہے وہ تو غیر مکلف کو بھی حاصل ہے جیسے یہ حدیث کہ "چاندی میں چالیسواں حصہ ہے"۔ (ربع عشر) اور ایسی ہی دوسری احادیث۔

٥٧٠- وعن عبد الله بن أبي أوفى رضي الله تعالى عنه، قال: كان رسول الله ﷺ إذا أتاه قوم بصدقتهم قال: اللهم صلِّ عليهم. متفق عليه.

عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے۔ کہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی زکوۃ لے کر حاضر ہوتے تو آپؐ فرماتے: یااللہ! ان پر رحمت نازل فرما۔ متفق علیہ(ا)۔

(ا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا اللہ کے اس قول کی بجا آوری کے طور پر کرتے تھے۔ خذ من اموالھم صدقه -- الی قوله --- وصل علیھم کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان کے لئے دعاء خیر کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ان الفاظ میں یہ دعا کرتے تھے۔ اللھم صل علی ال بنی فلان اور یہ بھی آیا ہے کہ آپ ان کے لئے برکت کی دعا فرماتے تھے۔ جیسا کہ نسائی نے روایت کیا کہ ایک شخص اپنی زکوۃ لایا تو اس کے حق میں آپؐ نے فرمایا: اللھم بارک فیه و فی اھله اور بعض ظاہریہ اس بات کے قائل ہیں کہ امام کو ایسا کہنا واجب ہے۔ گویا انہوں نے یہ حکم اس آیت سے اخذ کیا ہے۔ اور اس کا رد یوں کیا گیا کہ اگر یہ واجب ہوتا تو آپؐ مصلین کو ضرور یہ بات سکھلاتے۔ لیکن ایسی کوئی بات منقول نہیں۔ گویا اس آیت میں دعاء کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے خاص تھا۔ اس لئے کہ آپؐ کی دعاء ان لوگوں کے لئے تسکین کا باعث تھی۔

نیز اس حدیث سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں پر صلوۃ (درود یا دعائے

(ا) اس روایت میں یتیموں کے لئے ایتام کا لفظ ہے اور ایک دوسرے نسخہ میں یتامیٰ کا لفظ ہے۔ اور یہ دونوں لفظ یتیم کی جمع ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نزول رحمت) جائز ہے اور محصل کے پاس جو شخص بھی زکوۃ لائے اسے اس شخص کے لئے یہ دعا کرنا چاہئے۔ اور مالک نے اس بات کو ناپسند کیا ہے۔ خطابی نے کہا کہ صلوۃ کی اصل دعاء ہے۔ الایۃ کہ جس کے حق میں دعاء کی جائے اس کے حالات کے لحاظ سے یہ مختلف ہوتی ہے۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت پر صلوۃ ان کے لئے مغفرت کی دعاء ہے۔ اور امت کی آپ پر صلوۃ کا مطلب اللہ تعالیٰ سے مزید تقرب کی دعاء ہے۔ اسی لئے آپ کے بغیر کوئی دوسرا اس لائق نہیں۔

۵۷۱- وعن علي رضي الله تعالى عنه، أن العباس سأل النبي ﷺ في تعجيل صدقته قبل أن تحل، فرخص له في ذلك. رواه الترمذي والحاكم.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا زکوۃ سال پورا ہونے سے پہلے دی جا سکتی ہے؟ تو آپ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔ اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کیا(ا)۔

(ا) ترمذی نے کہا کہ اس باب میں ابن عباس کی بھی روایت ہے۔ اور وقت آنے سے پہلے زکوۃ کی ادائیگی میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ اہل علم کے ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ وقت سے پہلے زکوۃ نہیں دی جا سکتی اور سفیان اسی کے قائل ہیں۔ اور اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ زکوۃ وقت سے پہلے دینے سے بھی ادا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ احمد' اصحاب سنن اور بیہقی نے یہ حدیث روایت کی اور کہا کہ شافعی نے کہا کہ روایت کی گئی ہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم عباس کے مال کی زکوۃ سال پورا ہونے سے پہلے ادا کر دیتے تھے"۔ اور میں نہیں جانتا کہ یہ روایت ثابت ہے یا نہیں؟ بیہقی نے کہا: میری اس حدیث سے متعلق رائے یہ ہے کہ یہ ابوالبختری عن علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تائید کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "جب ہمیں ضرورت پڑتی تو ہم عباس کی دو سال کی زکوۃ پیشگی لے لیتے"۔ اس کے رجال ثقہ ہیں مگر یہ منقطع ہے۔ اور یہ روایت کئی طرق سے جمع کے صیغہ سے ہی آئی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عباس سے دو سال کی زکوۃ پیشگی لے لیتے تھے۔ اور روایات میں اختلاف ہے کہ آیا وہ بطور قرض ہوتی تھی یا زکوۃ کی پیشگی ادائیگی ہوتی تھی۔ اور غالبا" یہ دونوں باتیں ایک ساتھ ہوتی تھیں۔ اور یہ زکوۃ کے پیشگی ادا کرنے پر دلیل ہے اور یہی اکثر کا مذہب ہے جیسا کہ ترمذی وغیرہ' اس کے قائل ہیں۔ لیکن اس کا جواز صرف مال کے مالک سے مخصوص ہے' وصیت اور ولایت سے تصرف کرنے والے کے لئے یہ درست نہیں اور جو لوگ تعجیل کے قائل نہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں: "جب تک سال پورا نہ گزر جائے وہ زکوۃ نہیں ہوتی"۔ اور یہ حدیث تعجیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی نفی نہیں کرتی۔ اور مانعین کی عقلی دلیل یہ ہے کہ قبل از وقت زکوۃ قبل از وقت نماز کی طرح ہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ نص کی موجودگی میں قیاس جائز نہیں۔

٥٧٢- وعن جابر بن عبد الله رضي الله تعالى عنه، عن رسول الله ﷺ، قال: **«ليس فيما دون خمس أواق من الورق صدقة، وليس فيما دون خمس ذود من الإبل صدقة، وليس فيما دون خمسة أوسق من التمر صدقة».** رواه مسلم.

جابر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ کہ چاندی پانچ اوقیہ(۱) سے کم ہو تو اس میں زکوۃ نہیں۔ اور اونٹ اگر پانچ(۲) سے کم ہوں تو ان میں زکوۃ نہیں اور کھجور اگر پانچ وسق سے کم ہو تو اس میں زکوۃ نہیں(۳)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اس حدیث میں اوقیہ کی جمع کے لئے اواق کا لفظ آیا ہے اور مسلم ہی میں ایک دوسری جگہ اواقی یعنی یا کی زیادتی سے آیا ہے۔ اور یہ دونوں صحیح اور بطور جمع آتے ہیں جیسا کہ اہل لغت نے صراحت کی ہے۔
(۲) اصل میں خمس ذود کا لفظ آیا ہے اور ذود تین سے دس تک کے لئے آتا ہے اور ابل اسم جمع ہے۔ اس کا واحد نہیں آتا۔

(۳) یہ حدیث انصاب کی وضاحت میں اعداد کی صراحت پیش کرتی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں۔ آپ کو گزشتہ تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے کہ اونٹوں کا نصاب پانچ ہے اور چاندی کا دو سو درہم اور یہ پانچ اوقیہ ہوتے ہیں۔ رہا غلہ کا نصاب تو اس کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔ اور یہاں اس انداز میں بتلایا کہ پانچ وسق سے کم میں زکوۃ نہیں۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ پانچ وسق میں زکوۃ واجب ہو جاتی ہے۔

٥٧٣- وله من حديث أبي سعيد: ليس فيما دون خمسة أوساق من تمر ولا حب صدقة. وأصل حديث أبي سعيد. متفق عليه.

اور مسلم ہی میں ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ اگر کھجوریں یا غلہ پانچ وسق سے کم ہو تو اس میں زکوۃ نہیں۔ اور اصل جو ہے وہ ابو سعید کی حدیث ہے۔ متفق علیہ

یہ حدیث بھی گزشتہ احادیث کے مفہوم کی صراحت کر رہی ہے اور اوساق' وسق کی جمع ہے اور وہ ساٹھ صاع (ٹوپہ) کا ہوتا ہے اور ایک صاع کے چار مد ہوتے ہیں۔ گویا پانچ وسق تین سو صاع ہوئے اور مد ۱/۳-۱

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رطل کے برابر ہے۔ واوُدی نے کہا کہ مد ایک درمیانہ قد اور عمر کے انسان کی' جس کی ہتھیلیاں نہ بڑی ہوں نہ چھوٹی' چار بک کے برابر ہوتا ہے۔ صاحب قاموس نے یہ قول نقل کرنے کے بعد کہا کہ میں نے اس کا تجربہ کیا تو اس معیار کو صحیح پایا۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جب تک چاندی اور اونٹ اور پھل اور کھجور مذکورہ مقداروں کو نہ پہنچیں ان میں زکوۃ نہیں۔ اور یہ اللہ کی اپنے بندوں پر مہربانی اور تخفیف ہے۔ ان میں سے پہلی دو یعنی چاندی اور اونٹ کے نصاب میں تو سب کا اتفاق ہے۔ رہی تیسری تو اس میں اختلاف ہے جس کی وجہ اس سے معارض درج ذیل حدیث ہے۔

۵۷۴- وعن سالم بن عبد الله، عن أبيه، عن النبي ﷺ قال: فيما سقت السماء والعيون، أو كان عثرياً، العشر، وفيما سقي بالنضح نصف العشر. رواه البخاري. ولأبي داود: أو كان بعلاً العشر، وفيما سقي بالسواني أو النضح نصف العشر.

سالم بن عبداللہ اپنے باپ عمرؓ رضی اللہ عنہما سے' وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جو زمین بارش(۱) اور چشموں(۲) سے سیراب ہو یا خود رو(۳) ہو اس کی پیداوار میں دسواں(۴) حصہ ہے اور جو اپنی محنت(۵) سے سیراب کی جائے اس میں بیسواں حصہ ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا اور ابوداوُد(۶) میں ہے کہ بارانی(۷) میں دسواں حصہ ہے اور جو چھڑے(۸) یا ؟ سے سیراب کی جائے اس میں بیسواں حصہ(۹) ہے۔

(۱) اصل میں لفظ سقت السماء یعنی آسمان پانی پلائے یا سیراب کرے اور اس میں بارش' برف' اولے اور شبنم سب شامل ہیں۔

(۲) اصل میں عیون کا لفظ آیا ہے بمعنی چشمے اور اس میں جاری نہریں بھی شامل ہیں اور پانی زمین میں بہہ کر خود سیراب کرے۔ چھٹا وغیرہ نہ دینا پڑے۔

(۳) اصل میں لفظ عثریا آیا ہے خطابی نے کہا کہ یہ وہ زمین ہے جہاں پانی کے ذخیرے ہوں اور ان کے آس پاس کی زمین اپنی رگوں کے ذریعہ سیراب ہوتی رہے اور اسے خود سیراب نہ کرنا پڑے۔ اس کے متعلق اور اقوال بھی ہیں لیکن اقرب یہی ہے۔

(۴) العشر مبتداء ہے جس کی خبر فیما سقت پہلے آئی ہے یا یہ کہ اس کا فاعل محذوف ہے۔

(۵) اصل میں لفظ نضح ہے یعنی جسے گائے' بیل اور ان کے علاوہ آدمی سیراب کریں۔

(۶) سالم کی حدیث میں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۷) اصل میں بعلا کا لفظ آیا ہے جو عثریا کے عوض آیا ہے شرح میں یہ ع کے ضمہ سے ہے اور قاموس کے مطابق ع پر جزم ہے۔ اور اس کے معنی ایسی زمین اور اس کی پیداوار درخت اور پودے وغیرہ ہیں جسے سیراب نہ کرنا پڑے یا آسمان اسے سیراب کر دے یا پودے اپنی رگوں سے پانی حاصل کر کے سیراب ہو جائیں۔

(۸) اصل میں سوانی اور نضح کے الفاظ آئے ہیں۔ سوانی سے مراد چارپائے ہیں اور نضح سے مراد آدمیوں کا کسی آلہ سے سیراب کرنا ہے اور ہر ایک سے مراد محنت مشقت ہے۔

(۹) یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ محنت سے سیراب کی جانے والی اور بارش یا چشموں سے سیراب ہو جانے والی زمین کی پیداوار کی زکوۃ میں فرق ہے۔ اور اس کی حکمت واضح ہے جو محنت اور مشقت ہے اور اس میں زکوۃ کی کمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر نرمی ہے۔ نیز اس حدیث میں یہ بھی دلالت ہے کہ زمین سے جو کچھ بھی پیدا ہو' خواہ تھوڑا یا زیادہ اس میں زکوۃ واجب ہے اور یہ بات جابر کی اور ابو سعید کی حدیث سے معارض ہے۔ لہٰذا اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور یہ کہتے ہیں کہ سالم کی پانچ وسق والی حدیث اس کی مخصص ہے۔ اور جب تک پیداوار پانچ وسق نہ ہو جائے زکوۃ واجب نہیں۔ اور ایک جماعت جن میں زید بن علی اور ابو حنیفہ بھی شامل ہیں اس طرف گئی ہے کہ وہ حدیث اسے خاص نہیں کرتی بلکہ اس کے عموم پر عمل کیا جائے گا اور پیداوار خواہ کم ہو یا زیادہ اس میں زکوۃ واجب ہو گی۔

اور حق پہلے قول والوں کا ساتھ دیتا ہے کیونکہ وسقوں والی حدیث صحیح ہے جو اس مقدار کی وضاحت کے لئے آئی ہے جس میں زکوۃ واجب ہے۔ جیسا کہ دو سو درہم والی حدیث "چاندی میں چالیسواں حصہ ہے"۔ کی وضاحت کے لئے وارد ہوئی ہے۔ اور کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ چاندی خواہ اس سے کم ہو یا زیادہ اس میں زکوۃ واجب ہو گی اور اختلاف تو صرف کم مقدار میں ہے جب وہ نصاب کو نہ پہنچے اور یہ اس لئے کہ حدیث "چاندی میں چالیسواں حصہ ہے"۔ صرف اس جنس کی وضاحت کے لئے آتی ہے کہ اس میں زکوۃ واجب ہے۔ رہی وہ مقدار جس میں زکوۃ واجب ہے تو اس کے لئے دو سو درہم کی وضاحت والی حدیث پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اور یہاں بھی یہی بات ہے۔ "جسے آسمان سیراب کرے اس میں دسواں حصہ ہے"۔ یعنی یہ وہ جنس ہے جس میں عشر واجب ہے۔ رہی یہ بات کہ کتنی مقدار میں واجب ہوتی ہے تو اس کے لئے وسقوں والی حدیث پر اعتماد کیا جائے گا۔ حدیث میں اس کی مزید وضاحت یوں ہے۔ "جو پانچ وسقوں سے کم ہو اس میں زکوۃ نہیں ہے۔ گویا یہ حدیث آئی ہی اس لئے ہے کہ "جس زمین کو آسمان سیراب کرے اس میں دسواں حصہ ہے" میں عموم سے پیدا ہونے والے وہم کو دور کر دے جیسا کہ چاندی کے بارے میں آیا ہے کہ "چاندی اگر پانچ اوقیہ سے کم ہو تو اس میں زکوۃ نہیں"۔ پھر جب عام اور خاص کا تعارض ہو اور تاریخ کا بھی علم نہ ہو تو عمل خاص کے مطابق ہو گا جیسا کہ یہاں ہے۔ کیونکہ علم الاصول میں یہی نمایاں قول ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥٧٥- وعن أبي موسى الأشعري ومعاذ رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ قال لهما: لا تأخذا في الصدقة إلا من هذه الأصناف الأربعة: الشعير، والحنطة، والزبيب، والتمر. رواه الطبراني والحاكم.

ابو موسیٰ اشعری اور معاذ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے (ا) فرمایا کہ ان چار قسموں یعنی جو' گندم' منقہ اور کھجور کے علاوہ اور کسی چیز میں زکوۃ نہ لی جائے۔ اسے طبرانی اور حاکم نے روایت کیا(۲)۔

(ا) جب آپ نے ان دونوں کو یمن کی طرف بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو دینی امور کی تعلیم دیں۔

(۲) نیز دار قطنی نے بھی روایت کیا۔ بیہقی نے کہا کہ اس کے راوی ثقہ اور سند متصل ہے اور طبرانی نے موسیٰ بن طلحہ سے' عمر سے روایت کیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ان چار اصناف میں زکوۃ کا طریقہ جاری کیا۔ پھر ان کا ذکر کیا۔ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ زکوۃ صرف ان چار اجناس میں ہے اور کسی میں نہیں۔ حسن بصری' حسن بن صالح' ثوری' شعبی اور ابن سیرین کا یہی مذہب ہے۔ اور احمد سے مروی ہے کہ ان کے نزدیک باجرہ وغیرہ میں واجب نہیں۔ رہی عمرو بن شعیب کی اپنے باپ سے' اپنے دادا سے مروی حدیث تو اس میں ان چار کے علاوہ باجرہ کا اضافہ ہے۔ دار قطنی نے اسے باجرہ کے ذکر کے بغیر اور ابن ماجہ نے باجرہ کا بھی ذکر کیا۔ چنانچہ مصنف نے کہا کہ یہ حدیث کمزور ہے اور اس بارے میں کچھ مرسل احادیث بھی ہیں جن میں باجرہ کا ذکر ہے۔ بیہقی نے کہا کہ یہ ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ اور یہ تو واضح ہے کہ ایسی احادیث مندرجہ حدیث کا اور اس میں جو حصہ پایا جاتا ہے' اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں۔ اور شافعی نے مذکور چار اصناف میں قیاس سے باجرہ کو بھی شامل کیا ہے اور اسی بات کو پسند کیا کہ اسے خوردنی غلوں میں شامل کیا جائے اور ان اشیاء سے احتراز کیا ہے جو بھوک کو دور کرنے میں غذا کا کام دیتی ہیں۔ کہ ان میں زکوۃ واجب نہیں۔ اب جس شخص کی رائے قیاس پر عمل ہو اس کے لئے یہ زکوۃ لازم ہے۔ اگر اس بات پر دلیل قائم ہو جائے کہ اس کی علت اجناس ہی ہے۔ اور جو اسے دلیل نہیں سمجھتا وہ اس کا قائل نہ ہو گا۔

اور ہادویہ کا مذہب یہ ہے کہ جو کچھ بھی زمین سے پیدا ہو اس میں زکوۃ واجب ہے۔ کیونکہ دلائل میں عموم ہے جیسے "جسے بھی آسمان سیراب کرے اس میں عشر ہے" البتہ گھاس پھونس اور لکڑیاں اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "تین چیزوں میں سب لوگ شریک ہیں"۔ انہوں نے لکڑی کو گھاس پر قیاس کیا۔ شارح نے کہا کہ یہ معاذ اور ابوموسیٰ والی حدیث میں ہر قسم کی پیداوار پر وارد ہے۔ اور ظاہر اسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ ہے جو اس کا قائل ہو۔

میں کہتا ہوں۔ چونکہ اس حدیث میں حصر ہے لہٰذا عموم اور قیاس اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حدیث "دانوں سے دانے ہی وصول کرو" ابوداؤد کی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس میں عموم ہے۔ ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے واضح دلیل یہی ہے کہ زکوۃ صرف چار اصناف میں واجب ہے۔ اور منار میں ہے کہ ان چار اصناف کے علاوہ خواہ کسی صنف سے زکوۃ لی جائے یا چھوڑی جائے یہ احتیاط کا مقام ہے۔ اور مضبوط بات یہی ہے کہ ان کے علاوہ زکوہ نہ لی جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اصل تو مسلمان کے مال کی حرمت ہے۔ لہٰذا وہ کسی یقینی دلیل کے بغیر اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ اور ان مذکورہ روایات کی اس اصل تک رسائی نہیں۔ علاوہ ازیں دوسری اصل ذمہ داری سے برات ہے اور یہ دو اصلیں ایسی ہیں جن کے مقابلہ میں یہ دلیل ہیچ ہے۔ لہٰذا محل احتیاط یہ ہے کہ باجرہ یا ایسی ہی دوسری اجناس سے کچھ نہ لیا جائے۔ جن کے متعلق عموم کے علاوہ کچھ بھی وارد نہیں اور اس عموم کی بھی تخصیص ثابت ہو چکی ہے۔

٥٧٦- وللدارقطني عن معاذ قال: فأما القثاء والبطيخ والرمان والقصب، فقد عفا عنه رسول الله ﷺ. وإسناده ضعيف.

اور دار قطنی میں معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رہے خربوزہ، تربوز، انار اور گنا تو ان چیزوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف رکھا ہے۔ اور اس کی سند ضعیف ہے(ا)۔

(ا) کیونکہ اس کی سنڈ میں محمد بن عبداللہ عزرمی ہے۔ اور وہ روایت جو دار قطنی میں عمرو بن شعیب اپنے باپ سے' اپنے دادا سے کے طریق پر مروی ہے یوں ہے: عبداللہ بن عمرو سے سبزیوں اور خربوزہ اور کھیرے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے کہا: "سبزیوں میں زکوۃ نہیں ہے" یہ ہے محمد بن عبداللہ عزرمی کی روایت۔ اور جو معاذ کی روایت زیر کلام ہے اس کے متعلق مصنف نے تلخیص میں کہا۔ اس میں ضعف بھی ہے اور انقطاع بھی۔ الا یہ کہ پہلی حدیث میں مذکورہ چار اشیاء میں حصر کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اس حدیث "سبزیوں میں زکوۃ نہیں" کو دار قطنی نے موسیٰ ابن طلحہ اور معاذ کے طریق سے مرفوعا" روایت کیا ہے اور ترمذی کا کہنا یہ ہے کہ اس کا رفع درست نہیں یہ بس موسیٰ ابن طلحہ کی مرسل حدیث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ اور موسیٰ ابن طلحہ تابعی عادل ہیں۔ لازم ہے کہ ان سے مروی مراسیل کو قبول کیا جائے۔ اور یہ علی اور عمر سے بھی موقوفا" ثابت ہے اور ان کا حکم رفع کا ہے اور خضروات یا سبزیاں وہ ہیں جو نہ ناپی جائیں اور نہ وہ غذائی اجناس ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٥٧٧- وعن سهل بن أبي حثمة رضي الله تعالى عنه قال: أمرنا رسول الله ﷺ: «إذا خرصتم فخذوا، ودعوا الثلث فإن لم تدعوا الثلث، فدعوا الربع». رواه الخمسة إلا ابن ماجه، وصححه ابن حبان والحاكم.

سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ جب تم اندازہ کرو تو ایک تہائی(۱) چھوڑ کر وصول کرو۔ اور اگر ایک تہائی نہ چھوڑو تو کم از کم چوتھا حصہ ضرور چھوڑ دو۔ اسے ابن ماجہ کے سوا پانچوں نے روایت کیا۔ اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا(۲)۔

(۱) یعنی صاحب مال کو۔

(۲) اس کی سند میں ایسا راوی ہے جو مجہول الحال ہے جیسا کہ ابن قطان نے کہا ہے۔ لیکن حاکم نے کہا اس کا ایک شاہد ہے جو اس کی صحت پر متفق ہے۔ "عمرؓ نے ایسا ہی حکم دیا"۔ گویا اس نے اس روایت کی طرف اشارہ کر دیا جسے عبدالرزاق' ابن ابی شیبہ اور ابو عبید نے روایت کیا ہے کہ: "عمرؓ اندازہ کرنے والے کو کہتے تھے کہ اس سے اتنا چھوڑ دو جتنا لوگ کھا لیتے ہیں اور جتنا گر پڑتا ہے"۔ نیز ابن عبدالبر نے جابر سے مرفوعاً" روایت کیا کہ: "اندازہ لگانے میں ہلکا ہاتھ رکھو کیونکہ ایسے مال سے کچھ لوگوں کو عطیہ دے جاتا ہے کچھ روندا جاتا ہے اور کچھ لیا جاتا ہے"۔ الحدیث

اور اس حدیث کے معنی میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اندازہ لگاتے وقت مال کا تہائی یا چوتھائی چھوڑ دیا جائے اور دوسرا یہ کہ زکوۃ تہائی یا چوتھائی چھوڑ دی جائے۔ اور شافعی نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تہائی یا چوتھائی زکوۃ چھوڑ دی جائے۔ تاکہ وہ اسے اپنے' اپنے اقارب اور ہمسایوں کے لئے الگ کر سکے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اتنا چھوڑ دے جتنا وہ خود اور اس کے گھر والے کھاتے ہیں اور اس کا اندازہ نہ کرے۔ شرح میں کہا کہ اس سلسلہ میں جابر کی حدیث کی صراحت کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے اور وہ اندازے میں تخفیف اور عشر سے تہائی یا چوتھائی چھوڑ دینا ہے۔ کیونکہ کھیتی کاٹتے وقت ان امور کا اندازہ نہیں ہوتا لہٰذا ان میں زکوۃ واجب نہیں۔ ابن تیمیہ نے کہا کہ جابر کی حدیث شریعت کے قواعد اور محاسن کے مطابق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے موافق ہے کہ "سبزیوں میں زکوۃ نہیں"۔ کیونکہ دستور ہی ایسا چل نکلا ہے کہ پھلوں کے پکنے پر مال کے مالک کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ خود بھی کھائے اپنے اہل و عیال کو بھی اور لوگوں کو بھی کھلائے۔ جو نہ ذخیرہ ہوتا ہے اور نہ باقی رہتا ہے۔ گویا یہ کھانے اور کھلانے کا دستور ان سبزیوں کے قائم مقام ہے جو ذخیرہ نہیں کی جاتیں اور یہ دستور ایسا ہے جسے چھوڑنا بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ تازہ پھلوں سے بہت سے لوگوں کا کھا لینا ایسی بات ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا اگر اندازہ کرتے وقت کچھ نہ چھوڑا جائے تو یہ مال کے مالک کے لئے نقصان دہ بھی ہے اور اس پر شاق بھی گزرے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٨٧٥- وعن عتاب بن أسيد رضي الله تعالى عنه قال: أمرنا رسول الله ﷺ أن يخرص العنب، كما يخرص النخل، وتؤخذ زكاته زبيباً. رواه الخمسة، وفيه انقطاع.

عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ انگور کا بھی ایسے ہی اندازہ کیا جائے جیسے کھجور کا کیا جاتا ہے اور اس کی زکوۃ منقہ کی صورت میں لی جائے۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور اس میں انقطاع ہے(ا)۔

(ا) کیونکہ اسے سعید بن مسیب نے عتاب سے روایت کیا ہے اور ابو داؤد نے کہا کہ سعید نے عتاب سے نہیں سنا۔ ابو حاتم نے کہا کہ صحیح سند یوں ہے کہ سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب کو حکم دیا لہٰذا یہ مرسل ہے۔ نووی نے کہا کہ یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے تاہم ائمہ کے قول کی تائید کرتی ہے۔

اور یہ حدیث پھلوں اور انگور میں اندازہ لگانے کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ راوی کے قول سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر کے صیغہ سے خطاب کیا اور اس کی اصل وجوب ہے۔ اور شافعی بھی اس کے وجوب کے قائل ہیں اور ہادویہ کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے۔ اور ابو حنیفہ نے کہا کہ یہ حرام ہے۔ کیونکہ یہ ظن و تخمین کا معاملہ ہے اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ ظن سے کرنے کا کام ایسا ہے جس کا شارع نے حکم دیا ہے اور اس میں اتنا کافی ہے کہ اندازہ کرنے والا کوئی عادل شخص ہو۔ کیونکہ فاسق کی خبر قابل قبول نہیں یہ جانتے ہوئے کہ کسی چیز سے متعلق جاہل شخص اس میں اجتہاد کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کی پیداوار کا تخمینہ لگانے کے لئے اکیلے عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا تھا' اس لئے وہ ایک ایسے حاکم کی طرح ہوتا ہے جو اجتہاد بھی کرتا ہے۔ پھر اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ پھر اگر تخمینہ لگانے کے بعد پھلوں پر کوئی آفت پڑ جائے تو ابن عبدالبر نے کہا کہ پھر وہ کھجوریں توڑنے سے پہلے ان لوگوں کو اکٹھا کرے جنہیں اس بات کا علم ہو کہ کیا تخمینہ لگایا گیا تھا۔ تو اسے کچھ نہیں دینا پڑے گا جو اندازہ لگایا گیا تھا۔ اور تخمینہ کا فائدہ یہ ہے کہ مال کا مالک خیانت سے امن میں رہتا ہے۔ اسی لئے تخمینہ لگانے کے بعد اس میں نقص کے دعویٰ میں اسے گواہ پیش کرنا لازم ہے۔ کیونکہ ایسے دعوے سے مالک پر فقراء کا حق' محصل کا اپنے تخمینہ کے مطابق زکوۃ کا مطالبہ اور مالک کا اس سے کھانے کا انتفاع وغیرہ سب کچھ ضبط ہوتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ یہ نص صرف کھجور اور انگور کے تخمینہ سے متعلق آتی ہے۔ بعض کہتے ہیں ایسی دوسری چیزوں کو جن کا نظر سے احاطہ کیا جا سکتا ہے اور ضبط کیا جا سکتا ہے' اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صرف ان دو چیزوں کا ہی تخمینہ کیا جائے گا جو نص میں مذکور ہے اور یہی رائے اقرب ہے' کیونکہ علت پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی نص نہیں اور ہادویہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ کھیتی میں تخمینہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ غلہ کے دانوں پر چھلکا چڑھا ہوتا ہے اور اس کو ضبط کرنا مشکل ہے۔ اور اگر اندازہ کر لینے کے بعد مالک اس میں کسی سبب سے کمی کا دعویٰ کرے تو اس پر گواہ پیش کرنا یا ثبوت مہیا کرنا واجب ہے۔ ورنہ پھر قسم سے اپنی تصدیق کرے۔ اور تخمینہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ درخت کے گرد چکر لگائے اور اس کا تمام پھل پوری طرح دیکھے اور یہ کہے کہ اس کا اندازہ اتنا اور اتنا ہے۔ تازہ پھل اتنا ہے جو خشک ہو کر اتنا رہ جائے گا۔

٥٧٩- وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، أن امرأة أتت النبي ﷺ ومعها ابنة لها، وفي يد ابنتها مسكتان من ذهب، فقال لها: أتعطين زكاة هذا؟ قالت: لا، قال: أيسرك أن يسورك الله بهما يوم القيامة سوارين من نار؟ فألقتهما. رواه الثلاثة، وإسناده قوي، وصححه الحاكم من حديث عائشة.

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے' اپنے دادا رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت(۱) آئی۔ اور اس کے ساتھ اس کی چھوٹی سی بیٹی تھی۔ جس کے ہاتھوں میں سونے کے دو کڑے تھے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: "کیا اس کی زکوۃ ادا کرتی ہو؟" وہ کہنے لگی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تجھے ان کے بدلے آگ کے دو کڑے پہنائے؟" چنانچہ اس نے وہ آپؐ کو دے دیئے۔ اسے تینوں نے روایت کیا اور اس کی سند قوی(۲) ہے۔ اور حاکم نے عائشہ کی(۳) حدیث سے اسے صحیح کہا۔

(۱) یہ اسماء بنت یزید ابن السکن تھی۔

(۲) اور ابوداؤد نے اسے حسین المعلم کی حدیث سے روایت کیا اور وہ ثقہ ہے اور ترمذی کا کہنا یہ ہے کہ وہ اسے ابن لہیعہ کے طریق کے علاوہ صحیح نہیں سمجھتے۔

(۳) اور عائشہ کی حدیث جسے حاکم وغیرہ' نے روایت کیا اس کے الفاظ یہ ہیں: کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ آپ نے اس کے ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں دیکھیں تو فرمایا: "عائشہ! یہ کیا ہے؟" عائشہ نے کہا: "یا رسول اللہ! میں یہ پہن کر آپ کے لئے مزین ہونا چاہتی ہوں۔" آپ نے پوچھا: "کیا ان کی زکوۃ ادا کرتی ہو؟" وہ کہنے لگیں' نہیں۔ آپ نے فرمایا: "یہ تجھے آگ میں لے جانے کو کافی ہیں" حاکم نے کہا کہ اس کی سند شیخین کی شرط پر ہے۔

اور یہ حدیث زیور میں زکوۃ کے وجوب پر دلیل ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ اس میں نصاب شرط نہیں کیونکہ آپ نے ان کی زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیا اور غالب گمان یہی ہے کہ وہ پانچ اوقیہ نہیں تھے۔ اور اس مسئلہ میں چار اقوال ہیں۔ پہلا یہ کہ زکوۃ واجب ہے۔ اور یہ ہادویہ اور سلف کی ایک جماعت کا مذہب ہے۔ اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیث پر عمل کی بناء پر شافعی کا ایک قول بھی ایسا ہی ہے۔

دوسرا یہ کہ زیور میں زکوۃ واجب نہیں۔ یہ مالک اور احمد کا مذہب ہے۔ اور شافعی کا ایک قول بھی ایسا ہی ہے۔ کیونکہ سلف سے کئی ایسے آثار ملتے ہیں جو زیور میں زکوۃ کے عدم وجوب میں فیصلہ کن ہیں۔ لیکن حدیث کو صحت ثابت ہونے کے بعد ان آثار کی کچھ وقت نہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ زیور کی زکوۃ یہی ہے کہ اگر کوئی عاریتہ" مانگے تو اسے دے دے۔ جیسا کہ دار قطنی نے انس اور اسماء بنت ابی بکر سے روایت کیا۔ اور چوتھا یہ ہے کہ زکوۃ صرف ایک دفعہ واجب ہے۔ اسے بیہقی نے انس سے روایت کیا۔

اور دلیل کے لحاظ سے سب سے غالب قول اس کا وجوب ہے جس کی وجہ حدیث کا صحیح اور قوی ہونا ہے رہا اس کا نصاب تو اسے واجب سمجھنے والوں کے نزدیک اس کا وہی نصاب ہے جو سونے چاندی کا ہے۔ جبکہ حدیث کا بظاہر مطلق ہے گویا انہوں نے اس حدیث کو نقدین والی حدیث سے مقید کیا ہے۔ اور اس کے وجوب کو درج ذیل حدیث بھی قوی بناتی ہے۔

٥٨٠- وعن أم سلمة رضي الله تعالى عنها، أنها كانت تلبس أوضاحاً من ذهب، فقالت: يا رسول الله! أكنز هو؟ فقال: إذا أديت زكاته فليس بكنز. رواه أبو داود والدارقطني، وصححه الحاكم.

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ سونے کے پازیب(ا) پہنے ہوئے تھیں اور آپ سے پوچھا: "یارسول اللہ! کیا یہ خزانہ کے حکم میں ہیں؟"" "اگر تم ان کی زکوۃ ادا کر دو تو پھر یہ خزانہ نہیں"۔ اسے ابوداؤد اور دار قطنی نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا۔

(ا) نہایہ میں ہے کہ یہ زیور کی ایک قسم ہے جو چاندی سے بنایا جاتا ہے اس کی سفیدی کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا اور اس کا واحد وضح ہے پھر اس کا اطلاق سونے کے زیور پر بھی ہونے لگا۔

اس حدیث میں زیور میں زکوۃ کے وجوب پر دلیل ہے جیسا کہ پہلی حدیث میں ہے۔ اور جس مال سے بھی زکوۃ ادا کر دی جائے وہ کنز کے حکم میں نہیں رہتا۔ نہ اس پر آیت میں مذکور وعید لاگو ہوتی ہے۔

٥٨١- وعن سمرة بن جندب رضي الله تعالى عنه قال: كان رسول الله ﷺ يأمرنا أن نخرج الصدقة من الذي نعده للبيع. رواه أبو داود، وإسناده لين.

سمرۃ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم بیچنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لئے جو مال تیار کریں اس میں سے زکوۃ ادا کریں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اور اس کی سند کمزور ہے(۱)۔

(۱) کیونکہ اس کی سند میں سلیمان بن سمرہ ہے اور وہ مجہول ہے۔ اور دار قطنی اور بزار نے بھی اس کی حدیث کو روایت کیا ہے۔

اور یہ حدیث اموال تجارت میں زکوۃ کے واجب ہونے پر دلیل ہے نیز اس کے وجوب پر اللہ تعالیٰ کے اس قول سے بھی استدلال کیا گیا ہے "أنفقوا من طيبات ماكسبتم" مجاہد نے کہا کہ یہ آیت تجارت میں زکوۃ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے حاکم نے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اونٹوں میں ان کی زکوۃ ہے' گائے بیلوں میں ان کی زکوۃ ہے اور کپڑوں میں ان کی زکوۃ ہے" اور بز وہ کپڑے ہیں جو بزار بیچتا ہے۔ ابن المنذر نے کہا کہ مال تجارت میں زکوۃ کے وجوب پر اجماع قائم ہو چکا ہے۔ اور یہ ایسے امور سے ہے جس کے ساتوں فقہاء قائل ہیں۔ لیکن اس میں اختلاف کی بناء پر بعض لوگوں نے اس کے وجوب کا انکار کیا ہے۔

٥٨٢- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «وفي الركاز الخمس». متفق عليه.

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "دفن شدہ(۱) مال میں پانچواں حصہ زکوۃ ہے(۲)"۔ متفق علیہ

(۱) اصل میں لفظ رکاز ہے۔ یعنی ایسا مدفون مال جو زیادہ محنت کئے بغیر ہاتھ لگ جائے۔

(۲) رکاز کیا ہے ؟ اس بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ پہلا یہ کہ دور جاہلیت کے زمانہ سے زمین میں کوئی مدفون خزانہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد معدنیات ہیں۔ مالک پہلے قول کے قائل ہیں اور دوسرے کے متعلق کہا کہ ان سے زکوۃ لی جائے گی اور وہ بمنزلہ کھیتی ہیں اور شافعی نے بھی ایسا ہی کہا ہے اور ہادویہ دوسرے قول کی طرف گئے ہیں اور ابوحنیفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ پہلے قول پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: "مویشیوں میں کوئی تاوان نہیں نہ معدینات میں ہے اور رکاز میں پانچواں حصہ ہے"۔ اسے بخاری نے روایت کیا جس سے واضح ہے کہ رکاز معدنیات سے الگ چیز ہے۔ اور شافعی نے معدنیات کو سونے اور چاندی سے خاص کیا ہے جیسا کہ بیہقی نے روایت کیا کہ: لوگوں نے پوچھا: "یارسول اللہ! رکاز کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: "وہ سونا اور چاندی جو زمین میں کسی زمانہ میں پیدا کیا گیا" مگر کہتے ہیں کہ اس تفسیر کی روایت ضعیف ہے۔

اور نصاب کے بارے میں شافعی' مالک اور احمد نے اس حدیث پر اعتبار کیا ہے: "جو پانچ اوقیہ سے کم ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں زکوۃ نہیں"۔ یہ سونے اور چاندی کے نصاب میں ہے۔ اور یہ اس حدیث "چاندی میں چالیسواں حصہ ہے"۔ کے مطابق چالیسواں حصہ ہو گی۔ بخلاف رکاز کے کہ اس میں پانچواں حصہ ہے اور اس میں نصاب کا اعتبار نہیں۔ اور اس فرق میں یہ حکمت ہے کہ رکاز بلا مشقت ہاتھ لگ جاتا ہے جبکہ معدنیات سے نکالنے میں خاصی مشقت ہے۔ اور ہادویہ کا مذہب یہ ہے کہ خواہ رکاز ہو یا معادن ان میں پانچواں حصہ زکوۃ واجب ہے۔ اور اس میں نصاب بھی کچھ نہیں۔ نیز وہ تھوڑی ہو یا زیادہ' سمندر سے نکلے یا خشکی سے' زمین کے اوپر سے ملے یا اندر سے' زکوۃ کا وجوب سب کو عام ہے۔ جیسے سیسہ' تانبا' لوہا' پٹرول' نمک' لکڑی' گھاس اور چاندی اور سونا تو جو نص کی رو سے یقینی ہیں اور جو ان کے علاوہ ہیں ان کے متعلق اصل یہی ہے کہ ان میں زکوۃ واجب نہیں تا آنکہ کوئی دلیل قائم ہو۔ اور یہ سب اشیاء دور نبوی میں بھی موجود تھیں اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان میں پانچواں حصہ وصول کیا گیا ہو صرف رکاز کی حدیث ہی آتی ہے اور وہ صرف سونے اور چاندی کی وضاحت کرتی ہے۔ اور آیت واعلموا انما غنمتم من شئی اور وہ جنگ کی غنیمتوں کے بارے میں ہے۔

۵۸۳۔ وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال في كنز وجده رجل في خربة: **«إن وجدته في قرية مسكونة فعرفه، وإن وجدته في قرية غير مسكونة ففيه وفي الركاز الخمس»**. أخرجه ابن ماجه بإسناد حسن.

عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے' اپنے دادا سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خزانہ کے بارے میں جو کسی کو جنگل سے ملا تھا' اسے فرمایا: "اگر تو نے اسے کسی آباد بستی سے پایا ہے تو اسے لوگوں میں مشہور کر اور اگر غیر آباد بستی سے پایا ہے تو یہ دفینہ(۱) ہے۔ اور اس میں پانچواں حصہ زکوۃ ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حسن سند سے روایت کیا۔

(۱) حدیث میں اصل لفظ ہیں ففیہ وفی الرکاز جو اس بات کی وضاحت ہے کہ وہ دفینہ اسے پانے والے کی ملکیت بن گیا اور اب اس پر واجب ہے کہ اس سے پانچواں حصہ زکوۃ ادا کرے۔ اور جو دفینہ کسی بستی میں پائے اس کا نام شارح نے رکاز نہیں رکھا اس لئے اسے اس نے زمین کے اندر سے نہیں نکالا۔ بلکہ اس کا ظاہر یہ ہے کہ وہ بستی میں پایا گیا۔

شافعی اور اس کے پیروکاروں کا مذہب یہ ہے کہ وہ رکاز میں دو باتوں کی شرط لگاتے ہیں۔ ایک یہ کہ جاہلی دور کا ہو دوسرے یہ کہ ویرانہ میں ہو۔ اگر وہ راستے میں یا مسجد میں پایا جائے تو وہ لقطہ (گری پڑی چیز) ہے کیونکہ اس پر مسلمانوں کا ہاتھ ہے اور اس کا مالک بے خبر ہو گیا لہذا وہ لقطہ ہے۔ اور اگر کسی شخص کی ملکیت میں ہو تو اگر وہ شخص اسے اپنی ملکیت ہونے کی نفی نہ کرے تو وہ اسی کا ہے اور اگر اپنی ملکیت کی نفی کر دے تو وہ اس کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو گا جس سے اس نے زمین لی تھی۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ اس شخص تک پہنچ جائے گا جس نے وہ دفن کیا تھا۔ اور شافعی نے اس کی وجہ وہ حدیث بتلائی جسے اس نے عمرو بن شعیب سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ: جاہلی دور کے ایک ویرانہ میں ایک شخص کو خزانہ مل گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "اگر تو نے اسے کسی آباد بستی یا کسی بے آباد راستے میں پایا ہے تو اسے لوگوں میں مشہور کر اور اگر اسے جاہلی ویرانہ میں یا غیر آباد بستی میں پائے تو یہ تیرا ہے اور رکاز میں پانچواں حصہ ہے"۔

۵۸۴- وعن بلال بن الحارث رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ أخذ من المعادن القبلية الصدقة. رواه أبو داود.

بلال بن حرث(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلیہ(۱) کی کانوں سے زکوۃ وصول کی تھی۔ اسے ابوداؤد(۳) نے روایت کیا۔

(۱) آپ مزنی ہیں ۵ ہجری میں وفد کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آئے۔ اور مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ فتح مکہ کے دن جھنڈا برداروں میں سے ایک تھے۔ ان سے ان کے بیٹے حرث نے روایت کی۔ ۶۰ ہجری میں اسی سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۲) سمندر کے ساحلی علاقہ میں ایک گاؤں کا نام ہے۔

(۳) اور موطا میں ہے کہ ربیعہ سے کئی علماء نے روایت کی کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حرث کو قبلیہ کی معادن بطور جاگیر عطا کیں اور ان سے پانچویں حصہ سے کم زکوۃ وصول کی" مالک کی حدیث روایت کرنے کے بعد شافعی نے کہا۔ اس حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں جسے اہل الحدیث ثابت کر سکیں اور اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماسوائے بلال کو جاگیر عطا کرنے کے کوئی روایت بھی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ معادن میں پانچویں حصہ سے کم زکوۃ ہے تو یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے۔ بیہقی نے کہا۔ مالک کی روایت وہی کچھ ہے جو شافعی نے کہا۔

یہ حدیث معدنیات میں زکوۃ کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے آپ کی مراد پانچواں حصہ ہو۔ چنانچہ احمد اور اسحاق پہلی بات کی طرف گئے ہیں اور باقی دوسری کی طرف اور وہ خمس کا وجوب ہے کیونکہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ: "رکاز میں پانچواں حصہ ہے" اگرچہ اس میں احتمال ہے جیسا کہ گزر چکا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فطرانہ کا بیان

یعنی روزے توڑنے کا صدقہ۔ اور فطر کی طرف اس کی نسبت اس لئے ہے کہ وہی اس کا سبب ہے جیسا کہ بخاری کی ایک روایت "رمضان کا روزے چھوڑنے کی زکوۃ" اس پر دلالت کرتی ہے۔

۵۸۵- عن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: فرض رسول الله ﷺ زكاة الفطر صاعاً من تمر، أو صاعاً من شعير، على العبد والحر والذكر والأنثى والصغير والكبير، من المسلمين، وأمر بها أن تؤدى قبل خروج الناس إلى الصلاة. متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطر کی زکوۃ کھجور اور جو سے ایک صاع(۱) (ٹوپہ) مقرر(۲) کی اور اسے مسلمانوں کے تمام افراد پر خواہ کوئی غلام ہو یا آزاد ہو' مرد ہو یا عورت ہو' بڑا ہو یا چھوٹا سب پر فرض کیا اور حکم دیا کہ اسے لوگوں کے نماز عید کو جانے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے۔ متفق علیہ

(۱) صاعا" کا لفظ تمیز کی بنا پر منصوب ہے یا زکوۃ کا بدل ہونے پر کی بنا پر جو اس کی وضاحت کر رہا ہے۔

(۲) یہ حدیث صدقہ فطر کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ آپؐ نے اس کے لئے فرض کا لفظ استعمال فرمایا جس کا معنی لازم کرنا یا واجب کرنا ہے۔

اسحاق نے کہا۔ زکوۃ فطر بالاجماع واجب ہے گویا اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ اس میں ہادویہ اور بعض شافعیہ کا اختلاف ہے جو اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ اور لفظ فرض کی انہوں نے ایسی تاویل کی جو ظاہر کے خلاف ہے۔ رہا یہ قول صدقہ فطر فرض تھا پھر زکوۃ کے حکم سے منسوخ ہو گیا۔ قیس بن عبادہ کی حدیث ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زکوۃ کا حکم نازل ہونے سے قبل صدقہ فطر کا حکم دیا تھا۔ پھر جب زکوۃ کا حکم نازل ہوا پھر آپ نے ہمیں اس کا حکم دیا اور نہ منع کیا"۔ تو یہ قول درست نہیں کیونکہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ اور اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس میں نسخ پر دلیل نہیں کیونکہ آپ نے صحابہ کا صدقہ فطر ادا نہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ ثانیا" یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا کیونکہ اس کے لئے پہلا حکم کافی ہے۔ پھر حکم نہ دینا اسے کیسے ختم کر سکتا ہے؟

اور یہ حدیث اپنے عموم کے لحاظ سے غلام' آزاد' مرد' عورت' چھوٹے بڑے' مالدار اور فقیر سب پر اس صدقہ کے وجوب پر دلیل ہے۔ چنانچہ۔ بیہقی نے عبداللہ بن ابی ثعلبہ یا ثعلبہ ابن عبداللہ سے مرفوعا" روایت کیا کہ: "ہر انسان سے ایک صاع گندم ادا کرو خواہ وہ مرد ہو یا عورت' چھوٹا ہو یا بڑا' غنی ہو یا فقیر یا غلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو۔ اس سے غنی کو اللہ پاک کرے گا اور فقیر کو اس سے زیادہ لوٹا دے گا جو اس نے ادا کیا ہو"۔ منذری نے مختصر سنن میں کہا کہ اس کی سند میں نعمان بن راشد ہے جس کی حدیث سے احتجاج درست نہیں۔ البتہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ غلام کی ملکیت نہیں ہوتی' اس کے آقا پر لازم ہے۔ اور جن کے نزدیک وہ مالک ہے تو آقا پر لازم نہ ہو گا۔ اسی طرح بیوی کی زکوۃ اس کا خاوند اور خادم کی اس کا مخدوم' اور جس کے ذمہ کسی کا خرچ ہے اسی پر صدقہ ادا کرنا لازم ہے۔ بروئے حدیث "ان کا صدقہ ادا کرو جن کی تم کفالت کرتے ہو"۔ اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا اور اس کی سند کمزور ہے۔ اسی لئے اس مسئلہ میں اختلاف ہوا جیسا کہ شرح وغیرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ البتہ اگر چھوٹے کے پاس مال ہو تو زکوۃ اس کے مال سے دی جائے گی اور اگر نہ ہو تو اس پر خرچ کرنے والا ادا کرے۔ جیسا کہ جمہور اسی کے قائل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ باپ ہی ادا کرے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر چھوٹے پر صدقہ واجب نہیں کہ یہ صدقہ تو روزوں میں لغو اور لڑائی جھگڑے سے ان کی تطہیر اور مسکینوں کی خوراک کے لئے مشروع کیا گیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ دلیل چھوٹے پر وجوب کے بارے میں ابن عمر کی صریح حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

نیز یہ حدیث ہر انسان پر ایک صاع کھجور یا جو کے واجب ہونے پر دلیل ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اسی طرح ایک روایت میں منقہ بھی آیا ہے اور حدیث کے لفظ من المسلمین کے اضافہ کے بارے میں ائمہ حدیث نے لمبی چوڑی بحث کی ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں ان الفاظ کی زیادتی پر راویوں کا اتفاق نہیں۔ الا یہ کہ یہ زیادتی عدل ہے لہٰذا اسے قبول کر لینا چاہئے اور صدقہ فطر کے وجوب میں مسلمان ہونے کی شرط لگاتی ہے نیز یہ کہ کافر پر یہ واجب نہیں اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا مسلمان اپنے کافر غلام کی زکوۃ نکالے گا؟ جمہور اس کے جواب میں نفی کے قائل ہیں جبکہ حنفیہ اور بعض دوسرے اس کے وجوب کے قائل ہیں اور وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ: "مسلمان پر اس کے غلام میں صدقہ فطر کے سوا کوئی صدقہ نہیں" اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ حدیث خاص ہے اور خاص کے مطابق ہی عام کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس میں عبدہ دوسری حدیث میں من المسلمین سے مخصص ہے۔ رہا طحاوی کا یہ قول کہ مسلمان ہو' صدقہ دینے والوں کی صفت ہے جن کی طرف دیا جارہا ہے ان کی نہیں تو حدیث کا ظاہر اس قول کو تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ اس حدیث میں جیسے غلام کا لفظ ہے ویسے چھوٹے کا بھی ہے اور یہ ان لوگوں سے ہیں جن کی طرف سے صدقہ دیا جاتا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام کی صفت صدقہ دینے والوں سے خاص نہیں ہے اور مسلم کی ان الفاظ میں حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ "مسلمانوں کے ہر فرد پر خواہ وہ آزاد ہو یا غلام"

اور حدیث کے لفظ "اور آپ نے حکم دیا کہ یہ صدقہ نماز عید کو لوگوں کے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے" اس صدقہ کو جلد نکالنے پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر نماز کے بعد ادا کرے گا تو یہ صدقہ فطر نہ رہے گا بلکہ عام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدقات میں سے ایک صدقہ شمار ہو گا۔ اور درج ذیل حدیث اسے موکد بناتی ہے۔

۵۸۶- ولابن عدي والدارقطني بإسناد ضعيف: أغنوهم عن الطواف في هذا اليوم.

اور ابن عدی اور دار قطنی میں(۱) ضعیف(۲) سند سے ہے کہ: اس دن انہیں(۳) گھوم(۴) پھر کر مانگنے سے بے نیاز(۵) کر دو۔

(۱) یعنی ابن عمر کی حدیث سے

(۲) کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عمرواقدی ہے۔

(۳) یعنی فقراء کو

(۴) گلیوں اور بازارں میں طلب معاش کے لئے

(۵) یعنی دن کے آغاز میں صدقہ دے کر انہیں عید کے دن مانگنے سے بے نیاز کر دو۔

۵۸۷- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال: كنا نعطيها في زمن النبي ﷺ صاعاً من طعام، أو صاعاً من تمر، أو صاعاً من شعير، أو صاعاً من زبيب. متفق عليه، وفي رواية: «أو صاعاً من أقط». قال أبو سعيد: أما أنا فلا أزال أخرجه، كما كنت أخرجه في زمن رسول الله ﷺ. ولأبي داود: «لا أخرج أبداً إلا صاعاً».

ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اناج، کھجور، جو اور منقہ سے کسی ایک جنس میں ایک صاع دیا کرتے تھے۔ متفق علیہ۔ اور ایک روایت میں پنیر(۱) سے ایک صاع بھی ہے۔ ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ میں تو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صدقہ نکالا کرتا تھا(۲)، اسی طرح ہی نکالتا رہوں گا اور ابو داؤد میں ابو سعید کی روایت میں ہے کہ میں تو صاع ہی نکالا کروں گا(۲)۔

(۱) اصل میں لفظ اقط بمعنی پنیر ہے اور اس میں کچھ اختلاف نہیں کہ پنیر میں صدقہ ایک صاع ہی واجب ہے۔ اختلاف اگر ہے تو گندم میں ہے۔ چنانچہ ابن خزیمہ نے سفیان سے، ابن عمر سے روایت کیا کہ جب معاویہ کا دور آیا تو لوگوں نے ایک صاع جو کا بدل نصف صاع گندم قرار دیا۔ یہ اس لئے کہ گندم کے بارے میں کوئی نص نہیں آئی کہ اس میں سے بھی صاع ہی نکالا جائے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ابو سعید کی حدیث میں اناج (طعام) سے مراد گندم ہی ہے یہ صحیح نہیں جیسا کہ مصنف نے فتح الباری میں اس کی تحقیق کی ہے۔ ابن المنذر نے کہا کہ ہم گندم کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی حدیث نہیں جانتے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس زمانہ میں مدینہ میں گندم کم ہوتی تھی۔ پھر جب صحابہ کے زمانہ میں زیادہ ہو گئی تو انہوں نے دیکھا کہ گندم کا نصف صاع جو کے ایک صاع کے برابر بنتا ہے۔ اور وہ لوگ امام تھے لہٰذا ان کے قول کو درخور اعتناء سمجھنا جائز نہیں۔ الا یہ کہ کسی ایسے ہی قول کی طرف رجوع کیا جائے۔ مخفی نہ رہے کہ ابوسعید راوی نے اس سے اختلاف کیا تھا جیسا کہ اس کے اپنے آنے والے قول سے معلوم ہو رہا ہے۔

(۲) یعنی ایک صاع

(۳) یعنی خواہ کوئی بھی غذائی جنس ہو۔ ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا کہ ابوسعید نے یہ اس وقت کہا جب اس کے پاس صدقہ رمضان کا ذکر ہوا کہ میں تو وہی کچھ نکالوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نکالا کرتا تھا۔ یعنی کھجور سے بھی ایک صاع، گندم سے بھی، جو سے بھی اور پنیر سے بھی۔ ان لوگوں میں سے ایک نے کہا یا گندم سے دو مد (نصف صاع)؟ ابوسعید نے کہا۔ نہیں۔ یہ معاویہ کا کام ہے میں نہ اسے قبول کروں گا اور نہ اس پر عمل کروں گا۔ تاہم ابن خزیمہ نے کہا کہ ابوسعید کی حدیث میں گندم کا ذکر غیر محفوظ ہے اور میں نہیں جانتا کہ کس سے وہم ہوا۔ نووی نے کہا کہ جو لوگ گندم میں دو مد کے قائل ہیں وہ معاویہ کے قول سے تمسک کرتے ہیں اور یہ محل نظر ہے کیونکہ یہ صحابی کا فعل ہے۔ اور اس میں ابوسعید اور بعض دوسرے صحابہ نے اختلاف کیا جن کا عرصہ صحبت اس سے زیادہ ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کو اس سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اور معاویہ نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ یہ اس کی اپنی رائے ہے۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا نہیں سنا۔ جیسا کہ بیہقی نے سنن میں ابوسعید کی حدیث روایت کی کہ: "معاویہ حج یا عمرہ کی خاطر آیا تو منبر پر لوگوں سے وہی بات کی جس میں لوگ گفتگو کر رہے تھے۔ اس نے کہا میں نے شام کے تاجروں کو کھجور کے ایک صاع کو گندم کے دو مد کے برابر کرتے دیکھا ہے تو لوگوں نے اسے قبول کر لیا۔ ابوسعید نے کہا کہ میں تو وہی کچھ نکالتا رہوں گا"۔ یہ حدیث اس بات میں صریح ہے کہ یہ معاویہ کی رائے تھی۔ بیہقی نے اس باب میں یہ حدیث لانے کے بعد کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیث بھی مروی ہے جس میں گندم میں صدقہ ایک صاع ہے اور ایسی بھی جس میں نصف صاع ہے اور ان میں سے صحیح کچھ بھی نہیں۔ اور خلافیات میں ان میں ہر ایک کی علت واضح کر دی گئی ہے۔

۵۸۸۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: فرض رسول الله ﷺ زكاة الفطر طهرة للصائم من اللغو والرفث، وطعمة للمساكين، فمن أداها قبل الصلاة فهي زكاة مقبولة، ومن أداها بعد الصلاة فهي صدقة من الصدقات. رواه أبو داود وابن ماجه، وصححه الحاكم.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ فطر کو روزہ دار کی لغو اور بے ہودہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باتوں سے(۱) پاکیزگی کے لئے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لئے مقرر کیا۔ اب جو شخص اسے نماز عید سے پہلے ادا کر دے اس کی زکوۃ مقبول ہے اور جو نماز کے بعد ادا کرے تو وہ صدقات میں سے ایک صدقہ ہے۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا(۲)۔

(۱) جو روزہ کے دوران روزہ دار سے صادر ہوں۔

(۲) اس حدیث میں زکوۃ فطر کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ حدیث میں لفظ فرض آیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس بات پر بھی دلیل ہے کہ صدقات برائیوں کو دور کر دیتے ہیں۔ نیز اس بات پر یہ زکوۃ نکالنے کا وقت نماز عید سے پہلے ہے اور اس بات پر کہ اسے وقت پر نکالنا واجب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یکم شوال کو فجر کو نکالنا واجب ہے بموجب حدیث: "تم اس دن فقراء کو گھومنے پھرنے سے بے نیاز کر دو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آخری رمضان کو شام کے وقت واجب ہے۔ کیونکہ حدیث میں طھرۃ للصائم کے الفاظ آئے ہیں۔ اور بعض ان دونوں دلیلوں کے بموجب ان دونوں اوقات پر واجب سمجھتے ہیں۔

اور زکوۃ فطر کو وقت سے پہلے ادا کرنے سے متعلق بھی کئی اقوال ہیں۔ ایک وہ ہیں جو اسے زکوۃ کے ساتھ ملاتے ہیں اور اس میں تقدیم کے جواز کے قائل ہیں خواہ یہ دو سال پہلے ہو۔ اور بعض رمضان میں ادا کرنے کے قائل ہیں اس سے پہلے نہیں۔ کیونکہ اس زکوۃ کے دو سبب ہیں۔ ایک روزہ' دوسرا افطار لہٰذا اس کی تقدیم نصاب اور سال گزرنے کی طرح ہونی چاہئے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وقت سے ایک یا دو دن سے زیادہ پہلے نہیں ادا کرنا چاہئے اور سب اقوال کے لئے دلائل ہیں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

اور حدیث کے لفظ "مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لئے" میں دلیل ہے کہ یہ صرف مسکینوں کے لئے ہے اور آل کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ زکوۃ کی طرح ہے اور اس کے وہی آٹھ مصارف ہیں جو زکوۃ کے ہیں اور مہدی نے انماالصدقات میں عموم کی وجہ سے اسی کی تائید کی ہے۔ اور اس حدیث میں کسی ایک قسم کا نام آجانا اسے اس قسم سے خاص نہیں بناتا۔ کیونکہ یہ بھی زکوۃ ہی میں شامل ہے اور اس کے مصرف میں کوئی بھی تخصیص کا قائل نہیں۔ چنانچہ معاذ کی حدیث میں ہے۔ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں زکوۃ تمہارے اغنیاء سے وصول کروں اور تمہارے فقراء میں اسے لوٹا دوں"۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نفلی صدقہ کا بیان

۵۸۹- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: «سبعة يظلهم الله في ظله يوم لا ظل إلا ظله» - فذكر الحديث - وفيه: «ورجل تصدق بصدقة فأخفاها، حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه». متفق عليه.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: سات آدمی(۱) ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن سایہ مہیا کرے گا جب اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ(۲) نہ ہو گا پھر ساری حدیث ذکر کی جس میں اس آدمی کا بھی ذکر ہے جس نے اپنے صدقہ کو اتنا چھپایا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چل سکا کہ دائیں نے کیا خرچ کیا تھا۔
متفق علیہ

(۱) وہ سات آدمی یہ ہیں (۱) عدل و انصاف کرنے والا حاکم (۲) وہ نوجوان جو اپنے رب کی عبادت میں پروان چڑھا (۳) وہ شخص جس کا دل مساجد سے وابستہ رہتا ہے (۴) وہ دو آدمی جو اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے' اسی کی خاطر اکھٹے ہوتے اور اسی کی خاطر جدا ہوتے ہیں (۵) وہ شخص جسے کسی حسب و جمال والی عورت نے بلایا تو اس نے کہہ دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں (۶) وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کا ذکر کیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ساتواں جو اس حدیث میں مذکور ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ ظل (سایہ) سے مراد حمایت اور پناہ ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ میں فلاں کے سایہ میں ہوں اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ ہے اور اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے سعید بن منصور نے سلمان سے ان الفاظ میں روایت کیا "سات آدمی ہیں جنہیں اللہ اپنے عرش کا سایہ عطا کرے گا"۔ اور قرطبی اسی بات پر یقین کرتے ہیں۔

اور لفظ اخفی فعل ماضی ہے جو لفظ قدر محذوف کی بنا پر حال کے معنی میں ہے اور الفاظ "بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے" میں اخفاء یا چھپانے میں مبالغہ ہے تاکہ صدقہ میں ریاء کے شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مضاف حذف ہو یعنی عن شمالہ ہو۔

نیز اس حدیث میں ظاہر صدقہ کی نسبت پوشیدہ صدقہ کی فضیلت پر دلیل ہے۔ الا یہ کہ ظاہر صدقہ میں لوگوں کی پیروی کے لئے ترغیب ہوتی ہے جبکہ پوشیدہ صدقہ ریاء کے داعیہ کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان تبدوا الصدقات فنعما ھی --- الایہ

اور صدقہ کا لفظ عام ہے لہٰذا فرضی اور نفلی دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ لہٰذا مصنف کے اس حدیث کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس باب میں لانے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اخفاء نفلی صدقہ سے مختص ہے۔ نیز جاننا چاہئے کہ رجل تصدق کا یہ مفہوم نہیں کہ یہ صرف مرد کے لئے ہے کیونکہ عورت کا بھی معاملہ ایسا ہی ہے ماسوائے امامت کے۔ اسی طرح سات کے عدد کا یہ مفہوم نہیں کہ صرف سات قسم کے آدمیوں کو ہی سایہ نصیب ہو گا کیونکہ اور بھی خصائل ہیں جو سایہ کے مقتضی ہیں۔ اور مصنف نے فتح الباری میں ایسی ۲۸ خصلتیں بیان کی ہیں اور حافظ سیوطی نے انہیں ستر تک پہنچایا ہے۔ اور انہیں الگ تالیف کر کے ایک پمفلٹ بنایا ہے جس کا نام بزوغ الهلال فی الخصال المقتضیه للظلال رکھا ہے۔

۵۹۰۔ وعن عقبة بن عامر رضي الله تعالى عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «**كل امرىء في ظل صدقته حتى يفصل بين الناس**». رواه ابن حبان والحاكم.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہر شخص اپنے صدقہ(۱) کے سایہ میں ہو گا تا آنکہ لوگوں کے درمیان فیصلہ چکا(۲) دیا جائے۔ اسے ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا۔

(۱) یعنی قیامت کے دن اور خواہ یہ اس کا فرضی صدقہ ہو یا نفلی۔

(۲) اس حدیث میں صدقہ پر ابھارا گیا ہے۔ رہا اس کا سایہ میں ہونا تو اسے حقیقت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ کہ صدقہ بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت میں آئے اور اس سے سورج کی حرارت کو روک دے یا اس سے مراد اس کی حمایت اور حفاظت ہو۔ اور نفلی صدقہ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر فرضی صدقہ میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو نفلی صدقہ اس کی کسر پوری کر دیتا ہے جیسا کہ حاکم نے الکنی میں ابن عمر کی حدیث روایت کی جس میں ہے کہ "فرشتو! میرے بندے کی زکوۃ میں نظر کرو۔ اگر اس میں کچھ کمی ہو تو دیکھو کہ میرے بندے کا کوئی نفلی صدقہ ہے تاکہ تم اس سے زکوۃ کی کمی کو پورا کر سکو" گویا یہ نفلی صدقہ اللہ تعالیٰ کے فرضی صدقہ میں قبول کر لیا جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا عدل ہے۔

۵۹۱۔ وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه عن النبي ﷺ قال: «**أيما مسلم كسا مسلماً ثوباً على عري كساه الله من خضر الجنة، وأيما مسلم أطعم مسلماً على جوع أطعمه الله من ثمار الجنة، وأيما مسلم سقى مسلماً على ظمأ سقاه الله من الرحيق المختوم**». رواه أبو داود، وفي إسناده لين.

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: جو بھی مسلمان کسی ننگے مسلمان کو کپڑا پہنائے گا' اللہ اسے جنت کے سبز ریشمی کپڑے پہنائے گا۔ اور جو بھی مسلمان کسی بھوکے مسلمان کو کھانا کھلائے گا اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے جنت کے پھل کھلائے گا۔ اور جو بھی مسلمان کسی پیاسے مسلمان کو پانی پلائے گا۔ اللہ اسے جنت کی سربمہر(۱) خالص شراب پلائے گا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی سند(۲) کمزور ہے۔

(۱) اصل میں الرحیق المختوم کے الفاظ ہیں۔ رحیق بمعنی ایسی خالص شراب جس میں گدلا پن نام کو نہ ہو' شفاف ہو اور مختوم بمعنی سربمہر اور یہ اس کی نفاست سے عبارت ہے۔

(۲) شارح نے اس کی وجہ بیان نہیں کی۔ منذری کی مختصر سنن میں ہے کہ اس کی سند میں ابوخالد یزید بن عبدالرحمٰن المعروف بہ دالانی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے اور بعض نے اس میں کلام کیا ہے اور اس حدیث میں نیکی کی مختلف اقسام اور انہیں محتاج لوگوں کو دینے پر ابھارا گیا ہے۔ اور بتلایا گیا ہے کہ جس قسم کا فعل ہو گا اس کی جزاء بھی اسی قسم سے دی جائے گی۔

۵۹۲- وعن حكيم بن حزام رضي الله تعالى عنه عن النبي ﷺ قال: «اليد العليا خير من اليد السفلى، وابدأ بمن تعول، وخير الصدقة ما كان عن ظهر غنى، ومن يستعفف يعفه الله، ومن يستغن يغنه الله». متفق عليه، واللفظ للبخاري.

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے اور ان سے شروع کر جو تیرے زیر کفالت ہیں اور بہتر صدقہ اتنا ہے جس کے بعد انسان محتاج نہ ہو جائے۔ اور جو شخص سوال سے بچے گا اللہ اسے بچائے گا اور جو بے نیاز رہنے کی کوشش کرے گا۔ اللہ اسے بے نیاز کر دے گا۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

اکثر مفسرین اور علماء کہتے ہیں کہ اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والا ہے اور نچلے سے مراد مانگنے والا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اوپر والے سے مراد سوال سے بچنے والا ہے خواہ اسے دینے والا دینے کی کوشش کرے اور یہاں اوپر کا لفظ معنوی طور پر آیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ہاتھ ہے جو کسی دوسرے کے لئے لے رہا ہو۔ اور بعض کہتے ہیں بلند ہاتھ دینے والا ہے اور نچلا ہاتھ بخل کرنے والا ہے اور متصوفین میں سے بعض نے کہا کہ لینے والا ہاتھ دینے والے کے علی الاطلاق افضل ہے۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خستہ حالی کو بنیاد سمجھ کر سوال کرنے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور کیا ہی اچھی بات ہے جو تفسیر نبوی میں وارد ہے کہ اوپر والا ہاتھ وہ ہے جو دیتا ہے لیتا نہیں اسے اسحاق نے اپنی مسند میں حکیم بن حزام سے روایت کیا کہ: یارسول اللہ! اوپر والا ہاتھ کونسا ہے؟ تو آپ نے یہی بات بتلائی۔

اور اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے عیال پر خرچ کرے کیونکہ وہ سب سے اہم ہیں۔ نیز افضل وہ ہے جس کو نکالنے کے بعد انسان خود مستغنی رہے۔ گویا افضل صدقہ کا مطلب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ صدقہ کرنے والے کے پاس اتنا مال باقی رہے جس سے وہ اپنی ضروریات اور مصالح کو پورا کر سکے۔ کیونکہ سب کچھ صدقہ کرنے کے بعد وہ بسا اوقات نادم ہوتا ہے اور اگر وہ خود محتاج ہے تو اس پر واجب ہے کہ صدقہ نہ کرے۔ اور بقول خطابی یہاں ظھر کا لفظ اپنے تو سیعی معنوں میں آیا ہے۔ اور بعض کچھ دوسرے معنی بھی بتلاتے ہیں۔ اور کسی کے سارا مال صدقہ کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ علماء اور ائمہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ طبرانی نے کہا کہ جواز کے باوجود مستحب یہ ہے کہ ایسا نہ کرے اور تہائی پر اکتفا کرے۔ اور یہ کہنا بہتر ہوگا کہ جو سارا مال صدقہ کرے اور وہ فاقہ برداشت کر لینے والا ہو اور اگر اس کے عیال ہوں اور وہ صابر و شاکر ہوں تو ایسے کام کے بہتر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور اس پر یہ آیات دلالت کرتی ہیں۔ ویطعمون الطعام علی حبہ اور جو اس پایہ کا نہ ہو اس کے لئے سب کچھ صدقہ کر دینا مکروہ ہے۔ اور حدیث کے لفظ ہیں "جو شخص بچے" یعنی مانگنے سے تو اللہ اس کی نہ مانگنے پر مدد کرتا ہے۔ نیز لفظ ہیں "جو شخص بے نیاز رہے"۔ یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے خواہ تھوڑا ہو تو اللہ اس کے دل میں قناعت ڈال دیتا ہے اور وہ اسی پر قانع رہتا ہے۔

۵۹۳- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قيل: يا رسول الله! أي الصدقة أفضل؟ قال: جهد المقل، وابدأ بمن تعول. أخرجه أحمد وأبو داود، وصححه ابن خزيمة وابن حبان والحاكم.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ نے پوچھا: "یارسول اللہ افضل صدقہ کونسا ہے؟" فرمایا: "کم آمدنی والے کی محنت کی کمائی(۱) سے صدقہ اور ابتدا ان سے کر جو تیرے عیال ہیں"۔ اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا اور ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا۔

(۱) اصل عبارت میں جهد کا لفظ ہے۔ ج پر اگر ضمہ ہو تو اس کا معنی وسعت اور طاقت ہے اور اگر فتحہ ہو تو مشقت ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ج پر ضمہ مبالغہ اور انتہاء کا معنی دیتا ہے اور یہ دونوں لغت نہایہ کے قول کے مطابق ہیں یعنی اتنی مقدار جسے کم، مال والا برداشت کر سکے بموجب حدیث: "ایک شخص کے پاس صرف دو درہم تھے وہ ایک درہم صدقہ دے کر ایک ہزار درہم صدقہ دینے والے سے آگے نکل گیا جس کے پاس بہت سا مال تھا جس میں سے اس نے صرف ایک ہزار درہم صدقہ دیا"۔ اسے نسائی نے ابوذر سے اور ابن حبان اور حاکم نے ابوہریرہ سے روایت کیا۔ اس حدیث اور اس سے پہلی حدیث میں تطبیق کے متعلق بیہقی نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول یہ ہے۔ "صدقہ وہ بہتر ہے جس کے بعد وہ خود محتاج نہ ہو جائے"۔ اور دوسرا یہ کہ: "افضل صدقہ وہ ہے جو کم آمدنی والا اپنی محنت کی کمائی سے کرے" تو یہ بات لوگوں کے حالات میں اختلاف کی بنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر مختلف ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ فاقہ اور بھوک پر صبر کر سکتے ہیں اور تھوڑا بہت جو کچھ ان کے پاس ہو اس پر قناعت کر سکتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ پھر کئی احادیث بیان کیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۹۴۔ وعنه قال: قال رسول الله ﷺ: تصدقوا، فقال رجل: يا رسول الله! عندي دينار، قال: تصدق به على نفسك، قال: عندي آخر، قال: تصدق به على ولدك، قال: عندي آخر، قال: تصدق به على زوجتك، قال: عندي آخر، قال، تصدق به على خادمك، قال: عندي آخر، قال: أنت أبصر به. رواه أبو داود والنسائي وصححه ابن حبان والحاكم.

اور انہی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صدقہ کیا کرو"۔ ایک شخص کہنے لگا: یا رسول اللہ میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپ نے فرمایا: "اسے اپنی ذات پر صدقہ کرو"۔ وہ کہنے لگا: میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا: "اسے اپنی اولاد پر خرچ کر"۔ اس نے کہا: میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا: "اسے اپنے خادم پر صدقہ کر"۔ اس نے کہا: میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا: "اب یہ تیری صوابدید پر منحصر ہے"۔ اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا(۱)۔

(۱) اس حدیث میں زوجہ کا ذکر نہیں کیا جبکہ صحیح مسلم میں اولاد سے پہلے زوجہ کا ذکر ہے اور اس میں ہے کہ اپنی ذات پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ اور اپنی ذات سے ابتداء کی جائے' پھر بیوی پر' پھر اولاد پر' پھر اگر غلام ہو تو اس پر یا کوئی بھی خادم ہو۔ پھر جہاں چاہے اور نفقات میں یہ تحقیق آئے گی کہ کس کس پر اور کس ترتیب سے صدقہ کرنا واجب ہے۔

۵۹۵۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: قال النبي ﷺ: إذا أنفقت المرأة من طعام بيتها، غير مفسدة، كان لها أجرها بما أنفقت، ولزوجها أجره بما اكتسب، وللخازن مثل ذلك، لا ينقص بعضهم من أجر بعض شيئاً. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب عورت اپنے گھر کے کھانے پینے میں فضول خرچی نہ کرے تو اس کو اس طرح خرچ کرنے پر بھی اجر ملتا ہے اور اس کے خاوند کو بھی کیونکہ اس نے کمایا تھا اور اسی طرح خادم کو بھی اجر ملے گا۔ اور ان کے اجر میں سے کسی کا بھی اجر کم نہیں ہو گا۔ متفق علیہ(۱)

(۱) اس حدیث میں عورت کے اپنے خاوند کے گھر سے صدقہ کرنے کے جواز پر دلیل ہے اور طعام سے خرچ کرنے سے مراد ان متعلقہ افراد پر خرچ کرنا ہے جو خاوند کے زیر کفالت ہیں۔ بشرطیکہ نہ تو وہ خاوند کو تکلیف پہنچائے اور نہ ان کے خرچ میں بخل کرے۔ ابن عربی نے کہا کہ سلف نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ کچھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ ہیں جنہوں نے بیوی کو تھوڑا سا خرچ کر لینے کی اجازت دی ہو جس سے نہ کچھ خلل ہو اور نہ نقصان۔ اور بعض نے اس بات پر محمول کیا ہے کہ خاوند نے مجملاً اس کو اجازت دی ہو اور بخاری نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ اور اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ترمذی نے ابوامامہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیوی اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا کھانا بھی خرچ نہ کرے؟ فرمایا: یہی تو ہمارے اموال میں افضل ہے"۔ الا یہ کہ اس سے وہ حدیث معارض ہے جسے بخاری نے ابوہریرہ سے ان الفاظ میں روایت کیا: جب عورت اپنے خاوند کی کمائی سے اس کے حکم کے بغیر خرچ کرے تو اس کے لئے آدھا اجر ہے"۔ اور غالباً" ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اگر عورت خاوند کی اجازت کرے تے وہ پورے اجر کی مستحق ہوتی ہے اور بغیر اجازت کرے تو نصف اجر کی۔ اور خاوند کے مال سے اس کے اذن کے بغیر خرچ کرنے کی ممانعت اس صورت میں ہے جب خاوند محتاج ہو یا بخیل ہو۔ اس صورت میں عورت کو اس کے اذن کے بغیر خرچ کرنا جائز نہیں اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو اسے بلا اجازت خرچ کرنا جائز اور اس کے لئے نصف اجر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عورت' غلام اور خادم کے خرچ کرنے سے مراد صاحب مال کے عیال پر ان کے مصالح میں خرچ کرنا ہے لیکن حدیث کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور بعض وہ ہیں جو بیوی اور خادم میں فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیوی کو خاوند کے مال میں اس کے گھر میں تصرف کا حق ہے لہٰذا اسے صدقہ کرنا جائز ہے بخلاف خادم کے کہ اسے مالک کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کا حق نہیں ہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ عورت کو بھی تصرف کا صرف اتنا ہی حق ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ اور جب وہ اس سے صدقہ کرے گی تو صدقہ کا اجر اس سے مختص ہو گا۔ پھر ظاہر یہی ہے کہ وہ دونوں اجر میں برابر ہیں اور یہ احتمال بھی ہے کہ مثل سے مراد مجملاً اجر کا حصول ہو اگرچہ کمانے والے کا اجر زیادہ ہوتا ہے۔ الا یہ کہ ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ "اس کے لئے نصف اجر ہے" جس سے مساوات ہی معلوم ہوتی ہے۔

٥٩٦ - وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال: جاءت زينب امرأة ابن مسعود، فقالت: يا رسول الله! إنك أمرت اليوم بالصدقة، وكان عندي حلي لي، فأردت أن أتصدق به، فزعم ابن مسعود أنه وولده أحق من تصدقت به عليهم، فقال النبي ﷺ: صدق ابن مسعود، زوجك وولدك أحق من تصدقت به عليهم. رواه البخاري.

ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابن مسعود کی بیوی زینب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یارسول اللہ! آج آپ نے صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا اور میرے پاس کچھ زیور ہے جسے میں صدقہ کرنا چاہتی ہوں۔ ابن مسعود کا یہ خیال ہے کہ وہ خود اور اس کا بیٹا اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ میں ان پر صدقہ کروں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابن مسعود نے سچ کہا۔ تیرا خاوند اور تیرا بیٹا اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ تو ان پر صدقہ کرے۔ اسے بخاری نے روایت کیا(ا)۔

(ا) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ صدقہ کرنے والے سے جو قریب تر ہو اس پر صدقہ کرنا افضل ہے۔ اور بظاہر اس حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرضی صدقہ یا زکوۃ تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ نفلی ہو لیکن پہلی بات زیادہ واضح ہے اور اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جسے بخاری نے زینب زوجہ ابن مسعود سے روایت کیا کہ: "یارسول اللہ! ہمارا صدقہ محتاج خاوند یا اس کے یتیم بچوں کو لگ جاتا ہے جو ہمارے زیر کفالت ہیں؟" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا۔ "تیرے لئے ایک صدقہ کا اجر ہو گا اور ایک قرابت کا"۔ اور مسلم نے بھی اسے روایت کیا اور فرضی صدقہ میں اس کے الفاظ زیادہ واضح ہیں کہ عورت نے پوچھا: "کیا کفایت کر جاتا ہے یا لگ جاتا ہے"؟ اور آپ نے جواب دیا کہ "صدقہ بھی ہے اور صلہ بھی"۔ اور اطلاق کے وقت صدقہ سے مراد واجبی صدقہ ہی ہوتی ہے اور مازنی نے یہی بات وثوق سے کہی ہے۔ اور یہ عورت کی خاوند پر زکوۃ لگ جانے کے جواز پر دلیل ہے اور یہی جمہور کا قول ہے۔ البتہ اس میں ابو حنیفہ نے اختلاف کیا ہے جبکہ اس کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس نص کا مقابلہ کر سکے اور اس نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ وہ پھر عورت کا نفقہ بن جاتا ہے گویا کہ اس عورت سے زکوۃ کی ادائیگی نہیں ہوئی۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ پھر تو مرد کا بیوی پر خرچ کرنا بالاتفاق لازم ہو گا۔ رہا خاوند تو اس کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس کی زکوۃ اس کی بیوی کو نہیں لگتی۔ وہ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ مرد پر بیوی کا نفقہ واجب ہے لہٰذا اس کو زکوۃ نہیں لگ سکتی۔ یہی بات مصنف نے فتح میں کہی ہے اور پچھلی بات کے متعلق مجھے توقف ہے کیونکہ غنی عورت جسے اپنے خاوند پر خرچ کرنا واجب ہو اسے ایسے غنی مرد کی غنی بیوی نہیں بنا دیتا جسے زکوۃ نہ لگ سکے۔

اور حدیث کے لفظ "اور اس کا بیٹا" اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بیوی کی زکوۃ خاوند کے بیٹے کو لگ جاتی ہے۔ مگر ابن المنذر نے بیٹے کو زکوۃ نہ لگنے پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور حدیث کو اس بات پر محمول کیا کہ وہ نفلی صدقہ ہے یا یہ کہ خاوند کو زکوۃ لگ جاتی ہے اور وہ اولاد پر خرچ کرنے والا ہے یا یہ کہ اولاد خاوند کی ہوتی ہے۔ اور وہ بچے زینب سے نہیں تھے۔ جیسا کہ ایک دوسری روایت کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے یا اس کے خاوند پر اور ان یتیموں پر جو اس کے زیر کفالت تھے۔ اور شاید وہ زینب کے خاوند کی اولاد ہوں اور انہیں یتیم اس لئے کہا ہو کہ وہ ماں کی طرف سے یتیم تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۹۷- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: **«لا يزال الرجل يسأل الناس، حتى يأتي يوم القيامة، وليس في وجهه مضغة لحم»**. متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص(۱) گداگری کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہو گی۔ متفق علیہ

(۱) اصل عبارت میں الرجل یعنی مرد ہے اور اس میں عورت بھی شامل ہے۔

یہ حدیث کثرت سوال کی قباحت پر دلیل ہے۔ اور اس بات پر کہ ہر سوال اس کے چہرہ کے گوشت کا ایک ٹکڑا اڑا لے جاتا ہے حتیٰ کہ کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس حدیث میں لفظ "لایزال" اور "الناس" عام ہیں جو دلیل سے مخصص ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ نیز یہ حدیث سوال کی قباحت میں مطلق ہے جبکہ بخاری نے یہ قید لگائی کہ جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لئے سوال کرے جیسا کہ آگے مذکور ہے۔ یعنی جو غنی ہونے کے باوجود سوال کرے۔ بخاری کے باب کا عنوان ہے۔ جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لئے سوال کرے وہ نہیں جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرے کیونکہ یہ اس کے لئے جائز ہے۔ اور عنقریب یہ وضاحت بھی آرہی ہے کہ غنی کیا ہے جس سے سوال کی ممانعت ہے۔ خطابی نے کہا کہ حدیث کے الفاظ "اس کے چہرہ پر گوشت کی بوٹی بھی نہ ہو گی" سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ اس کی کچھ قدر و منزلت نہ ہوگی یا اس کے چہرے میں عذاب دیا جائے گا حتیٰ کہ اس کا گوشت گر پڑے گا اور یہ سزا اسے اس مقام پر اس لئے دی جائے گی کہ سوال کی وجہ سے وہ بہت حقیر مقام ہو گا یا یہ اسے اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کا چہرہ ہڈی ہی ہڈی ہو گا اور اس کا شعار ہو گا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔ اور پہلی وجہ کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جسے طبرانی اور بزار نے مسعود بن عمرو سے روایت کیا: "بندہ غنی ہونے کے باوجود مانگتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کا چہرہ گھس جاتا ہے لہٰذا اللہ کے ہاں اس کا کوئی چہرہ نہیں رہتا"۔ اور اس بارے میں اور بھی کئی اقوال ہیں۔

۵۹۸- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«من سأل الناس أموالهم تكثراً، فإنما يسأل جمراً، فليستقل أو ليستكثر»**. رواه مسلم.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اپنی دولت بڑھانے کے لئے لوگوں سے سوال کرتا پھرتا ہے وہ دراصل آگ کے انگارے مانگ رہا ہے۔ چاہے تو کم اکٹھے کرے یا زیادہ کر لے"۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ا) ابن عربی نے کہا کہ حدیث کے الفاظ "وہ تو آگ کے انگارے مانگ رہا ہے"۔ کا معنی یہ ہے کہ وہ آگ کا تعاقب کر رہا ہے اور ممکن ہے یہ حقیقت ہو۔ کہ جو کچھ وہ لے رہا ہے آگ میں تپا کر اس سے اس کو داغا جائے جیسا کہ زکوۃ نہ دینے والے کو عذاب ہو گا۔ اور لفظ "چاہے تو کم لے لے" ازراہ استہزا ہے اور اسی طرح زیادہ لینے پر عطف ہے۔ یا یہ دھمکی کے باب سے ہے جیسے ارشاد باری ہے۔ اعملوا ما شئتم اور یہ دولت بڑھانے کی خاطر، مانگنے کی تحریم کو سمجھانے کے طور پر ہے۔

٥٩٩- وعن الزبير بن العوام رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: لأن يأخذ أحدكم حبله، فيأتي بحزمة الحطب على ظهره، فيبيعها، فيكف الله بها وجهه، خير له من أن يسأل الناس، أعطوه أو منعوه. رواه البخاري.

زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی رسی لے کر لکڑیوں ا ایک گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے پھر اسے فروخت کرے اور اس طرح اپنے چہرہ کو بچا لے(ا) یہ اس سے بہتر ہے کہ یہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے۔ چاہے تو اسے کچھ دے دیں اور چاہے تو نہ دیں(۲)۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

(ا) یعنی اس کی قیمت ہے۔

(۲) یہ حدیث حاجت کے باوجود سوال کرنے کی قباحت پر ایسے ہی دلالت کر رہی ہے جیسے اس سے پہلی حدیث دلالت کرتی ہے اور کمائی کرنے پر اکساتی ہے خواہ اسے مشقت اٹھانی پڑے۔ یہ اس لئے کہ جب سائل سوال کرتا ہے تو اسے سوال کی ذلت خود بھی محسوس ہوتی ہے اور جب مسئول کچھ نہ دے تو رد کی ذلت بھی ہوتی ہے علاوہ ازیں جب وہ مسئول کے پاس جاتا ہے تو اسے بھی ہر ایک کو دینے سے گھٹن محسوس ہوتی ہے اور جو شخص کما سکتا ہے اس کے سوال کرنے میں شافعیہ کے ہاں دو وجوہ ہیں جن میں صحیح یہ ہے کہ یہ بموجب ظاہر حدیث حرام ہے اور دوسری یہ کہ یہ تین شرطوں کے ساتھ مکروہ ہے ایک یہ کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے، دوسرے مانگنے میں اصرار نہ کرے، تیسرے مسئول کو دکھ نہ دے۔ ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو یہ بالاتفاق حرام ہے۔

٦٠٠ - وعن سمرة بن جندب رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«المسألة كدوح يكدح بها الرجل وجهه، إلا أن يسأل الرجل سلطاناً أو في أمر لا بد منه»**. رواه الترمذي، وصححه.

سمرۃ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوال کرنا دراصل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خارش کی طرح ہے جس سے کوئی شخص اپنے چہرے کو چھیل ڈالتا ہے۔ الا یہ کہ کوئی شخص بادشاہ سے سوال کرے یا اسے ایسا معاملہ درپیش ہو جس میں مانگنے کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور صحیح کہا(۱)

(۱) یعنی لوگوں سے مال کا سوال کرنا ایک خراش ہے جو اپنا نشان ڈال دیتی ہے۔ اور ایک روایت میں کدوح بمعنی زخم ہے۔ البتہ بادشاہ سے سوال کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ وہ اس بات کا سوال کرتا ہے جس کا بیت المال میں اس کا حق ہے اور بادشاہ کا سائل پر کچھ احسان نہیں کیونکہ وہ وکیل ہے اور اس کی صورت یہی ہے جیسے کوئی انسان اپنے وکیل سے مانگتا ہے کہ جو حق وکیل کے پاس ہے وہ اسے دے دے۔ اور کا ظاہر یہی ہے کہ انسان خواہ مال بڑھانے کے لئے بادشاہ سے مانگے اس میں نہ کچھ حرج ہے اور نہ گناہ۔ کیونکہ اس نے اسے ایسے کام میں حصہ دار بنایا ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ اور وہ کام جس کے بغیر چارہ نہیں اس کی تفسیر قبیصہ کی حدیث میں یوں ہے کہ: "تین آدمیوں کے علاوہ کسی کو سوال کرنا جائز نہیں۔ ایسا فقیر جو خاک نشین ہو جائے یا ایسا خون جو باعث درد و الم ہو یا ایسا تاوان جو انتہائی قبیح ہو"۔ الحدیث۔ اور حدیث کے الفاظ "یا ایسا معاملہ جس میں مانگے بغیر چارہ نہ ہو" یعنی ایسی مجبوری جو سوال کئے بغیر پوری ہی نہ ہو سکتی ہو۔ اور عنقریب قبیصہ کی حدیث آرہی ہے۔ جو اس بات کی پوری وضاحت پیش کرتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زکوۃ کی تقسیم کا بیان

یعنی وہ مصارف جو زکوۃ کی تقسیم میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائے۔

٧٠١- عن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**لا تحل الصدقة لغني إلا لخمسة: لعامل عليها، أو رجل اشتراها بماله، أو غارم، أو غاز في سبيل الله، أو مسكين تصدق عليه منها فأهدى منها لغني**». رواه أحمد وأبو داود وابن ماجه، وصححه الحاكم، وأعل بالإرسال.

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "صدقہ غنی کے لئے پانچ صورتوں کے علاوہ جائز نہیں: وہ عامل زکوۃ ہو' یا جس نے اپنے مال سے خریدا ہو یا مقروض ہو یا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو' یا کسی مسکین پر صدقہ کیا جائے اور وہ مسکین اس صدقہ میں سے کسی غنی کو کچھ دے۔ اسے احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا۔ اور مرسل ہونے کی وجہ سے یہ معلول ہے(ا)۔

(ا) بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ محدثین نے جو روایات کی ہیں ان سب میں علت ہے اور شرح میں ہے کہ مرسل ہونے کی علت صرف اس روایت میں ہے جو حاکم نے روایت کی اور اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔

اور غنی کی حد کے بارے میں مختلف اقوال ہیں جس کی بنا پر اسے زکوۃ لینا حرام ہو جاتا ہے۔ اور کوئی قول ایسا نہیں جس کے استدلال سے دل کو تسکین حاصل ہو۔ کیونکہ یہ مبحث اتنا بھی عاجز کرنے والا نہیں کہ اس کے لئے لغت کی تفسیر کی طرف رجوع کیا جائے اور اس لئے بھی کہ لغوی لحاظ سے یہ ایک نسبی امر ہے۔ جو کوئی قدر متعین نہیں کرتا۔ البتہ ایسی احادیث آئی ہیں جو غنی کی وہ قدر متعین کر دیتی ہیں جس سے اس کو زکوۃ لینا حرام ہو جاتا ہے۔ جیسے نسائی میں ابوسعید کی حدیث ہے کہ: "جس کے پاس ایک اوقیہ چاندی ہو اس نے اصرار سے مانگا"۔ اور ابوداؤد میں ہے "جس نے ایک اوقیہ چاندی یا اس کے برابر مالیت ہونے کے باوجود سوال کیا تو اس نے اصرار سے مانگا"۔ نیز ابوداؤد نے ہی روایت کی کہ: "جس نے سوال کیا اور اس کے پاس وہ کچھ تھا جو اسے غنی کر دے تو وہ آگ ہی جمع کرتا ہے"۔ لوگوں نے پوچھا کہ کتنی چیز اسے غنی بناتی ہے؟ فرمایا: "صبح اور شام کے کھانے کے بقدر"۔ اسے ابن حبان نے صحیح کہا۔ گویا غنی کی اس قدر پر سوال کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ رہی غنا کی وہ قدر جس سے زکوۃ لینا حرام ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ زکوۃ اس پر واجب ہوتی ہے جو دو سو درہم کا مالک ہو۔ بقول ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے اغنیاء سے وصول کروں اور تمہارے فقراء میں لوٹاؤں"۔ گویا آپ نے غنی اور فقیر کا تقابل کر کے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ جس پر زکوۃ واجب ہے' وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غنی ہے اور جس کو دی جائے وہ فقیر ہے۔ اس بارے میں یہی بات اقرب ہے جو ہی جا سکتی ہے اور ہم نے ایک سوال کے جواب میں ایک رسالہ میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔

نیز اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کے لئے زکوۃ حلال ہے خواہ وہ غنی ہو کیونکہ وہ اپنے کام کی اجرت لے رہا ہے فقر کی وجہ سے نہیں لے رہا۔ اسی طرح جس نے زکوۃ کے مال سے کوئی چیز رقم دے کر خرید لی وہ اس کے لئے جائز ہے۔ کیونکہ یہ زکوۃ کے مصرف کے موافق ہے اور وہ اس کی ملکیت ہو گئی۔ جب اس نے خرید لیا تو سودا کے وقت وہ زکوۃ کا مال نہ رہا بلکہ اس کی ملکیت بن گیا۔ اسی طرح قرض میں ڈوبا ہوا شخص اگر غنی ہو تب بھی اس کے لئے زکوۃ جائز ہے۔ اسی طرح غازی کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ زکوۃ کے مال سے تیاری کرے اگرچہ وہ غنی ہو کیونکہ وہ اللہ کی راہ میں کوشش کر رہا ہے۔ شارح نے کہا کہ اس سے وہ لوگ بھی مل جاتے ہیں جو مسلمانوں کے مصالح سے کسی مصلحت عامہ کو قائم کرنے والے ہوں جیسے قضاء' افتاء اور تدریس۔ اگرچہ وہ غنی ہوں اور ابو عبید نے ہر اس شخص کو جو مصلحت عامہ کے کام میں لگا ہو عاملین میں شمار کیا ہے اور بخاری نے بھی اس طرف اشارہ کر دیا جب کہا: "باب رزق الحاكم والعالمين عليها" اور رزق سے مراد وہ رزق ہے جو امام بیت المال سے ہر اس شخص کو دیتا ہے جو مسلمانوں کے مصالح جیسے قضاء افتاء اور تدریس کا کام کر رہا ہو۔ لہٰذا ایسے شخص کو اپنے کام کے عوض زکوۃ سے لے لینا چاہئے جب تک وہ اس کام میں لگا ہوا ہے اگرچہ وہ غنی ہو۔ طبری نے کہا کہ قاضی کو فیصلہ کرنے کی اجرت لینا جائز ہے اور جمہور کا یہی مذہب ہے کیونکہ وہ اس کام کے ہوتے ہوئے اپنی معاش کے لئے کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ سلف کی ایک جماعت نے اسے مکروہ سمجھا ہے لیکن حرام نہیں کہا۔ اور ایک جماعت نے کہا کہ قضاء پر اجرت لینا بیت المال کی آمدنی حلال ذرائع سے ہو تو وہ بالاجماع جائز ہے۔ اور اگر وہ چھوڑے تو محض پرہیزگاری کی بنا پر چھوڑے گا۔ اور ذرائع مشتبہ ہوں تو ترک بہتر ہے اور اگر بیت المال کی آمدنی کسی دوسرے طریق سے ہو تو وہ حرام ہے۔ اور اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر غالب ذرائع ایسے ہی ہوں تو وہ مال حرام ہوتا ہے۔ رہا قاضی کا فیصلہ کرنے والوں سے کچھ لینا تو اس کے جواز میں اختلاف ہے اور جو جائز سمجھتے ہیں انہوں نے اس کے لئے کئی شرطیں لگائی ہیں۔ جن کا ذکر باب القضاء میں آئے گا۔ یہ بات ضرور ہے کہ شارح نے جس بات سے یہاں تعرض کیا ہے ہم وہاں کریں گے۔

٦٠٢- وعن عبيد الله بن عدي بن الخيار ، أن رجلين حدثاه: أنهما أتيا رسول الله ﷺ يسألانه من الصدقة، فقلب فيهما البصر، فرآهما جلدين، فقال: إن شئتما أعطيتكما، ولا حظ فيها لغني، ولا لقوي مكتسب. رواه أحمد، وقواه أبو داود والنسائي.

عبداللہ(۱) بن عدی نے بن خیار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو آدمیوں نے اسے حدیث سنائی کہ وہ رسول اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زکوۃ کے مال میں سے کچھ مانگنے آئے تھے۔ آپ نے انہیں نظر(۲) بھر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ طاقتور ہیں۔ آپ نے انہیں فرمایا: "اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں لیکن صدقے میں غنی کا اور مضبوط کمانے کے قابل آدمی کا کوئی حصہ نہیں"۔ اسے احمد(۳) نے روایت کیا اور ابوداؤد اور نسائی نے قوی کہا۔

(۱) عبداللہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ تابعین میں شمار ہوتے ہیں' عمر' عثمان وغیرہما سے روایت کی۔

(۲) ایک دوسری روایت نے الفاظ میں اس کی تفسیر کی ہے۔ "آپ نے ہماری طرف نظر اٹھائی پھر اسے نیچے کر لیا"۔

(۳) احمد بن حنبل نے کہا' کیا اچھی حدیث ہے۔ اور حدیث کے لفظ "اگر تم چاہو"۔ کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ لینا ذلت ہے اگر تم اس پر راضی ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں یا یہ کہ زکوۃ طاقتور آدمی پر حرام ہے۔ اور اگر تم حرام کھانا چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ آپؐ نے انہیں یہ بات ازراہ سرزنش کہی اور سختی سے کہی۔

اور یہ حدیث غنی پر زکوۃ کے حرام ہونے کے دلائل میں سے ایک ہے اور آیت کا بھی صریح مفہوم یہی ہے۔ اور غنی کی تحقیق میں اختلاف کا ذکر پہلے گزر چکا۔ اور مضبوط' کمانے کے قابل آدمی بھی اپنے ہنر اور اپنی ہیئت کی وجہ سے غنی کے حکم میں ہے اور جس نے اس کو جائز قرار دیا اس نے اس حدیث کی تاویل کی جو قابل قبول نہیں۔

۶۰۳- وعن قبيصة بن مخارق الهلالي رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**إن المسألة لا تحل إلا لأحد ثلاثة: رجل تحمل حمالة، فحلت له المسألة حتى يصيبها، ثم يمسك، ورجل أصابته جائحة اجتاحت ماله، فحلت له المسألة حتى يصيب قواماً من عيش، ورجل أصابته فاقة، حتى يقوم ثلاثة من ذوي الحجى من قومه: لقد أصابت فلاناً فاقة، فحلت له المسألة حتى يصيب قواماً من عيش، فما سواهن من المسألة يا قبيصة سحت، يأكله صاحبه سحتاً**». رواه مسلم وأبو داود وابن خزيمة وابن حبان.

قبیصہ بن مخارق ہلالی(۱) رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں کے علاوہ کسی کے لئے سوال کرنا جائز نہیں۔ ایک وہ شخص جس نے کسی کی ضمانت کا بار اٹھایا (اور وہ اسے پڑ گئی) تو اس کے لئے مانگنا جائز ہے تا آنکہ وہ پوری ہو جائے۔ پھر رک جائے۔ دوسرا وہ شخص جس (کی کھیتی) پر کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناگہانی آفت پڑ جائے جو اسے تباہ کر دے اس کے لئے مانگنا جائز ہے تا آنکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ تیسرا وہ شخص جسے فاقوں کی نوبت آئے حتیٰ کہ اس کے قبیلے کے تین عقلمند آدمی یہ گواہی دیں کہ فلاں شخص واقعی فاقوں میں مبتلا ہے اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے تا آنکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ ان تینوں آدمیوں کے علاوہ جو بھی سوال کرتا ہے وہ حرام(۲) ہے۔ اور مانگنے والا حرام کھاتا ہے۔ اسے مسلم' ابوداؤد' ابن خزیمہ اور ابن حبان نے روایت کیا(۳)۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں وفد میں آئے۔ ان کا شمار اہل بصرہ میں ہوا ہے۔ ان سے ان کے بیٹے قطن وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(۲) اصل میں لفظ سحت آیا ہے۔ بمعنی ایسا مال جو کمائی کی وجہ سے حرام ہو یعنی اسے کمانا جائز نہ ہو اس لئے کہ اس سے برکت اٹھ جاتی ہے۔

(۳) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ تین طرح کے آدمیوں کے سوا باقی سب کو سوال کرنا حرام ہے۔ پہلا وہ شخص ہے جس نے ضمانت کا بار اٹھایا۔ وہ اس طرح کسی دوسرے کے قرضہ یا دیت کا بوجھ اٹھایا ہو یا دو فریقوں کے درمیان مال سے سمجھوتہ کرا رہا ہو اسے مانگنا جائز ہے اور اس کا ظاہر یہی ہے کہ خواہ وہ مالدار ہو کیونکہ یہ لازم نہیں کہ وہ اپنے مال سے ہی وہ بار ادا کرے۔ اور یہ ان پانچ آدمیوں میں سے ایک ہے۔ جسے زکوۃ کا مال لینا جائز ہے اگرچہ وہ غنی ہو۔ جیسا کہ ابوسعید کی حدیث میں گزر چکا۔ دوسرا وہ شخص جس کے مال کو کوئی ارضی یا سماوی آفت جیسے اولے یا سیلاب۔ یا کوئی اور آفت پہنچے جس سے اس کے پاس اتنا مال بھی باقی نہ رہے جس سے وہ گزر اوقات کر سکے۔ اسے اس وقت تک مانگنا جائز ہے جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔ تیسرا وہ شخص جسے فاقے آنے لگیں لیکن اسے صرف اس شرط پر مانگنا جائز ہے کہ اس کے علاقے کے تین اہل عقل و دانش اس کی حالت کی خبر دیں بے سمجھ اور لاپروا لوگوں کی شہادت مقبول نہ ہو گی۔

شافعیہ کا مذہب یہی ہے کہ اس نص کے مطابق تنگدستی پر تین سے کم کی شہادت مقبول نہیں اور دوسرے باقی سب شہادتوں پر قیاس کرتے ہوئے دو بھی کافی سمجھتے ہیں اور اس حدیث کو استحباب پر محمول کیا ہے۔ پھر یہ اس بات پر محمول ہے کہ وہ شخص غنی مشہور ہو پھر محتاج ہو جائے۔ تاہم اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی اس کے لئے مانگنا جائز ہے اور اگر اس کے فاقہ کی شہادت نہ دیں تو بھی اس کی بات قبول کی جائے گی۔ اور ابن ابی لیلیٰ کا مذہب یہ ہے کہ اسے سوال کرنا حرام ہے اور وہ عدل کے مقام سے گر جائے گا۔ اور اس حدیث کا ظاہر یہی ہے کہ ان مذکورہ تین آدمیوں کے علاوہ باقی سب کو مانگنا حرام ہے یا وہ بادشاہ سے مانگ سکتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٦٠٤- وعن عبد المطلب بن ربيعة بن الحارث رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «إن الصدقة لا تنبغي لآل محمد، إنما هي أوساخ الناس». وفي رواية: «وإنها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد». رواه مسلم.

عبدالمطلب بن ربیعہ بن حرث (۱) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائق نہیں وہ تو لوگوں کی میل (۲) ہے۔ اور ایک روایت (۳) میں ہے کہ صدقہ محمد اور آل محمد کے لئے جائز نہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) بن عبدالمطلب بن ہاشم مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے پھر دمشق چلے گئے اور وہیں ۶۲ ہجری میں فوت ہوئے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ آپؐ انہیں زکوۃ کے کسی کام پر عامل بنا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا .... الحدیث۔ اور اس میں قصہ ہے۔

(۲) یہ حرمت کی وجہ کی وضاحت ہے۔

(۳) یہ روایت بھی مسلم کی ہے اور عبدالمطلب سے ہی ہے۔

اس حدیث میں لاتنبغی سے مراد یہ ہے کہ جائز نہیں۔ نیز تحریم کا بھی فائدہ دیتا ہے۔ اور صحاح ستہ میں اس حدیث کے علاوہ عبدالمطلب مذکور کی اور کوئی حدیث نہیں۔ اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر زکوۃ کی حرمت پر دلیل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہونے پر تو اجماع ہے اور ابو طالب اور ابن قدامہ نے آپ کی آل پر بھی حرام ہونے پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ جبکہ ابوحنیفہ سے جواز منقول ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس صورت میں حرام ہے جب انہیں پانچویں کا پانچواں حصہ نہ ملے۔

اور یہ وہ تحریم ہے جس پر کئی احادیث دلالت کرتی ہیں ۔ اور جس نے اس میں اختلاف کیا اس کی تاویل کر کے کیا۔ حالانکہ تاویل تو اس وقت واجب ہوتی ہے جب کوئی ضرورت اس پر دلیل قائم کرتی ہو۔ اور یہ توجیہہ کہ یہ لوگوں کی میل ہوتی ہے اس بات کا فیصلہ کر دیتی ہے کہ آل محمد پر واجبی صدقہ حرام ہے نفلی نہیں۔ کیونکہ یہی وہ صدقہ ہے جو نکالنے والے کو پاک کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خذ من اموالھم صدقہ تطھرھم وتزکیھم بھا..... الا یہ کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی ہو جیسا کہ یہ کتب تفسیر میں معروف ہے اور ایک گروہ کا مذہب یہ ہے کہ آل پر صدقہ نفلی بھی حرام ہے اور ہم نے بھی دلائل میں عموم کی بنا پر ضوء النہار کے حواشی میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آل کو لوگوں کی میل کچیل کا مقام ہونے سے تکریم بخشی اور عزت افزائی کی ہے اور یہی وہ منصوص علت ہے۔

اور ابو نعیم نے جو اس کی علت مرفوعاً" روایت کی ہے وہ آل کے لئے پانچویں کا پانچواں حصہ ہے جو انہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کفایت کرتی اور زکوۃ سے بے نیاز کر دیتی ہے گویا یہ دونوں ہی منصوص علتیں ہیں اور کوئی شخص انہیں خمس دینے کا قائل نہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زکوۃ ان کے لئے حلال ہو جائے۔ کیونکہ اگر کوئی انسان اپنے مال اور حق کو روکتا ہے تو اس کے نہ دینے سے کوئی حرام چیز حلال نہیں بن جائے گی۔ اور ہم نے ایک مستقل رسالہ میں تفصیل سے یہ بحث پیش کی ہے۔

نیز آل سے مراد میں بھی اختلاف ہے اور اقرب وہی تفسیر ہے جو اس کے راوی زید بن ارقم نے پیش کی ہے کہ آل سے مراد آل عباس، آل علی، آل جعفر اور آل عقیل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی رو سے آل حارث بن عبدالمطلب بھی مراد ہے۔ یہ راوی کی تفسیر ہے اور یہ دوسری تفسیروں پر مقدم ہے۔ لہٰذا آل محمد کی تفسیر میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ کیونکہ لفظ آل مشترک ہے اور راوی کی تفسیر اس کے معنی کی مراد پر دلیل ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی زید بن ارقم نے تفسیر کی ہے اور یہ صحیح مسلم میں ہے۔ اور یہاں بنو ہاشم سے ان کی تفسیر کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ابولہب کی اولاد میں سے جو لوگ اسلام لائے انہیں بھی ان میں شامل کیا جائے تو یہ ایسی تفسیر ہو گی جو راوی کی تفسیر کے خلاف ہے۔ اسی طرح جن پر زکوۃ حرام ہے ان میں بنو عبدالمطلب بن عبدمناف بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ پانچویں حصہ کی تقسیم میں ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں جیسا کہ بعد میں آنے والی حدیث سے معلوم ہو رہا ہے اور وہ یہ ہے۔

٦٠٥- وعن جبير بن مطعم رضي الله تعالى عنه قال: مشيت أنا وعثمان بن عفان إلى النبي ﷺ، فقلنا: يا رسول الله! أعطيت بني المطلب من خمس خيبر وتركتنا، ونحن وهم بمنزلة واحدة، فقال رسول الله ﷺ: **«إنما بنو المطلب وبنو هاشم شيء واحد»**. رواه البخاري.

جبیر بن مطعم(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور عثمان بن عفان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے عبدالمطلب کے بیٹوں کو خیبر کے خمس سے حصہ دیا ہے اور ہمیں چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ اور ہم بلحاظ قرابت ایک سطح پر ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو ہاشم(۲) اور بنو عبدالمطلب ایک ہی چیز ہے(۳)۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

(۱) جبیر ابن مطعم ابن نوفل بن عبد مناف القرشی۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے اور مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے اور ۵۴ ہجری میں وفات پائی۔ اور اس کے علاوہ بھی کہا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) بنو ہاشم سے مراد آل علی، آل جعفر، آل عقیل، آل عباس اور آل حارث ہیں۔ آل ابولہب ان میں شامل نہیں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی بھی اسلام نہیں لایا۔ بعض کہتے ہیں کہ ان میں سے ابولہب کے دو بیٹے عتبہ اور معتب اسلام لائے اور خیبر کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔

(۳) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ بنو عبدالمطلب اور بنو ہاشم قرابت کی بنا پر حصہ پانے میں بھی مشترک ہیں اور تحریم زکوۃ میں بھی۔ دوسرے ان میں شامل نہیں اگرچہ وہ نسب کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اور اس کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلائی کہ ان لوگوں نے ازراہ موالات ہمیشہ آپ کا ساتھ دیا جیسا کہ آخر میں یہ وجہ بتلائی کہ: "ان لوگوں نے نہ جاہلیت میں ہمارا ساتھ چھوڑا اور نہ اسلام میں"۔ لہٰذا وہ احکام میں ایک ہی چیز ہو گئے۔ اور اس بارے میں یہ واضح دلیل ہے۔ شافعی کا یہی مذہب ہے جبکہ جمہور نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تفضل کی بنا پر حصہ دیا تھا استحقاق کی بنا پر نہیں دیا تھا۔ اور یہ بات ظاہر کے خلاف ہے۔ بلکہ آپ کا قول شيء واحد اس بات پر دلیل ہے کہ وہ بھی خمس کے استحقاق میں اور تحریم زکوۃ میں برابر کے شریک ہیں۔

جاننا چاہئے کہ بنو مطلب، مطلب بن عبدمناف کی اولاد ہیں اور جبیر بن مطعم، نوفل بن عبد مناف کی اولاد سے اور عثمان، عبد شمس بن عبد مناف کی اولاد سے تھے۔ گویا بنو عبدالمطلب اور بنو عبد شمس اور بنو نوفل ایک دوسرے کے چچا کی اولاد اور ایک ہی درجہ میں ہیں۔ اسی لئے عثمان اور جبیر بن مطعم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ اور بنو مطلب ایک درجہ پر ہیں کیونکہ وہ سب آپس میں چچا زاد بھائی تھے۔

۲۰۶ - وعن أبي رافع رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ بعث رجلاً على الصدقة من بني مخزوم، فقال لأبي رافع: اصحبني، فإنك تصيب منها، فقال: لا، حتى آتي النبي ﷺ، فأسأله، فأتاه، فسأله، فقال: مولى القوم من أنفسهم، وإنا لا تحل لنا الصدقة. رواه أحمد والثلاثة وابن خزيمة وابن حبان.

ابورافع(۱) رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مخزوم کے ایک آدمی(۲) کو زکوۃ وصول کرنے پر مقرر کیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ رہو میں تمہیں اپنی اجرت میں سے حصہ دے دوں گا۔ میں نے کہا کہ میں اس وقت تک یہ کام نہ کروں گا جب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لوں۔ چنانچہ میں آپ کے پاس آیا اور پوچھا تو آپ نے جواب دیا: قوم کا آزاد شدہ غلام انہی میں شمار ہوتا ہے اور ہمارے لئے صدقہ جائز نہیں(۳)۔ اسے احمد اور تینوں نے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے روایت کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) آپ ابورافع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں کہتے ہیں کہ ان کا نام ابراہیم ہے اور بعض ہرمز کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ عباس کے غلام تھے۔ عباس نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا۔ پھر جب عباس اسلام لائے تو ابو رافع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عباس کے اسلام لانے کی خوشخبری دی تو آپ نے انہیں آزاد کر دیا۔ حضرت علی کے دور خلافت میں فوت ہوئے جیسا کہ ابن عبدالبر نے کہا ہے۔

(۲) اس کا نام ارقم تھا۔

(۳) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ زکوۃ جیسے آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہے ویسے ہی آل محمد کے آزاد کردہ غلاموں پر بھی حرام ہے۔ ابن عبدالبر نے تمہید میں کہا کہ مسلمانوں میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ صدقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے' بنو ہاشم کے لئے اور ان کے آزاد کردہ غلاموں کے لئے حلال نہیں۔ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ آزاد کردہ غلاموں پر صدقہ حرام نہیں کیونکہ ان کے نسب مشترک نہیں اور اس لئے بھی کہ ان کا خمس میں حصہ نہیں ہوتا۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ایسی توجیہات نص پر مقدم نہیں لہٰذا یہ مردود ہیں جو نص کو اٹھا دیتی ہیں۔ ابن عبدالبر نے کہا کہ یہ چیز نص سے ثابت شدہ بات کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث آزاد کردہ غلاموں کے زکوۃ سے اجرت لینے کی تحریم پر نص ہے۔ تو آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بالاولیٰ یہ حرام ہوئی۔ کیونکہ جس آدمی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کی وصولی کے کام پر مقرر فرمایا تھا۔ اس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اس کام میں ابورافع اس کا ہاتھ بٹائے۔ اور وہ حصہ رسدی اجرت ابو رافع کو دے دے گا۔ اس کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی اجرت میں سے کچھ ابو رافع کو دے دے کیونکہ اس کا لینا ابورافع کے لئے جائز تھا۔ کیونکہ وہ ان پانچ قسم کے لوگوں میں شامل تھا جن کے لئے زکوۃ حلال ہے۔ اس لئے کہ کام کی اجرت پہلے اس آدمی کی ملک ہو گئی۔ اب وہ اپنی ملک میں سے جو ابو رافع کو دے گا تو وہ اس کے لئے حلال ہے اور یہ آپ کے اس قول کی نظیر ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ "اور وہ شخص جس پر صدقہ کیا جائے۔ پھر وہ اس میں سے تحفتہ" دے دے۔

٧٠ ـ وعن سالم بن عبد الله بن عمر، عن أبيه، أن رسول الله ﷺ كان يعطي عمر العطاء، فيقول: أعطه أفقر مني، فيقول: خذه، فتموله، أو تصدّق به، وما جاءك من هذا المال، وأنت غير مشرف ولا سائل، فخذه، ومالا فلا تتبعه نفسك. رواه مسلم.

سالم بن عبداللہ بن عمر اپنے باپ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی عمر بن خطاب کو کوئی عطیہ دیتے تو عمر کہا کرتے کہ: آپ یہ اس کو دے دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہے۔ تو آپؐ فرماتے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ لے لو اور مال دار ہو جاؤ یا پھر اسے صدقہ کر دو۔ اور جو مال آس لگائے یا سوال کئے بغیر ملتا ہو اسے لے لیا کرو۔ اور جو نہ ملے تو اس کی حرص نہ لگائے رکھو۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کو چاہئے کہ اپنے کام کی اجرت لے لے اور اسے واپس نہ کرے کیونکہ یہ حدیث اجرت کے بارے میں ہی ہے جیسا کہ مسلم کی روایت نے اس کی صراحت کر دی ہے۔

اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کے قول فحذہ میں امر استحباب کے لئے ہے۔ اور بعض وجوب کے لئے کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ہر طرح کے عطیہ میں مستحب ہے جو انسان کو دیا جائے۔ یہ اسے حدیث میں مذکور دو شرطوں کے تحت قبول کرنا مستحب ہے اس صورت میں ہے کہ جس مال سے اسے عطیہ دیا جارہا ہے وہ حلال ہو۔ رہا جور کرنے والے بادشاہ کا عطیہ جس میں حلال و حرام کی آمیزش ہوتی ہے تو ابن المنذر کہتے ہیں کہ اسے لے لینا جائز ہے اور اس میں رخصت ہے۔ اور دلیل یہ دی کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا کہ وہ جھوٹ کے لئے کان لگانے والے اور حرام کمائی کھانے والے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھ کر غلہ لیا تھا۔ حالانکہ آپ یہ بات جانتے تھے۔ یہی صورت ان سے جزیہ لینے کی ہے حالانکہ معلوم ہے کہ ان کا مال حلال نہیں۔ اور ان کے اکثر اموال تو خنزیر کی قیمت اور باطل معاملات سے جمع کردہ ہوتے ہیں۔

اور جامع کافی میں ہے کہ ظالم بادشاہ کا عطیہ رد نہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ معلوم ہے کہ یہ فلاں مسلم کا مال ہے جو بھی اس کا مالک ہے اس کو سپرد کرنا واجب ہے اور اگر مال مشکوک ہے تو یہ ایک زیادتی ہے۔ جسے اصل مالک کی طرف لوٹنا چاہئے۔ اور اگر یہ ظالم کا اصل مال ہے تو اس کے باطل ہونے کی بنا پر اس کے مال میں کمی واقع ہو گی اور ایسے مال کو وہ برے کاموں میں خرچ نہ کر سکے گا۔ یہ قواعد شرعیہ کے مطابق عمدہ قول ہے۔

البتہ شرط یہ ہے کہ قبول کرنے والا بذاتہ اپنے محسن کی اس محبت سے محفوظ ہو جو محسن کے لئے فطری طور پر نفوس میں پائی جاتی ہے کہ جو کسی سے بھلائی کرے وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ نیز یہ کہ کوئی دوسرا یہ وہم نہ کرے کہ بادشاہ جو کچھ لیتا ہے اور جو عطا کرتا ہے وہ حق پر ہے۔ اور ہم نے یہ بحث ضوء النہار کی کتاب البیع کے حواشی میں اس مقام کی نسبت بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روزوں کا بیان

صیام، صوم کی جمع ہے۔ لغوی لحاظ سے اس کا معنی محض کسی کام سے رکنا ہے اور شرعی لحاظ سے خاص طرح کا رکنا یعنی دن کے وقت کھانے پینے اور جماع وغیرہ سے مشروع طریق پر رکنا ہے۔ اور اس رکنے میں بے ہودہ اور گندی باتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جو مکروہ یا حرام ہیں۔ کیونکہ احادیث میں ان چیزوں کی عام دنوں سے زیادہ ممانعت آئی ہے۔ اور کچھ خاص شرائط بھی ہیں جن کی تفصیل آنے والی حدیث میں مذکور ہے۔ روزوں کی ابتداء ۲ ہجری سے ہوئی تھی۔

٦٠٨- عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«لا تقدموا رمضان بصوم يوم ولا يومين، إلا رجل كان يصوم صوماً فليصمه»**. متفق عليه.

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان کے استقبال(۱) کے لئے ایک دن کا روزہ یا دو روزے مت رکھو۔ البتہ جو شخص(۲) پہلے ہی ان آخری ایام ماہ میں روزے رکھنے کا عادی ہو، وہ رکھ سکتا ہے(۳)۔ متفق علیہ

(۱) اصل میں لفظ لاتقدموا آیا ہے جس میں یہ دلیل ہے کہ ماہ رمضان پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور احمد وغیرہ میں ابوہریرہ کی مرفوع حدیث یوں ہے: "یہ نہ کہو کہ رمضان آگیا کیونکہ رمضان تو اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے بلکہ یوں کہا کرو کہ ماہ رمضان آگیا"۔ یہ حدیث ضعیف ہے جو صحیح میں مذکور ثابت حدیث کے مقابلہ نہیں کر سکتی۔

(۲) بلوغ المرام کے نسخوں میں ایسے ہی الفاظ ہیں جبکہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں الا ان یکون رجل مصنف نے کہا کہ یکون تامہ ہے۔ یعنی ایسا آدمی پایا جائے۔ اور مسلم میں صرف الا رجلا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو عربی زبان کا قیاس ہے کیونکہ استثناء ساتھ ہی مذکور ہے۔

(۳) یہ حدیث رمضان سے پہلے ایک یا دو دن کے روزے رکھنے کی تحریم پر دلیل ہے۔ ترمذی نے یہ حدیث روایت کرنے کے بعد کہا کہ اہل علم کا اسی حدیث پر عمل ہے وہ اس بات کو مکروہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص رمضان کے آنے سے پہلے روزے رکھنا شروع کرے۔

اور نہی کی قید لگانے سے مراد یہ ہے کہ وہ احتیاطی روزہ سے مشروط ہو۔ الا یہ کہ وہ کوئی مطلق روزہ ہو جیسے نفلی یا نذر کا روزہ وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ روزہ خواہ کسی طرح کا ہو، اس قید کے بعد اس سے رمضان کے استقبال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا جواز لازم آئے گا اور یہ ظاہر نہی کے خلاف ہے کیونکہ یہ عام ہے جس سے حسب عادت ایام معلوم کے روزے کا استثناء کیا گیا ہے اور اتفاق سے یہ شعبان کا آخری دن ہو۔ اور جس قید کا اوپر ذکر ہے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی مراد ہوتی تو آپ یوں فرماتے۔ "مگر کوئی نفلی روزہ رکھنے والا"۔ یا کوئی ایسا ہی لفظ فرماتے۔ اور رمضان کے استقبال سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ شارع نے رمضان کے روزے کو رویت ہلال سے متعلق کیا ہے۔ گویا رمضان سے پہلے روزہ رکھنے والا نص کا مخالف ہے۔ خواہ وہ امر ہو یا نہی ہو۔ نیز اس میں باطنی فرقہ کا ابطال ہے جو رمضان کا چاند دیکھنے سے پہلے ہی ایک دو روزے رکھ لیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ صوموا الرویته میں ل استقبال کرنے والوں کے معنی میں ہے۔ حالانکہ اس حدیث سے صاف معلوم ہو رہا ہے۔ یہاں ل کو اس معنی پر محمول کرنا صحیح نہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے مقامات میں ان معنوں میں آیا بھی ہے۔

اور بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ روزوں پر سے یہ ممانعت شعبان کا پہلا نصف چھوڑ کر سولہویں شعبان سے شروع ہو جاتی ہے کیونکہ ابوہریرہ کی مرفوع حدیث ہے کہ "جب آدھا شعبان گزر جائے تو روزے نہ رکھو"۔ اسے اصحاب سنن وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نصف شعبان کے بعد روزے رکھنا مکروہ ضرور ہے لیکن حرام صرف رمضان سے پہلے ایک دو روزے رکھنا ہے۔ اور بعض دوسروں نے کہا کہ نصف شعبان کے بعد روزے رکھنا جائز ہے البتہ رمضان سے ایک دو دن پہلے رکھنا حرام ہے۔ رہا پہلے قول کا جواز تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل یہی ہے اور ابوہریرہ کی حدیث ضعیف ہے۔ اور احمد اور ابن معین نے کہا کہ وہ منکر ہے۔ رہا دوسرا قول یعنی رمضان سے پہلے ایک دو روزے رکھنا تو اس کی تحریم اسی مندرج حدیث کی بنا پر ہے اور یہی بہتر قول ہے۔

٦٠٩- وعن عمار بن ياسر رضي الله تعالى عنه قال: من صام اليوم الذي يشك فيه، فقد عصى أبا القاسم ﷺ. ذكره البخاري تعليقاً، ووصله الخمسة، وصححه ابن حبان.

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص شک کے دن کا روزہ رکھے اس نے ابوالقاسم (محمد) صلی اللہ علیہ وسلم (کے حکم) کی نافرمانی کی۔ اسے بخاری نے "تعلیقا" روایت کیا۔ اور پانچوں نے اسے وصل کیا(۱)۔ اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح کہا(۲)۔

(۱) عمار تک ۔ اور مصنف نے فتح الباری میں حاکم کا اضافہ کیا۔ انہوں نے اسے عمرو بن قیاس عن ابی اسحاق کے طریق سے وصل کیا ہے۔ اور ان کے نزدیک اس کے الفاظ یوں ہیں۔ "ہم عمار بن یاسر کے ہاں بیٹھے تھے۔ وہ ایک بکری بھون کر لے آئے اور کہنے لگے 'کھاؤ۔ تو ایک شخص الگ ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں روزہ دار ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمار نے کہا: ”جس نے روزہ رکھا .... الخ“۔

(۲) ابن عبدالبر نے کہا کہ ”ان کے نزدیک یہ حدیث مسند ہے اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں“۔ اور یہ حدیث لفظا“ موقوف لیکن حکما“ مرفوع ہے اور اس کا معنی ان احادیث سے مستفاد ہوتا ہے جو رمضان کے استقبال میں روزہ رکھنے کی نہی میں اور چاند دیکھ کر روزہ رکھنے کے حکم میں آئی ہیں۔

جاننا چاہئے کہ شک کا دن تیسویں شعبان کا دن ہی ہو سکتا ہے جب بادل یا کہر کی وجہ سے چاند نظر نہ آرہا ہو۔ یہ دن رمضان کا پہلا دن بھی ہو سکتا ہے اور شعبان کا آخری دن بھی۔ اور یہ حدیث اور اس کا مفہوم اس دن روزہ رکھنے کی تحریم پر دلالت کرتا ہے اور شافعی کا یہی مذہب ہے۔ صحابہ نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کسی نے کہا کہ اس دن کا روزہ جائز ہے اور کسی نے منع کیا اور اسے ابوالقاسم کی نافرمانی شمار کیا۔ اور دلائل حرام سمجھنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ رہی وہ حدیث جسے شافعی نے فاطمہ بنت حسین سے روایت کیا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”مجھے رمضان کا روزہ نہ رکھنے سے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں شعبان کا روزہ رکھ لوں“۔ یہ اثر منقطع ہے کیونکہ یہ محض شک کے دن کے بارے میں نہیں بلکہ کسی آدمی کی چاند کو دیکھنے کی شہادت دینے کے بعد کی ہے۔ چنانچہ آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو روزے رکھنے کا حکم دیا اور کہا کہ ”مجھے رمضان کا رزہ .... الخ“۔ اور جو بات اس بارے میں نص ہے وہ ابن عباس کی حدیث ہے کہ: ”اگر تمہارے اور چاند کے درمیان ابر حائل ہو جائے تو تیس کی گنتی پوری کرو اور استقبالی روزہ نہ رکھو“۔ اسے احمد' اصحاب سنن' ابن خزیمہ اور ابو یعلیٰ نے روایت کیا اور طیالسی نے ان الفاظ میں روایت کیا: ”شعبان کے آخری دن سے رمضان کا استقبال نہ کرو“۔ اسے دار قطنی نے بھی روایت کیا اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اسے صحیح کہا۔ اور ابوداؤد میں عائشہ کی حدیث یوں ہے: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کی تاریخوں کا جتنا دھیان رکھتے اور کسی مہینے کا نہ رکھتے اور چاند دیکھ کر روزہ رکھتے۔ یعنی رمضان کا چاند' پھر اگر ابر آلود ہوتا تو تیس دن شمار کرتے پھر روزہ رکھتے“۔ اور ابوداؤد نے حذیفہ کی مرفوع حدیث یوں روایت کی۔ ”جب تک چاند نہ دیکھ لو رمضان کا استقبالی روزہ نہ رکھو یا گنتی پوری کرو پھر روزے رکھو تا آنکہ ہلال دیکھ لو یا گنتی پوری کرو“۔ اور اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں جو شک کے روزے کی تحریم پر دلالت کرتی ہیں۔ انہی میں سے درج ذیل حدیث ہے

٦١٠- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «إذا رأيتموه فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، فإن غم عليكم فاقدروا له». متفق عليه، ولمسلم: فإن أغمي عليكم فاقدروا له ثلاثين. وللبخاري: فأكملوا العدة ثلاثين.

٦١١- وله في حديث أبي هريرة: فأكملوا عدة شعبان ثلاثين

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: جب تم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(رمضان کا) چاند دیکھو تو روزے شروع کر دو اور جب (شوال کا) چاند دیکھو تو چھوڑ دو۔ پھر اگر بادل وغیرہ ہوں تو تیس دن پورے کرو(۱)۔ متفق علیہ۔ اور مسلم میں ہے کہ: اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس دن پورے کرو۔ اور بخاری(۲) میں ہے کہ تیس کی گنتی پوری کرو۔ اور بخاری میں ہی ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ: "شعبان کی تیس دن کی گنتی پوری کر لو"(۳)۔

(۱) یہ حدیث رمضان کا چاند دیکھ کر رمضان کا روزہ رکھنے' اور شوال کا چاند دیکھ کر روزے چھوڑنے کے وجوب پر دلیل ہے۔ اور ظاہر یہی ہے کہ تمام مخاطبین کے چاند دیکھنے کی شرط ہے لیکن اس کے عدم وجوب پر اجماع قائم ہو چکا ہے۔ بلکہ اس سے مراد ایک یا دو عادل شخصوں کی شہادت ہے جن سے حکم شرعی ثابت ہو جائے۔ تاہم اس میں اختلاف ہے۔ اور "جب تم اسے دیکھو" سے مراد یہ ہے کہ تم میں وہ شخص موجود ہو جس نے چاند دیکھا ہو جو اس پر دلالت کرتا ہے کسی علاقے کی رویت تمام شہروں کی رویت ہے لہٰذا حکم لازم ہو جائے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا اعتبار نہ ہو گا کیونکہ "جب تم اسے دیکھو" میں سب لوگوں کو خطاب ہے جو اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اس مسئلہ میں کئی اقوال ہیں لیکن کسی کے پاس بھی کوئی کار آمد دلیل نہیں۔ اور اقرب یہ ہے کہ ایک شہر کی رویت اس سے متصل علاقوں کے لئے لازم ہوتی ہے اگر وہ اسی سمت میں ہوں۔

اور لرویتہ میں اس بات پر دلیل ہے کہ فرد واحد کی رویت سے اس پر روزہ رکھنا اور چھوڑنا لازم ہو جاتا ہے۔ ائمہ آل کا یہی قول ہے۔ اور ائمہ اربعہ کا روزہ رکھنے کے بارے میں ہے لیکن افطار کے بارے میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔ شافعی نے کہا کہ روزہ نہ رکھے لیکن اسے چھپائے رکھے۔ اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ احتیاطاً" روزہ رکھ لے۔ مصنف نے شرح میں ایسا ہی کہا ہے۔ لیکن وہ باب صلوۃ العیدین کی ابتداء میں کہہ چکا ہے کہ کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں کہ وہ اپنا یقین چھوڑ کر لوگوں کے حکم کے پیچھے لگ جائے ماسوائے محمد بن حسن شیبانی کے۔ اور جمہور یہ کہتے ہیں کہ جس بات کا اسے یقین ہو وہ حکم اس پر متعین ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں گزشتہ کلام سے تناقض ہے اور اختلاف کا سبب ابن عباس کا وہ قول ہے جو آپ نے کریب سے کہا: کہ وہ اہل شام کی رویت کا لحاظ نہ رکھے اور اہل مدینہ کی موافقت کرے اور شام کی رویت کے اعتبار سے اکتیس روزے رکھے کیونکہ اہل مدینہ کے ہاں یہ تیس دن کا مہینہ تھا۔ اور ابن عباس نے کہا کہ "سنت یہی ہے"۔ اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ اور یہ اس بارے میں نص نہیں ہے جس کے احتمال کے لئے انہوں نے احتجاج کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ لہٰذا حق یہی ہے کہ روزہ رکھنے اور چھوڑنے میں اپنے نفس کے یقین کے مطابق عمل کرے اور بہتر یہ ہے کہ اسے لوگوں سے چھپائے تاکہ لوگ اس کے متعلق بدظنی کے گناہ سے محفوظ رہیں۔

(۲) اور مسلم اور بخاری میں جو الفاظ کے اختلاف کا ذکر ہے یہ روایات بھی ابن عمر ہی سے ہیں۔

اور فاقدروالہ یہ امر ہے اور اس کا ہمزہ وصلی ہے اور د کے نیچے کسرہ ہے۔ اور ضمہ بھی آسکتا ہے۔ لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اور فاقدروالہ ثلاثین سے یہی مراد ہے کہ تیس کی گنتی پوری کرو۔ یعنی تیسویں دن روزہ نہ رکھو اور اسے پورا مہینہ شمار کرو۔ اور یہ اس کی سب سے اچھی تفسیر ہے۔ اس کی اور بھی کئی تفسیریں ہیں جنہیں شارح نے نقل کیا ہے اور وہ حدیث کی ظاہری مواد سے خارج ہیں۔ ابن بطال نے کہا۔ اس حدیث میں اہل نجوم کے حساب کا رد ہے اور اعتماد کے قابل چیز صرف چاند کی رویت ہے نیز ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے اور جو لوگ اہل نجوم کے حساب پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق روزہ رکھنا اور چھوڑنا جائز سمجھتے ہیں ان کا رد کرتے ہوئے باجی نے کہا کہ سلف کا اجماع ان پر حجت ہے اور ابن بزیزہ نے کہا کہ یہ مذہب باطل ہے کیونکہ شریعت نے علم نجوم میں غوروخوض سے منع کر دیا ہے کیونکہ وہ ظن و تخمین ہے یقینی بات نہیں ہوتا۔ شارح نے کہا کہ میں کہتا ہوں کہ اس کا جواب ابن عمر کی اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے جسے بخاری نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم امی امت ہیں ہم لکھنا اور حساب کرنا نہیں جانتے۔ مہینہ اتنا بھی ہوتا ہے اور اتنا بھی یعنی کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا"۔

(۳) یہ روزے کے حکم میں صریح ہے کہ یہ رویت کے مطابق ہو گا جیسا کہ اس روایت میں "اگر بادل ہو تو گنتی پوری کر لو"۔ یعنی شعبان کی۔ اور یہ سب احادیث اس معاملہ میں نصوص ہیں کہ روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کا انحصار صرف رویت ہلال یا گنتی پوری کرنے پر ہے۔

۶۱۲- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: تراأى الناس الهلال، فأخبرت النبي ﷺ أني رأيته، فصام، وأمر الناس بصيامه. رواه أبو داود، وصححه الحاكم وابن حبان.

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ لوگ چاند دیکھ رہے تھے۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے تو آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور حاکم اور ابن حبان نے صحیح کہا(۱)۔

(۱) یہ حدیث رمضان کے آغاز کے سلسلہ میں خبرواحد پر عمل درآمد ہونے پر دلیل ہے۔ اگر علم کے ایک گروہ کا یہی مذہب ہے۔ البتہ وہ اس میں عدالت کی شرط لگاتے ہیں اور دوسرے اس طرف گئے ہیں کہ کم از کم دو ہونا ضروری ہیں۔ کیونکہ یہ شہادت ہے۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے نسائی نے عبدالرحمٰن بن زید بن الخطاب سے روایت کیا کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میں نے ان سے سوال کیا اور انہوں نے مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی کہ: "چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر چھوڑو۔ پھر اگر بادل چھا جائیں تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔ الا یہ کہ دو گواہ گواہی دیں"۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سے معلوم ہوا کہ ایک گواہی کافی نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ مفہوم ہے اور بات وہی ہے جو ابن عمر کی حدیث ہے اور آگے مذکور اعرابی کی حدیث سے معلوم ہوتی ہے اور وہ اس حدیث سے قوی ہے اور خبر واحد کے مقبول ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ خواہ یہ خبر عورت کی ہو یا غلام کی' قبول کی جائے گی۔ رہا اس سے باہر ہونا تو ظاہر یہی ہے کہ روزہ رکھنے اور چھوڑنے میں خبر واحد کا کافی ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ رہی ابن عباس اور ابن عمر کی حدیث کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے چاند میں خبر واحد کو جائز رکھا ہے لیکن روزے چھوڑنے میں دو سے کم شہادتوں کو جائز نہیں رکھتے تھے"۔ اس حدیث کو دار قطنی نے ضعیف کہا اور کہا کہ اس میں حفص بن عمر ایلی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اور رمضان کے آغاز کے لئے خبر واحد کے مقبول ہونے میں درج ذیل حدیث بھی دلالت کر رہی ہے۔

٦١٣- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن أعرابياً جاء إلى النبي ﷺ فقال: إني رأيت الهلال، فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله؟ قال: نعم. قال: أتشهد أن محمداً رسول الله؟ قال نعم، قال: فأذن في الناس يا بلال أن يصوموا غداً. رواه الخمسة، وصححه ابن خزيمة وابن حبان، ورجح النسائي إرساله.

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں نے نیا چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں؟ اس نے کہا۔ ہاں۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟ وہ کہنے لگا۔ ہاں۔ پھر آپ نے بلال سے فرمایا: بلال! لوگوں میں منادی کردو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔ اسے پانچوں نے روایت کیا۔ اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح کہا۔ اور نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے(ا)۔

(ا) اس میں بھی پہلی حدیث کی طرح روزے شروع کرنے میں خبر واحد کے مقبول ہونے پر دلیل ہے اور اس بات پر دلالت ہے کہ مسلمانوں میں اصل بنیاد عدالت ہے کیونکہ آپ نے اس اعرابی سے شہادت کے سوا اور کچھ نہیں پوچھا۔ نیز یہ کہ چاند دیکھنے کا معاملہ خبر دینے کے قائم مقام ہے شہادت نہیں۔ نیز یہ کہ ایمان کے ثبوت میں دونوں شہادتوں کا اقرار کافی ہے۔ باقی تمام ادیان سے بیزاری لازم نہیں۔

٦١٤- وعن حفصة أم المؤمنين رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ قال: «من لم يبيت الصيام قبل الفجر فلا صيام له». رواه الخمسة، ومال الترمذي والنسائي إلى ترجيح وقفه، وصححه مرفوعاً ابن خزيمة وابن حبان.

وللدارقطني: «لا صيام لمن لم يفرضه من الليل».

حفصہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے فجر ہونے سے پہلے پہلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روزہ کی نیت نہیں کی اس کا کوئی روزہ نہیں"۔ اسے پانچوں نے روایت کیا۔ اور ترمذی اور نسائی اس حدیث کے موقوف ہونے کو ترجیح(۱) دینے پر مائل ہوئے۔ اور ابن خزیمہ اور ابن حبان اسے صحیح اور مرفوع کہتے ہیں۔ اور دار قطنی(۲) کے الفاظ یہ ہیں: جو شخص رات کو روزہ کی نیت نہیں کرتا اس کا کوئی روزہ نہیں۔

(۱) حفصہ پر

(۲) حفصہ سے

اس حدیث کے وقف اور رفع کے بارے میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ ابو محمد بن حزم نے کہا۔ اس میں اختلاف اس کی قوت کو بڑھا دیتا ہے کیونکہ جس نے اسے مرفوعا" روایت کیا اسی نے موقوفا" بھی روایت کیا۔ اور طبرانی نے اسے ایک دوسرے طریق سے روایت کیا اور کہا: اس کے سب رجال ثقہ ہیں۔ اور یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نیت کے بغیر روزے صحیح نہیں ہوتے۔ نیز یہ کہ رات کے کسی بھی حصے میں ان کی نیت کی جا سکتی ہے اور اس کا اول وقت غروب آفتاب ہے۔ یہ اس لئے کہ روزہ بھی ایک عمل ہے اور اعمال نیت سے ہوتے ہیں اور دن کے اجزاء رات سے اس طرح ملے ہوتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کن گھڑی متحقق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کا حل یہی ہے کہ رات کے ہی کسی حصہ میں نیت کر لی جائے۔ اور ہر روزہ کے لئے الگ الگ نیت کرنا شرط ہے اور یہی بات احمد کے مذہب میں مشہور ہے۔ نیز وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اگر مہینہ کے آغاز میں ہی نیت کر لے تو وہ کافی ہے اور اسے ابن عقیل کا یہ قول قوی کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "ہر شخص کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی"۔ اور اس شخص نے پورے مہینے کی نیت کی اور اس لئے بھی رمضان بمنزلہ ایک ہی عبادت ہے۔ کیونکہ اس کی رات کو روزہ کھولنا بھی عبادت ہے جو اس کے دن کے روزے کو مدد دیتا ہے۔ اور اس بات پر استدلال کے لئے طویل بحث کی جو اس کی قوت پر دلالت کرتی ہے۔

نیز یہ حدیث عام ہے خواہ روزے فرضی ہوں یا نفلی، قضاء کے ہوں یا نذر کے معین ہوں یا مطلق۔ اور اس بارے میں اختلافات بھی ہیں اور تفاصیل بھی۔ اور جو شخص نیت کے وجوب کا قائل نہیں اس نے بخاری کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ: "آپ نے عاشورا کے دن ایک آدمی بھیجا جو لوگوں میں منادی کر دے کہ جس نے (صبح سے) کچھ کھایا ہے وہ چاہے تو روزہ نہ رکھے اور چاہے تو رکھ لے اور جس نے نہیں کھایا وہ نہ کھائے"۔ وہ کہتے ہیں کہ عاشورا کا روزہ واجب تھا۔ پھر رمضان کے روزے واجب ہونے سے وہ منسوخ ہو گیا۔ اور وجوب کے نسخ سے اس کے باقی ماندہ احکام اٹھ نہیں جاتے۔ لہٰذا اسی پر رمضان کو قیاس کیا جائے گا اور انہیں بھی جو اس کے حکم میں ہیں جیسے نذر معین کے اور نفلی روزے۔ گویا اس نے فلا صیام لہ کے عموم کو قیاس سے خاص کر دیا اور حضرت عائشہؓ کی آگے مذکور حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسلم نفلی روزے بغیر نیت کے رکھ لیتے تھے۔

اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ عاشورا' کا روزہ رمضان کے روزہ کے برابر نہیں کہ اس پر قیاس کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف رک جانے کو لازم کیا تھا' جس نے کچھ کھایا تھا اسے بھی اور جس نے نہیں کھایا تھا اسے بھی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک امر خاص تھا۔ اور اس لئے بھی کہ کسی عذر کی بنا پر عاشورا کا بغیر نیت روزہ کفایت کر جاتا ہے اور اس پر دوسرے روزوں کو قیاس کیا جائے گا۔ جیسے کوئی سو گیا اور اس وقت جاگا جب صبح ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ اگر شام تک کچھ نہ کھانے کا حکم دیا گیا یا یہ کہ عاشورہ کا روزہ واجب تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شام تک کچھ نہ کھانے سے ان کا روزہ پورا بھی رہتا۔ رہی عائشہ کی حدیث تو وہ یہ ہے۔

٦١٥- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، قالت: دخل علينا النبي ﷺ ذات يوم فقال: هل عندكم شيء؟ قلنا: لا، قال: فإني إذاً صائم، ثم أتانا يوماً آخر، فقلنا: أهدي لنا حيس، فقال: أرينيه فلقد أصبحت صائماً، فأكل. رواه مسلم.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور کہا: کیا تمہارے پاس (کھانے) کو کوئی چیز ہے؟ ہم نے کہا: نہیں آپ نے فرمایا: اچھا پھر میں روزہ رکھ لیتا ہوں پھر ایک دن ہمارے پاس آئے تو ہم نے کہا کہ ہمیں کسی نے(۱) حلوہ کا تحفہ بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا: مجھے دکھلاؤ۔ میں صبح سے روزہ سے تھا(۲)۔ پھر آپ نے کھا لیا۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اصل عبارت میں لفظ حیس ہے۔ بمعنی وہ حلوا جو کھجور' گھی اور پنیر سے بنایا جاتا تھا۔

(۲) اس کا جواب یہ ہے کہ رزہ کی پہلے نیت ہی عام اصل ہے اور اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ نے روزہ کی نیت کی ہو اور محتمل بات عام اصل کی طرف ہی لوٹائی جاتی ہے کیونکہ بعض روایات میں عائشہ کی حدیث یوں ہے: "میں صبح سے روزہ رکھے ہوئے تھا"۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل یہی ہے کہ نیت والی حدیث میں عموم ہے اور فرضی' نفلی' قضاء اور نذر کے روزے میں کوئی فرق نہیں۔ اور ایسی کوئی چیز نہیں جو ان دونوں اصلوں کو اٹھا دے۔ لہذا ان اصلوں کا باقی رہنا متعین ہو گیا۔

٦١٦- وعن سهل بن سعد رضي الله تعالى عنهما، أن رسول الله ﷺ قال: «لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر» متفق عليه.

سہیل بن سعد(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں بھلائی اس وقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک رہے گی جب تک وہ روزہ جلد افطار کرتے(۲) رہیں گے۔ متفق علیہ۔

(۱) آپ ابوالعباس سہیل بن سعد بن مالک انصاری خزرجی ہیں۔ پہلے آپ کا نام حزن تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام سہل رکھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت پندرہ برس کے تھے۔ مدینہ میں ۹۱ ہجری میں فوت ہوئے اور بقول بعض ۸۸ ہجری میں۔ آپ آخری صحابی ہیں جو مدینہ میں فوت ہوئے۔

(۲) احمد نے اتنا زیادہ کیا کہ "سحری کھانے میں تاخیر کریں گے" اور ابوداؤد نے یہ زیادہ کیا: "کیونکہ یہود و نصاریٰ ستاروں میں چمک آنے تک افطار میں تاخیر کرتے ہیں۔ شرح المصابیح میں کہا کہ پھر ہماری امت میں دیر سی افطار اہل بدعت کا شعار اور ان کی علامت بن گیا۔

یہ حدیث روزہ جلد افطار کرنے کے مستحب ہونے پر دلیل ہے جب دیکھنے پر غروف آفتاب ثابت ہو جائے یا ایسا شخص خبر دے جو اس کا قائل ہو۔ نیز اس حدیث میں اس کی علت بھی مذکور ہے اور وہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت ہے مہلب کہتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ رات کا کچھ حصہ دن کی مدت کو بڑھا نہ دے۔ اور روزہ کے لئے بھی اس میں نرمی ہے اور عبادت پر اسے قوی رکھتی ہے۔ شافعی نے کہا: روزہ جلد افطار کرنا مستحب ہے اور تاخیر مکروہ نہیں۔ مگر اس شخص کے لئے جو عمداً ایسا کرے۔ اور اسے افضل سمجھتا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحر تک اسے مباح کیا ہے۔ جیسا کہ ابوسعید کی حدیث میں ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب اس سے مقصود نفس کے لئے اصلاح اور اس کے شہوت کو دور کرنا ہو تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔

۶۱۷- وللترمذي من حديث أبي هريرة، عن النبي ﷺ قال: قال الله عز وجل: ﴿أحب عبادي إلي، أعجلهم فطرا﴾.

اور ترمذی میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ عزوجل فرماتا ہے: مجھے میرے وہ بندے محبوب ہیں جو روزہ جلد افطار کرتے ہیں۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تاخیر کی نسبت تعجیل زیادہ پسند ہے اور سحری تک وصل کرنے کی اباحت جلد افطار کرنے سے افضل نہیں ہو سکتی۔ یا اس حدیث سے یہ مراد ہے کہ اللہ کو وہ بندے محبوب ہیں جو روزہ کھول دیتے ہیں۔ سحری تک وصل نہیں کرتے۔ رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو وہ اس حدیث کے عموم سے خارج ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی صراحت فرما دی کہ ان کا معاملہ عام لوگوں جیسا نہیں جیسا کہ حدیث آگے آرہی ہے۔ گویا آپ سب روزہ داروں سے زیادہ اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعالیٰ کے ہاں محبوب تھے اگرچہ آپ جلد افطار کرنے والوں سے نہ تھے کیونکہ آپ کو وصل کی اجازت دی گئی تھی خواہ یہ کئی دنوں کا ہو۔ جیسا کہ حدیث آگے آ رہی ہے۔

٦١٨- وعن أنس بن مالك رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**تسحروا، فإن في السحور بركة**». متفق عليه.

انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سحری کھایا کرو۔ کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ متفق علیہ(۱)

(۱) احمد میں ابوسعید کی حدیث میں یہ زیادہ ہے: "لہٰذا اسے چھوڑو نہیں' خواہ تم میں سے کوئی شخص پانی کا ایک گھونٹ ہی پی لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں پر رحمت نازل کرتے ہیں"۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ سحری کھانا واجب ہے۔ لیکن چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے وصل ثابت ہے لہٰذا اس وجوب کو استحباب کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اور وصال کے بارے میں حکم آگے آرہا ہے۔ اور ابن المنذر نے سحری کھانے اور اس میں مشار الیہ برکت کے مستحب ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔ اس میں سنت کی اتباع بھی ہے اور اہل کتاب کی مخالفت بھی کیونکہ مسلم میں مرفوع حدیث ہے کہ "ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں فرق سحری کھانا ہے"۔ سحری کھا لینے میں عبادت تقویٰ' طبیعت میں فرحت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ صدقہ کا سبب بھی بن جاتا ہے جب کوئی سائل سحر کے وقت سوال کرے۔

٦١٩- وعن سلمان بن عامر الضبي رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: «**إذا أفطر أحدكم فليفطر على تمر، فإن لم يجد فليفطر على ماء، فإنه طهور**». رواه الخمسة، وصححه ابن خزيمة وابن حبان والحاكم.

سلیمان بن عامر(۱) الضبی رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: جب تم روزہ کھولو تو کھجور سے کھولو۔ اور اگر کھجور نہ مل سکے تو پانی سے کھول لو۔ کیونکہ یہ پاک چیز ہے۔ اسے پانچوں نے روایت کیا۔ اور ابن خزیمہ اور ابن حبان اور حاکم(۲) نے صحیح کہا۔

(۱) ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں کہا کہ وہ صحابی نہیں ضبی سلیمان بن عامر مذکور کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی ہے۔

(۲) یہ حدیث عمران بن حصین سے بھی مروی ہے اور اس میں ضعف ہے اور انس کی حدیث کو ترمذی اور حاکم نے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ نیز ترمذی' نسائی وغیرہم میں انس کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسلم کا فعل ذکر کرتے ہوئے کہا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تازہ کھجوروں سے نماز سے پہلے افطار فرماتے اگر وہ نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے اگر وہ نہ ہوتیں تو چند گھونٹ پانی پی لیتے"۔ اور کھجوروں کی تعداد تین مذکور ہے اور اس بارے میں اور بھی روایات ہیں جو انہی معنوں میں ہیں جو ہم نے بیان کئے اور جو کچھ مذکور ہوا۔ وہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ سنت ہے۔ ابن قیم نے کہا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت پر کمال شفقت اور خیر خواہی ہے کیونکہ خالی معدہ کی صورت میں میٹھی چیز کو طبیعت فوراً قبول کرتی ہے اور اس سے قوت ہوتی ہے۔ خاص طور پر قوت باصرہ اس سے قوی ہوتی ہے۔ رہا پانی تو روزہ سے جگر میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر اسے پانی سے تر کر لیا جائے تو غذا سے پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں پانی اور کھجور میں ایسی خاصیت ہے جو دل کی اصلاح میں خاصا اثر رکھتی ہے اور اسے صرف دل کے ماہر اطباء ہی جانتے ہیں۔

٦٢٠- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن الوصال، فقال رجل من المسلمين: فإنك تواصل يا رسول الله؟ قال: وأيكم مثلي؟ إني أبيت يطعمني ربي، ويسقيني، فلما أبوا أن ينتهوا عن الوصال واصل بهم يوماً، ثم يوماً، ثم رأوا الهلال، فقال: لو تأخر الهلال لزدتكم، كالمنكل لهم حين أبوا أن ينتهوا. متفق عليه.

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصلی(۱) روزے رکھنے سے منع فرمایا۔ مسلمانوں میں سے ایک آدمی(۲) کہنے لگا: یا رسول اللہ! آپ تو وصلی(۳) روزے رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم میں سے میرے جیسا کون ہے۔ میں رات گزارتا ہوں۔ میرا رب مجھے کھلا بھی دیتا ہے اور پلا بھی دیتا ہے۔ پھر جب وہ وصال سے باز نہ آئے تو آپ نے ان کے ساتھ ایک دن کا وصال کیا پھر دوسرے دن کا۔ پھر لوگوں نے چاند دیکھ لیا۔ آپ نے فرمایا: اگر چاند نظر نہ آتا تو میں زیادہ وصال کرتا۔ جیسا کہ آپ انہیں باز نہ آنے کی سزا دے رہے تھے۔ متفق علیہ(۴)۔

(۱) اصل عبارت میں وصال ہے بمعنی رمضان میں شام کو روزہ نہ کھولنا اور راتوں کو بھی روزہ سے رہنا۔

(۲) مصنف نے کہا کہ مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

(۳) یہ حدیث شیخین کے نزدیک ابوہریرہ' ابن عمرؓ عائشہ اور انس سے مروی ہے اور صرف مسلم نے اسے ابو سعید سے بھی روایت کیا ہے۔ اور یہ وصال کی تحریم پر دلیل ہے کیونکہ اصل نہی ہی ہے۔ ابو سعید کی اس حدیث کے مطابق وصال سحر تک مباح ہے۔ "اگر تم میں سے کوئی وصل کا ارادہ رکھتا ہو تو سحر تک کر لے"۔ نیز ابو سعید کی حدیث میں یہ دلیل بھی ہے کہ رات کے بعض حصے تک روزہ سے رہنا بھی مواصلت ہے اور یہ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخص کا رد ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ رات کو روزہ نہیں ہوتا اور نہ اس کی نیت کرنا چاہئے۔ نیز اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ وصال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے ہے اور دوسرے کے حق میں اختلاف کیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں۔ مطلق حرام ہے اور بعض کہتے ہیں جس پر یہ شاق ہو اس پر یہ حرام ہے اور جس پر نہ ہو اس کے لئے مباح ہے۔ پہلی نہی والی رائے اکثریت کی رائے ہے کیونکہ اس کی اصل تحریم ہے۔ اور جو اسے حرام نہیں کہتا وہ اس بات سے استدلال کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کیا۔ اگر یہ نہی تحریم کے لئے ہوتی تو آپ اس پر خاموش نہ رہتے۔ جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ نہی کراہت کے لئے ہے اور یہ لوگوں پر رحمت اور تخفیف ہے۔ اور اس لئے بھی کہ ابوداؤد (ا) نے صحابی میں سے ایک آدمی سے روایت کیا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور وصلی روزے سے منع فرمایا اور صحابہ پر ان کی تحریم باقی نہیں رکھی"۔

اس کی سند صحیح ہے۔ اور ابقاء کا تعلق حدیث کے لفظ نہی سے ہے۔ اور بزار نے اور طبرانی نے اوسط میں سمرۃ کی حدیث یوں روایت کی کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال سے منع فرمایا اور یہ عزیمت (اصل حکم) نہیں"۔ نیز صحابہ کا وصلی روزے رکھنا بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند سے روایت کیا کہ: ابن الزبیر پندرہ دن وصل کیا کرتے تھے۔ اور یہ بات ان کے علاوہ ایک جماعت کے متعلق مذکور ہے۔ اگر وہ اسے حرام سمجھتے تو ایسا کبھی نہ کرتے۔ اور اس کے جواز پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے ابن سکن نے مرفوعا" روایت کیا کہ: "اللہ نے رات کے روزے فرض نہیں کئے۔ اب جو چاہے میری اتباع کرے اور اس کے لئے کچھ اجر نہیں"۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ وجہ کہ یہ نصاریٰ کا فعل ہے اس کی تحریم کا تقاضا نہیں کرتی اور جمہور کا عذر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے ساتھ وصل کیا تو یہ ان کی سرزنش اور سزا کے طور پر تھا۔ اور اس میں جواز کا بھی احتمال ہے اس لئے کہ تاکیدی نہی کی مصلحت انہیں ڈانٹنا تھا۔ کیونکہ جب صحابہ نے آپ کا ساتھ دیا تو ان پر نہی کی حکمت واضح ہو گئی اور اسے قبول کرنے کے لئے یہ طریقہ زیادہ موثر تھا کیونکہ وصلی روزے رکھنے سے عبادت سے اکتاہٹ ہوتی ہے اور اس میں کمی کرنا زیادہ اہم اور عبادات کے وظائف میں راجح تر ہے اور اقوال میں سب سے اقرب وصل نہیں فصل ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ایکم مثلی استفہام انکاری ہے اور اس میں ڈانٹ بھی ہے۔ یعنی میرے پروردگار کے ہاں میرا جو مرتبہ اور مقام ہے، تم میں سے کون ایسا ہو سکتا ہے۔ اور آپؐ کے قول "وہ مجھے

(ا) جو روایت نیل الاوطار میں ہے اس کے الفاظ اس روایت سے مختلف ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھلاتا اور پلاتا ہے"۔ میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے کہ آپ کو اللہ کے ہاں سے کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔ اور اس کا تعاقب یوں کیا گیا کہ اگر یہی بات ہے تو وصل کیسے رہا؟ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ آپ کو تکریم کے طور پر جو کھانا ملتا تھا وہ تکلیف کے منافی نہیں اور نہ ہی اس کا حکم دنیا کے کھانے کی طرح ہے۔ اور ابن قیم نے کہا کہ اس سے مراد اللہ کی طرف سے اس کے معارف کی روحانی غذا ہے جو آپ کی مناجات کی لذت سے آپ کے دل پر فیضان کرتی ہے اور اللہ کے قرب سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی رہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور شوق کی نعمت ملتی ہے پھر اس کے توابع ایسے احوال ہیں جو دلوں کی غذا' ارواح کے لئے نعمت' آنکھوں کی ٹھنڈک' نفوس کی تازگی کا سبب بنتے ہیں اور یہ قلب و روح کے لئے بہت کارآمد اور نفع بخش غذا ہے اور کبھی یہ غذا ایسی قوی ہو جاتی ہے جو بسا اوقات جسمانی غذاؤں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ جیسا کسی شاعر نے کہا ہے۔

لها حديث من ذكراك تشغلها   عن الشراب وتلهيها عن الزاد

کبھی وہ تیرے ذکر کی باتوں میں اس قدر منہمک ہو جاتی ہے کہ اسے کھانا اور پینا یاد بھی نہیں رہتا

لها بوجهك نور يستضاء له   ومن حديثك في اعقابها حادى

تیرے چہرہ کی روشنی ہی سے اسے روشنی ملتی ہے اور تیری باتیں ذکر کرنے کے بعد وہ گیت گانے لگتی ہے

اور جسے ادنیٰ سی بھی معرفت اور شوق ہو گا وہ جانتا ہے کہ قلب و روح کی غذا جسم کی بہت سی حیوانی غذاؤں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور بالخصوص وہ مطلوبہ چیز کے ملنے پر خوش و خرم ہو جاتا ہے۔ اس کے محبوب سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی اور اس کی قرب و رضا سے وہ ترو تازہ ہو جاتا ہے۔ ابن قیم نے تفصیل سے یہ معنی ذکر کئے اور کھلانے اور پلانے میں اسی وجہ کو پسند کیا ہے۔

رہا سحر تک وصال تو اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے جیسا کہ بخاری میں ابوسعید کی حدیث ہے کہ: اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: وصل نہ کیا کرو۔ پھر اگر کوئی شخص وصل کا ارادہ کرے تو سحر تک کر لے۔ رہی صحیحین میں عمر کی مرفوع حدیث کہ: "جب اس طرف سے رات آگے بڑھنے لگے اور اس طرف سے دن پیچھے ہٹنے لگے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ کھول دے۔ تو یہ وصال کے منافی نہیں اسی لئے کہ افطر سے مراد یہ ہے افطار کا وقت ہو گیا ہے یہ نہیں کہ فی الحقیقت وہی روزہ کھولنے کا وقت ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کیونکہ اگر حقیقتاً" یہی وقت روزہ کھولنے کا ہوتا تو جلد روزہ کھولنے پر ابھارا نہ جاتا۔ نہ وصال کی ممانعت ہوتی اور نہ سحر تک وصل کی اجازت دی جاتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۲۱- وعنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من لم يدع قول الزور، والعمل به، والجهل، فليس لله حاجة في أن يدع طعامه وشرابه». رواه البخاري وأبو داود، واللفظ له.

اور ابوہریرہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہیرا پھیری کی باتیں اور ان پر عمل کرنا اور جہالت کے کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کا کھانا اور پینا چھڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا۔ اور یہ لفظ ابوداود کے ہیں(۱)۔

(۱) یہ حدیث روزہ دار کے لئے جھوٹ بولنے، جھوٹ سے لوگوں کو دھوکا فریب دینے اور احمقانہ باتیں کرنے کی تحریم پر دلیل ہے۔ اور یہ دونوں باتیں غیر روزہ دار پر بھی حرام ہیں الا یہ کہ روزہ دار کے حق میں تحریم موکد ہے جیسے بوڑھے سے زنا کی، فقیر سے تکبر کی تحریم موکد ہے۔ اور حدیث کے الفاظ "اللہ کو کوئی ضرورت نہیں"۔ سے مراد ان جرائم کا ارتکاب بہت بڑا گناہ ہے اور یہ کہ اس کے روزے، روزے نہیں رہتے اور یہاں یہ معنی مفہوم کے اعتبار سے نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی اور کسی شخص کی احتیاج نہیں وہ تو پاک ذات ہے بے نیاز ہے۔ ابن بطال نے اس کا ذکر کیا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ عدم قبول کے لئے کنایہ ہے جیسے کسی غصہ میں بھرے ہوئے شخص کو جب کوئی چیز لوٹائے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ روزے کے ثواب کے مقابلہ میں ان چیزوں کی وجہ سے وہ سزا بڑھ جاتی ہے جس کا وہ مستحق ہو جاتا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ "اگر کوئی اسے گالی دے یا برا بھلا کہے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں"۔ لہٰذا نہ تو وہ پہلے کسی کو گالی دے اور نہ ہی جواب میں گالی دے۔

۶۲۲- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كان رسول الله ﷺ يقبل وهو صائم، ويباشر وهو صائم، ولكنه كان أملككم لأربه. متفق عليه، واللفظ لمسلم، وزاد في رواية: «في رمضان».

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں بوسہ بھی لے لیتے تھے اور معانقہ(۱) بھی کر لیتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ آپ اپنی خواہش(۲) پر سب سے زیادہ ضبط رکھ سکتے تھے۔ متفق علیہ۔ اور یہ لفظ مسلم کے ہیں۔ اور ایک روایت میں "رمضان(۳) میں" کے لفظ زیادہ ہیں۔

(۱) اصل عبارت میں لفظ یباشر ہے۔ اور مباشرت کا معنی ایک کی جلد دوسرے کے ساتھ لگنا ہے۔ بمعنی ملامست۔ اور کبھی یہ لفظ جماع کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مگر یہاں یہ مراد نہیں۔

(۲) اصل عبارت میں لفظ ادب آیا ہے۔ بمعنی نفس کی خواہش۔ مصنف نے تلخیص میں کہا کہ اس کا معنی ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے عضو کے لئے سب سے زیادہ ضبط رکھتے تھے۔

(۳) علماء نے کہا ہے کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ تمہیں بوسہ لینے سے پرہیز کرنا چاہئے اور تمہیں اس وہم میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ اس کام کے مباح ہونے میں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں ہو کہ آپ اپنے نفس پر کنٹرول رکھ سکتے تھے' اور بوسہ لینے سے آپ کو انزال یا شہوت یا ہیجان کا خطرہ نہیں ہوتا تھا لیکن تم ان باتوں سے محفوظ نہیں ہو۔ لہٰذا تمہارا طریق یہ ہونا چاہئے کہ نفس کو اس سے روکے رکھو۔ اور نسائی نے اسود کے طریق سے روایت کیا کہ: "میں نے عائشہؓ سے پوچھا۔ کیا روزہ دار معانقہ کر سکتا ہے؟ کہنے لگیں۔ نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں معانقہ نہیں کرتے تھے؟ کہنے لگیں کہ وہ تم سب سے زیادہ اپنی خواہش پر ضبط کرنے والے تھے"۔ اور اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا یہ اعتقاد تھا کہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختص ہے۔ قرطبی نے کہا کہ یہ حضرت عائشہؓ کا اجتہاد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت عائشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں کے لئے بوسہ لینا' مکروہ سمجھتی تھیں۔ اور یہ مکروہ تنزیہی تھا' تحریمی نہیں تھا جیسا کہ ان کا یہ قول "وہ تم سب سے زیادہ اپنی خواہش پر ضبط کرنے والے تھے" اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الصیام میں حماد بن سلمہ کی روایت ہے کہ: حضرت عائشہ سے روزہ دار کے معانقہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اسے مکروہ سمجھا۔ اور زیر بحث حدیث کا ظاہر یہی ہے کہ روزہ دار کے لئے بوسہ اور معانقہ جائز ہے اور اس کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ہے اور اس لئے بھی کہ حضرت عائشہ نے یہ حدیث اس شخص کے جواب میں بیان کی جس نے روزہ کی حالت میں بوسہ کے متعلق پوچھا تھا اور حضرت عائشہ نے اس کا فیصلہ کن جواب اس کے مباح ہونے کا دیا اور ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے تھا۔

اور اس مسئلہ میں کئی اقوال ہیں۔ پہلا قول مالکیہ کا ہے جو اسے مطلق مکروہ سمجھتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حرام ہے ان کا استدلال اس آیت سے ہے فالٰئن باشروھن گویا دن کے وقت مباشرت سے منع کر دیا گیا۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس آیت میں مباشرت سے مراد جماع ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی وضاحت ہے جیسا کہ متعلقہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بوسہ لینا حرام ہے اور جو بوسہ لے اس کا روزہ باطل ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ مباح ہے اور بعض ظاہریہ نے مبالغہ کیا اور کہا کہ یہ مستحب ہے۔

چوتھا قول فرق کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جوان کے لئے حرام اور بوڑھے کے لئے مباح ہے اور اس کی دلیل ابوداؤد کی روایت ہے جو ابن عباس سے مروی ہے کہ: "ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور روزہ دار کے معانقہ سے متعلق پوچھا تو آپ نے اسے رخصت دے دی۔ پھر ایک اور شخص نے آکر یہی سوال کیا تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ نے اسے منع فرمایا۔ کیونکہ جس شخص کو آپ نے رخصت دی وہ بوڑھا تھا اور جسے منع کیا وہ جوان تھا"۔

پانچواں قول یہ ہے جو شخص اپنے آپ پر ضبط رکھ سکا ہو اس کے لئے جائز ہے ورنہ نہیں اور یہ قول شافعی سے مروی ہے۔ اس نے عمرو بن ابی سلمہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو اسے اس کی والدہ ام سلمہ نے خبر دی کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کر لیتے تھے۔ اس نے کہا: یارسول اللہ! آپ کے تو اللہ نے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں"۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بوڑھے اور جوان میں کوئی فرق نہیں۔ ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرو سے اس کی وضاحت فرما دیتے بالخصوص جبکہ عمرو جوانی کے آغاز میں تھے۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا جیسا کہ ظاہر ہے کہ ان اقوال میں سے قوی قول اباحت کا ہے اور اس پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے احمد اور ابو داؤد نے عمر بن خطاب کی حدیث سے روایت کیا کہ: "میں ایک دن کچھ ہلکا ہوا اور روزہ کی حالت میں بوسہ لے بیٹھا۔ پھر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا۔ آج میں ایک بڑا کام کر بیٹھا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: بھلا دیکھو۔ اگر تم روزہ کی حالت میں پانی سے کلی کر لو تو؟ میں نے کہا۔ اس میں کیا حرج ہے؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر اس میں بھی کچھ ہرج نہیں"۔

پھر اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ جب کوئی شخص بوسہ لے' یا دیکھے یا معانقہ کرے تو اسے انزال ہو جائے یا مذی نکل آئے۔ شافعی وغیرہ سے منقول ہے کہ جب کسی غیر عورت کی طرف دیکھنے سے اسے انزال ہو جائے تو روزہ کی قضاء دے اور اگر مذی نکلے تو قضاء نہیں۔ اور مالک نے کہا کہ ہر ایک کے لئے قضاء بھی دے اور کفارہ بھی مگر مذی نکلنے کی صورت میں صرف قضاء دے۔ اور اس میں اور بھی اختلاف ہیں۔ اور واضح بات یہی ہے کہ اس میں نہ قضاء ہے اور نہ کفارہ۔ قضاء یا کفارہ صرف جماع کرنے والے پر ہے۔ جماع نہ کرنے والے پر قضاء اور کفارہ بعید از قیاس ہے۔

تنبیہ - حدیث کے لفظ وھو صائم اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ وہ مرد عورت کا بوسہ لے اور وہ عورت روزہ دار ہو۔ چنانچہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں عائشہؓ سے روایت کیا کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرضی اور نفلی روزہ میں اپنی کسی بیوی کا بوسہ لے لیا کرتے تھے"۔ پھر اس کی سند بیان کی کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی روزہ دار بیوی کا چہرہ نہیں چھوتے تھے"۔ اور کہا کہ ان دونوں حدیثوں میں تضاد نہیں۔ اس لئے کہ آپ اپنی خواہش پر کنٹرول رکھ سکتے تھے۔ آپ کے اس فعل سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص اپنے آپ پر قابو رکھ سکتا ہو اس کے لئے یہ کام جائز ہے اور جب یہ معلوم ہو کہ روزہ دار بیوی سے ایسا کام کرنے سے کمزوری کی بنا پر اس پر جذبات غالب آجائیں گے۔ تو ایسا کام نہ کرے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٦٢٣- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ احتجم وهو محرم، واحتجم وهو صائم. رواه البخاري.

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں بھی پچھنے لگوائے اور روزہ کی حالت میں بھی۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

کہتے ہیں کہ اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ آپ سے یہ دونوں کام الگ الگ واقع ہوئے۔ ایک دفعہ آپ نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے اور ایک دفعہ احرام کی حالت میں۔ لیکن یہ ایک ہی وقت میں واقع نہیں ہوئے۔ کیونکہ جب آپ محرم تھے تو روزہ دار نہیں تھے۔ آپ نے حجتہ الوداع کے موقعہ پر احرام باندھا اور اس وقت رمضان نہیں تھا۔ فتح مکہ کا سفر آپ نے رمضان میں کیا اس وقت آپ نے عمرہ کے لئے احرام نہیں باندھا۔ البتہ یہ احتمال ہے کہ آپ نے نفلی روزہ رکھا ہو مگر اس کا علم نہ ہو سکا ہو۔ اور اس حدیث میں کئی روایات ہیں۔ احمد نے کہا کہ ابن عباس کے اصحاب روزوں کا ذکر نہیں کرتے اور ابو حاتم نے کہا کہ اس میں شریک نے غلطی کی کہ آپ نے پچھنے لگوائے اور حجام کو اس کی اجرت بھی دی۔ اور شریک نے اپنی یادداشت سے حدیث بیان کی اور اس کی یادداشت بڑی تھی۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے صرف پچھنے لگوائے تھے جبکہ حدیث میں یہ احتمال ہے کہ یہ الگ الگ واقعات سے متعلق خبر ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ کسی وقت آپ نے احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے اور کسی دوسرے وقت آپ نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ کسی وقت بھی آپ کو بیک وقت محرم اور روزہ دار ہونے کا اتفاق نہیں ہوا۔ رہی شریک کی غلطی اور اس لفظ کو نقل کرنا تو یہ امر بعید ہے اور اسے اس کی روایت کے صحیح لفظ پر محمول کرنا اور اس کی تاویل کرنا ہی بہتر ہے۔ اور روزہ دار کے پچھنے لگوانے میں اختلاف ہے۔ اکثر ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ وہ کہتے ہیں کہ شداد بن اوس کی حدیث اس کی ناسخ ہے اور وہ یہ ہے۔

٦٢٤- وعن شداد بن أوس رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ أتى على رجل بالبقيع، وهو يحتجم في رمضان، فقال: أفطر الحاجم والمحجوم. رواه الخمسة إلا الترمذي، وصححه أحمد وابن خزيمة وابن حبان.

شداد بن اوس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بقیع میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جو رمضان میں پچھنے لگوا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ پچھنے لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ اسے ترمذی کے سوا پانچوں نے روایت کیا۔ اور احمد' ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح کہا(ا)۔

(ا) اس حدیث کا بخاری وغیرہ نے صحیح کہا ہے اور ائمہ حدیث سے اسے سولہ صحابہ سے روایت کیا ہے۔ سیوطی نے جامع الصغیر میں کہا کہ یہ حدیث متواتر ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ پچھنے لگوانے سے پچھنے لگانے والے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کچھ تھوڑے سے لوگوں کا یہی مذہب ہے۔ احمد بن حنبل اور آپ کے پیرو اسی شداد کی حدیث کی بنا پر اس کے قائل ہیں۔ اور باقی لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ پچھنے لگوانے والے کا تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے مگر لگانے والے کا نہیں ٹوٹتا۔ ان کا عمل شداد کی اس حدیث کی طرف پر ہے اور طرف اول سے مراد محجوم کہ' یعنی پچھنے لگوانے والا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کونسی چیز اس حدیث کے ایک حصے کو چھوڑ کر دوسرے حصے کو واجب العمل بناتی ہے۔ رہے جمہور تو وہ اس بات کے قائل ہیں کہ نہ پچھنے لگانے والے کا روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ لگوانے والے کا۔ وہ شداد کی اس حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ ابن عباس کی حدیث اس سے بعد کی ہے۔ کیونکہ وہ حجتہ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور ۱۰ ہجری تھا۔ اور شداد فتح مکہ میں آپ کے ساتھ تھے جیسا کہ شافعی نے بیان کیا ہے۔ نیز شافعی نے کہا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اس سے احتیاطا" بچنا ہی چاہئے۔ اور نسخ کی تائید انس کی اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے جس میں جعفر بن ابی طالب کا قصہ مذکور ہے۔ نیز حازمی نے بھی ابوسعید سے ایسی ہی حدیث روایت کی ہے۔ ابو محمد بن حزم نے کہا کہ پچھنے لگانے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ جانے والی حدیث بلا شک و شبہ ثابت ہے لیکن ہمیں یہ حدیث بھی ملتی ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو پچھنے لگوانے سے اور وصل کرنے سے منع کیا تاہم اپنے اصحاب پر باقی رکھنے کے لئے ان دونوں چیزوں کو حرام نہیں کیا"۔ اس کی سند صحیح ہے۔ نیز ابن ابی شیبہ نے ابوسعید کی حدیث روایت کی جو اس کی تائید کرتی ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو پچھنے لگوانے کی رخصت دی"۔ اور یہ تو واضح ہے کہ رخصت عزیمت (اصل حکم) کے بعد ہی ہوتی ہے۔ جو اس کے نسخ پر دلالت کرتی ہے خواہ وہ پچھنے لگانے والا ہو یا لگوانے والا۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کراہت پر دلالت کرتی ہے اور انس کی آنے والی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔
اور بعض یہ کہتے ہیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات صرف ایک خاص موقعہ پر فرمائی تھی۔ آپ ایسے آدمیوں پر گزرے جو لوگوں کی غیبت کر رہے تھے"۔ اسے وحاظی نے یزید بن ربیعہ سے' ابوالاشعث صنعانی سے روایت کیا کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہ پچھنے لگانے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ گیا ان آدمیوں کو کہی تھی جو لوگوں کی غیبت کر رہے تھے"۔ اس تاویل کے متعلق ابن خزیمہ نے کہا کہ یہ کیسی عجب بات ہے کہ اس تاویل کا قائل بھی یہ نہیں کہتا کہ غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور احمد نے کہا' بھلا کون غیبت سے بچا ہوا ہے؟ اگر غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو ہم میں سے کسی کا بھی روزہ نہیں۔ شافعی نے اس قول کی یہی توجیہ کی ہے غیبت سے روزہ ٹوٹ جانے کو روزے کے اجر سے محرومی پر محمول کیا۔ اور اس کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے جو آپ نے خطیب کے خطبہ کے دوران بولنے والے کے حق میں کہا کہ: "اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا کوئی جمعہ نہیں"۔ لیکن آپ نے اسے دہرانے کا حکم دیا جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد اجر کا ضائع ہونا ہے۔ اس صورت میں اسے اعجوبہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں جیسا کہ ابن خزیمہ نے کہا ہے۔ اور بغوی نے کہا کہ ان کے روزہ ٹوٹ جانے سے مراد ان کا روزہ توڑنے کے درپے ہونا ہے کیونکہ سینگی لگانے والا جب خون کو چوستا ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ حصہ اس کے اندر چلے جانے سے وہ بچ نہیں سکتا۔ رہا لگوانے والا تو وہ خون نکلنے کی وجہ سے اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ روزہ کھولنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ابن تیمیہ نے اس تاویل کے رد میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "سینگی لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا"۔ یہ دونوں کے روزہ ٹوٹنے میں صریح حکم ہے۔ للذا یہ جائز نہیں کہ ان کا روزہ باقی سمجھا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے روزہ ٹوٹنے کی خبر دے رہے ہوں۔ بالخصوص اس صورت میں کہ یہ قول علی الاطلاق ہے اور کوئی قرینہ بھی ایسا نہیں کہ اس کے ظاہر کے علاوہ کچھ اور مراد لی جا سکے۔ اب اگر کوئی شخص اس کی حقیقت کو چھوڑ کر روزہ ٹوٹنے کا کوئی قریبی مفہوم جائز سمجھے تو یہ اس حدیث کے حکم کی وضاحت نہیں بلکہ اسے مشکوک بنانا ہو گا۔

میں کہتا ہوں کہ بلا شبہ یہ وہی بات ہے جس پر درج ذیل حدیث دلالت کر رہی ہے۔

۶۲۵- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: أول ما كرهت الحجامة للصائم، أن جعفر بن أبي طالب احتجم وهو صائم، فمر به النبي ﷺ فقال: أفطر هذان. ثم رخص النبي ﷺ بعد في الحجامة للصائم، وكان أنس يحتجم وهو صائم. رواه الدارقطني، وقواه.

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رزہ دار کے سینگی لگوانے کی کراہت کی ابتداء یوں ہوئی کہ جعفر بن ابی طالب نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے تو فرمایا کہ: ان دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ پھر اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو سینگی لگوانے کی رخصت دے دی۔ اور انس خود روزے کی حالت میں سینگی لگوا لیا کرتے تھے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا اور قوی کہا۔

دار قطنی نے کہا کہ اس کے رجال ثقہ ہیں اور اس میں کوئی علت معلوم نہیں ہو سکی۔ اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ یہ حدیث بھی شداد کی حدیث کے نسخ کے دلائل میں سے ہے۔

۶۲۶- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ اكتحل في رمضان وهو صائم. رواه ابن ماجه بإسناد ضعيف، وقال الترمذي: لا يصح فيه شيء.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگا لیا کرتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند سے روایت کیا اور ترمذی نے کہا کہ اس باب میں کوئی بھی حدیث صحیح نہیں۔
پھر ترمذی نے کہا کہ اہل علم نے روزہ دار کے سرمہ لگانے میں اختلاف کیا ہے اور بعض اسے مکروہ سمجھتے ہیں جیسے سفیان' ابن المبارک' احمد اور اسحاق۔ اور بعض اہل علم نے روزہ دار کو سرمہ لگانے کی رخصت دی ہے اور یہ شافعی کا قول ہے۔ اور ابن شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "جسم میں داخل ہونے والی چیز سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے خارج ہونے والی سے نہیں"۔ اور جب اس نے اس کا مزا پایا تو گویا وہ چیز داخل ہوئی۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ہم اسے داخل ہونے والی چیز تسلیم نہیں کرتے کیونکہ آنکھ کوئی نفوذ کا راستہ نہیں ہے وہ تو مسام سے ملی ہوتی ہے۔ کبھی انسان حنظل (تمہ) سے اپنے پاؤں رگڑتا ہے تو اس کا مزا (کڑواہٹ) اپنے منہ میں محسوس کرتا ہے لیکن اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ نیز اس حدیث الفطر مما دخل کو بخاری نے ابن عباس سے تعلیقاً روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے اسے موصول کیا۔ رہی وہ حدیث جسے ابوداؤد نے سرمہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ: "روزہ دار کو اس سے بچنا چاہیے"۔ تو اس کے متعلق ابو داؤد نے کہا کہ مجھ سے یحییٰ بن معین نے کہا کہ یہ منکر ہے۔

٧٢٢- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من نسي وهو صائم، فأكل أو شرب، فليتم صومه، فإنما أطعمه الله، وسقاه». متفق عليه.

وللحاكم: من أفطر في رمضان ناسياً فلا قضاء عليه ولا كفارة. وهو صحيح.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی روزہ دار بھول کر کچھ کھا لے یا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کر لے۔ یہ تو اسے اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے(ا)۔ متفق علیہ۔ اور حاکم میں ابوہریرہ کی روایت ہے کہ جس نے رمضان میں روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لیا۔ تو اس پر نہ قضاء ہے اور نہ کفارہ۔ اور یہ حدیث صحیح ہے(۲)۔

(ا) اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ وہ تو ایسا رزق ہے جو اللہ نے اس کی طرف بھیج دیا۔

(۲) اور من افطر کا استعمال جماع کو بھی عام ہے اور کھانے پینے کا بالخصوص اس لئے نام لیا گیا کہ اکثر ان دو چیزوں میں ہی بھول لگتی ہے۔ ابن دقیق العید نے ایسا ہی کہا ہے۔ اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص بھول کر کچھ کھا لے یا پی لے یا جماع کر لے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹا اور اس پر دلیل فلیتم صومہ کے الفاظ ہیں کہ وہ حقیقتاً" روزہ دار ہی ہے۔ اور یہ جمہور' زید بن علی' باقر' احمد بن عیسیٰ' امام یحییٰ اور فریقین کا قول ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے اس بات کے قائل ہیں کہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ روزہ توڑنے والی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیزوں سے رکے رہنا روزہ کا رکن ہے۔ اور اس کا حکم وہی ہے جو نماز کا رکن بھولنے والے کا ہے کہ اس پر اعادہ واجب ہے خواہ بھول کر چھوڑے اور آپ کے ارشاد فليتم صومه کی یہ تاویل کی کہ وہ روزہ توڑنے والی چیزوں سے رکا رہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "نہ اس پر قضاء ہے نہ کفارہ"۔ کے الفاظ اس کے روزہ کے صحیح ہونے اور اس کی قضاء نہ دینے میں صریح ہیں۔ چنانچہ دار قطنی نے قضاء کے ساقط ہونے میں ابو رافع' سعید مقبری' ولید بن عبدالرحمن اور عطاء بن یسار سے روایت کی ہے اور یہ سب ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور صحابہ کی ایک جماعت اسی کے مطابق فتویٰ دیتی رہی جن میں علی' زید بن ثابت' ابوہریرہ اور ابن عمر شامل ہیں جیسا کہ ابن المنذر اور ابن حزم نے یہی بات کہی ہے۔ اور قضاء کے ساقط ہونے میں کئی احادیث آتی ہیں جو ایک دوسری کو مضبوط بناتی ہیں اور ان سے احتجاج پورا ہو جاتا ہے رہا اس کا نماز پر قیاس کرنا تو یہ قیاس فاسد الاعتبار ہے کیونکہ یہ نص کے مقابلہ میں ہے اور اس کی اصل سے متصادم ہے چنانچہ احمد نے کسی صحابیہ کی آزاد کردہ کنیز سے روایت کیا کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تھی کہ ثرید کی ایک رکابی لائی گئی جس میں سے اس نے کھا لیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو روزہ سے تھی۔ اسے ذوالیدین نے کہا کہ اب پیٹ بھر کر تجھے یاد آیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "اپنا روزہ پورا کر۔ یہ تو ایسا رزق تھا جسے اللہ نے تیری طرف چلا دیا"۔ اور عبدالرزاق نے روایت کیا کہ: ایک شخص ابوہریرہ کے پاس آکر کہنے لگا: "میں نے صبح سے روزہ رکھا ہوا تھا اور اب میں کھا بیٹھا ہوں۔ ابوہریرہ نے کہا' کوئی بات نہیں۔ وہ کہنے لگا۔ پھر میں ایک شخص کے ہاں گیا۔ میں پھر بھول گیا اور پھر کھا لیا۔ ابوہریرہ کہنے لگے۔ تو ایک انسان ہی ہے۔ روزوں کا اعادہ نہ کر"۔

۶۲۸- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«من ذرعه القيء فلا قضاء عليه، ومن استقاء فعليه القضاء»**. رواه الخمسة، وأعله أحمد، وقواه الدارقطني.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو از خود قے آجائے اس پر قضاء نہیں۔ اور جو شخص خود کوشش سے قے کرے اس پر قضاء ہے۔ اسے پانچوں نے روایت کیا۔ اور احمد نے معلول(۱) کہا اور دار قطنی نے قوی کہا(۲)۔

(۱) کہ یہ غلط ہے۔

(۲) اور بخاری نے کہا: میں اسے محفوظ نہیں سمجھتا۔ اور یہ حدیث دوسرے طریق سے بھی مروی ہے اور وہ سند بھی صحیح نہیں۔ احمد نے اسے منکر کہا اور کہا: یہ کوئی چیز نہیں۔ خطابی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ دونوں کی شرط پر صحیح ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ از خود آنے والی قے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ آپ کا ارشاد ہے کہ: "اس پر قضاء نہیں"۔ اور قضاء نہ ہونا صحت ہی کی فرع ہے۔ اور اس بات پر بھی دلیل ہے کہ کوشش کے ساتھ قے کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ خواہ اسے قے نہ آئے تب بھی اس کے لئے قضاء کا حکم ہے اور ابن المنذر نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ عمداً قے لینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن عباس' مالک' ربیعہ اور ہادی سے مروی ہے کہ مطلق قے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ مگر جب اس کا کچھ حصہ معدہ کو واپس لوٹے تو ٹوٹ جائے گا۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جسے ترمذی اور بیہقی نے کمزور سند سے روایت کیا ہے کہ: "تین چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا' قے اور سینگی لگوانا اور احتلام"۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اسے از خود آنے الی قے پر محمول کیا جائے گا۔ اس طرح دلائل میں تطبیق ہو جائے گی اور عام کو خاص پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ عام غیر صحیح ہے اور خاص سند کے لحاظ سے اس سے بہتر ہے لہٰذا اسی پر عمل بہتر ہو گا۔ خواہ اس سے اس کی اصل کا حکم بجا لانا معارض ہو۔

۶۲۹- وعن جابر بن عبد الله رضي الله تعالى عنهما، أن رسول الله ﷺ خرج عام الفتح إلى مكة، في رمضان، فصام، حتى بلغ كراع الغميم، فصام الناس، ثم دعا بقدح من ماء فرفعه، حتى نظر الناس إليه، ثم شرب، فقيل له بعد ذلك: إن بعض الناس قد صام، فقال: أولئك العصاة، أولئك العصاة.

وفي لفظ: «فقيل له: إن الناس قد شق عليهم الصيام، وإنما ينتظرون فيما فعلت، فدعا بقدح من ماء بعد العصر فشرب». رواه مسلم.

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال(۱) رمضان میں مکہ آئے۔ آپ نے اور دوسرے لوگوں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ جب آپ کراع(۲) الغمیم کے مقام پر پہنچے تو آپ نے پانی کا ایک پیالہ منگایا۔ پھر اسے بلند کیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں(۳)۔ پھر آپ نے پانی پیا۔ پھر اس کے بعد آپ سے کہا گیا کہ بعض لوگ ابھی تک روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ لوگ نافرمان ہیں۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ سے کہا گیا کہ لوگ روزہ کی وجہ سخت تکلیف میں ہیں اور صرف اس بات کی انتظار کر رہے ہیں کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ تو آپ نے عصر کے بعد پانی کا پیالہ منگایا۔ پھر اس سے پانی پیا(۴)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) ۸ ہجری میں۔ ابن اسحاق وغیرہ نے کہا کہ آپ دسویں رمضان کو مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔

(۲) ایک وادی جو عسفان سے آگے آتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) کہ آپ روزہ کھول رہے ہیں۔
(۴) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ مسافر کو حق ہے چاہے تو روزہ رکھ لے چاہے تو نہ رکھے۔ نیز وہ روزہ کھول سکتا ہے۔ اگرچہ دن کا زیادہ حصہ گزر چکا ہو۔ اور پہلی طرف کی داؤد اور امامیہ نے مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں اس کا روزہ نہ ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فعدة من ایام اخر (دوسرے دنوں میں روزہ رکھ کر گنتی پوری کر لے) نیز ارشاد نبوی ہے کہ: "یہ لوگ نافرمان ہیں"۔ نیز آپ نے فرمایا: "سفر میں روزے رکھنا کوئی نیکی نہیں"۔

اور جمہور نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے روزہ رکھنا اس لئے درست ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے اور اس آیت میں روزہ نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ اور ارشاد نبوی "یہ لوگ نافرمان ہیں"۔ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے آپ کے روزہ کھولنے کے حکم کی مخالفت کی تھی جبکہ ان پر یہ واضح ہو گیا تھا۔ نیز اس حدیث میں یہ نہیں آیا کہ آپ نے انہیں حکم دیا تھا۔ اب بات یوں پوری ہوتی ہے کہ آپ کا فعل وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ رہی "یہ کوئی نیکی نہیں"۔ والی حدیث' تو آپ نے یہ بات ان لوگوں کو کہی تھی جن کے روزے وبال بن رہے تھے۔ البتہ یہ استدلال یوں پورا ہوتا ہے کہ جس شخص کو سفر میں روزہ رکھنے سے تکلیف پہنچتی ہو اسے سفر میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ صرف اس لئے کھولا تھا کہ لوگوں نے آپ کو کہا تھا کہ ان کو روزہ سے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اور جن لوگوں نے پھر بھی روزہ نہ چھوڑا تو انہیں آپ نے نافرمان کہا تھا۔ رہا روزہ کھول دینے کا جواز اگرچہ دن کا زیادہ حصہ گزر چکا ہو تو جمہور اسے جائز سمجھتے ہیں۔ اور شافعی نے اپنا قول حدیث کی صحت پر معلق رکھا ہے اور یہ اس وقت ہے جب سفر میں روزوں کی نیت کرے۔ اور اگر وہ مقیم ہو اور اس نے روزہ رکھا ہوا ہو پھر اسی دن کسی وقت سفر کرے تو جمہور کا مذہب یہ ہے کہ وہ روزہ نہ چھوڑے اور احمد اور اسحاق وغیرہم نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور ظاہر انہی کے ساتھ ہے کیونکہ وہ مسافر ہے۔ اب افضل کی بات یہ ہے کہ ہادویہ' ابوحنیفہ اور شافعی مسافر کے لئے روزہ رکھنا اس صور میں افضل سمجھتے ہیں جب اسے نہ مشقت ہو اور نقصان۔ اور اگر نقصان پہنچے تو روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ اور احمد' اسحاق اور دوسرے کہتے ہیں کہ روزہ نہ رکھنا بہرحال افضل ہے۔ اور ان لوگوں نے بھی انہی احادیث سے احتجاج کیا ہے جن سے روزہ نہ ہونے کے قائلین احتجاج کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ احادیث اگرچہ ممانعت پر دلالت کرتی ہیں مگر حمزہ بن عمرو کی حدیث جو آرہی ہے یوں ہے: "اور جو روزہ رکھنا پسند کرے اس پر کوئی گناہ نہیں"۔ گناہ نہ ہونے کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔ یہ نہیں کہ یہ حرام ہے یا افضل ہے۔ اور جو لوگ سفر میں روزہ رکھنے کے افضل ہونے کے قائل ہیں وہ اس بات سے احتجاج کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکثر سفروں میں روزہ رکھا کرتے تھے۔ مخفی نہ رہے کہ اس اکثر سفروں پر بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی دلیل ہونا ضروری ہے۔ اور جن حدیثوں میں ممانعت ہے ان کی یہ تاویل کی کہ یہ ان کے لئے ہے جنہیں روزہ سے مشقت ہوتی ہو۔ اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ روزہ رکھنا' نہ رکھنا دونوں برابر ہیں کیونکہ اس بارے میں احادیث بھی مقابلہ پر ہیں۔ اور یہی وہ بات ہے جو انس کی اس حدیث سے ظاہر ہے کہ: "ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر کرتے تو نہ تو روزہ رکھنے والا نہ رکھنے والے پر نکتہ چینی کرتا اور نہ چھوڑنے والا رکھنے والے پر"۔ اور اس کا ظاہر دونوں میں برابری ہے۔

٦٣٠- وعن حمزة بن عمرو الأسلمي رضي الله تعالى عنه، أنه قال: يا رسول الله! إني أجد بي قوة على الصيام في السفر، فهل عليّ جناح؟ فقال رسول الله ﷺ: **«هي رخصة من الله، فمن أخذ بها فحسن، ومن أحب أن يصوم فلا جناح عليه»**. رواه مسلم، وأصله في المتفق عليه من حديث عائشة، أن حمزة بن عمرو سأل.

حمزہ بن عمرو اسلمی (۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ! میں اپنے آپ میں اتنی قوت پاتا ہوں کہ سفر میں روزہ رکھ لوں تو کیا مجھے گناہ ہو گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تو اللہ کی طرف سے رخصت ہے۔ تو جس نے اسے قبول کیا تو یہ اچھی بات ہے اور جو روزہ رکھنا چاہتا ہے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا اور اس کی اصل مسلم(۲) کے علاوہ بخاری میں بھی عائشہ کی حدیث میں ہے کہ حمزہ بن عمرو نے سوال کیا۔

(۱) آپ ابوصالح یا محمد حمزہ بن عمرو اسلمی ہیں۔ اہل حجاز میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے محمد نے اور عائشہ نے روایت کی ہے۔ ٦١ ہجری میں فوت ہوئے اس وقت آپ اسی برس کے تھے۔

(۲) اور مسلم میں الفاظ یوں ہیں: "میں ایسا شخص ہوں جو مسلسل روزے رکھتا ہوں تو کیا میں سفر میں روزہ رکھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا: "چاہے تو رکھ لے اور چاہے تو نہ رکھ"۔ ان الفاظ میں یہ دلالت ہے کہ دونوں کام برابر ہیں اور اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور جو لوگ ہمیشہ روزہ رکھنے کو مکروہ نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ حمزہ نے آپ کو بتلایا کہ وہ مسلسل روزے رکھتا ہے تو آپ خاموش رہے اور اس پر نکیر نہیں کی اور یہ سفر کی بات ہے تو حضر میں تو اور بھی درست ہوا۔ اور یہ اس صورت میں جائز ہے کہ جس سے نہ کسی واجب کی ادائیگی میں کمزوری واقع ہو اور نہ اس سے کسی کا حق تلف ہوتا ہو۔ اور شرط یہ ہے کہ عیدین اور ایام تشریق کے روزے نہ رکھے۔ رہی یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو پر کیوں گرفت فرمائی کہ وہ ہمیشہ روزہ نہ رکھیں تو وہ اس سے معارض نہیں۔ الا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

وسلم کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھنے سے کمزور ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ آخر عمر میں کمزور ہو گئے اور کہا کرتے: "کاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصت قبول کرلیتا"۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وہ عمل پسند فرماتے جو ہمیشہ کیا جائے خواہ تھوڑا ہی ہو۔ اور اس پر ابھارتے بھی تھے۔

٦٣١- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: رخصَ للشيخ الكبير أن يفطر ويطعم عن كل يوم مسكيناً، ولا قضاء عليه. رواه الدارقطني والحاكم، وصححاه.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بہت بوڑھے آدمی کو یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھا کرے اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کرے اور اس پر کوئی قضاء نہیں اور اسے دار قطنی اور حاکم نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا۔

جاننا چاہئے کہ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول و علی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین میں اختلاف کیا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ جب ابتداء" روزے فرض ہوئے اس وقت جو شخص چاہتا مسکین کو کھانا کھلا دیتا اور روزہ نہ رکھتا اور جو چاہتا وہ روزہ رکھ لیتا۔ پھر یہ آیت اللہ تعالیٰ کے قول وان تصوموا خیرلکم اور بقول بعض فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ سے منسوخ ہو گئی۔ اور کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ منسوخ نہیں ہوئی۔ ابن عباس انہی میں سے ہیں اور ان سے مروی ہے کہ وہ یوں پڑھا کرتے تھے۔ وعلی الذین یطوقونہ یعنی جو روزہ بتکلف رکھ سکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں۔ بلکہ بوڑھوں مردوں اور عورتوں کے لئے ہے اور یہی وہ بات ہے جو ابن عباس سے مروی ہے اور جس کا مصنف نے ذکر کیا ہے۔ اور سنن دار قطنی میں ابن عباس سے مروی ہے۔ اور جو لوگ طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دیں اور فمن تطوع کے متعلق کہا کہ اگر کسی اور مسکین کو دے دے فھو خیرلہ (تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے) پھر کہا کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ الا یہ کہ یہ ایسے بڑے بوڑھوں کو رخصت دیتی ہے جو روزوں کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس کی سند صحیح ثابت ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ رخصت اس بوڑھے کے لئے ہے جو روزوں کی طاقت نہ رکھتا ہو یا اس مریض کے لئے جو شفایاب نہ ہو سکے۔ اس نے کہا یہ صحیح ہے اور ایک روایت میں کھانے کی مقدار معین کی کہ وہ گندم کا نصف صاع ہو۔ نیز حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کے بارے میں بھی ابن عباس اور ابن عمر سے روایت کیا کہ وہ روزے نہ رکھیں اور ان پر قضاء نہیں۔ اور ایسی ہی روایت صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی کہ وہ ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ اور انس بن مالک سے روایت کیا کہ ایک سال وہ کمزور ہو گئے اور روزہ رکھنے کے قابل نہ رہے۔ تو انہوں نے ثرید کا ایک لگن تیار کیا۔ پھر تیس مسکینوں کو بلایا۔ جنہوں نے وہ پیٹ بھر کر کھایا۔ اور اس مسئلہ میں سلف میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی اختلاف ہے۔

جمہور کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص بڑھاپے کی وجہ سے روزوں کی طاقت نہیں رکھتا اس کے لئے تو کھانا کھلانا لازم ہے لیکن دوسروں کے لئے یہ منسوخ ہے۔ اور سلف کی ایک جماعت نے کہا کہ کھانا کھلانا منسوخ ہے۔ اور جو بوڑھا روزہ نہیں رکھ سکتا اسے کھانا کھلانا لازم نہیں۔ اور مالک نے کہا کہ اسے کھانا کھلانا مستحب ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔ اور سب سے واضح وہی بات ہے جو ابن عباس نے کہی ہے اور بوڑھے سے مراد وہ شخص ہے جو روزہ رکھنے سے عاجز ہو۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ رخصت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہو اور علم کی وجہ سے صیغہ مجہول استعمال ہوا ہو کیونکہ رخصت دینا توقیفی (من جانب اللہ) ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ آیت مذکورہ سے ابن عباس نے یہی سمجھا ہو اور یہی بات اقرب ہو۔

٦٣٢- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: هلكت يا رسول الله! قال: وما أهلكك؟ قال: وقعت على امرأتي في رمضان، فقال: هل تجد ما تعتق رقبة؟ قال: لا، قال: فهل تستطيع أن تصوم شهرين متتابعين؟ قال: لا، قال: فهل تجد ما تطعم ستين مسكيناً؟ قال: لا، ثم جلس، فأتى النبي ﷺ بعرق فيه تمر، فقال: تصدّق بهذا، فقال: أعلى أفقر منا؟ فما بين لابتيها أهل بيت أحوج إليه منا، فضحك النبي ﷺ حتى بدت أنيابه، ثم قال: اذهب فأطعمه أهلك. رواه السبعة واللفظ لمسلم.

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: یارسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے پوچھا: تجھے کس چیز نے ہلاک کیا؟ کہنے لگا کہ رمضان میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی پر جا پڑا۔ آپ نے پوچھا: کیا تو ایک غلام آزاد کر سکتا ہے؟ کہنے لگا۔ نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا دو ماہ کے متواتر روزے رکھ سکتا ہے؟ کہنے لگا۔ نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا ساٹھ مسکینوں(۲) کو کھانا کھلا سکتا ہے؟ کہنے لگا۔ نہیں۔ پھر وہ وہاں بیٹھا رہا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوروں کا ایک(۳) ٹوکرا آگیا۔ آپ نے فرمایا: یہ کھجوریں جا کر صدقہ کر دے۔ وہ کہنے لگا: کیا اسے جو ہم سے زیادہ فقیر ہو؟ مدینہ کی دونوں(۴) چوٹیوں کے درمیان ایسا کوئی گھرانہ نہیں جو ان کھجوروں کا ہم سے زیادہ محتاج ہو۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اتنا ہنسے کہ آپ کی داڑھیں نظر آنے لگیں۔ پھر آپ نے فرمایا: جا اپنے گھر والوں کو کھلا دے(۵)۔ اسے ساتوں نے روایت کیا اور لفظ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم کے ہیں۔

(۱) وہ سلمہ(۱) یا سلمان صخرالبیاضی ہے۔

(۲) جمہور کا یہ مذہب ہے کہ ہر مسکین کے لئے ایک مد یا صاع کا چوتھا حصہ طعام درکار ہے۔

(۳) صحیحین کے علاوہ دوسری کتب کی ایک روایت کے مطابق اس ٹوکرے میں پندرہ صاع اور دوسری کے مطابق بیس صاع کھجوریں تھیں۔

(۴) اصل میں لفظ لابتیہا ہے جو لابہ کا تثنیہ ہے۔ جس کا معنی سیاہ پتھروں والی زمین ہے۔ بعض نے اسے لابہ کے بجائے لوبہ بھی کہا ہے۔

(۵) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص رمضان میں روزہ کی حالت میں دانستہ طور پر جماع کرے اس پر کفارہ واجب ہے اور نووی نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے خواہ کوئی تنگدست ہو یا خوشحال ہو۔ اور شافعی کے دو اقوال میں سے ایک کے مطابق کفارہ اس کے ذمہ بحال رہتا ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی کہ اس کے ذمہ کچھ باقی ہے۔ اور غلام کے بارے میں اختلاف ہے کیونکہ یہاں صرف غلام کا ذکر ہے اور جمہور نے اسے کفارہ قتل پر محمول کرتے ہوئے مومن غلام ہونے کی قید لگائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ اللہ کا کلام واحد حاضر کے حکم میں ہے لہٰذا مطلق حکم ہو تو وہ مقید پر مرتب ہو گا۔ اور حنفیہ نے کہا۔ نہیں بلکہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ لہٰذا کافر غلام بھی کفالت کر سکتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان میں فرق کیا جائے گا۔ اور وہ یہ ہے مطلق کو صرف اس وقت مقید کیا جائے جب قیاس اس کا تقاضا کرتا ہو۔ گویا قیاس سے مقید ہو گا جیسے قیاس سے تخصیص ہوتی ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے' اور یہاں جامع علت یہ ہے کہ سب کفارے اس گناہ کا کفارہ بن جاتے ہیں اور علم الاصول میں یہ مسئلہ بڑی تفصیل سے مذکور ہے۔

پھر اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ کفاروں کی ترتیب وہی رہے گی جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ اور اگر پہلا کفارہ ممکن ہو تو دوسرے کی طرف رخ نہیں کیا جائے گا اور نہ تیسرے کی طرف جبکہ دوسرا ممکن ہو کیونکہ صحیحین میں یہی ترتیب مذکور ہے۔ اور زہری نے یہ ترتیب تیس یا ان سے زیادہ آدمیوں سے روایت کی ہے۔ اور صحیحین میں ترتیب ثابت ہونے کے بعد اختیار والی روایت مرجوح ہے۔ اور اس ترتیب کی تائید ظہار کے کفارہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہ کفارہ اسی کی مانند ہے۔

---

(۱) خلاصہ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال میں یوں ہے: سلمہ بن صخر بن سلیمان ابن الصمتہ الانصاری الخزرجی البیاضی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور "ساٹھ مسکینوں" کا ظاہر مفہوم یہی ہے کہ ساٹھ سے کم مسکینوں کو کھلانا کفایت نہیں کرتا۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ ایک آدمی پر بھی صرف کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کتاب قدوری میں ہے کہ اگر ایک ہی آدمی کو ساٹھ دن کھانا کھلائے تو ہمارے نزدیک کفایت کر جاتا ہے۔ اور اسے ایک ہی دن دے دے تو صرف اسی دن کے لئے کفایت کرے گا۔

اور ارشاد نبوی "جا اور اپنے اہل و عیال کو کھلا" کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ کفارہ ہے اور کفاروں کا قاعدہ یہ ہے کہ اسے اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو خاص کیا۔ دوسرا یہ کہ اس کی تنگدستی کی بناء پر کفارہ اس سے ساقط ہو گیا۔ اور اس کے لئے علی رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ "تو خود کھا اور اپنے عیال کو کھلا کیونکہ اللہ نے تیری طرف سے کفارہ دے دیا"۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ یا یہ کہ کفارہ اس کے ذمہ باقی ہے۔ اور جو کچھ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا وہ اس پر اور اس کے اہل پر صدقہ تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی احتیاج معلوم ہو چکی تھی۔

اور ہادویہ اور ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ اصولی طور پر کفارہ نہ خوشحال پر واجب ہے' اور نہ تنگدست پر۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس کو کھانا اس شخص کے لئے مباح کیا۔ اور یہ واجب ہوتا تو آپ اس کے لئے کیوں جائز رکھتے اور یہ استدلال ایسا ہے جو ناقابل اعتماد ہے۔ کیونکہ بظاہر اس سے مراد وجوب اور اس کا کھانا مباح ہونا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ کفارہ ہے بلکہ اس میں کئی احتمال ہیں جو گزر چکے۔ اور مہدی نے بحر میں کفارہ کے عدم وجوب پر استدلال کیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماع کرنے والے سے فرمایا: "اللہ سے معافی مانگ اور اس کے بدلے ایک دن روزہ رکھ لے"۔ اور کفارہ کا ذکر نہیں کیا۔ اور اس بات کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے روایت کیا اور ان میں آپ کا حکم دینا ثابت ہے۔ جاننا چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس روایت میں یہ حکم نہیں دیا کہ وہ اس دن کی قضاء دے جس میں اس نے جماع کیا تھا۔ البتہ یہ اس روایت میں آیا جسے ابوداؤد نے ابوہریرہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: "تو خود بھی کھا اور اپنے اہل بیت کو بھی کھلا اور ایک دن کا روزہ رکھ لے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کر"۔ چنانچہ ہادویہ اور شافعی اس کی قضاء کے وجوب کی طرف گئے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول فعدة من ايام اخر میں عموم ہے۔ اور شافعی کے ایک قول میں ہے کہ اس پر قضاء نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کفارہ کا ہی حکم دیا تھا اور کچھ نہیں کہا تھا۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی چیز پر بھروسہ کیا تھا جو آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہ حکم ہے جو مرد پر واجب ہے۔

رہی وہ عورت جس سے جماع کیا گیا تو اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا کہ اس پر صرف ایک کفارہ لازم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اور یہ بھی کہ بیوی پر کچھ بھی واجب نہیں۔ اور شافعی کے دو اقوال میں سے یہی زیادہ ہے اور اوزاعی بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور جمہور عورت پر بھی کفارہ کے وجوب کی طرف گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماع کرنے والے کے ساتھ اس کی بیوی کا ذکر صرف اس لئے نہیں کیا کہ اس نے اعتراف نہیں کیا تھا اور خاوند کا اعتراف اس کی بیوی پر کوئی حکم واجب نہیں کرتا۔ یا اس احتمال کی بنا پر کہ بیوی روزہ دار نہ ہو۔ وہ اس طرح کہ وہ طلوع فجر کے بعد حیض سے پاک ہوئی ہو۔ یا اس لئے کہ مرد کے حق میں حکم کی وضاحت عورت کے حق میں بھی حکم ثابت کر دیتی ہے۔ جیسا کہ احکام کی عمومیت سے معلوم ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ آپ کو اس عورت کے فقر کا بھی حال معلوم ہو گیا۔ جیسا کہ خاوند کے حال سے واضح ہو چکا تھا۔

جاننا چاہئے کہ یہ حدیث جلیلہ کثیر الفوائد ہے۔ مصنف نے فتح الباری میں کہا۔ کہ ہمارے استادوں نے اس حدیث سے جس قدر فوائد معلوم کئے بعض متاخرین نے ان سے زیادہ اس کو درخور اعتناء سمجھا ہے اور دو جلدوں میں اس حدیث کے فوائد پر کلام کیا اور ان میں ایک ہزار فوائد جمع کر دیئے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا وہ احکام کے لحاظ سے کافی ہے۔ اور شارح نے فتح الباری سے نقل کرتے ہوئے اسے بہت طویل کیا ہے۔

۶۳۳- وعن عائشة وأم سلمة رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ كان يصبح جنبا من جماع، ثم يغتسل ويصوم. متفق عليه، وزاد مسلم في حديث أم سلمة «ولا يقضي».

حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جماع کی بنا پر جنبی ہوتے اور صبح ہو جاتی۔ پھر آپ غسل کرتے اور آپ روزہ سے ہوتے۔ متفق علیہ۔ اور مسلم میں ام سلمہ کی حدیث میں اتنا زیادہ ہے کہ "اس کی قضاء نہ دیتے"(۱)۔

(۱) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص جماع کی بنا پر جنبی ہو اور اسی حالت میں روزہ رکھ لے اور اگر وہ طلوع فجر کے بعد بھی نہا لے تو اس کا روزہ درست ہو گا۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔ نووی نے کہا کہ اس بات پر اجماع ہے۔ البتہ اس سے ابوہریرہ کی وہ حدیث معارض ہے۔ جسے احمد اور ابن حبان نے روایت کیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "جب صبح کی نماز کی اذان ہو جائے اور کوئی شخص جنبی ہو تو وہ اس دن کا روزہ نہ رکھے"۔ اور جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ نیز یہ کہ جب ابو ہریرہ کو عائشہ اور ام سلمہ کی حدیث بتلائی گئی تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ اور حضرت عائشہ اور ام سلمہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ اور اس کے نسخ پر حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے مسلم، ابن حبان اور ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے کہ: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ وہ آپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے اسی بارے میں فتویٰ پوچھ رہا تھا اور میں پردہ کے پیچھے سن رہی تھی۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! صبح کی نماز کا وقت اس حالت میں ہو گیا جبکہ میں جنبی تھا۔ آپ نے فرمایا: "میرے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوتا ہے اور میں روزہ رکھ لیتا ہوں"۔ وہ کہنے لگا: یارسول اللہ! آپ ہماری طرح تو نہیں۔ آپ کے تو اللہ تعالیٰ نے سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں تو یہ توقع رکھتا ہوں کہ تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا بن جاؤں۔ اور اللہ سے تقویٰ کا حق تم سب سے زیادہ جاننے لگوں"۔ چنانچہ ابن المنذر اور خطابی وغیرہما اس کے نسخ کی طرف ہی گئے ہیں۔

نیز یہ حدیث اس شخص کے قول کا رد کرتی ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تھی۔ اور بخاری نے ابوہریرہ کی حدیث کو رد کیا کیونکہ عائشہ کی حدیث سند کے اعتبار سے اس سے بہت قوی ہے حتیٰ کہ ابن عبدالبر نے کہا کہ یہ صحیح اور متواتر ہے۔ رہی ابوہریرہ کی حدیث تو اکثر روایات یہی ہیں کہ وہ عائشہ کی حدیث کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اور رفع کی روایت بہت قلیل ہے پھر جب تعارض بھی ہو تو اسی کو ترجیح دی جائے گی جو سند کے لحاظ سے قوی ہو۔

۶۳۴- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ قال: «من مات وعليه صيام، صام عنه وليه». متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ فرضی روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے۔ متفق علیہ

اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ جب کوئی شخص مر جائے اور اس کے ذمہ فرضی روزے ہوں اور میت کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے تو وہ اسے کفایت کر جاتے ہیں۔ اور یہ اخبار حکم کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کے ولی کو چاہئے کہ اس کی طرف سے روزے رکھے اور اس میں اصل وجوب ہے۔ الا یہ کہ اس کے مستحب ہونے پر اجماع کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اور ولی یا مولیٰ سے مراد میت کا ہر قریبی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ولی سے مراد اس کا خاص وارث ہے اور بقول بعض اس سے مراد اس کا عصبہ ہے۔

اور اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ چنانچہ اصحاب الحدیث' ابوثور اور ایک جماعت نے کہا کہ اس صحیح حدیث کی رو سے ولی کا روزہ رکھنا میت کو کفایت کرتا ہے جبکہ آل کی ایک جماعت' مالک اور ابوحنیفہ اس طرف گئے ہیں کہ میت کی طرف روزے نہیں ہوتے اور واجب صرف روزوں کا کفارہ ہے جیسا کہ ترمذی نے ابن عمر سے مرفوعاً" روایت کیا کہ: "جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ روزے ہوں تو ہر روزہ کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے"۔ مگر ترمذی نے یہ روایت کرنے کے بعد کہا کہ یہ حدیث غریب ہے ہم اسے اس طریق کے علاوہ نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانتے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث ابن عمر پر موقوف ہے۔ وہ کہتے ہیں: اور اس لئے بھی کہ ابن عباس اور عائشہ سے کھلانے کے متعلق فتویٰ وارد ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ باقی تمام عبادات کے موافق ہے۔ کیونکہ ایک مکلف دوسرے کی جگہ کھڑا نہیں ہو سکتا اور حج کا معاملہ مخصوص ہے۔ اور ان باتوں کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ عائشہ اور ابن عباس کے فتاویٰ سے متعلق مروی آثار' صحیح حدیث کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ رہا عبادت میں کسی مکلف کا کسی دوسرے کی طرف سے قائم مقام ہونا تو حج کے بارے میں نص سے ثابت ہے۔ تو روزے کے بارے میں ثابت ہو گا۔ لہٰذا اس پر عمل کے بارے میں کچھ عذر نہ ہونا چاہئے اور مالکیہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اہل مدینہ کا اس پر عمل نہیں۔ اور ان کا اس حدیث پر عمل نہ ہونا حجت ہے۔ حالانکہ بات یوں نہیں جیسا کہ علم الاصول میں معروف ہے۔ اسی طرح حنفیہ کا عذر یہ ہے کہ راوی اپنی روایت کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ یہ عذر بھی نامقبول ہے کیونکہ اعتبار روایت کا ہو گا فتویٰ کا نہیں ہو گا جیسا کہ علم الاصول میں یہ بات بھی معروف ہے۔

پھر جو لوگ روزہ کفایت کرنے کے قائل ہیں ان میں یہ اختلاف ہوا کہ آیا صرف ولی ہی مخصوص ہے یا کوئی دوسرا بھی روزے رکھ سکتا ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ ولی مخصوص نہیں بلکہ کوئی غیر بھی ولی کی اجازت یا حکم سے میت کی طرف سے روزے رکھ سکتا ہے جیسا کہ حج میں ہے اور حدیث ولی کا ذکر محض غالب کے طور پر آیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا ولی کی اجازت کے بغیر بھی رکھ سکتا ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قرضہ سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا: اللہ سب سے زیادہ اس بات کا مستحق کہ اس کا قرضہ بیباق کیا جائے۔ پھر جس طرح قرضہ چکانا کسی قریبی سے مختص نہیں۔ یہی صورت روزہ کی ہے۔ اور قریبی کو چاہئے کہ وہ کوئی نائب مقرر کر دے(۱)۔

---

(۱) صاحب فتح العلام نے کہا: میں کہتا ہوں کہ حدیث کا ظاہر یہ ہے۔ روزے رکھنا ولی سے مختص ہے اور یہی صورت حج کی ہے۔ اور غیر کے روزے رکھنے یا حج کرنے سے متعلق کوئی دلیل نہیں آئی بلکہ زیر بحث حدیث اور جو روایات بھی اس معنی میں آئی ہیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ میت کی طرف سے ولی روزے رکھے۔ اسی طرح حج بھی ولی ہی کرے کوئی اجنبی یا غیر نہ کرے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نفلی روزے کا بیان اور جن دنوں میں یہ روزہ رکھنا منع ہے

۶۳۵- عن أبي قتادة الأنصاري رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ سئل عن صوم يوم عرفة، قال: يكفر السنة الماضية والباقية، وسئل عن صوم يوم عاشوراء فقال: يكفر السنة الماضية، وسئل عن صوم يوم الاثنين، فقال: ذلك يوم ولدت فيه، وبعثت فيه، وأنزل علي فيه. رواه مسلم.

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرفہ کے دن کے روزے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور عاشورا کے دن کے روزے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ گزشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور پیر کے دن کے روزہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اسی دن پیدا ہوا اسی دن مجھے نبوت ملی اور اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ سال کے گناہ جو ابھی واقع ہی نہیں ہوئے ان کی تکفیر کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسے گناہ کی توفیق نصیب ہی نہیں ہوتی اور گزشتہ سال کی مناسبت سے اسی بات کو تکفیر کہا گیا ہے۔ اور عاشورا کا دن جمہور کے نزدیک ماہ محرم کا دسواں دن ہے۔ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے یہ روزہ واجب تھا۔ پھر یہ مستحب رہ گیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عرفہ کے دن کا روزہ عاشورا کے دن کے روزے سے افضل ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر کے دن کے روزے کی مشروعیت کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اسی دن آپ پیدا ہوئے۔ اور راوی کو یہ شک ہے کہ دوسرا جملہ آپ نے یہ کہا تھا کہ اسی دن میں مبعوث ہوا یا یہ کہا تھا کہ اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی۔ اور اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ پیر کے دن پیدا ہوئے اور پیر کے دن ہی مبعوث ہوئے تھے۔ اور اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ اس دن کی تعظیم کرنا چاہیے جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر نعمتیں نازل فرمائیں اور روزہ رکھ کر اس کا تقرب حاصل کرنا چاہیے۔ اور اسامہ کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیر اور جمعرات کے دن روزہ رکھنے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان دنوں میں اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور آپ اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ اعمال کی پیشی کے دن آپ روزہ سے ہوں۔ اور ان دونوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجوہ میں کوئی منافات نہیں۔

۶۳۶- وعن أبي أيوب الأنصاري رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: **«من صام رمضان، ثم أتبعه بستاً من شوال، كان كصيام الدهر»**. رواه مسلم.

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عالی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے۔ پھر اس کے بعد شوال کے بھی چھ(۱) روزے رکھے۔ وہ ایسے ہے جیسے اس نے ہمیشہ روزے رکھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) اصل عبارت میں لفظ ستا" بطور صیغہ مونث آیا ہے جبکہ اس کا ممیز لفظ ایام مذکور ہے کیونکہ اسم عدد میں جب اس کے ممیّز کا ذکر نہ کیا جائے۔ تو مذکر و مونث دونوں طرح جائز ہے جیسا کہ نحویوں نے اس کی صراحت کی ہے۔

اس حدیث میں شوال کے چھ دنوں کے روزے مستحب ہونے پر دلیل ہے۔ آل کی ایک جماعت' احمد اور شافعی کا یہی مذہب ہے۔ اور مالک نے کہا کہ شوال کے روزے مکروہ ہیں۔ کیونکہ اہل علم میں سے کسی کی بھی یہ رائے نہیں کہ وہ روزے رکھے اور اس لئے بھی کہ ان روزوں کے واجب ہونے کا گمان نہ ہونے لگے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ نص کے ثبوت کے بعد ایسی وجوہ بیان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور ابن عبدالبر نے کیا ہی اچھی بات کہی کہ مالک کو مسلم کی یہ حدیث نہیں پہنچی۔ جاننا چاہیئے کہ ان روزوں کا اجر ہر روزے رکھنے والے کو ملے گا۔ خواہ وہ الگ الگ روزے رکھے یا لگاتار رکھے' عید کے بعد رکھ لے یا سارے شوال کے مہینہ کے دوران رکھ لے۔ اور سنن ترمذی میں ابن المبارک سے مروی ہے کہ وہ شوال کے آغاز میں چھ دن پسند کرتے تھے۔ اور ابن المبارک سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر کوئی شخص شوال کے روزے متفرق طور پر رکھ لے تو بھی جائز ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آغاز شوال کے پسندیدہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا اگر ایک شخص شوال کے کوئی بھی چھ دنوں کے روزے رکھ لیتا ہے تو وہ اس قول کا مصداق ہے کہ "رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے"۔ اور ان کی ہمیشہ کے روزوں سے تشبیہ اس لئے دی کہ ہر نیکی کا دس گنا اجر ملتا ہے گویا رمضان کے روزے دس ماہ کے اور شوال کے چھ دنوں کے دو ماہ کے روزے ہوئے۔ نیز اس حدیث میں ہمیشہ روزے رکھنے پر کوئی دلیل نہیں۔ اور اس باب کے آخر میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔

جاننا چاہیئے کہ تقی سبکی نے کہا کہ اس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا تو اس پر بعض نافہم لوگوں کو دھوکا ہوا۔ یعنی سعد بن سعید انصاری کی روایت میں جو یحیی بن سعید کا بھائی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دھوکا کھانے کی وجہ یہ ہوئی کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترمذی نے اسے صحیح نہیں بلکہ حسن کہا گویا کہ یہ نسخہ میں ہے۔اور جو کچھ ہم نیں سنن ترمذی میں اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد دیکھا وہ یہ الفاظ ہیں۔ابو عیسیٰ (ترمذی) نے کہا کہ ابوایوب کی حدیث حسن صحیح ہے۔ پھر کہا کہ سعد بن سعید، یحیی بن سعید انصاری کا بھائی ہے۔اور بعض اہل حدیث نے سعد بن سعید کے حفظ کے بارے میں کلام کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن دحیہ کہتے ہیں کہ یہ بات احمد بن حنبل نے کہی تھی کہ سعد بن سعید ضعیف الحدیث ہے۔ اور نسائی نے کہا: قوی نہیں۔ اور ابو حاتم نے کہا کہ سعد بن سعید کی حدیث کو درخور اعتنا سمجھنا درست نہیں۔ پھر ابن السبکی نے کہا کہ ہمارے استاذ ابو محمد و میاطی نے اسے درخور اعتنا سمجھا اس کے طریق جمع کئے تو بیس سے زائد لوگوں سے سند بیان کی جو سعد بن سعید سے روایت کرتے ہیں اور ان میں اکثر حفاظ اور ثقہ ہیں۔ اور ان میں دونوں سفیان ہیں۔ اور سعد کی روایت کے تابع اس کے بھائی یحییٰ اور عبدربہ اور صفوان بن سلیم وغیرہم نے روایت کئے ہیں۔ نیز ثوبان' ابوہریرہ' جابر' ابن عباس' براء بن عازب اور عائشہ نے بھی اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ ثوبان کے الفاظ یہ ہیں: "جس نے رمضان کے روزے رکھے تو یہ اس کا ایک ماہ دس ماہ ہوئے اور جس نے عیدالفطر کے بعد چھ دن روزے رکھے تو یہ پورے سال کے روزے ہو گئے"۔ اسے احمد اور نسائی نے روایت کیا۔

۷۳۶- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«ما من عبد يصوم يوماً في سبيل الله إلا باعد الله بذلك اليوم عن وجهه النار سبعين خريفاً»**. متفق عليه، واللفظ لمسلم.

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بھی اللہ کی راہ میں (۱) ایک دن کا روزہ رکھتا ہے تو اللہ اس کے ایک دن کے بدلے جہنم اس کے سامنے سے ستر سال پیچھے ہٹا دیتا ہے(۲)۔ متفق علیہ۔ اور یہ لفظ مسلم کے ہیں۔

(۱) اصل عبارت میں فی سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اور جب یہ علی الاطلاق مستعمل ہوں تو ان سے مراد جہاد ہوتا ہے۔

(۲) یہ حدیث اس روزے کی فضیلت پر دلیل ہے جو دوران جہاد رکھا جائے اور اس سے دشمن کے مقابلہ کے وقت نا طاقتی پیدا نہ ہو۔ اور یہ فضیلت اس لئے ہے کہ جیسے وہ اپنے دشمن سے جہاد کرتا ہے۔ اور حدیث کے الفاظ "اللہ تعالیٰ اس کو جہنم سے ستر سال دور کر دیتا ہے"۔ سے کنایۃ" مراد جہنم کے عذاب سے اس کی سلامتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۳۸۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كان رسول الله ﷺ يصوم حتى نقول لا يفطر، ويفطر حتى نقول لا يصوم، وما رأيت رسول الله استكمل صيام شهر قط إلا رمضان، وما رأيته في شهر أكثر منه صياماً في شعبان. متفق عليه، واللفظ لمسلم.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے جاتے حتیٰ کہ ہم کہتے کہ اب چھوڑیں گے نہیں۔ پھر جب چھوڑنا شروع کر دیتے تو ہم کہتے اب روزہ نہیں رکھیں گے۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رمضان کے سوا کسی مہینہ کے پورے کے پورے روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی شعبان سے زیادہ کسی مہینہ میں روزے رکھتے دیکھا ہے۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں(ا)۔

(ا) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ آپ روزے کسی خاص مہینے سے مختص نہیں تھے۔ نیز یہ کہ جب آپ روزے رکھنا شروع کرتے تو پھر رکھتے ہی جاتے اور جب چھوڑتے تو پھر چھوڑتے ہی جاتے اور شاید آپ اس طرح حالات کے تقاضا کے تحت کرتے تھے۔ جب اشغال سے کچھ فرصت ملتی تو روزے رکھنا شروع کر دیتے اور اس سے برعکس صورت میں چھوڑ دیتے۔

نیز یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ آپ بالخصوص شعبان میں زیادہ روزے رکھتے تھے۔ اور حضرت عائشہؓ نے اس کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ طبرانی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ میں تین دن روزے رکھتے۔ پھر اکثر ایسا ہوتا کہ آپ یہ روزے موخر کر دیتے اور شعبان میں سال بھر کے چھوڑے ہوئے روزے اکٹھے ہو جاتے"۔ اور اس روایت میں ابن ابی لیلیٰ ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آپ رمضان کی تعظیم کی خاطر شعبان میں زیادہ روزے رکھتے تھے جیسا کہ ترمذی نے انس وغیرہ کی حدیث روایت کی کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا روزہ افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جو روزہ رمضان کی تعظیم کی خاطر شعبان میں رکھا جائے"۔ ترمذی نے کہا کہ اس کی سند میں صدقہ بن موسیٰ ہے اور وہ ان کے ہاں قوی نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آپ شعبان میں اس لئے زیادہ روزے رکھتے تھے کہ لوگ رجب اور رمضان کے درمیان شعبان کے مہینہ میں غافل رہتے ہیں۔ جیسا کہ نسائی اور ابوداؤد نے اسے اسامہ بن زید سے روایت کیا اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا کہ: میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ جتنے روزے شعبان میں رکھتے ہیں، اتنے اور کسی مہینہ میں رکھتے میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ: "یہ مہینہ ایسا ہے جو رجب اور رمضان کے درمیان آتا ہے اور اس میں اکثر لوگ غافل رہتے ہیں۔ اسی مہینہ میں اعمال اللہ رب العالمین کی طرف بلند ہوتے ہیں لہٰذا میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے عمل اس حال میں بلند ہوں کہ میں روزہ سے ہوں"۔

میں کہتا ہوں کہ آپ کے شعبان کے روزے رکھنے میں ان سب باتوں کا احتمال ہے۔ البتہ اس حدیث میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"رمضان کے بعد شعبان کا روزہ سب سے افضل ہے"۔ اس حدیث کا معارضہ ہے جسے مسلم نے ابوہریرہ سے مرفوعاً" روایت کیا ہے کہ: "رمضان کے بعد محرم کا روزہ سب سے افضل ہے"۔ اور اس پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ اگر محرم کے روزے افضل ہوتے تو آپ زیادہ روزے محرم میں رکھتے جبکہ عائشہ کی حدیث اس بات کی مقتضی ہے کہ آپ شعبان میں سب سے زیادہ روزے رکھتے تھے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ محرم کے روزے کی فضیلت اس کے ماہ حرام ہونے کی بنا پر ہے۔ جبکہ شعبان کی فضیلت مطلقاً" ہے۔ رہا آپ کا محرم میں زیادہ روزے نہ رکھنا تو اس کے متعلق نووی نے کہا کہ اس بات کا آپ کو آخر عمر میں علم ہوا۔

۶۳۹- وعن أبي ذر رضي الله تعالى عنه قال: أمرنا رسول الله ﷺ أن نصوم من الشهر ثلاثة أيام، ثلاث عشرة، وأربع عشرة، وخمس عشرة. رواه النسائي والترمذي، وصححه ابن حبان.

ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم ہر مہینے کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ کو تین دن روزے رکھا کریں۔ اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا۔

یہ حدیث متعدد طریقوں سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے۔ "اگر تو روزے رکھنا چاہے تو پچھلے دنوں کے روزے رکھ"۔ یعنی ایام بیض یا سفید دنوں کے۔ اسے احمد، نسائی اور ابن حبان نے روایت کیا۔ اور نسائی کی بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں: "اگر تو روزے رکھنا چاہے تو سفید دنوں یعنی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ کے روزے رکھ"۔ اور اصحاب سنن نے قتادہ بن ملحان کی حدیث یوں روایت کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم ایام بیض یعنی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ کے روزے رکھیں اور کہا کہ یہ ہمیشہ روزے رکھنے کی طرح ہے"۔ اور نسائی نے جریر کی حدیث مرفوعاً" روایت کی کہ: "ہر ماہ میں تین دن روزے رکھنا ایسے ہے جیسے ہمیشہ روزے رکھنا اور وہ تین دن ایام بیض ہیں"۔ الحدیث اور اس کی سند صحیح ہے۔ اور ہر ماہ تین دن روزے رکھنے کی احادیث مطلقاً" بھی آئی ہیں اور وضاحت کرنے والی بھی جن میں تین کا ذکر نہیں۔ اور اصحاب سنن نے ابن مسعود کی حدیث روایت کی جسے ابن خزیمہ نے صحیح کہا کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ تین دن روزے رکھا کرتے تھے"۔ اور مسلم نے عائشہ کی حدیث روایت کی کہ: "نبی صلی اللہ ہر ماہ تین دن کے روزے رکھا کرتے اور یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کون سے مہینہ میں روزے رکھیں۔ رہے وہ روزے جن کے متعلق وضاحت ہے کہ وہ تین نہیں ہوتے تھے تو اس کے متعلق ابوداؤد اور نسائی نے حفصہ کی حدیث روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ تین دن روزے رکھا کرتے تھے پیر اور جمعرات کے دن کا اور آخری جمعہ میں سے پیر کے دن کا۔ اور ان احادیث میں کچھ معارضہ نہیں۔ کیونکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ سب روزے کے استحباب پر دلالت کرتے ہیں۔ اور جس راوی کو جیسی اطلاع ملی وہی اس نے روایت کر دی۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جن روزوں کا آپ نے حکم دیا اور ان کی ترغیب دی وہی اولیٰ اور افضل ہیں۔ رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل تو آپ کو جو مشاغل پیش آتے تھے' آپ کو ان کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ البتہ شارع نے ایام بیض کی تعین کر دی۔ اور ہر مہینہ کے جن تین دنوں میں روزے رکھنا مستحب ہے اس بارے میں علماء کے دس اقوال ہیں جنہیں شارح نے شرح میں درج کر دیا ہے۔

٦٤٠- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: **«لا يحل للمرأة أن تصوم، وزوجها شاهد، إلا بإذنه»**. متفق عليه، واللفظ للبخاري، زاد أبو داود: «غير رمضان».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھے۔ متفق علیہ۔ اور یہ لفظ بخاری کے ہیں۔ اور ابو داؤد میں یہ لفظ زیادہ ہیں "سوائے رمضان کے"(ا)۔

(ا) اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ خاوند کا حق پورا کرنا نفلی روزے سے بہتر ہے۔ رہے رمضان کے روزے تو وہ عورت پر واجب ہیں خواہ اس کا خاوند اس بات کو ناپسند کرے اور اسی پر قضاء کا روزہ قیاس کیا جائے گا۔ اور اگر عورت خاوند کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھتی ہے تو وہ حرام کام کرنے والی ہے۔

٦٤١- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ نهى عن صيام يومين: يوم الفطر، ويوم النحر. متفق عليه.

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دنوں کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ ایک عیدالفطر اور دوسرا قربانی کا دن یا عیدالاضحیٰ۔ متفق علیہ(ا)

(ا) اس حدیث میں دو دنوں کا روزہ رکھنے کی تحریم پر دلیل ہے کیونکہ نہی کی اصل تحریم ہے۔ اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔ اور اگر ان دنوں میں روزہ رکھنے کی نذر مانے تو واضح بات یہی ہے کہ اس کی نذر منعقد نہ ہو گی کیونکہ یہ معصیت کی نذر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان دونوں دنوں کی جگہ اور دنوں کے روزے رکھ لے۔

٦٤٢- وعن نبيشة الهذلي رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«أيام التشريق أيام أكل وشرب وذكر الله عز وجل»**. رواه مسلم.

نبیشہ ہذلی (ا) رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایام تشریق(۲)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھانے' پینے اور اللہ عزوجل کو یاد کرنے کے دن ہیں- اسے مسلم نے روایت کیا(۳)-

(۱) اسے نبیشہ الخیر بن عمرو کہتے تھے اور بقول بعض وہ ابن عبداللہ ہیں-

(۲) یعنی قربانی کے دن کے بعد کے تین دن- اور بعض دو دن کہتے ہیں-

(۳) نیز مسلم نے کعب بن مالک کی حدیث بھی روایت کی' ابن حبان نے ابوہریرہ کی حدیث' نسائی نے بشر بن سحیم کی حدیث' اصحاب سنن نے عقبہ بن عامر کی حدیث اور بزار نے ابن عمر کی حدیث روایت کی کہ: "ایام تشریق کھانے پینے اور نماز کے دن ہیں لہٰذا کوئی شخص ان میں روزہ نہ رکھے"- اور ابوداؤد نے عمر کی حدیث جس میں ان کا قصہ ہے' روایت کی کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دنوں میں روزہ نہ رکھنے کا حکم دیتے اور روزہ رکھنے سے منع کرتے تھے"- یعنی ایام تشریق کے دنوں میں- اور دار قطنی نے عبداللہ بن حذافہ اسہمی کی حدیث روایت کی کہ: "ایام تشریق کھانے پینے اور جماع کے دن ہیں"-

نیز یہ حدیث اور جو احادیث ہم نے اس معنی میں بیان کی ہیں ایام تشریق کے روزوں کی ممانعت پر دلالت کرتی ہیں اور اگر اختلاف ہے تو اس بات میں کہ آیا یہ نہی تحریمی ہے یا تنزیہی؟ سلف کی ایک جماعت اور بعض دوسرے اس کی مطلق تحریم کی طرف گئے ہیں- اور مشہور قول کے مطابق شافعی کا بھی یہی مذہب ہے- اور ان لوگوں نے کہا کہ ان دنوں میں نہ کوئی حج تمتع کرنے والا روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا- اور اسے اللہ تعالیٰ کے قول ثلاثہ ایام فی الحج سے مخصص کیا- کیونکہ یہ آیت قربانی کے دن سے پہلے اور بعد کے سب دنوں کو عام ہے- اور حدیث ایام تشریق سے خاص ہے اگرچہ اس میں یہ عموم حج وغیرہ کے لحاظ سے ہے لہٰذا اس کے خصوص کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ دلالت کا یہی مقصود ہے کہ یہ دن روزوں کا محل نہیں- اور اپنی ذات کے اعتبار سے یہ دن ایسے ہیں کہ ان میں روزہ نہ رکھا جائے- اور ہادویہ کا مذہب یہ ہے کہ ان دونوں دنوں میں ایسا متمتع روزہ رکھ سکتا ہے جسے قربانی نہ مل رہی ہو جیسا کہ آیت کے سیاق اور علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ حج قران کرنے والا اور احصار والا روزہ نہ رکھے جب کہ اسے قربانی نہ مل رہی ہو- اور دوسروں کا مذہب یہ ہے متمتع روزہ رکھ سکتا ہے اور وہ بھی جسے قربانی نہ مل رہی ہو اور وہ احصار والا اور قارن ہو- کیونکہ آیت میں عموم ہے اور درج ذیل حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے-

۶۴۳- وعن عائشة وابن عمر رضي الله تعالى عنهم قالا: لم يرخص في أيام التشريق أن يصمن إلا لمن لم يجد الهدي. رواه البخاري.

عائشہ اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ ایام تشریق میں کسی کو روزہ رکھنے کی رخصت نہیں دی گئی سوائے اس حاجی کے جسے قربانی نہ مل رہی ہو- اسے بخاری نے روایت کیا(۱)-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ا) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایام تشریق کے روزے کی رخصت صرف ایسے حاجی کو ہے جسے قربانی نہ مل رہی ہو۔ خواہ وہ متمتع ہو یا قارن ہو یا احصار والا ہو کیونکہ حدیث مطلق ہے اور اس بنا پر کہ یہ رخص دینے والے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حدیث مرفوع ہے۔ اور اس بارے میں تین اقوال ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر اس کی نسبت دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو تو یہ حجت ہے ورنہ نہیں۔ اور دار قطنی اور طحاوی کی روایت میں فاعل کی تصریح بھی آئی ہے مگر اس کی سند کمزور ہے۔ اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے متمتع کو ایام تشریق میں روزے رکھنے کی رخصت دی جسے قربانی نہ ملے"۔ مگر اس حدیث میں صرف متمتع کو خاص کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ اس قول کے قائلین کے لئے حجت نہیں بن سکتا۔ اور حضرت عائشہ اور ابوبکر کا فعل اور حضرت علی کے فتوے بھی روایت کئے گئے ہیں۔ اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ نہی تنزیہی ہے۔ اور یہ کہ ہر ایک کو روزہ رکھنا جائز ہے اور یہ ایسا قول ہے جس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں۔

٦٤٤- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، عن النبي ﷺ قال: «لا تخصوا ليلة الجمعة بقيام، من بين الليالي، ولا تخصوا يوم الجمعة بصيام، من بين الأيام، إلا أن يكون في صوم يصومه أحدكم». رواه مسلم.

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ تمام راتوں میں سے صرف جمعہ کی رات کو قیام کے لئے مخصوص نہ کرو۔ اور نہ ہی تمام دنوں کو چھوڑ کر صرف جمعہ کو روزہ کے لئے مخصوص کرو ۔ الا یہ کہ کوئی شخص پہلے ہی روزے رکھتا ہو جن میں جمعہ بھی آ جائے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(ا)۔

(ا) یہ حدیث جمعہ کی رات کو نماز اور عبادت اور تلاوت سے خاص کرنے کی تحریم پر دلیل ہے۔ مگر ایسی قرات جس کے متعلق نص وارد ہو جیسے سورہ کہف کی قرات کیونکہ جمعہ کی رات کو یہ سورت پڑھنے کی تخصیص وارد ہے۔ اور دوسری بعض سورتوں کے متعلق بھی احادیث آئی ہیں لیکن ان میں کلام ہوا ہے۔ نیز اس حدیث میں عموم صلوۃ الرغائب کی عدم مشروعیت پر دلالت کرتا ہے جو رجب کے پہلے جمعہ کی رات کو پڑھی جاتی ہے۔ اگر اس کی حدیث ثابت ہو جائے تو یہ نہی کے عموم کی مخصص ہو گی لیکن اس حدیث میں علماء نے کلام کیا ہے اور اس پر موضوع کا حکم لگایا ہے۔

نیز یہ حدیث صرف جمعہ کے دن نفلی روزہ رکھنے کی تحریم پر بھی دلالت کرتی ہے۔ ابن منذر نے کہا۔ جمعہ کے روزہ کی نہی ایسے ہی ثابت ہے جیسے عید کے روزہ کی۔ اور ابو جعفر طبری نے کہا۔ جمعہ میں اور عید میں فرق ہے۔ کیونکہ عید کے دن روزہ کی تحریم پر اجماع ہو چکا ہے۔ خواہ اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی روزہ رکھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے۔ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ صرف جمعہ کے دن کے روزہ کی نہی تنزیہی ہے۔ اور وہ ابن مسعود کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ میں تین دن روزے رکھتے اور کم ہی ایسا موقع ہوتا کہ جمعہ کے دن آپ کا روزہ نہ ہو"۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا۔ گویا آپ کا فعل اس بات پر قرینہ ہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ آپ جمعہ سے ایک دن پہلے یا بعد بھی روزہ رکھتے ہوں۔ اور احتمال کی موجودگی میں استدلال مکمل نہیں ہوتا۔

اور جمعہ کے دن کے روزہ کی تحریم میں کیا حکمت ہے؟ اس میں بھی اختلاف ہے اور کئی اقوال ہیں۔ اور ان میں سے قابل ذکر یہ قول ہے کہ یہ عید کا دن ہے جیسا کہ ابوہریرہ سے مرفوعاً" مروی ہے۔ "جمعہ کا دن تمہارا عید کا دن ہے"۔ اور ابن ابی شیبہ نے علی رضی اللہ عنہ سے حسن سند سے روایت کیا کہ: "جو شخص تم میں سے مہینہ کے نفلی روزے رکھنا چاہے تو وہ جمعرات کا روزہ رکھ لے لیکن جمعہ کا نہ رکھے۔ کیونکہ جمعہ کا دن کھانے' پینے اور ذکر اذکار کا دن ہے" اور یہ بھی جمعہ کے روزہ کی تحریم کے دلائل میں سے دلیل ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اس کی تحریم ہر پہلو سے عید کے دن کی طرح ہو۔ کیونکہ جمعہ سے ایک دن پہلے یا بعد میں روزہ رکھ لینے سے اس کی تحریم زائل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

۶۴۵- وعنه أيضاً قال: قال رسول الله ﷺ: «لا يصومن أحدكم يوم الجمعة، إلا أن يصوم يوماً قبله، أو يوماً بعده». متفق عليه.

اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص صرف جمعہ کے دن کا روزہ نہ رکھے۔ وہ یا تو جمعہ سے ایک دن پہلے روزہ رکھ لے یا بعد میں رکھ لے۔ متفق علیہ(ا)۔

(ا) یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جمعہ کے روزہ کی تحریم کسی حکمت کی بنا پر زائل بھی ہو جاتی ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ اگر صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھے تو روزہ کھول دینا واجب ہے۔ جیسا کہ جویریہ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جسے احمد' بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن جویریہ کے ہاں آئے اور وہ روزہ سے تھیں۔ آپؐ نے ان سے پوچھا: کیا تم نے کل کا روزہ رکھا تھا؟ وہ کہنے لگیں۔ نہیں۔ پھر پوچھا: کل روزہ رکھو گی؟ کہنے لگیں۔ نہیں۔ آپ نے فرمایا: تو پھر روزہ کھول دو"۔ اور یہاں امر میں اصل وجوب ہے۔

۶۴۶- وعنه أيضاً أن رسول الله ﷺ قال: «إذا انتصف شعبان فلا تصوموا». رواه الخمسة، واستنكره أحمد.

اور انہی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نصف شعبان گزر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے تو روزے نہ رکھو۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور احمد نے منکر کہا(۱)۔

(۱) اور ابن حبان وغیرہ' نے صحیح کہا اور احمد نے اسے صرف اس لئے منکر کہا کہ یہ علاء بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ مسلم کے رجال سے ہے۔ مصنف نے تقریب میں کہا: وہ ہمیشہ سچ بولنےوالا ہے البتہ کبھی کبھی اسے وہم ہو جاتا ہے۔

اور یہ حدیث نصف شعبان کے بعد روزے رکھنے کی ممانعت پر دلیل ہے لیکن اس حدیث "مگر جب کوئی معمول کے مطابق روزے رکھتا ہو"۔ سے مقید ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اور علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر شافعی اس کی نہی کی وجہ سے تحریم کی طرف گئے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مکروہ ہیں۔ البتہ رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ رکھنا حرام ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مکروہ بھی نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مستحب ہیں۔ اور اس حدیث کی یہ تاویل کی کہ یہ صرف ان کے لئے ہے جنہیں روزہ کمزور کر دیتا ہے۔ گویا وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کو رمضان سے ملا دیتے تھے"۔ واضح رہے کہ جب قول اور فعل میں تضاد ہو تو قول کو مقدم رکھا جائے گا۔

٦٤٧- وعن الصماء بنت بسر ، أن رسول الله ﷺ قال: **«لا تصوموا يوم السبت إلا فيما افترض عليكم، فإن لم يجد أحدكم إلا لحاء عنب، أو عود شجرة، فليمضغها»**. رواه الخمسة، ورجاله ثقات، إلا أنه مضطرب، وقد أنكره مالك، وقال أبو داود: هو منسوخ.

صماء بنت بسر(۱) رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہفتہ کے دن فرضی روزوں کے سوا روزہ نہ رکھا کرو۔ اور اگر تمہیں کھانے کی کوئی چیز نہ ملے تو انگور کا چھلکا یا کسی درخت کی لکڑی ہی چبالو(۲)۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور اس کے راوی معتبر ہیں مگر اس حدیث میں اضطراب(۳) ہے اور مالک نے اسے منکر کہا ہے اور ابو داؤد نے کہا کہ یہ منسوخ ہے۔

(۱) ان کا نام بھیہ ہے اور بعض اس میں م کا اضافہ کر کے بھیمہ کہتے ہیں۔ آپ عبداللہ بن بسر کی بہن ہیں۔ آپ سے ان کے بھائی عبداللہ نے روایت کی ہے۔

(۲) یعنی اگر روزہ رکھا ہو تو اسے کھولنے کے لئے کھا لے۔

(۳) کیونکہ اسے عبداللہ بن بسر نے اپنی بہن صماء سے روایت کیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ عبداللہ بن بسر سے مروی ہے اور اس میں اس کی بہن کا ذکر نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کوئی مجروح کرنے والی علت نہیں کیونکہ وہ صحابی ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ عبداللہ سے' اس کے باپ بسر سے مروی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صماء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے' عائشہ سے مروی ہے۔ نسائی نے کہا کہ اس طرح یہ حدیث مضطرب ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ عبداللہ کے پاس یہ روایت اپنے باپ سے اور اپنی بہن سے ہو۔ اور اس کی بہن کے پاس کسی واسطہ سے ہو اور یہی صحیح طریقہ ہے۔ عبدالحق نے پہلے طریق کو ہی ترجیح دی ہے اور دار قطنی نے اس کا تتبع کیا ہے۔ لیکن ایک ہی حدیث اور ایک ہی سند میں اس قدر تلون جبکہ اس کا مخرج ایک ہی ہو' روایت کو کمزور کر دیتا ہے۔ اور اس سے قلت ضبط کا پتہ چلتا ہے۔ الا یہ کہ معروف اور کثرت سے روایت کرنے والے حفاظ حدیث اس حدیث کے طریقے جمع کر دیں' تو اس صورت میں یہ قلت ضبط پر دلالت کرنے والی نہ رہے گی۔ لیکن یہاں معاملہ ایسا نہیں بلکہ اس میں تو عبداللہ بن بسر سے اگلے راوی میں بھی اختلاف ہے۔ اور مالک کے منکر کہنے کی صورت یہ ہے کہ ابوداؤد نے مالک کی طرف سے کہا کہ یہ روایت جھوٹ ہے۔ رہا ابوداؤد کا اسے منسوخ قرار دینا تو غالباً" اس سے ان کی مراد درج ذیل حدیث اس کی ناسخ ہے۔

٦٤٨- وعن أم سلمة رضي الله تعالى عنها، أن رسول الله ﷺ أكثر ما كان يصوم من الأيام، يوم السبت، ويوم الأحد، وكان يقول: **«إنهما يوما عيد للمشركين، وأنا أريد أن أخالفهم»**. أخرجه النسائي، وصححه ابن خزيمة، وهذا لفظه.

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنوں میں سے اکثر ہفتہ اور اتوار کے دن کا روزہ رکھا کرتے۔ اور فرماتے کہ یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ان کی مخالفت کرو۔ اسے نسائی نے روایت کی اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا اور یہ لفظ ابن خزیمہ کے ہیں۔

پہلے یہی حکم تھا کہ ہفتہ کے دن روزہ نہ رکھا جائے جبکہ آپ اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے۔ پھر بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کا حکم دیا جیسا کہ یہ حدیث خود صراحت کر رہی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نہی اس صورت میں ہے کہ صرف ہفتہ کا روزہ رکھا جائے۔ اس سے پہلے یا بعد کے دن نہ رکھا جائے۔ اور ترمذی نے عائشہ کی حدیث یوں روایت کی ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینہ میں تو ہفتہ' اتوار اور پیر کا روزہ رکھتے اور اگلے مہینے منگل' بدھ اور جمعرات کا"۔ اور یہ حدیث اہل کتاب کی مخالفت میں ہفتہ اور اتوار کے روزہ کے مستحب ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ صرف ہفتہ کا یا صرف اتوار کا روزہ بھی رکھا جا سکتا اور دونوں اکٹھے بھی۔

٦٤٩- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ نهى عن صوم يوم عرفة بعرفة. رواه الخمسة غير الترمذي، وصححه ابن خزيمة والحاكم، واستنكره العقيلي.

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منع فرمایا- اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا اور ابن خزیمہ اور حاکم نے صحیح کہا اور عقیلی نے منکر کہا(۱)-

(۱) کیونکہ اس کی سند میں مہدی ہجری ہے- جسے عقیلی نے ضعیف قرار دیا اور کہا کہ اس کا کوئی تابع نہیں اور جس سے اس نے روایت کیا اس میں بھی اختلاف ہے-

میں کہتا ہوں- خلاصہ وہی ہے جو ابن معین نے کہا کہ میں اسے نہیں پہچانتا- رہا حکم تو اس نے اس کی حدیث کو صحیح کہا ہے- اور ذہبی نے مختصر المستدرک میں اسے ثابت کیا ہے اور مغنی میں اسے کمزور لوگوں میں شمار نہیں کیا- اور جس راوی نے اس سے روایت کی وہ حوشب بن عبدل ہے- مصنف نے تقریب میں کہا کہ وہ ثقہ ہے-

اور اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ عرفات میں عرفہ کے دن روزہ رکھنا حرام ہے- یحییٰ بن سعید انصاری کا یہی مذہب ہے- وہ کہتے ہیں کہ اس دن روزہ نہ رکھنا حاجی پر واجب ہے- اور بعض کہتے ہیں کہ اگر دعاء سے کمزور نہ ہو تو کچھ حرج نہیں- یہ شافعی سے منقول ہے اور خطابی اور جمہور نے اسے ہی اختیار کیا ہے- کہ اس دن روزہ نہ رکھنا مستحب ہے- اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ کے حج (حجتہ الوداع) کے موقعہ پر عرفات میں عرفہ کے دن آپ کا روزہ نہیں تھا- لیکن آپ کا روزہ نہ رکھنا اس کی تحریم پر دلالت نہیں کرتا- البتہ اس بات پر دلالت کر سکتا ہے کہ روزہ رکھنے سے نہ رکھنا افضل ہے- کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہی کام کرتے تھے جو افضل ہو- الا یہ کہ کبھی محض جواز کی وضاحت کے لئے مفضول کام بھی کر لیتے تھے- گویا آپؐ کے حق میں یہی بات افضل تھی کیونکہ اس میں تشریع بھی ہے اور عملاً" تبلیغ بھی- لیکن واضح بات یہی ہے کہ نہی کی اصل تحریم ہے-

۶۵۰- وعن عبد الله بن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «لا صام من صام الأبد». متفق عليه.

۶۵۱- ولمسلم عن أبي قتادة بلفظ: لا صام ولا أفطر.

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس کا کوئی روزہ نہیں- متفق علیہ(۱) اور مسلم میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ: "اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ کھولا"(۲)-

(۱) اس کے معنوں میں اختلاف ہے- مصابیح کے شارح نے کہا کہ اس کی دو وجہوں سے تفسیر کی گئی ہے-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک یہ کہ یہ الفاظ روزہ دار کے اس کام پر زجر و توبیخ کے طور پر آئے ہیں۔ اور دوسری یہ کہ بطور اطلاع ہیں۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص ہمیشہ روزہ رکھنے کا عادی ہو جائے اسے نہ پیاس کی گرمی تنگ کرتی ہے اور نہ بھوک کی شدت۔ اور وہ کسی مشقت پر صبر کا محتاج ہی نہیں رہتا جس پر ثواب ملتا ہے۔ وہ گویا ایسا ہے کہ نہ اس نے روزہ رکھا اور نہ اس کی فضیلت حاصل کی۔ اور اس دوسری توجیہ کی تائید درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(۲) نیز ترمذی کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے جس کے لفظ ہیں لم یصم ولم یفطر ابن عربی نے کہا کہ اگر یہ الفاظ بطور بد دعا ہیں تو اس شخص پر کتنا افسوس ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بد دعا کریں۔ اور اگر اس کا معنی بھلائی لینا ہے تو اس پر کس قدر افسوس ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے رہے ہیں کہ اس کا کوئی روزہ نہیں۔ اور جب شرعاً" روزہ ہی نہیں تو اس کا ثواب کیا لکھا جائے گا؟

اور علماء نے ہمیشہ روزہ رکھنے میں اختلاف کیا ہے۔ ایک گروہ اس کے جواز کا قائل ہے اور ابن المنذر کا مذہب ہے۔ وہ ہمیشہ روزہ کی ممانعت والی احادیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ہمیشہ روزہ رکھنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو عیدین اور ایام تشریق کے منہی عنہ روزے بھی رکھے۔ یہ تاویل اس لحاظ سے مردود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو کو ہمیشہ روزہ رکھنے سے منع کیا اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ اس کے نفس کا بھی اس پر حق ہے اور بیوی کا بھی اس پر حق ہے اور مہمان کا بھی اس پر حق ہے۔ نیز اس لئے بھی کہ آپ نے فرمایا کہ: "میں خود روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں اور جو شخص میری سنت سے منہ موڑے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"۔ گویا دلیل کے لحاظ سے تحریم ہی صحیح تر ہے۔ پھر وہ دلائل بھی ہیں جنہیں احمد، نسائی اور ابن خزیمہ نے ابو موسیٰ کی مرفوع حدیث سے روایت کیا کہ: "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا جہنم اس پر تنگ کر دی جائے گی اور یہ گرہ اس نے خود اپنے ہاتھ سے لگائی"۔ جمہور کہتے ہیں کہ ہمیشہ روزہ رکھنا اس کے لئے مستحب ہے جسے وہ اپنے حق سے کمزور نہ بنا دے۔ اور نہی کی احادیث کی ایسی تاویلیں کیں جو سب مرجوح ہیں۔ اور استدلال یہ پیش کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے ساتھ شوال کے چھ روزے ملانے سے صائم الدہر سے تشبیہ دی ہے۔ اور ہر ماہ تین روزے رکھنے والے کو بھی۔ پھر اگر صائم الدہر ثواب کا مستحق نہیں تو آپ ایسی تشبیہ کیوں دیتے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ بات تو ہمیشہ کا روزہ مشروع ہونے کی صورت میں ہے۔ کیونکہ جیسے پانچ نمازیں پچاس نمازوں کو کفایت کرتی ہیں جو فرض کی گئی تھیں۔ اب اگر کوئی شخص واجب سمجھ کر پچاس نمازیں ادا کرے گا تو ثواب کا نہیں بلکہ عذاب(۱) کا مستحق ہو گا۔ ہاں ابن السنی نے ابوہریرہ کی حدیث یوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرفوعاً" روایت کی ہے کہ: "جس نے ہمیشہ روزے رکھے اس نے اپنے آپ کو اللہ عزو جل سے بخشوا لیا"۔ الا یہ کہ ہم اس کی صحت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

(ا) شارح ابو ایوب کی حدیث میں کہہ چکا ہے کہ اس کی سند میں سعد بن سعید ہے جس کے متعلق احمد نے کہا ضعیف الحدیث ہے۔ اور نسائی نے کہا قوی نہیں۔ اور ابو حاتم نے کہا کہ اس کی حدیث کی طرف توجہ دینا جائز نہیں۔ تو اب اسے کیسے صحیح اصل قرار دیا جائے۔ جبکہ اس سے ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت کی تمام صحیح احادیث بے کار ہو جاتی ہیں؟۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعتکاف اور نماز تراویح کا بیان

اعتکاف کا لغوی معنی کسی چیز کو لازم کرنا اور اپنے آپ کو اس پر روکے رکھنا ہے اور شرعاً" اس کا معنی کسی خاص شخص کا مخصوص شرائط کے ساتھ مسجد میں قیام کرنا ہے۔ اور قیام رمضان سے مراد رمضان کی راتوں میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا اور تلاوت کرنا ہے۔ نووی نے کہا کہ قیام رمضان نماز تراویح سے حاصل ہوتا ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رمضان کی سب راتوں کو اس نفلی نماز میں مشغول ہونا شرط نہیں۔ اور جو کچھ نووی نے کلام کیا ہے وہ آگے آرہا ہے۔

٦٥٢- عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «من قام رمضان إيماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه. متفق عليه.

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یقین رکھتے(۱) ہوئے اور ثواب کی(۲) نیت سے رمضان میں قیام کرے گا اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے(۳) جائیں گے۔ متفق علیہ

(۱) اصل عبارت میں ایماناً" آیا ہے۔ یعنی اللہ نے ثواب کا جو وعدہ کیا ہے اسے سچا سمجھتے ہوئے۔

(۲) احتساباً" کا لفظ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس لئے کہ گویا ایماناً" کا اس پر عطف ہے بمعنی اللہ کی رضاء اور اس کا ثواب چاہتے ہوئے۔ اور احتساب' حسب سے مشتق ہے۔ جیسے اعتداد' عد سے ہے۔ اور یہ لفظ صرف اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص اللہ کی رضا کے لئے کوئی عمل کرے اس لئے کہ اس کا عمل احتساب اس وقت شمار ہو گا جب وہ اپنے کام کے ساتھ ساتھ ایسی نیت بھی کرے۔ نہایہ میں اس کے یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔

(۳) اس میں یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد رمضان کی تمام راتوں کا قیام ہے۔ اور جو شخص کچھ راتیں قیام کرے اسے مذکورہ مغفرت حاصل نہیں ہو گی اور یہی بات ظاہر ہے اور لفظ ذنب کا اطلاق سب بڑے گناہوں پر ہوتا ہے۔ اور نووی نے کہا کہ یہ مغفرت چھوٹے گناہوں سے مختص ہے اور یہی بات امام الحرمین نے وثوق سے کہی ہے اور عیاض نے اہل سنت کے لئے اس کی نسبت کی ہے۔ اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ بڑے گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ اور نسائی نے اپنی روایت میں ماتقدم کے ساتھ وماتاخر بھی زیادہ کہا ہے۔ چنانچہ اسے احمد نے بھی روایت کیا ہے اور مالک کے طریق سے بھی روایت کی گئی ہے۔ اور آئندہ ہونے والے گناہوں کی مغفرت کے معنی بتلائے جا چکے ہیں۔

یہ حدیث قیام رمضان کی فضیلت پر دلیل ہے۔ اور واضح بات یہ ہے کہ یہ وتروں سمیت گیارہ رکعت نماز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں اتنی ہی رکعت پڑھا کرتے تھے جیسا کہ عائشہ کی حدیث میں پہلے گزر چکا ہے۔ رہی نماز تراویح کی موجودہ صورت تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھی۔ اس کی ابتداء تو حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں کی اور ابی بن کعب کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کی جماعت کرائیں۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ ابی کتنی رکعت نماز پڑھاتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ گیارہ رکعت پڑھاتے تھے' اکیس رکعتوں کی بھی روایت ہے' بیس کی بھی اور تیئس کی بھی۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ اور اس کی تحقیق ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

۶۵۳۔ عن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كان رسول الله ﷺ إذا دخل العشر، أي العشر الأخيرة من رمضان، شد مئزره، وأحيا ليله، وأيقظ أهله متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب رمضان کا عشرہ یعنی آخری عشرہ (۱) آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہبند کس لیتے(۲)۔ خود بھی رمضان کی راتوں کو قیام فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی(۳) بیدار کرتے۔ متفق علیہ

(۱) یہ بطور تفسیر راوی کا کلام درج ہوا ہے۔

(۲) یعنی عورتوں سے کنارہ کر لیتے۔ بعض کہتے ہیں شد مئزرہ عبادت کے لئے سرگرم ہو جانے سے کنایہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ سب معنوں کو شامل ہے۔ یعنی آپ عورتوں سے بھی الگ رہتے اور عبادت پر بھی کمر بستہ ہو جاتے۔ یہ حضرت علی کی اس روایت سے بعید ہے کہ "آپ تہبند مضبوط کر لیتے اور عورتوں سے کنارہ کش ہو جاتے"۔ کیونکہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور رات کو زندہ کرنے سے مراد خود رات کو بیدار رہنا ہے۔

(۳) یعنی نماز اور عبادت کے لئے۔ اور یہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص اس وقت کرتے جب آخر رمضان میں عبادت کا وقت نکلنے کے قریب ہوتا۔ پھر آپ تہجد پڑھتے کیونکہ یہ اس عمل کا خاتمہ ہے۔ اور اعمال کا انحصار خاتموں پر ہے۔

۶۵۴۔ وعنها أن النبي ﷺ كان يعتكف العشر الأواخر من رمضان، حتى توفاه الله عز وجل، ثم اعتكف أزواجه من بعده. متفق عليه.

اور عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی۔ پھر آپؐ کے بعد آپ کی بیویاں بھی اعتکاف کرتی رہیں۔ متفق علیہ(ا)

(ا) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ اعتکاف ایسی سنت ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی بھر ہیشگی کرتے رہے۔ پھر آپ کے بعد آپ کی بیویاں بھی کرتی رہیں۔ ابو داؤد نے احمد سے روایت کیا۔ میں کوئی ایسا عالم نہیں جانتا جس نے اعتکاف کے مسنون ہونے میں اختلاف کیا ہو۔ اور اس سے مقصود خلوت میں اور خالی معدہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے لو لگانا اس کی طرف متوجہ ہونا اس کی نعمتوں کا ذکر کرنا اور ماسوا اللہ سے اعراض کرنا ہے۔

٦٥٥- وعنها رضي الله تعالى عنها قالت: كان النبي ﷺ إذا أراد أن يعتكف، صلى الفجر ثم دخل معتكفه. متفق عليه.

اور عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف بیٹھنے کا ارادہ کرتے تو صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اعتکاف کی جگہ چلے جاتے۔ متفق علیہ(ا)

(ا) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ اعتکاف کا اول وقت یعنی آغاز صبح کی نماز کے بعد ہے اور یہی بات یہاں واضح ہے۔ اس میں ان لوگوں نے اختلاف کیا ہے جو کہتے ہیں کہ اگر آپ دن کو اعتکاف بیٹھنا چاہتے تو طلوع فجر سے پہلے مسجد میں چلے جاتے اور اگر رات کو اعتکاف کرنا چاہتے تو سورج غروب ہونے سے پہلے مسجد میں چلے جاتے۔ اور اس حدیث کی یہ تاویل کی کہ جب فجر طلوع ہوتی تو اس وقت آپ مسجد میں ہوتے تھے اور فجر کی نماز کے بعد اس جگہ چلے جاتے جو آپ نے اعتکاف کے لئے تیار کی ہوتی۔ میں کہتا ہوں کہ مخفی نہ رہے کہ آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ اعتکاف کی جگہ سے صرف اقامت کے وقت باہر نکلتے تھے۔

٦٥٦- وعنها قالت: إن كان رسول الله ﷺ ليدخل علي رأسه، وهو في المسجد، فأرجله، وكان لا يدخل البيت إلا لحاجة، إذا كان معتكفاً. متفق عليه، واللفظ للبخاري.

اور عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف ہوتے اور کھڑکی سے اپنا سر میری طرف نکالتے تو میں آپ کے سر میں کنگھی کر دیتی۔ اور جب اعتکاف میں ہوتے تو سوائے قضائے حاجت کے کبھی گھر میں نہ آتے۔ متفق علیہ۔ اور یہ لفظ بخاری کے ہیں(ا)۔

(ا) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ معتکف اپنا سارا بدن باہر نہیں کر سکتا اور کچھ حصہ نکال لے تو وہ نقصان نہیں دیتا۔ نیز معتکف کے لئے یہ مشروع ہے کہ وہ پاک صاف رہے' نہائے' سرمنڈائے اور آرائش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے۔ نیز اس بات پر بھی دلیل ہے کہ جو افعال انسان سے مخصوص ہیں وہ تھوڑے بہت مسجد میں بھی بجا لا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ اس کی بیوی اپنے خاوند کی خدمت کر سکتی ہے۔

اور حدیث کے الفاظ الا لحاجه اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ معتکف ایسی ضرورت کے لئے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے جس کے بغیر چارہ نہ ہو اور زہری نے حاجت کی تفسیر بول و براز سے کی ہے۔ اور ان دونوں کے استثناء پر سب کا اتفاق ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسری حاجات مثلاً کھانے' پینے میں اختلاف ہے۔ اور حق یہ ہے کہ بول و براز یا سینگی لگوانے یا ایسی ہی دوسری چیزوں کے لئے مسجد سے نکلنا جائز ہے۔

۶۵۷- وعنها قالت: السنة على المعتكف أن لا يعود مريضاً، ولا يشهد جنازة، ولا يمس امرأة، ولا يباشرها، ولا يخرج لحاجة إلا لما لا بد له منه، ولا اعتكاف إلا بصوم.

ولا اعتكاف إلا في مسجد جامع. رواه أبو داود، ولا بأس برجاله، إلا أن الراجح وقف آخره.

اور عائشہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ اعتکاف کرنے والے کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ نہ کسی مریض کی عیادت کرے' نہ کسی جنازہ میں شامل ہو' نہ اپنی عورت کو چھوئے اور نہ اس سے مباشرت کرے اور مسجد سے ایسی حاجت کے بغیر نہ نکلے جس کے سوا چارہ نہ ہو۔ اور اعتکاف نہ روزے کے بغیر ہوتا ہے اور نہ جامع کے علاوہ کسی اور جگہ۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا اور اس کے راوی معتبر ہیں الا یہ کہ راجح بات یہی ہے کہ اس کا آخری(۱) حصہ موقوف ہے۔

(۱) یعنی حدیث کے الفاظ کہ "روزہ کے بغیر اعتکاف نہیں"۔ مصنف نے فتح الباری میں یوں کہا کہ دار قطنی نے وثوق سے کہا ہے کہ حضرت عائشہ کا قول لایخرج لحاجه تک ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے کہ عائشہ کا قول نہیں اور یہاں یہ کہا کہ اس کا آخری حصہ موقوف ہے۔

اور اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو باتیں اس میں بتلائی گئی ہیں' ان کے علاوہ معتکف سے نکل نہیں سکتا۔ نیز وہ جمعہ میں حاضر ہونے کے لئے بھی نہیں نکل سکتا۔ اور اگر وہ کوئی ایسا کام کرے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ اور اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے لیکن دلیل اسی پر قائم ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ رہی روزے کی شرط لگانا تو اس میں بھی اختلاف ہے۔ اور یہ حدیث موقوف ہے جو شرط لگانے پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس بارے میں کئی احادیث ہیں جن میں سے کسی میں روزہ کی شرط ہے اور کسی میں نہیں اور حجت کسی پر قائم نہیں ہوتی۔ اور وہ اعتکاف جو آپ نے شوال کے بعد عشرہ میں کیا تھا اس میں آپ روزہ سے رہے یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعتکاف ۲ شوال کو شروع کیا تھا۔ کیونکہ عید کے دن تو نماز عید اور خطبہ اور کھلے میدان کی طرف جانے کے مشاغل تھے۔ مگر صرف آپ کے فعل سے روزہ کی شرط پر حجت قائم نہیں ہوتی۔

رہی اعتکاف کے لئے مسجد کی شرط تو چند علماء کے علاوہ اکثریت اس شرط کی قائل ہے۔ اور اس کے جامع ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہاں نماز باجماعت کا اہتمام ہوتا ہو۔ احمد اور ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے۔ اور جمہور کا قول یہ ہے کہ ہر مسجد میں جائز ہے مگر جو شخص جمعہ کا التزام چاہتا ہو اس کے لئے شافعی نے جامع مسجد کو مستحب کہا ہے۔ اور اس میں بھی وہی بات ہے جو روزہ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہی مسجد میں اعتکاف بیٹھتے تھے اور وہ جامع مسجد تھی۔ اور وہ احادیث جو روزہ کی شرط نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

۶۵۸- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ قال: «ليس على المعتكف صيام، إلا أن يجعله على نفسه». رواه الدارقطني والحاكم، والراجح وقفه أيضاً.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اعتکاف کرنے والے پر روزے لازم نہیں الا یہ کہ وہ خود اپنے آپ پر مقرر کرلے (نذر مان لے) اسے داقطنی اور حاکم نے روایت کیا۔ اور راجح بات یہی ہے کہ یہ بھی موقوف(۱) ہے۔

(۱) ابن اعباس پر موقوف ہے۔ بیہقی نے کہا: صحیح بات یہ ہے کہ یہ موقوف ہے اور اسے مرفوع سمجھنا وہم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں اجتہاد کے لئے وسیع میدان ہے لہٰذا عدم شرط پر دلیل قائم نہیں ہوتی۔ اور حدیث کے الفاظ "مگر جو اپنے آپ پر مقرر کرلے" سے مراد روزہ کی نذر ماننا ہے۔

۶۵۹- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، أن رجالاً من أصحاب النبي ﷺ أروا ليلة القدر في المنام، في السبع الأواخر، فقال رسول الله ﷺ: «أرى رؤياكم قد تواطأت في السبع الأواخر، فمن كان متحريها، فليتحرها في السبع الأواخر». متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ(۱) کو خواب میں رمضان کی آخری سات راتوں میں لیلۃ القدر(۲) دکھائی گئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری خوابیں رمضان کی آخری راتوں پر متفق ہو گئی ہیں۔ اور یہ سب آخری سات راتوں پر موافق ہو گئی ہیں۔ لہٰذا جو شخص لیلۃ القدر کو تلاش کرنا چاہے وہ آخری سا راتوں میں تلاش کرے۔ متفق علیہ(۳)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) مصنف نے کہا کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی مجھے نام معلوم نہیں ہو سکا۔
(۲) یعنی انہیں خواب میں یہ کہا گیا کہ وہ رات آخری سات راتوں میں ہے۔
(۳) نیز مسلم نے ابن عمر سے مرفوعاً" روایت کیا: "اسے آخری دس راتوں میں تلاش کرو۔ پھر اگر تم میں سے کوئی کمزور یا عاجز ہو جائے تو اسے پچھلی سات راتوں پر غالب آنا چاہیے"۔ نیز احمد نے روایت کیا کہ: ایک آدمی نے دیکھا کہ "لیلتہ القدر ستائیسویں رات ہے"۔ کچھ ایسا ہی دیکھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اسے آخری دس راتوں کی طاق راتوں میں تلاش کرو"۔ اور احمد نے علی سے "مرفوعاً" روایت کیا کہ اگر تم مغلوب ہو جاؤ تو آخری سات راتوں سے مغلوب نہ ہونا"۔ اور ان روایات میں تطبیق یوں ہے کہ دس والی اور اسی طرح سات اور نو راتوں والی روایات ازراہ احتیاط ہیں۔ کیونکہ یہ لیلتہ القدر کا مظنہ ہیں اور اس ظن میں ادراک کا کچھ دخل نہیں۔ اور اس حدیث میں خواب کی شان کی عظمت اور پائے جانے والے امور میں خواب پر اعتماد کرنے کے جواز پر دلیل ہے بشرطیکہ وہ خواب قواعد شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔

٦٧٠- وعن معاوية بن أبي سفيان رضي الله تعالى عنهما، عن النبي ﷺ، قال في ليلة القدر: «ليلة سبع وعشرين». رواه أبو داود، والراجح وقفه.

وقد اختلف في تعيينها على أربعين قولاً، أوردتها في فتح الباري.

معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لیلتہ القدر کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت(۱) کیا ہے اور راجح بات یہ ہے کہ یہ موقوف(۲) ہے۔ اور لیلتہ القدر کی تعین میں چالیس مختلف اقوال ہیں جنہیں میں نے فتح الباری میں درج کر دیا(۳) ہے۔

(۱) مرفوعاً"
(۲) معاویہ پر موقوف اور اس کا حکم رفع کا ہے۔
(۳) انہیں یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو تعیین میں مرفوع قول کی طرح نہیں اور ایسے قول کا انکار اس کی اصل سے انکار ہے۔ مصنف نے ایسے چالیس اقوال شمار کئے ہیں۔ علاوہ ازیں اور اقوال بھی ہیں جن پر کوئی دلیل نہیں۔ اور سب سے قوی قول یہ ہے کہ وہ آخری سات راتوں میں ہے۔ مصنف نے فتح الباری میں یہ اقوال درج کرنے کے بعد کہا کہ ان میں سے راجح قول یہی ہے کہ وہ آخری عشرہ کی وتر راتوں میں ہے۔ اور وہ منتقل ہوتی رہتی ہے جیسا کہ اس باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اور شافعیہ کے نزدیک طاق راتوں سے کوئی طاق رات زیادہ متوقع ہے اور وہ اکیسویں یا تئیسویں رات ہے جیسا کہ ابو سعید اور عبداللہ بن انیس کی دونوں حدیثوں سے پتہ چلتا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک زیادہ متوقع ستائیسویں رات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

٦٦١- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، قالت: قلت: يا رسول الله! أرأيت إن علمت أي ليلة ليلة القدر، ما أقول فيها؟ قال: «**قولي اللهم إنك عفو، تحب العفو، فاعف عني**». رواه الخمسة غير أبي داود، وصححه الترمذي والحاكم.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! بھلا دیکھیں کہ اگر مجھے لیلۃ القدر کا علم ہو جائے تو میں اس میں کیا دعا کروں؟ آپ نے فرمایا: "یوں کہو: اے اللہ تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنا پسند کرتا ہے۔ لہٰذا مجھے معاف فرما دے"۔ اسے ابوداؤد کے سوا پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی اور حاکم نے اسے صحیح کہا(ا)۔

(ا) بعض کہتے ہیں کہ اس کی علامت یہ ہے کہ اطلاع پانے والے کو ہر چیز سجدہ کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے(ا)۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر جگہ چمکنے والے انوار دکھائی دیتے ہیں خواہ وہ تاریک مقامات ہوں۔ بعض کہتے ہیں کہ فرشتوں کا سلام یا ان کا خطاب سنائی دیتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جو شخص اسے پالے اس وقت کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔ اور طبری نے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ ایسی چیزیں حاصل ہوں نہ کوئی چیز دکھائی دیتی ہے اور نہ سنائی دیتی ہے۔

اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا جو شخص یہ سمجھے کہ اس نے اس رات کو پا لیا ہے اور اس کے لئے کوئی چیز ظاہر نہ ہو تو بھی اسے مترتب اور موعودہ ثواب ملے گا یا صرف اسی کو ملے گا جس پر لیلۃ القدر واضح ہو جائے۔ پہلی صورت طبری' ابن عربی اور پچھلوں کا مذہب ہے اور دوسری صورت اکثریت کا۔ اور اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے مسلم ؒ ابوہریرہ سے بدیں الفاظ روایت کیا ہے: جو لیلۃ القدر کے لئے کوشش کرے تو اسے پالے" نووی نے کہا۔ یعنی یہ جان لے کہ یہ لیلۃ القدر ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعتا سے مراد فی نفسہ لیلۃ القدر ہو اگرچہ اسے اس کا علم نہ ہو سکے۔ اور مصنف نے اسی کو ترجیح دی ہے اور کہا کہ جو شخص لیلۃ القدر کی تلاش میں کھڑا ہو اسے بہت بڑا ثواب حاصل ہونے سے انکار نہیں خواہ وہ لیلۃ القدر نہ پائے۔ بحث صرف اس بات میں ہے کہ آیا پانے والے کو موعودہ اور معین ثواب مل جاتا ہے جو اس کے سابقہ گناہوں کی بخشش ہے۔

٦٦٢- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**لا تشدوا الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد، المسجد الحرام، ومسجدي هذا، والمسجد الأقصى**». متفق عليه.

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین مسجدوں کے علاوہ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی جگہ کی زیارت کے لئے سفر اختیار (۱) نہ کیا جائے۔ پہلی مسجد حرام' دوسری میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور تیسری مسجد اقصیٰ ۔ متفق علیہ

(۱) اصل عبارت میں لاتشد الرحال کے لفظ آئے ہیں اگر لاتشد کو نفی کے معنوں میں سمجھا جائے تو د پر ضمہ ہو گا۔ اور یہ سکون سے بھی مروی ہے۔ اگر اسے نہی سمجھا جائے اور رحال' رحل بمعنی اونٹ کا کجاوہ جیسے گھوڑے کی کاٹھی ہوتی ہے۔ اور شد یہاں سفر سے کنایہ ہے کیونکہ بسا اوقات یہ سفر کے لئے لازمی ہوتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس حدیث کو باب الاعتکاف میں اس لئے لایا گیا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ اعتکاف صحیح نہیں۔ پھر وہ نفی سے مجازاً نہی مراد لیتے ہیں۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ ان مقامات کے علاوہ کسی اور جگہ زیارت کے مقصد سے جانا شرعاً" درست نہیں۔ کیونکہ ان مقامات کو اللہ تعالیٰ نے بالخصوص شرف عطا فرمایا ہے۔

اور مسجد حرام سے مراد پورے کا پورا حرم ہے جیسا کہ ابوداؤد طیالسی نے عطاء کے طریق سے روایت کیا کہ: "ان سے پوچھا گیا کہ آیا یہ فضیلت صرف مسجد حرام میں ہے یا پورے حرم میں؟ انہوں نے کہا پورے حرم میں ہے"۔ اور اس لئے بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کی تعین سے یہی مراد تھی جو فرمایا: "میری مسجد' اور مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے"۔ زمخشری نے کہا کہ مسجد اقصیٰ کا یہ نام اس لئے پڑا کہ اس سے آگے کوئی مسجد نہ تھی۔

اور یہ حدیث ان مساجد کی فضیلت پر دلیل ہے۔ اور حصر کا مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ سفر کا قصد کرنا حرام ہے جیسے زندہ یا فوت شدہ لوگوں کی زیارت کے لئے تقرب کے مقصد سے جانا اور کسی فضیلت والے مقام کا تبرک حاصل کرنے اور وہاں نماز پڑھنے کے لئے قصد کرنا۔ شیخ ابو محمد جوینی کا یہی مذہب ہے' اور قاضی عیاض اور ایک گروہ بھی اسی بات کا قائل ہے۔ اور اس پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے اصحاب سنن نے روایت کیا کہ ابوہریرہ طور کی زیارت کے لئے گئے تو ابو بصرہ غفاری نے ان پر گرفت کی کہ اگر میں تمہارے روانہ ہونے سے پہلے آجاتا تو تمہیں جانے نہ دیتا۔ اور اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ابوہریرہ کو بتلایا۔

---

(۱) اللہ تعالیٰ مولف کو معاف فرمائے کہ اس نے اس طرح کے عامیانہ خیال کو درج کر دیا اور ایسی بات توقیف (نص شرعی) کے بغیر نہ کہنا چاہئے۔

(۲) صاحب فتح العلام نے کہا کہ اکثر لوگ زیارت کے مسئلہ اور سفر کے مسئلہ کے درمیان فرق کو سمجھ نہیں سکے۔ لہٰذا اسی حدیث کو اس کے واضح مفہوم سے بلا دلیل پھیر دیا جس کا یہ حدیث مطالبہ کرتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ حرام نہیں۔ اور ناقابل اعتماد باتوں سے استدلال کیا اور اس حدیث کی دور از کار تاویل کر ڈالی۔ حالانکہ تاویل اس وقت کرنا چاہئے جب اس کے خلاف پر کوئی دلیل قائم ہو(ا)۔

نیز یہ حدیث ان تین مساجد کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس بات پر بھی کہ ان میں سب سے افضل مسجد الحرام ہے۔ اس کا پہلے ذکر ہونا ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شرف و منزلت میں یہ مقدم ہے پھر اس کے بعد مسجد نبوی اور پھر مسجد اقصیٰ۔ اس پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے بزار نے ابو الدرداء سے مرفوعاً روایت کیا اور اس کی سند کو حسن کہا' "مسجد الحرام میں ایک نماز کا ایک لاکھ نماز کے برابر ثواب ملتا ہے' اور میری مسجد میں ایک ہزار نماز کے برابر اور بیت المقدس میں پانچ سو نمازوں کے برابر"۔ اور اس معنی میں اور بھی کئی احادیث ہیں۔

پھر اس بات میں بھی علماء نے اختلاف کیا کہ آیا ان مساجد کی یہ فضیلت فرض اور نفل دونوں طرح کی نمازوں کو عام ہے یا صرف پہلی (فرض) سے خاص ہے؟ طحاوی وغیرہ' نے کہا کہ یہ فضیلت صرف فرضوں سے خاص ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "کسی شخص کی سب سے بہتر نماز وہ ہے جو وہ اپنے گھر میں پڑھے ماسوائے فرض نمازوں کے"۔

واضح رہے کہ لفظ الصلوہ معرفہ میں لام جنس کا ہے لہذا عام ہے اور اس میں نفلی نماز بھی شامل ہے۔ الا یہ کہ یہ کہا جائے کہ جب مطلق الصلوۃ کہا جائے تو اس سے فوری طور پر فریضہ نماز ہی ذہن میں آتی ہے اور اس میں نفلی نماز شامل نہیں ہوتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتاب الحج

حج کی حا پر فتحہ بھی درست ہے اور کسرہ بھی۔ اور یہ بالاتفاق اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ سب سے پہلے ۶ ہجری میں فرض ہوا۔ اور ابن قیم نے الھدی النبوی میں اس بات کو اختیار کیا کہ یہ ۹ تا ۱۰ ہجری میں فرض ہوا۔ اور اس بارے میں اختلاف ہے۔

حج کی فضیلت اور جن لوگوں پر یہ فرض ہے

۶۲۳- عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «**العمرة إلى العمرة كفارة لما بينهما، والحج المبرور ليس له جزاء إلا الجنة**». متفق عليه.

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک عمرہ سے لے کر دوسرے عمرہ تک گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور(۱) کی جزاء جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ متفق علیہ

(۱) یعنی ایسا حج جس میں گناہ کی آمیزش نہ ہو۔ نووی نے اسی تعریف کو ترجیح دی ہے۔ اور بعض مبرور بمعنی مقبول کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حج مبرور وہ ہے جس کا نتیجہ حاجی پر ظاہر ہونے لگے۔ اور اس کے پہلے حال سے پچھلا حال بہتر ہو۔ اور احمد اور حاکم نے جابر کی حدیث روایت کی کہ: "آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! حج کی نیکی کیا ہے؟ فرمایا: کھانا کھلانا اور سلام پھیرنا"۔ اور اس کی سند کمزور ہے اور اگر ثابت ہو جائے تو تفسیر معین کر دیتی ہے۔

عمرہ کا لغوی معنی زیارت اور بقول بعض قصد ہے اور شرعی معنی احرام، سعی، طواف اور سر منڈانا یا بال کترانا ہے۔ اس کا یہ نام اس لئے پڑا کہ اس سے بیت اللہ کی زیارت اور اس کا قصد کیا جاتا ہے۔ اور حدیث کے لفظ ہیں العمرہ الی العمرہ جو عمرہ بار بار کرنے پر دلیل ہے اور اس میں نہ کوئی کراہت ہے اور نہ وقت کی پابندی ہے۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ ایک سال میں ایک سے زیادہ عمرے مکروہ ہیں۔ انہوں نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سال بہ سال عمرہ کیا کرتے تھے اور آپ کے افعال مالکیہ کے ہاں یا وجوب پر محمول ہوتے ہیں یا استحباب پر۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کبھی کبھی کسی مستحب کام کو اس لئے چھوڑ دیتے کہ امت سے مشقت اٹھ جائے۔ اور کبھی اسے مستحب کہا جاتا ہے۔

اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ عمرہ کسی وقت بھی کر لینا مشروع ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اسے حج سے نہ ملائے اور بقول بعض ایام تشریق میں اور بقول بعض عرفہ کے دن عمرہ نہ کرے اور بعض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہتے ہیں کہ متمتع "اور قارن حاجی کے سوا کوئی دوسرا حج کے مہینوں میں عمرہ نہ کرے۔ اور واضح تر بات یہ ہے کہ عمرہ مطلقاً" مشروع ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا اس شخص کا رد ہے۔ جو اسے ان مہینوں میں کرنا مکروہ سمجھتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چاروں عمرے حج کے مہینوں میں کئے تھے جیسا کہ معلوم ہے اگرچہ چوتھا عمرہ آپ کے حج کا عمرہ تھا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قران حج کیا تھا جیسا کہ دلائل سے ثابت ہے۔ اور سب بڑے بڑے اماموں کا یہی مذہب ہے۔

٦٦٤-وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: قلت: يا رسول الله! على النساء جهاد؟ قال: **«نعم، عليهن جهاد لا قتال فيه؛ الحج والعمرة»**. رواه أحمد وابن ماجه، واللفظ له، وإسناده صحيح، وأصله في الصحيح.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں ان پر ایسا جہاد فرض ہے جس میں لڑائی نہیں۔ اور وہ حج اور عمرہ(۱) ہے۔ اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور یہ لفظ ابن ماجہ کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے اور اس کی اصل صحیح میں بھی(۲) ہے۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کے لئے مجازاً جہاد کا لفظ استعمال فرمایا اور انہیں جہاد سے تشبیہ دی اور یہ لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ حج اور عمرہ میں مشقت ہوتی ہے اور آپ کا فرمان "اس میں لڑائی نہیں"۔ مراد کی وضاحت ہے اور یہ ذکر کرنے سے حج اور عمرہ جہاد کے استعارہ سے نکل گیا۔ اور جواب حکیمانہ انداز میں دیا۔

(۲) یعنی صحیح بخاری میں۔ مصنف کی عبارت سے معلوم ہوا کہ جب وہ صرف صحیح کا لفظ کہے تو اس سے مراد بخاری ہوتا ہے۔ اور اس سے مصنف کی مراد وہ حدیث ہے۔ جسے بخاری نے عائشہ بنت طلحہ سے' عائشہ ام المومنین سے روایت کیا کہ: "حضرت عائشہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! ہم جہاد کو سب سے افضل عمل سمجھتی ہیں کیا ہم جہاد نہ کیا کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ افضل الجہاد حج مبرور ہے"۔ اس سے حج کے بارے میں احمد کی مطلق روایت کی قید معلوم ہو گئی۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ عورتوں کے حق میں حج اور عمرہ کے قائم مقام ہوتے ہیں ور اس کے ظاہر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عمرہ واجب ہے مگر یہ کہ آگے مذکور حدیث اس کے خلاف ہے اور وہ یہ ہے۔

٦٦٥- وعن جابر بن عبد الله رضي الله تعالى عنهما قال: أتى النبي ﷺ أعرابي، فقال: يا رسول الله! أخبرني عن العمرة، أواجبة هي؟ فقال: **«لا، وأن تعتمر خير لك»**. رواه أحمد والترمذي، والراجح وقفه.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۲۲-وأخرجه ابن عدي من وجه آخر ضعيف عن جابر مرفوعاً: الحج والعمرة فريضتان.

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک اعرابی (۱) آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! مجھے بتلایئے کہ آیا عمرہ واجب ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ اور اگر تو عمرہ کرے تو تیرے(۲) لئے اچھا ہے۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا۔ اور راجح اس کا موقوف(۳) ہونا ہے۔ نیز اسے ابن عدی نے اسے ایک دوسرے(۴) کمزور طریق(۵) سے روایت کیا ہے۔ اور جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ: "حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں(۶)۔

(۱) اعرابی ' اعراب کی طرف منسوب ہے یعنی جنگل میں رہنے والے لوگ جو ایسی جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں بارش ہوتی ہو اور گھاس اگتی ہو۔ خواہ وہ عرب کے لوگ ہوں یا ارد گرد کے۔ اور عربی وہ ہے جس کا نسب عرب کی طرف ثابت ہو اور اس کی جمع اعراب ہے۔ اور اعرابی کی جمع اعراب بھی آئی ہے اور اعارب بھی۔

(۲) یعنی عمرہ واجب تو نہیں لیکن اگر تو عمرہ کرے تو چھوڑنے سے بہتر ہے۔ اور آپ کا اجر کی خبر دینا اس کے مستحب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اس کی دونوں اطراف برابر نہیں حتیٰ کہ وہ مباح ہو جائے۔ اور یہ جملہ یہ وہم دور کرنے کے لئے لایا گیا کہ جب یہ واجب نہیں تو آیا کیا یہ مباح ہے یا مستحب؟ بلکہ اس کا ظاہر اباحت ہے کیونکہ وہی اصل ہے لہٰذا اس کے مستحب ہونے کی وضاحت فرما دی۔

(۳) اسے احمد اور ترمذی نے مرفوعا" روایت کیا اور راجح یہ ہے کہ یہ جابر پر موقوف ہے انہی سے اعرابی نے سوال کیا تھا اور آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جواب دیا اور یہ ایسی بات ہے جس میں اجتہاد کی خاص گنجائش ہے۔

(۴) ابن عدی نے ابو عصمۃ سے' ابن المنکدر سے' جابر سے' کے طریق سے روایت کیا۔ اور ابو عصمۃ کو سب نے جھوٹا کہا ہے۔

(۵) کیونکہ اس کی سند میں ابو عصمۃ ہے اور جو سند احمد اور ترمذی نے بیان کی اس میں حجاج بن ارطاہ ہے اور وہ بھی ضعیف ہے۔

نیز اسے ابن عدی اور بیہقی نے عطاء عن جابر کی حدیث سے روایت کیا کہ "حج اور عمرہ دونوں فریضے ہیں"۔ اور اس روایت میں جو کچھ ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اور یہ قول کہ جابر مذکور کی حدیث کو ترمذی نے صحیح کہا ہے مردود ہے۔ کیونکہ امام میں ہے کہ ترمذی نے جتنی روایات بھی اس سے روایت کی ہیں کسی کے ساتھ حسن نہیں لکھا۔ اور ابن حزم افراط کی طرف گیا کہ وہ مکذوب اور باطل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس باب میں جتنی بھی احادیث ہیں ان سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ اور ترمذی نے شافعی سے نقل کرتے ہوئے کہا: عمرہ کے بارے میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے ثابت ہو کہ وہ واجب نفل ہے۔ اور جو احادیث اس کے وجوب میں ہیں ان سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ عائشہ کی گزشتہ حدیث اور یہ حدیث۔

(٦) اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو عمرہ کے وجوب پر دلیل بن سکتی ہے۔ الا یہ کہ مصنف نے یہاں نہ تو یہ ذکر کیا ہے کہ اسے کس نے روایت کیا اور نہ یہ کہ اس کے بارے میں کیا کچھ کہا گیا ہے۔ اور جو تلخیص میں ہے وہ یہ ہے کہ اسے ابن عدی اور بیہقی نے ابن لہیعہ سے، عطاء سے، جابر سے روایت کیا ہے اور ابن لہیعہ ضعیف ہے اور ابن عدی نے کہا: یہ عطاء سے غیر محفوظ ہے۔ نیز اسے دار قطنی نے بھی زید بن ثابت کی روایت سے اس اضافہ سے روایت کیا ہے۔ "ان میں سے کوئی بھی پہلے شروع کر لے تجھے کچھ نقصان نہ ہو گا"۔ اور اس کے دو طریق میں سے ایک میں ضعیف ہے اور دوسرے میں انقطاع ہے۔ اور بیہقی نے ابن سیرین کے طریق سے موقوفاً" روایت کیا ہے اور اس کی سند بہت صحیح ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ اور چونکہ عمرہ کے وجوب اور عدم وجوب میں اختلاف ہوا ہے لہٰذا علمائے سلف و خلف میں اس بارے میں اختلاف رہا ہے۔ ابن عمر اس کے وجوب کے قائل ہیں اور بخاری نے اسے تعلیقاً" ذکر کیا ہے۔ اور ابن خزیمہ اور دار قطنی نے اسے موصول کیا ہے۔ نیز بخاری نے ابن عباس سے بھی تعلیقاً" روایت کیا کہ اس کا قرینہ قرآن کی آیت واتموا الحج والعمرة لله میں موجود ہے۔ اور اس سے شافعی وغیرہ نے موصول کیا ہے۔ اور بخاری نے باب کا یہ عنوان قائم کر کے باب وجوب العمرة و فضلها عمرہ کے وجوب کی صراحت کی ہے۔ اور ابن عمر اور ابن عباس کی حدیث بیان کی ہے۔ اور دوسروں نے اس کے واجب ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ "اپنے باپ کی طرف سے حج کرو اور عمرہ کر"۔ اور یہ حدیث صحیح ہے۔ شافعی نے کہا: "عمرہ کے وجوب میں اس سے اچھی میں کوئی حدیث نہیں جانتا"۔ مذکورہ دلائل کی بنا پر حنفیہ اس کے وجوب کی طرف گئے ہیں۔

رہا اللہ تعالیٰ کے اس قول واتموا الحج والعمرة لله سے استدلال تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ تو صرف حج اور عمرہ کو پورا کرنے کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اور کوئی شخص عمرہ کا احرام باندھ لے یا یہ نفلی عمرہ ہو تو اسے پورا کرنے کے وجوب پر سب کا اتفاق ہے۔ اور شافعیہ کا غالب قول یہ ہے کہ یہ فرض ہے اور تحقیق کے وقت دلائل اس کا وجوب ثابت نہیں کرتے جس کی اصل عدم وجوب ہے۔

٦٦٧- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: قيل يا رسول الله! ما السبيل؟ قال: **«الزاد والراحلة»**. رواه الدارقطني، وصححه الحاكم، والراجح إرساله، وأخرجه الترمذي من حديث ابن عمر أيضاً، وفي إسناده ضعف.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! رستہ(۱) سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"زاد راہ اور سواری"- اسے دار قطنی نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا(۲)- اور راجح بات یہ ہے کہ یہ مرسل ہے(۳)- اور ترمذی نے بھی ابن عمر کی حدیث روایت کی- لیکن اس کی سند کمزور ہے-

(۱) یعنی جس کا اللہ تعالیٰ نے آیت میں ذکر کیا ہے-

(۲) میں کہتا ہوں کہ بیہقی نے بھی سعید بن ابی عروبہ سے' قتادہ سے' انسؓ سے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے' کے طریق کو صحیح کہا ہے-

(۳) کیونکہ بیہقی نے کہا- درست سند یوں ہے قتادہ سے' حسن سے' لہٰذا یہ مرسل ہے- مصنف نے کہا- یعنی جس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا اور اس کی صحیح سند حسن کی طرف ہے میں اسے موصول نہیں سمجھتا یہ محض وہم ہے-

(۴) یعنی جیسے دوسروں نے انس کی حدیث روایت کی ہے-

(۵) اگرچہ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے- ادر یہ اس لئے کہ اس میں ایک راوی متروک الحدیث ہے- اور اس کے اور بھی کئی طریق علی سے' ابن عباس سے' ابن مسعود سے' عائشہ اور دوسروں سے مروی ہیں اور یہ سب کے سب ضعیف ہیں- عبدالحق نے کہا- اس کے سارے طریقے ضعیف ہیں اور ابن المنذر نے کہا- اس بارے میں کوئی بھی حدیث مسند نہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ جن کی روایت مرسل ہے-

اور امت کی اکثریت اسی تفسیر کی طرف گئی ہے- گویا زاد راہ کی شرط تو مطلق ہے اور سواری کی شرط اس کے لئے ہے جس کا گھر دور ہو- اور اس بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے سب کا احاطہ کرنے کے بعد ابن تیمیہ نے عمدہ کی شرح میں کہا- یہ احادیث اچھے طرق سے مسند بھی مروی ہیں' مرسل بھی اور موقوف بھی جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دجوب کا انحصار زاد راہ اور سواری پر ہے- حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات جانتے تھے کہ بہت سے لوگ پیدل چلنے پر قدرت رکھتے ہیں- علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے حج کے بارے میں فرمایا: "جو شخص حج کے رستہ کی استطاعت رکھتا ہو"- یعنی ایک تو وہ قدرت ہے جو سب عبادات میں قابل اعتبار ہے اور مطلق استطاعت یا اس قدرت معتبرہ پر قدر زائد ہے- اگر وہ پہلی قدرت ہی معتبر ہوتی تو یہ قید لگانے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ روزے اور نماز کی آیت میں ایسی کوئی قید لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی- تو معلوم ہوا کہ حج کے بارے میں قدر زائد ہی معتبر ہے اور وہ مال ہی ہو سکتا ہے- علاوہ ازیں حج میں مسافت کی ضرورت پڑتی ہے- لہٰذا حج کے وجوب کا انحصار خرچ اور سواری پر ہے جیسا کہ جہاد میں ہے- اور اس اصل کی دلیل یہ آیت ہے- وعلى الذين لايجدون ما ينفقون حرج ---- الى قوله --- ولا على الذين اذا ما اتوك لتحملهم ---- الايه اور ابن زبیر اور تابعین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ استطاعت سے مراد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحت یا تندرستی ہے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وتزودوا فان خیرا الزاد التقوی گویا اللہ تعالیٰ نے زاد کی تفسیر تقویٰ سے کی۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس آیت سے مراد یہ نہیں جیسا کہ اس کا شان نزول اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس باب کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد زاد راہ ہی ہے۔ اور اگرچہ اس کے طریق کمزور ہیں تاہم ان کی کثرت اسے مضبوط بنا دیتی ہے۔ اور اس سے مراد وہ فاضلہ کفایت بھی ہے جو اس کے گھر واپس آنے تک اس کے عیال کے خرچ کو کفایت کر سکتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کے لئے یہ گناہ ہی کافی ہے کہ جن کی پرورش کر رہا ہے اسے ضائع کر دے"۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔

اور حج حرام مال سے بھی کفایت کر جاتا ہے اگرچہ اکثر کے نزدیک ایسا حاجی گنہگار ہوتا ہے اور احمد نے کہا کہ کفایت نہیں کرتا۔

۶۲۸۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ لقي ركباً بالروحاء، فقال: من القوم؟ قالوا: المسلمون، فقالوا: من أنت؟ قال: رسول الله، فرفعت إليه امرأة صبياً، فقالت: ألهذا حج؟ قال: **«نعم، ولك أجر»**. رواه مسلم.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روحاء کے مقام پر ایک قافلہ(۱) ملا۔ آپ نے پوچھا: تم کون لوگ ہو؟ وہ کہنے لگے ہم مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں۔ پھر ایک عورت نے اپنے بچے کو آپ کو دکھلانے کی خاطر بلند کیا اور پوچھا کہ: کیا اس کا بھی حج ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں اور اس کا اجر تجھے ملے(۲) گا۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۳)۔

(۱) عیاض نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں رات کو ملے ہوں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان نہ سکے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن کا وقت ہو مگر ان لوگوں کو آپ کو پہلے نہ دیکھا ہو۔ اور روحاء (بروزن حمراء) مدینہ کے قریب ایک مقام ہے۔

(۲) کیونکہ وہ عورت بچے کو اٹھائے ہوئے تھی اور اس کے ساتھ حج کیا تھا۔ یا اس لئے کہ اس نے اس کا حکم پوچھا تھا۔ یا دونوں باتوں کی وجہ سے۔

(۳) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ بچہ کا حج صحیح ہے اور منعقد ہو جاتا ہے خواہ اسے تمیز ہو یا نہ ہو۔ بشرطیکہ اس کے ولی نے اس کی طرف سے وہی کام کئے ہوں جو ایک حاجی کرتا ہے۔ اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ لیکن اس سے اسلام کی حجت پوری نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابن عباس کی حدیث میں ہے کہ "کوئی لڑکا جس نے اپنے اہل کے ساتھ حج کیا ہو۔ پھر وہ بالغ ہو تو اس کے ذمہ ایک اور حج ہے"۔ اسے خطیب اور ضیاء المقدسی نے ابن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عباس کی حدیث سے روایت کیا۔ جس میں یہ اضافہ ہے۔ قاضی نے کہا کہ اس بات پر اجماع ہے کہ بچہ جب بالغ ہو جائے تو اس سے اسلام کا فریضہ ساقط نہیں ہوتا الا یہ کہ ایک شاذ فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ نے نعم کہا تھا۔ کیونکہ اس کا ظاہر یہی ہے کہ حج ہو گیا۔ اور مطلق حج کہنے سے فوری طور پر یہی بات ذہن میں آتی ہے کہ واجب ساقط ہو گیا۔ لیکن علماء کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ نووی نے کہا۔ ولی جو ایسے بچے کی طرف سے احرام باندھتا ہے جسے تمیز نہ ہو وہی ہو گا جو اس کے مال کا ولی ہوا اور وہ اس کا باپ یا دادا یا وصی ہو سکتا ہے۔ یعنی جو حاکم کی طرف سے وصی مقرر ہوا ہو۔ یا ماں تو اس کا احرام بچے کی طرف سے درست نہیں الا یہ کہ وہ یا تو وصیتہ ہو یا حاکم کی طرف سے مقرر کی گئی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ماں کا اور عصبہ کا احرام درست ہے خواہ وہ اس کے مال کے ولی نہ ہوں۔ اور بچے کی طرف سے ولی کے احرام باندھنے کی صورت یہ ہے کہ وہ دل میں کہے کہ میں نے اس کی طرف سے احرام باندھا۔

٦٦٩۔ وعنه قال: كان الفضل بن عباس ردیف رسول الله ﷺ، فجاءت امرأة من خثعم، فجعل الفضل ينظر إليها، وتنظر إليه، وجعل النبي ﷺ يصرف وجه الفضل إلى الشق الآخر، فقالت: يا رسول الله! إن فريضة الله على عباده في الحج أدركت أبي شيخاً كبيراً، لا يثبت على الراحلة، أفأحج عنه؟ قال: **«نعم، وذلك في حجة الوداع»**. متفق عليه، واللفظ للبخاري.

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھے ہوئے تھے(۱) کہ قبیلہ بنو خثعم کی ایک عورت آئی تو فضل نے اس کی طرف اور اس عورت نے فضل کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل کا چہرہ دوسری جانب پھیر دیا۔ وہ کہنے لگی: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے اور میں نے اپنے باپ کو اس حال میں پایا ہے کہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے سواری پر جم کر بیٹھ بھی(۲) نہیں سکتا۔ اب کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں(۳)۔ اور یہ حجتہ الوداع کا واقعہ ہے۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں(۴)۔

(۱) یعنی حجتہ الوداع کے موقعہ پر اور یہ قصہ منیٰ میں پیش آیا۔

(۲) اور ایک روایت کے لفظ یوں ہیں۔ ”اگر میں اسے مضبوطی سے بٹھلا دوں تو بھی مجھے اس کا خطرہ ہے“۔

(۳) یعنی اس کی طرف سے حج کر۔

(۴) اس حدیث کی اور بھی روایات ہیں۔ ایک میں ہے کہ سائل کوئی مرد تھا اور اس نے پوچھا: ”کیا میں اپنی ماں کی طرف سے حج کر سکتا ہوں“۔ اور ممکن ہے کہ یہ الگ الگ واقعات ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ مکلف جب حج پر قدرت رکھنے سے جیسے بڑھاپے کی وجہ سے مایوس ہو جائے تو اس کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔ مگر جب قدرت نہ ہونے کی وجہ ایسا مرض یا جنون ہو جس سے نجات کی توقع ہو تو پھر درست نہیں۔ اور حدیث کا ظاہر بمع اضافہ (یعنی اگر مضبوطی سے بٹھاؤں تو بھی مجھے اس کا خطرہ ہے) یہ ہے کہ دوسرے کی طرف سے حج کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک سواری پر بیٹھ نہ سکے دوسرے اگر اسے مضبوطی سے سواری پر جمایا جائے تو اسے تکلیف یا نقصان ہو۔ اور جس شخص کو مضبوطی سے بٹھانے میں نقصان نہ ہو مثلاً پالکی یا سٹریچر پر حج کرایا جا سکے تو پھر دوسرے کی طرف سے حج کفایت نہ کرے گا۔ الا یہ کہ بحر میں ایسے حج کی صحت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور اس اجماع میں شرط یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے تھامے رکھے۔ پھر اگر یہ اجماع درست ہے تو خیر ورنہ دلیل اسی چیز کا ساتھ دیتی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے حج کی نیت کرے تو اس دوسرے کی طرف سے حج اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ خواہ اس دوسرے پر حج واجب نہ ہو۔ اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ اس عورت نے یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ اس کا باپ خرچ اور سواری کی استطاعت رکھتا ہے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے یہ تفصیل پوچھی تھی۔ اور اس کا رد یوں کیا گیا کہ اس حدیث میں بات صرف کفایت کرنے کی ہے وجوب کی نہیں۔ لہٰذا یہ اس سے معارض نہیں۔ اور اس لئے بھی کہ ممکن ہے کہ اس عورت کو اپنے باپ پر حج کا واجب ہونا معلوم ہو جیسا کہ اس کا یہ قول "اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے"۔ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اسے اس بات کا علم تھا کہ استطاعت کی شرط پر حج اس کے باپ پر فرض ہے۔

دوسرے کی طرف سے فرض حج کے کفایت کرنے کے قائلین اس بات پر متفق ہیں کہ ایسا حج یا تو اس کی موت کی صورت میں ہو سکتا ہے یا عدم قدرت یعنی عاجزی وغیرہ کی صورت میں۔ لیکن نفلی حج میں کوئی شرط نہیں۔ چنانچہ احمد اور ابو حنیفہ دوسرے کی طرف سے علی الاطلاق حج کی نیابت کے جواز کی طرف گئے ہیں کیونکہ نفل میں خاصی وسعت ہے۔ اور بعض لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ کسی کی طرف سے فرض حج کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ اور اس قصہ میں اس عورت کے لئے یہ حکم خاص ہے اگرچہ یہ اختصاص اصل کے خلاف ہے۔ یا ان کا

---

(۱) فتح العلام شرح بلوغ المرام کے مصنف نے کہا: میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ میت کی طرف سے اس کا قریبی حج میں نیابت کر سکتا ہے خواہ یہ اس کی اولاد ہو یا کوئی دوسرا ہو۔ کیونکہ اس بارے میں جتنی بھی روایات آئی ہیں سب اقارب کے حق میں ہیں اور ایک بھی دلیل ایسی نہیں جس کی رو سے حج کی نیابت اجنبیوں کے لئے درست ہو۔ جبکہ قرضہ کوئی بھی ادا کر سکتا ہے۔ گویا قرضہ کی بات عام ہے جبکہ نیابت کی احادیث خاص ہیں اور ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ اپنے اپنے موقع پر ان میں سے ہر ایک پر عمل ہوتا رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استدلال اس روایت سے ہے جو اس حدیث میں بدیں الفاظ مروی ہے۔ "تو اپنے باپ کی طرف سے حج کر لے لیکن تیرے بعد کسی کو یہ اجازت نہیں"۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ اضافہ ضعیف سند سے مروی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ نیابت اولاد سے مختص ہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس قیاس پر شرعی دلیل بھی موجود ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں اس کی وجہ یہ بتلائی کہ: "اللہ کا قرضہ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہے کہ اسے ادا کیا جائے"۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے کہ آپ نے اسے قرضہ قرار دیا۔ اور قرضہ تو اولاد کے علاوہ کوئی بھی چکائے تو وہ بالاتفاق صحیح ہے۔ اور یہی کچھ حدیث شبرمتہ میں آرہا ہے(۱)۔

٦٧٠۔ وعنه أن امرأة من جهينة جاءت إلى النبي ﷺ، فقالت: إن أمي نذرت أن تحج، فلم تحج، حتى ماتت، أفأحج عنها؟ قال: «**نعم، حجي عنها، أرأيت لو كان على أمك دين أكنت قاضيته؟ اقضوا الله، فالله أحق بالوفاء**». رواه البخاري.

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگی۔ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ مگر وہ اپنی وفات تک حج نہ کر سکی تو کیا اب میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ اس کی طرف سے حج کر۔ بھلا دیکھ! اگر تیری ماں پر قرضہ ہوتا تو تو اسے ادا کرتی؟ اللہ کا قرض بھی چکاؤ۔ کیونکہ اللہ اس ادائیگی کا سب سے زیادہ مستحق(۲) ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

(۱) مصنف نے کہا کہ میں نہ اس عورت کے نام سے واقف ہوں اور نہ اس کی ماں کے نام سے۔

(۲) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اگر کوئی حج کی نذر ماننے والا حج کئے بغیر مر جائے اور اس کی طرف سے اس کی اولاد یا کوئی قریبی حج کرے تو اسے کفایت کر جاتا ہے خواہ اس نے اپنا فرضی حج ادا نہ کیا ہو۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے یہ نہیں پوچھا کہ تم خود اپنا حج کر چکی ہو یا نہیں؟ اور اس لئے بھی کہ اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرضہ سے تشبیہ دی ہے اور اس شخص کا قرضہ کوئی بھی ادا کر دے تو ادا ہو جائے گا۔ اور اس کا جواب شبرمتہ کی آگے مذکور حدیث سے دیا گیا جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے اپنا حج نہ کیا ہو اس کی طرف سے حج کفایت نہیں کرتا۔ رہی قرضہ سے تشبیہ کی بات تو کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو قرضہ ادا کرنے میں اپنا مال صرف کرے جبکہ اس کے اپنے قرضہ کا مطالبہ موجود ہو۔

نیز اس حدیث میں قیاس کرنے اور مثال بیان کرنے کی مشروعیت پر دلیل ہے۔ کیونکہ مثال سامع کے دل میں زیادہ اثر کرتی ہے۔ اور تشبیہ سے مجہول چیز پر معلوم چیز سے حکم لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ میت کی طرف سے قرضہ ادا کرنے سے فی الواقعہ قرضہ اتر جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے الحاق کرنے کی یہ خوب تشبیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ نیز یہ حدیث میت کی طرف سے حج کرنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے خواہ میت نے اس کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ کیونکہ قرضہ کی ادائیگی بہرحال لازم ہے اور یہی صورت باقی مالی حقوق مالی کفاروں وغیرہ کی ہے اور ابن عباس' زید بن ثابت' ابوہریرہ اور شافعی کا یہی مذہب ہے۔ ان کے نزدیک راس المال سے خرچہ نکالنا واجب ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ آدمی کے قرضہ پر مقدم ہے اور شافعی کا ایک قول یہی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وان لیس للانسان الاماسعی سے معارض نہیں۔ کیونکہ یہ عام(۱) اصل ہے۔ جسے اس حدیث نے خاص کر دیا یا اس لئے کہ یہ کافر کے حق میں ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس آیت میں ل' علیٰ کے معنی میں ہے یعنی انسان کے ذمہ نہیں۔ اس کی مثال ولھم اللعنہ ہے جس میں لھم علیھم کے معنوں میں ہے۔ اور ہم نے اس بات کو ضوء النہار کے حواشی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۷۱۔ وعنه قال: قال رسول الله ﷺ: «أيما صبي حج، ثم بلغ الحنث، فعليه أن يحج حجة أخرى، وأيما عبد حج، ثم أعتق فعليه أن يحج حجة أخرى». رواه ابن أبي شيبة والبيهقي، ورجاله ثقات، إلا أنه اختلف في رفعه، والمحفوظ أنه موقوف.

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بچہ بھی حج کرے پھر جوانی(۱) کو پہنچے تو اس پر دوسرا (فرضی) حج لازم ہے۔ اور اسی طرح اگر کوئی غلام حج کرے پھر آزاد ہو تو اس پر بھی دوسرا حج لازم ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے روایت کیا۔ اور اس کے راوی معتبر ہیں۔ مگر اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اور صحیح یہی ہے کہ یہ موقوف ہے(۲)۔

(۱) اصل میں لفظ حنث آیا ہے جس کا معنی گناہ ہے۔ یعنی اس عمر کو پہنچے جب اس کا گناہ اس پر لکھا جاتا ہے۔

(۲) ابن خزیمہ نے کہا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ اور محدثین نے اس کے مرفوع یا موقوف ہونے میں بہت کلام کیا ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے اسے مرفوعاً" روایت کیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ مومنوں کے دلوں میں یہ بات پیدا کردوں کہ جو بچہ اپنے گھروالوں کے ساتھ حج کرے پھر مرجائے تو وہ اسے کفایت کرتا ہے اور اگر زندہ رہے تو اس پر حج لازم ہے"۔ اسی طرح غلام کے بارے میں کہا

---

(۱) حدیث میں ہے کہ اولاد آدمی کی کمائی ہوتی ہے جیسا کہ بعض میں آیا ہے۔ اس کی رو سے آیت عام ہے اور باپ کی طرف سے اولاد کا حج اسی سے جا ملتا ہے۔ اور اگر اس میں غور کیا جائے تو یہ آیت ایسی عام نہیں جسے حدیث مخصص کر دے۔ کیونکہ اس میں حصر ہے اور حدیث اس حصر کے خلاف ہے۔ گویا اس حدیث پر عمل حصر کو باطل کرتا ہے۔

اور جب شارح کے لئے یہ درست ہے کہ ل کی تاویل علی کے معنوں سے کرے اور اس آیت کو کافر کے حق میں کہہ دے۔ حالانکہ یہ ظاہر کے خلاف ہے تو پھر دوسری آیات کے متعلق کہا جائے گا مثلاً فمن تزکی فانما یتزکی لنفسه اور آیت من عمل صالحا" فلنفسه

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سعید بن منصور اور ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں روایت کیا اور اس سے احمد نے احتجاج کیا۔ اور شافعی نے ابن عباس کی حدیث روایت کی۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ ایسی مرسل روایت جس پر صحابہ کا عمل رہا ہو بالاتفاق حجت ہے اور کہا کہ یہ مجمع علیہ ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اہل عبادات اس کا حج درست سمجھتے ہیں اور یہ اسے کفایت نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا یہ فعل مکلف ہونے سے پہلے کا ہے۔

٦٧٢_ وعنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يخطب، يقول: «لا يخلون رجل بامرأة إلا ومعها ذو محرم، ولا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم»، فقام رجل فقال: يا رسول الله! إن امرأتي خرجت حاجة، وإني اكتتبت في غزوة كذا وكذا، قال: «انطلق فحج مع امرأتك». متفق عليه، واللفظ لمسلم.

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی مرد کسی عورت(۱) کے ساتھ اس کے محرم کے بغیر خلوت نہ کرے۔ اور نہ ہی کوئی عورت بغیر محرم کے سفر کرے۔ ایک آدمی اٹھ کھڑا (۲) ہوا اور کہنے لگا: "یارسول اللہ! میری بیوی حج پر چلی گئی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں لکھا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: چلو' جا کر اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔ متفق علیہ(۳) اور یہ لفظ مسلم کے ہیں۔

(۱) یعنی اجنبی عورت سے۔

(۲) مصنف نے کہا کہ مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

(۳) یہ حدیث اجنبی عورت سے خلوت کی تحریم پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس بات پر اجماع ہے اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ "ان دونوں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ عورت کے ساتھ اگر شیطان کے بجائے تیسرا آدمی عورت کا کوئی غیر محرم ہو تو کیا خلوت کے معنی ختم ہو جاتے ہیں؟ ظاہر حدیث تو یہی ہے کہ وہ قائم مقام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نہی کا مناسب معنی یہی ہے کہ شیطان ان دونوں میں فتنہ نہ ڈال دے۔ اور قفال نے کہا۔ اس حدیث کے الفاظ پر عمل کرتے ہوئے محرم کا عورت کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

نیز یہ حدیث محرم کے بغیر عورت کے سفر کی تحریم پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ شرط بہرحال لازم ہے خواہ سفر تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ اس اطلاق کو مقید کرنے کے بارے میں کئی احادیث آئی ہیں مگر ان کے الفاظ مختلف ہیں۔ ایک کے الفاظ یہ ہیں: "کوئی عورت محرم کے بغیر ایک رات کا سفر نہ کرے"۔ دوسری روایت میں "دو تین رات سے زائد" ہے۔ ایک اور میں "دو دن کی مسافت" ہے۔ ایک اور میں "تین میل" ہے۔ اور ایک میں "برید" ہے اور ایک اور میں "تین دن" ہے۔ نووی نے کہا۔ اس تحدید سے مراد بالکل وہی مدت نہیں جو مذکور ہے بلکہ وہ فاصلہ ہے جسے سفر کا نام دیا جا سکے' اسی سے عورت کو بغیر محرم کے منع کیا گیا ہے۔ اور تحدید تو محض ایک امر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقع پر لگائی گئی ہے لہٰذا اس کے مفہوم پر عمل نہ ہو گا۔

اور علماء نے اس بارے میں لمبی چوڑی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت دارالحرب سے ہجرت کے لئے اکیلی سفر کر سکتی ہے نیز جب اسے اپنی جان کا خطرہ ہو یا قرضہ کی ادائیگی کا معاملہ ہو یا امانت کی واپسی کا ہو یا خاوند کی نافرمانی سے رجوع کرنا ہے۔ اور یہ مجمع علیہ ہے۔ نیز انہوں نے واجب حج کے سفر میں اختلاف کیا ہے۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ نوجوان عورت کے لئے محرم کے بغیر سفر جائز نہیں۔ اور شافعی سے منقول ہے کہ اگر راستہ پر امن ہو تو اکیلی سفر کر سکتی ہے لیکن اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا قول وللہ علی الناس حج البیت میں عموم ہے جو مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے۔ اور ارشاد نبوی کہ "کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے"۔ میں ہر قسم کے سفر کے لئے عموم ہے۔ گویا یہ عموم معارض ہو گئے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "کوئی عورت محرم کے بغیر حج کا سفر نہ کرے"۔ آیت کے عموم کا مخصص ہے۔ نیز یہ حدیث نوجوان اور بوڑھی سب عورتوں کے لئے ہے اور ائمہ کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ بوڑھی عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنا جائز ہے۔ اور ایک سوال یہ ہے کہ کیا کوئی معتبر عورت، عورت کے لئے محرم کا قائم مقام بن سکتی ہے؟ بعض لوگوں نے صحابہ کے افعال سے استدلال کرتے ہوئے اسے جائز قرار دیا ہے مگر اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس پر اجماع نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اگر عورت دبدبہ والی ہو تو اسے جائز ہے لیکن دلیل اس پر بھی کوئی نہیں۔

رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مرد کو اپنی عورت کے ساتھ جانے کا حکم دینا تو اس سے احمد نے یہ نتیجہ نکالا کہ مرد کا عورت کے سفر حج میں اس کے ہمراہ جانا اس صورت میں واجب ہے کہ اس کے ساتھ اور کوئی نہ ہو۔ اور احمد کے علاوہ دوسروں نے کہا: کہ عورت کے ہمراہ جانا مرد پر واجب نہیں۔ بلکہ اسے استحباب پر محمول کیا۔ اور یہ استحباب پر اسی صورت میں محمول ہو گا جبکہ اس پر کوئی قرینہ موجود ہو۔ اور دین کے قواعد سے اس پر قرینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پر یہ واجب نہیں کہ وہ اپنے فائدے کے حصول کی خاطر دوسرے سے وہ کچھ حاصل کرے جو اس دوسرے پر واجب ہے۔ اور اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ کسی مرد کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی عورت کو فریضہ حج سے روکے کیونکہ وہ عبادت ہے جو اس پر واجب ہو چکی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ فریضہ فوری طور پر ادا کرنا واجب ہے، یا کچھ دیر بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔ پہلی صورت تو ظاہر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دوسری بھی ظاہر ہے کیونکہ اس عورت کو اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں جلدی کرنا چاہئے۔ جیسا کہ اسے نماز اول وقت پڑھنا چاہئے جبکہ کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ رہی وہ حدیث جسے دار قطنی نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ یہ حدیث ایسی عورت کے بارے میں ہے جس کا خاوند بھی ہے اور اس کے پاس مال بھی۔ اور خاوند اسے حج کی اجازت نہیں دیتا کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"اس عورت کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر نہ جانا چاہئے"۔ تو یہ بات نفلی حج پر محمول ہے اور یہ دونوں حدیثوں میں تطبیق کی صورت ہے۔ کیونکہ زیر بحث حدیث میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ وہ عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر حج پر روانہ ہوئی تھی۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ: بغیر محرم عورت کا بھی حج درست ہے اور استطاعت نہ رکھنے والے کا بھی حج درست ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ جس پر عدم استطاعت کی بنا پر حج واجب نہ ہو جیسے وہ مریض ہو یا فقیر ہو' یا اس کی راہ روک دی گئی ہو یا راستہ پر خطر ہو۔ یا عورت کو محرم نہ ملے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود کوئی شخص حج کے جملہ ارکان بجالاتا ہے تو اس کا حج ہو جائے گا۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو اچھا طریق اختیار کرتے ہیں۔ جیسے سواری نہ ہو تو پیدل حج کرنے اور بعض بری راہ اختیار کرتے ہیں جیسے کوئی مانگ کر حج کرے یا کوئی عورت بغیر محرم حج کرے تو ان سب کا حج ہو جائے گا کیونکہ جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ سب انہوں نے پورا کر دیا۔ اگر ان سے نافرمانی ہوئی ہے تو حج کا طریق اختیار کرنے میں ہوئی ہے۔ فی نفسہ حج میں نہیں ہوئی۔

٦٧٣۔ وعنه أن النبي ﷺ سمع رجلاً يقول: لبيك عن شبرمة، قال: من شبرمة؟ قال: أخ لي، أو قريب لي، قال: حججت عن نفسك؟ قال: لا، قال: حج عن نفسك، ثم حج عن شبرمة. رواه أبو داود وابن ماجه، وصححه ابن حبان، والراجح عند أحمد وقفه.

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یوں کہتے سنا کہ میں شبرمہ کی طرف سے حج کرتا ہوں۔ آپ نے اسے پوچھا شبرمہ کون ہے؟ کہنے لگا۔ میرا بھائی ہے(۱)۔ یا قریبی۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا تو نے اپنا حج کر لیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: پہلے اپنا حج کر پھر شبرمہ کی طرف سے کرنا۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا۔ اور احمد نے اس کے موقوف(۲) ہونے کو ترجیح دی ہے۔

(۱) یہ راوی کا شک ہے۔

(۲) اور بیہقی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے اور اس باب میں اس سے بہتر کوئی حدیث نہیں۔ اور احمد بن حنبل نے کہا: اسے مرفوع کہنا غلطی ہے۔ اور ابن المنذر نے کہا۔ اس کا مرفوع ہونا ثابت نہیں۔ اور دار قطنی نے کہا۔ مرسل ہے لیکن بالکل صحیح ہے۔ مصنف نے کہا یہ سب ٹھیک ہے لیکن اسے دوسروں نے بھی روایت کیا جس سے اس کا رفع قوی ہو جاتا ہے۔ اور ابن تیمیہ نے کہا کہ احمد کے بیٹے صالح نے یہ روایت کی اور احمد نے اس پر صالح کا حکم لگایا۔ گویا ثقہ لوگوں نے اسے مرفوع ہی سمجھا ہے۔ اور اگرچہ یہ حدیث موقوف ہے لیکن چونکہ اس بارے میں ابن عباس کی کسی نے مخالفت نہیں کی اس لئے ایک جماعت نے اسے مرفوع ہی کہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو اس کے لئے دوسرے کے کی طرف سے حج کرنا صحیح نہیں- جب وہ دوسرے کی طرف سے احرام باندھے گا تو وہ اس کی اپنی طرف سے ہو جائے گا- کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شبرمہ کی طرف سے تلبیہ کہنے کے بعد اسے یہ حکم دیا تھا کہ اسے اپنا حج بنا لے- جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دوسرے کی طرف سے نیت منعقد نہیں ہوتی- ورنہ مناسب تو یہی بات تھی کہ وہ شبرمہ ہی کی طرف سے حج کر لیتا- نیز یہ کہ احرام کے وقت نیت ٹھیک ہو یا غلط' احرام منعقد ہو جاتا ہے- نیز مطلقاً" منعقد ہو جاتا ہے خواہ نیت مجمول ہو یا اس میں تردد ہو- لہٰذا اس کا اپنی طرف سے واقع ہونا درست ہے اور دوسروں کی طرف سے بھی- کیونکہ احرام تو دوسرے کی طرف سے نہی کی بنا پر باطل ہوتا ہے- اور نہی ہی اس کے غلط اور باطل ہونے کی مقتضی ہوتی ہے- احرام کی صفت اپنی اصل کو باطل کا سبب نہیں بنتی- اور امت کی اکثریت اسی بات کی قائل ہے کہ جس نے اپنا حج نہ کیا ہو اسے دوسرے کی طرف سے حج کرنا کسی حال میں بھی صحیح نہیں خواہ وہ صاحب استطاعت ہو یا نہ ہو- کیونکہ کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہوتے وقت کسی بات کی تفصیل نہ پوچھنا اور فرق نہ کرنا اس کے عموم پر دلالت کرتا ہے اور اس لئے بھی کہ حج استطاعت کے سالوں میں پہلے سال ہی واجب ہو جاتا ہے- پھر جب وہ اپنا حج کرنے کے قابل ہو گیا تو اس کے لئے دوسرے کی طرف سے حج کرنا جائز نہیں- کیونکہ پہلا فرض اور دوسرا نفل ہے- اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جس کے پاس اتنی ہی رقم ہو جس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو اور قرض خواہ بھی مطالبہ کر رہے ہوں تو اسے صرف اپنا قرضہ ہی ادا کرنا ضروری ہوتا ہے- اسی طرح ہر شخص جو واجب میں اپنا مال صرف کرنے کا حاجت مند ہے وہ اسے دوسرے کاموں میں صرف نہ کرے الا یہ کہ وہ ایسا صاحب استطاعت ہو جو واجب اور غیرواجب میں صرف کر سکتا ہو- اور اسی لئے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسے اپنا حج ادا کرنے کا حکم صرف اس صورت میں دیا جائے گا جب اس پر اس کا اپنا حج فرض ہو چکا ہو اور اگر اس پر حج فرض نہ ہوا ہو تو وہ دوسرے کی طرف سے حج کر سکتا ہے- لیکن حدیث کے بہ ظاہر عموم پر عمل کرنا ہی بہتر ہے-

٦٧٤- وعنه قال: خطبنا رسول الله ﷺ فقال: «إن الله كتب عليكم الحج»، فقام أقرع بن حابس» ، فقال: أفي كل عام؟ يا رسول الله! قال: «لو قلتها لوجبت. الحج مرة، فما زاد فهو تطوع». رواه الخمسة غير الترمذي، وأصله في مسلم من حديث أبي هريرة.

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے- اس وقت اقرع بن حابس کھڑا ہو کر کہنے لگا: یا رسول اللہ! کیا ہر سال؟ آپ نے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ حج صرف ایک مرتبہ ہے اور جو زیادہ کرے تو وہ نفل ہے۔ اسے ترمذی کے سوا پانچوں نے روایت کیا اور اس کی اصل مسلم میں ابوہریرہ کی حدیث موجود ہے۔

اور ایک روایت میں لوجبت کے بعد یہ اضافہ بھی ہے کہ "اور اگر فرض ہو جاتا تو تم اسے نباہ نہ سکتے اور جب نباہ نہ سکتے تو تمہیں اس کی سزا ملتی"۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ حج ہر صاحب استطاعت مکلف پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ نیز اس ارشاد نبوی: "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا"۔ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احکام کی شرح اور اصولی مسئلہ کے مناسب موقع کا اختیار تفوض کیا ہوا تھا۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس کی طرف شارح رحمہ اللہ نے اشارہ کر دیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میقات کا بیان

مواقیت میقات کی جمع ہے۔ میقات اسم ظرف ہے زمان و مکان دونوں کی تعین و تحدید کے لئے بسلسلہ عبادت مستعمل ہوتا ہے لہٰذا اس باب میں ان حدود کا ذکر ہو گا کہ کون کون سے مقام سے شارع نے احرام کے لئے حد مقرر کی ہے۔

۶۷۵۔ عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ وقت لأهل المدينة ذا الحليفة، ولأهل الشام الجحفة، ولأهل نجد قرن المنازل، ولأهل اليمن يلملم، هن لهن، ولمن أتى عليهن من غيرهن، ممن أراد الحج والعمرة، ومن كان دون ذلك فمن حيث أنشأ، حتى أهل مكة من مكة. متفق عليه.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ(۱)' اہل شام کے لئے جحفہ(۲)' اہل نجد کے لئے قرن(۳) منازل اور اہل یمن کے لئے یلملم(۴) میقات مقرر کئے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ میقات ان لوگوں کے لئے بھی ہیں جو ان مقامات(۵) پر رہتے ہیں اور ان کے لئے بھی جو حج اور عمرہ کے ارادہ سے دور سے آئیں اور ان مقامات سے گزریں اور جو لوگ ان میقاتوں کی حدود کے اندر ہیں وہ جہاں سے چاہئیں احرام باندھ لیں۔ حتیٰ کہ اہل مکہ' مکہ سے ہی احرام باندھ سکتے ہیں(۶)۔ متفق علیہ

(۱) حلیفتہ ۔ حلفتہ کی تصغیر ہے اور حلفتہ' حلفاء کی جمع ہے جو پانی میں اگنے والی ایک بوٹی ہے۔ اور ذوالحلیفہ مدینہ اور مکہ کے درمیان ایک مشہور مقام ہے۔ جو مدینہ سے صرف ایک فرسخ اور مکہ سے دس منزلوں کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہی وہ مقام جہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تھا۔ اسی مقام پر وہ کنواں ہے جسے اب بئرعلی کہتے ہیں۔ مکہ سے سب سے زیادہ فاصلہ اسی میقات کا ہے۔

(۲) جحفتہ کا یہ نام اس لئے پڑا کہ سیلاب کا پانی وہاں کے رہنے والوں کو اس پہاڑ کی طرف بہا لے جاتا تھا جو وہاں موجود ہے۔ یہ مکہ سے تین منزل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کا نام مہیعتہ بھی ہے جو ایک قدیمی بستی تھی اور اب اجڑ چکی ہے۔ اسی لئے اب حرام باندھنے والے اس سے ایک منزل پہلے رابغ سے احرام باندھتے ہیں اس لئے کہ وہاں نہانے دھونے کے لئے پانی مل جاتا ہے۔

(۳) قرن منازل کو قرن ثعالب کہتے ہیں اور یہ مکہ کے دو منزل کے فاصلہ پر ہے۔

(۴) یہ بھی مکہ سے دو منزل کے فاصلہ پر ہے۔

(۵) بعض روایات میں ھن لھن کے بجائے ھن لھم ہے اور بخاری کی روایت میں ھن لاھلھن ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(٦) یہ ہیں وہ میقات جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اطراف کے لوگوں کے لئے مقرر فرمائے۔ اور ان لوگوں کے لئے بھی جو حج یا عمرہ کے ارادہ سے مکہ کو آتے ہوئے وہاں سے گزریں۔ پھر اس میں اور لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شامی ذوالحلیفہ آتا ہے تو اسے وہیں سے احرام باندھنا واجب ہے۔ وہ یہ نہیں کر سکتا کہ جحفہ پہنچنے تک احرام نہ باندھے۔ اور اگر اس میں تاخیر کرے گا تو برا کرے گا۔ اور بعض کے نزدیک اس کو قربانی دینا لازم ہو گی۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اسے اپنی میقات (جحفہ) تک تاخیر کرنا جائز ہے اگرچہ افضل یہی ہے کہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث محتمل ہے۔ کیونکہ ارشاد نبوی ھن لھن کا ظاہر یہی ہے کہ وہ ان علاقوں کے رہنے والوں کے لئے عام ہیں۔ خواہ وہ اپنی میقات سے گزریں یا کسی دوسری میقات سے تو وہ اپنی میقات تک بلا احرام جا سکتے ہیں۔ جیسے اگر شامی ذوالحلیفہ آتا ہے تو اس پر لازم نہیں کہ وہ وہیں سے احرام باندھے بلکہ وہ جحفہ سے باندھے گا۔ نیز اس ارشاد "اگر دوسرے علاقہ کا آدمی ان میقاتوں سے گزرے"۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہماری اس مثال میں شامی پر یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھے کیونکہ وہ وہاں کا باشندہ نہیں۔

ابن دقیق العید نے کہا کہ ارشاد نبوی "اور اہل شام کے لئے جحفہ میقات ہے"۔ اہل شام میں سے کسی شخص کے ذوالحلیفہ پر سے گزرنے والے کو بھی شامل ہے اور نہ گزرنے والے کو بھی اور یہ ارشاد "اور جو ان میقاتوں پر سے گزرے خواہ وہ ان علاقوں کا رہنے والا نہ ہو"۔ شامی کو بھی شامل کر لیتا ہے جب وہ ذوالحلیفہ یا کسی دوسری میقات پر سے گزرے۔ تو یہاں دو طرح کے عموم کا تعارض واقع ہوتا ہے۔ مصنف نے کہا کہ یہ دونوں احتمال اس صورت میں جدا جدا ہوتے ہیں کہ آپ کے ارشاد "اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ میقات مقرر کی"۔ کو آپ کے ارشاد ھن لھن کی تفسیر قرار دیا جائے۔ اور اہل مدینہ سے مراد مدینہ کے رہنے والے بھی ہیں اور وہ بھی جن کے راستہ میں یہ میقات آتی ہے اور وہ اس پر سے گزرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ عروہ کی حدیث اگر صحیح ہو، جو یوں روایت کی گئی ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لئے اور جو بھی وہاں سے گزریں ذوالحلیفہ میقات مقرر کی"۔ تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ شامی کے لئے جحفہ میقات صرف اس صورت میں ہے جب وہ مدینہ نہ آئے۔ اور اس لئے بھی کہ میقات بیت اللہ شریف کے حرم کا ہر جانب سے احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اب ہر شخص جو حرم کی اطراف میں سے کسی بھی طرف سے گزرے گا، اس پر کعبہ کی حرمت کی تعظیم لازم ہو گی۔ اگرچہ بعض میقات دوسروں سے بہت دور ہیں۔

اور ارشاد نبوی: "جو لوگ ان میقاتوں کی حدود کے اندر ہیں وہ جہاں سے چاہیں احرام کی ابتداء کر لیں"۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو لوگ مکہ اور میقات کے درمیان ہیں وہ جہاں سے چاہیں احرام شروع کر لیں۔ خواہ وہ وہاں کے رہنے والے اور اہل وطن ہوں یا کسی دوسرے علاقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور ارشاد نبوی "حتیٰ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ مکہ والے مکہ سے"۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مکہ والے مکہ سے ہی احرام باندھ سکتے ہیں۔ خواہ وہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا آس پاس کے لوگ ہوں یا مکہ میں باہر سے آئے ہوں جب وہ حج یا عمرہ کا احرام باندھیں تو یہیں سے باندھ سکتے ہیں۔

اور ارشاد نبوی "جو شخص حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو"۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ میقات پر احرام باندھنا صرف اس شخص کو لازم ہے جو حج یا عمرہ کے ارادہ سے مکہ میں داخل ہو رہا ہو اور اگر اس کا ایسا ارادہ نہ ہو تو اسے بغیر احرام باندھے مکہ میں داخل ہونا جائز ہے۔ چنانچہ ابن عمر مکہ میں بغیر احرام داخل ہوئے تھے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ بات بالاتفاق ثابت ہے کہ جو لوگ حج اور عمرہ کو واجب سمجھتے ہیں وہ صرف ایک ہی بار واجب سمجھتے ہیں۔ اور اگر ہم حج یا عمرہ کے لئے مکہ آنے پر ہر شخص پر اسے واجب قرار دیں تو یہ ایک سے بہت زیادہ بار واجب ہو جائے گا۔ اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں میقات سے احرام کے بغیر آگے جانا جائز نہیں اور اس سے مستثنیٰ صرف اہل حاجات جیسے لکڑ ہارے وغیرہ ہیں۔ تو ان کے لئے سلف سے کچھ آثار تو ملتے ہیں مگر ان سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ لہٰذا جو شخص حج یا عمرہ کی نیت نہ رکھتا ہو اور مکہ جانا چاہتا ہو اور وہ بغیر احرام باندھے میقات سے آگے چلا جائے۔ پھر اس کا حج یا عمرہ کرنے کا ارادہ بن جائے تو وہ جہاں سے چاہے احرام باندھ سکتا ہے اسے اپنی میقات تک واپس جانا لازم نہیں۔

جاننا چاہئے کہ ارشاد نبوی "حتیٰ کہ اہل مکہ، مکہ سے احرام باندھیں"۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اہل مکہ کے عمرہ کی میقات وہی ہے جو ان کے حج کی ہے اور اسی طرح اگر کوئی قران حج کر رہا ہو تو اس کی میقات بھی مکہ ہی ہے۔ لیکن محب طبری نے کہا۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ آپ نے عمرہ کے لئے مکہ کو میقات بنایا ہو۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کی رو سے مکہ کو عمرہ کے لئے میقات بنایا ہے۔ رہی ابن عباس کی روایت کہ انہوں نے کہا: "اے مکہ والو! تم میں سے جو شخص عمرہ کا ارادہ کرے تو بطن محسر سے احرام باندھے"۔ نیز یہ بھی کہا کہ: "اہل مکہ میں سے جو شخص عمرہ کرنے کا ارادہ کرے تو تنعیم کی طرف چلا جائے اور وہاں سے حرم کو احرام باندھے ہوئے آئے"۔ تو یہ موقوف آثار ہیں جو مرفوع حدیث کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ رہی یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو حکم دیا تھا کہ وہ تنعیم کی طرف چلی جائے اور وہاں سے عمرہ کا احرام باندھے۔ تو اس سے آپ کی مراد صرف حضرت عائشہ کے دل کو تشفی دینا تھا کہ اس نے بھی اپنی ساتھ والی عورتوں یا (ازواج مطہرات) کی طرح مکہ میں داخلہ کے وقت عمرے کا احرام باندھا ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ عمرے کا احرام باندھا۔ پھر انہیں حیض آگیا اور جب وہ مکہ میں داخل ہوئیں تو اپنے ساتھ والی عورتوں کی طرح بیت اللہ کا طواف نہ کر سکیں۔ جیسا کہ ان کا اپنا قول اس پر دلالت کرتا ہے۔ "میں نے کہا: یارسول اللہ! لوگوں نے تو حج اور عمرہ دونوں کر لئے اور میرا تو صرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک ہی ہوا؟ آپ نے فرمایا: اب انتظار کرو۔ پھر تنعیم چلی جانا اور وہیں سے تلبیہ شروع کر دینا"۔ الحدیث۔ تو یہ حدیث بھی محتمل ہے اور اس میں احتمال یہ ہے کہ حضرت عائشہ کا ارادہ صرف ان لوگوں سے مشابہت تھی جو از سر نو احرام باندھ کر مکہ آکر عمرہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ جو لوگ مکہ میں ہیں وہ تنعیم جانے کے بغیر اگر عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا عمرہ درست نہیں ہوتا۔ اور اس احتمال کی موجودگی میں یہ حدیث زیر بحث حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ طاؤس نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ جو لوگ تنعیم جاکر عمرہ کا احرام باندھتے ہیں انہیں اس کا اجر ملے گا یا عذاب ہو گا۔ ان سے پوچھا گیا کہ عذاب کیوں ہو گا؟ کہنے لگے: اس لئے کہ ایسے شخص نے بیت اللہ اور اس کا طواف چھوڑا اور چار میل گیا اور چار میل واپس آیا جبکہ وہ دو سو طواف کر سکتا تھا۔ اور ہر طواف کا ثواب اس جگہ جانے سے بہت زیادہ ہے جہاں جانا ضروری بھی نہ تھا۔ الا یہ کہ طاؤس کا موضوع کلام یہ تھا کہ طواف عمرہ سے افضل ہے۔

احمد نے کہا کہ بعض اہل مکہ عمرہ کو طواف پر ترجیح دیتے ہیں اور بعض مکہ میں ٹھہرنا اور طواف کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور احمد کے اصحاب کے نزدیک اگر کوئی شخص عمرہ کا احرام مکہ ہی سے باندھ لے تو اس کا عمرہ درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شخص میقات سے احرام نہیں باندھتا اس پر دم (قربانی) لازم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دم کے لازم ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔

٦٧٢۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها أن النبي ﷺ وقت لأهل العراق ذات عرق. رواه أبو داود والنسائي، وأصله عند مسلم من حديث جابر، إلا أن راويه شك في رفعه.

وفي صحيح البخاري: أن عمر هو الذي وقت ذات عرق.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عراق کے لئے ذات (۱) عرق میقات مقرر کیا۔ اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا۔ اور اس کی اصل مسلم میں جابر کی حدیث میں ہے۔ الا یہ کہ اس کے راوی کو اس کے مرفوع (۲) ہونے میں شک ہے۔ اور بخاری میں ہے کہ ذات عرق کو میقات مقرر کرنے والے عمرؓ تھے (۳)۔

(۱) ذات عرق مکہ سے دو منزل کے فاصلہ پر ہے۔ اور اس کا یہ نام اس لئے پڑا کہ وہاں عرق یعنی ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔

(۲) کیونکہ مسلم میں ابوالزبیر سے مروی ہے کہ کسی نے جابر بن عبداللہ سے مہل کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میرا گمان ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے مگر یقین سے کچھ نہیں کہا۔

(۳) یہ اس وقت ہوا جب کوفہ اور بصرہ فتح ہو گئے یعنی ان کی زمین مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی۔ ورنہ ان دونوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شہروں کو تو آباد ہی مسلمانوں نے کیا تھا۔ پھر انہیں مسلمانوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ ان لوگوں کے لئے میقات مقرر کریں تو عمرؓ نے ذات عرق مقرر کیا اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہو گیا۔ ابن تیمیہ منتقی میں کہتے ہیں کہ ذات عرق کے میقات ہونے کی نص اتنی قوی نہیں جیسی دوسری میقاتوں کی ہے۔ پھر اگر یہ ثابت ہو تو یہ حضرت عمر کا یہ اجتہاد کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ حقیقت سے مواقق ہو گئی۔ حضرت عمرؓ کو یہ حدیث نہیں پہنچی تھی تو انہوں نے اجتہاد کیا جو نص کے موافق ہو گیا۔ بات یہی ہے چنانچہ اس پر اجماع منعقد ہو گیا۔ چنانچہ ابن ماجہ نے ابن الزبیر کی حدیث کو جابر سے بلاشک مرفوعا" روایت کیا ہے۔ اور احمد نے جابر بن عبداللہ اور ابن عمر سے مرفوعا" روایت کیا ہے جس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ ہے اور ابو داؤد' نسائی' دار قطنی وغیرہم نے اسے عائشہ کی حدیث سے یوں روایت کیا کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عراق کے لئے ذات عرق میقات مقرر کیا"۔ اور اس کی سند خوب ہے۔ نیز اس حدیث کو عبداللہ بن احمد نے بھی عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور مکحول اور عطاء سے یہ حدیث مرسل ثابت ہے۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہ احادیث مرفوع اور اچھی سند والی ہیں اور ایسی حدیثوں پر عمل کرنا واجب ہے۔ علاوہ ازیں یہ متعدد ہیں اور کئی طریقوں سے مسندا اور مرسلا" مروی ہیں۔ البتہ درج ذیل حدیث بھی قابل غور ہے۔

٦٧٧ـ وعند أحمد وأبي داود والترمذي عن ابن عباس، أن النبي ﷺ وقت لأهل المشرق العقيق.

اور احمد' ابوداؤد اور ترمذی میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مشرق کے لئے عقیق کو میقات مقرر کیا۔

اس حدیث کو اگرچہ ترمذی نے حسن کہا ہے لیکن اس کا مدار یزید ابن زیادہ ہی ہے۔ جس کے متعلق کئی اماموں نے کلام کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ عراقی اگر ذات عرق سے احرام باندھے تو یہی میقات سے احرام ہے۔ اور عقیق ذات عرق کا ہی حصہ ہے۔ اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ابن عباس کی اس حدیث کی یہی اصل ہے تو یہ منسوخ ہے۔ کیونکہ حجتہ الوداع کے موقعہ پر' جب اللہ تعالیٰ نے اپنا دین کمل کیا تو اہل مشرق کی میقات ذات عرق ہی تھی جیسا کہ اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے حارث بن عمرو سہمی نے روایت کیا کہ: "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آیا جب آپ منیٰ یا عرفات میں تھے لوگ آپ کے گرد گھوم پھر رہے تھے۔ چند اعرابی آئے۔ انہوں نے آپؐ کا چہرہ دیکھا تو کہنے لگے۔ یہ بڑا بابرکت چہرہ ہے۔ اس وقت آپ نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا"۔ اسے ابوداؤد اور دار قطنی نے روایت کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احرام کی اقسام اور اس کی کیفیت

وجوہ - وجہ کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ اقسام ہیں جو احرام باندھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی حج کا یا عمرہ کا یا دونوں کا اکٹھا احرام اور صفتہ سے مراد وہ کیفیت ہے جو احرام باندھنے والے کو اختیار کرنا چاہئے

۶۷۸۔ عن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: خرجنا مع رسول الله ﷺ عام حجة الوداع، فمنا من أهل بعمرة، ومنا من أهل بحج وعمرة، ومنا من أهل بحج، وأهل رسول الله ﷺ بالحج، فأما من أهل بعمرة فحل، وأما من أهل بحج، أو جمع بين الحج والعمرة، فلم يحلوا حتى كان يوم النحر. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حجتہ الوداع کے سال ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ روانہ(۱) ہوئے۔ ہم میں سے کچھ لوگ وہ تھے جنہوں نے صرف عمرہ کا تلبیہ پکارا' اور بعض نے حج اور عمرہ دونوں(۲) کا اور بعض نے صرف(۳) حج کا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا تلبیہ پکارا۔ پھر جن لوگوں نے صرف عمرہ کا تلبیہ کہا تھا وہ تو طواف کر کے اور سعی کے(۴) بعد حلال ہو گئے اور جنہوں نے حج کا یا حج اور عمرہ دونوں کا تلبیہ کہا تھا وہ قربانی کے دن تک حلال نہ ہوئے۔ متفق علیہ

(۱) یعنی مدینہ سے - اور آپ مدینہ سے ہفتہ کے دن ظہر کی نماز کے بعد روانہ ہوئے جبکہ ماہ ذی القعدہ کے ابھی پانچ دن باقی تھے۔ روانگی سے پہلے آپ نے لوگوں کو خطبہ دیا جس میں لوگوں کو احرام کے واجبات و سنن سکھلائے۔

اور حجتہ الوداع ۱۰ ہجری میں واقع ہوا۔ اور اس حج کا نام حجتہ الوداع اس لئے پڑ گیا کہ اس میں آپ نے لوگوں کو الوداع کیا۔ ہجرت کے بعد آپ نے اس حج کے علاوہ اور کوئی حج نہیں کیا۔

(۲) گویا وہ قارن یا حج قران کرنے والا ہوا۔

(۳) گویا وہ مفرد یا حج افراد کرنے والا ہوا۔

(۴) اصل عبارت میں لفظ عند قدومہ ہے یعنی مکہ پہنچ کر عمرہ کے باقی اعمال پورے کرنے کے بعد۔

اہلال کا معنی آواز بلند کرنا ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ یہاں اس سے مراد احرام باندھتے وقت تلبیہ کی آواز کو بلند کرنا ہے۔ اور عائشہ کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ مختلف قسم کے تلبیے ان لوگوں نے کہے تھے جو اس حجتہ الوداع کے قافلہ میں آپ کے ساتھ تھے۔ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی کچھ ایسی روایات مروی ہیں جو اس کی مخالف ہیں اور ان میں تطبیق کی وہی صورت ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ اور حضرت عائشہ کے احرام کے متعلق بھی روایات مختلف ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اپنی روایات میں بھی اختلاف ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نیز حضرت عائشہ کی حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اس قافلہ کے لوگوں نے تین قسم کے حج کے احرام باندھے تھے۔ جنھوں نے صرف حج کا احرام باندھا ان کا حج افراد تھا اور جنھوں نے عمرہ کا احرام باندھا ان کا حج تمتع تھا اور جنھوں نے دونوں کا احرام باندھا ان کا حج قران تھا۔ نیز یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جن لوگوں نے صرف حج کا تلبیہ کہا تھا یعنی وہ مفرد تھے وہ بھی قربانی کے دن سے پہلے حلال نہ ہوئے۔ اور یہ بات ان احادیث کے خلاف ہے جو چودہ صحابہ سے ثابت اور صحیحین اور دوسری کتب احادیث میں مروی ہیں کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جس کے ساتھ قربانی نہیں وہ اپنا حج فسخ کر کے اسے عمرہ بنا لے"۔ بعض کہتے ہیں کہ اس قید کے مطابق حضرت عائشہ کی حدیث کی تاویل کی جائے گی کہ جس کے ہمراہ قربانی ہو اور اس نے حج افراد کے لئے احرام باندھا ہو وہ اسی حاجی کی طرح ہے جو قربانی ساتھ لایا ہو اور حج اور عمرہ کا اکھٹا احرام باندھا ہو۔

اور قدیم و جدید علماء نے حج کو فسخ کر کے عمرہ بنانے کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ بات انہی لوگوں سے مخصوص تھی جنھوں نے آپ کے ساتھ حج کیا تھا یا نہیں؟ ابن قیم نے یہ بات زاد المعاد میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے اور ہم نے الگ رسالہ لکھا ہے اور ان اختلافات کو یہاں نقل کر کے خواہ مخواہ طول دینے کا یہ موقع نہیں۔ نیز اس بات میں بھی علماء نے اختلاف کیا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قسم کا احرام باندھا تھا۔ اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آپ نے حج اور عمرہ دونوں کا باندھا تھا یعنی آپ قارن تھے جبکہ عائشہ کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ نے حج افراد کا احرام باندھا تھا لیکن آپ کے قارن ہونے کے دلائل بہت زیادہ ہیں۔ نیز علماء نے اس بات میں بھی اختلاف کیا کہ کونسا حج افضل ہے اور دلائل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں افضل قران ہے اور ابن قیم نے اس بارے میں بھرپور دلائل پیش کئے ہیں۔

احرام اور اس کے متعلقات کا بیان

احرام کا شرعاً" مفہوم کسی شخص کا حج یا عمرہ کے لئے اس کی نیت کر کے اس کے اعمال و افعال کو بجا لانا ہے۔

٦٧٩۔ عن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: ما أهل رسول الله ﷺ إلا من عند مسجد. متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ کی مسجد سے ہی تلبیہ پکارنا شروع کیا تھا۔ متفق علیہ(ا)۔

(ا) ابن عمرؓ نے یہ بات اس شخص کے جواب میں کہی تھی جس نے یہ کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیداء سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احرام باندھا تھا۔ ابن عمرؓ نے کہا: "تم لوگ بیداء کی بات کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتے ہو آپ نے جب تلبیہ پکارا تو اسی مسجد سے پکارا تھا"۔ الحدیث۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: "جب آپ اپنے اونٹ پر بیٹھ گئے تو درخت کے نزدیک تلبیہ پکارا تھا"۔ اور یہ درخت مسجد کے پاس تھا۔ اور مسلم میں ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز ادا کی پھر مسجد کے قریب ہی اونٹنی پر سوار ہوئے تو تلبیہ پکارا"۔ اور بیداء یا ذوالحلیفہ سے تلبیہ پکارنے کی حدیثوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس راوی نے آپ کو جس جگہ تلبیہ پکارتے سنا وہ اس نے روایت کر دیا۔ چنانچہ ابوداؤد اور حاکم نے ابن عباس کی حدیث روایت کی کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت پڑھیں تو ان سے فراغت کے بعد تلبیہ پکارا۔ کچھ لوگوں نے اسے سنا اور یاد رکھا۔ پھر جب آپ اونٹنی پر سوار ہوئے تو تلبیہ پکارا۔ تو کچھ لوگوں نے اسے سنا۔ جبکہ یہ لوگ اس وقت موجود نہیں تھے۔ جب آپ نے پہلی بار مسجد میں تلبیہ پکارا تھا۔ ان لوگوں نے یہ کہا کہ آپ نے تو سواری پر سوار ہونے پر ہی تلبیہ پکارا تھا۔ پھر آپ آگے چلے اور جب بیداء کی بلندی پر پہنچے تو پھر تلبیہ پکارا۔ جسے کچھ ان لوگوں نے سنا جنہیں پہلے دو مرتبہ تلبیہ پکارنے کا علم نہ تھا۔ تو جس نے جیسے سنا نقل کر دیا"۔ الحدیث۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ میقات سے احرام باندھنا افضل ہے پہلے نہیں۔ اگرچہ پہلے بھی باندھ سکتا ہے۔ چنانچہ ابن المنذر نے کہا کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ محرم میقات سے پہلے احرام باندھ سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ مکروہ ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ ہاں مکروہ ہے۔ کیونکہ صحابہ کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ کو میقات مقرر کیا' اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اسی میقات سے تلبیہ پکارا جائے۔ اس میں کمی بیشی کا تقاضا نہیں کرتا۔ اگرچہ اس پر زیادتی حرام نہیں تاہم کم از کم اس کو چھوڑنا افضل ضرور ہے۔ اور اگر اس کے جواز پر اجماع نہ ہو چکا ہوتا تو ہم میقاتوں کے دلائل کی بنا پر اس کی تحریم کے قائل ہوتے۔ نیز اس لئے بھی کہ مشروع کاموں کی تعداد یا مقدار میں اضافہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے نمازوں یا رمی جمار میں اضافہ کرنا۔ جن میں نہ بیشی مشروع ہے اور نہ کمی۔ اور ہم وثوق کے ساتھ تحریم اس لئے نہیں کہتے کہ ہم اس پر اجماع کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ متعدد صحابہ سے میقات سے پہلے احرام باندھنا مروی ہے۔ چنانچہ ابن عمر نے بیت المقدس سے اور ابن عباس نے شام سے احرام باندھا اور عمران بن حصین نے بصرہ سے اور ابن مسعود نے قادسیہ سے تلبیہ پکارا۔ اور آیت کی تفسیر میں علی اور ابن مسعود سے مروی ہے کہ "حج اور عمرہ کو پورا کرنے کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ تو ان کے لئے اپنے گھر کے آس پاس سے احرام باندھے"۔ اگرچہ اس کی یہ تاویل کی گئی ہے کہ اپنے شہر سے ان کے لئے افراد کی نیت سے روانہ ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ اور قضاء کے عمرہ کے لئے اپنے شہر سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تاویل تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نہ علی نے اور نہ خلفائے راشدین میں سے کسی اور خلیفہ نے ایسا کام کیا تھا بلکہ وہ میقات سے ہی حج اور عمرہ کا احرام باندھتے تھے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ کام نہیں کیا تو پھر اس سے اتمام حج کیسے ہوا جسے نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور نہ کسی خلیفہ نے اور نہ ہی جمہور صحابہ نے کیا تھا؟ البتہ بیت المقدس سے احرام باندھنے کے متعلق بالخصوص ام سلمہؓ کی حدیث آتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''جو شخص بیت المقدس سے عمرہ یا حج کا احرام باندھے اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں''۔ اسے احمد نے روایت کیا اور ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ ''جس نے بیت المقدس سے احرام باندھا اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں''۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''جس نے بیت المقدس سے مسجد حرام تک حج یا عمرہ کا تلبیہ پکارا۔ اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ یا اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے''۔ یہ راوی کا شک ہے۔ اور ابن ماجہ نے اسے ان الفاظ میں روایت کیا کہ: ''جس نے بیت المقدس سے عمرہ کا تلبیہ پکارا تو وہ اس کے سابقہ گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے''۔ تو یہ سب روایات بیت المقدس سے مخصوص ہیں۔ گویا بیت المقدس سے احرام باندھنا بالخصوص میقاتوں سے احرام باندھنے سے افضل ہے اور ابن عمر کا بیت المقدس سے احرام باندھنا اس پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن انہوں نے مدینہ سے احرام نہیں باندھا کیونکہ بعض لوگوں نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا اور بعض نے یہ تاویل کی کہ اس سے یہ مراد ہے کہ وہاں سے سفر شروع کرنے ۔سے دونوں مقام شامل ہو جاتے ہیں۔

٦٨٠۔ وعن خلاد بن السائب ، عن أبيه رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: **«أتاني جبرئيل، فأمرني أن آمر أصحابي، أن يرفعوا أصواتهم بالإهلال»**. رواه الخمسة، وصححه الترمذي وابن حبان.

خلاد بن سائب اپنے باپ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل میرے پاس آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے صحابہ کو حکم دوں کہ جب وہ لبیک کہیں تو اپنی آوازیں بلند کریں۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی اور ابن حبان نے صحیح کہا(۱)۔

(۱) اور ابن ماجہ نے روایت کیا کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: آواز بلند کرنا (تلبیہ کے وقت) اور قربانی بکثرت کرنا''۔ اور ایک روایت کے مطابق سائب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ: ''میرے پاس جبریل آئے اور کہا: آواز کو خوب بلند کرو اور بکثرت قربانی کرو''۔ اور عج کا معنی آواز بلند کرنا اور ثج کا معنی قربانی کے جانور ذبح کرنا ہے۔ اور یہ سب روایات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبیک کہتے وقت آواز کو بلند کرنے کے استحباب پر دلالت کر رہی ہیں۔ اگرچہ صیغہ امر بظاہر وجوب کے لئے آتا ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب لبیک کہتے وقت آواز کو اتنا بلند کیا کرتے کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا تھا۔ اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ اور مالک سے متعلق منقول ہے کہ وہ مسجد حرام اور مسجد منیٰ کے پاس لبیک کہتے وقت اپنی آواز بلند کیا کرتے تھے۔

٦٨١۔ وعن زيد بن ثابت رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ تجرد لإهلاله، واغتسل. رواه الترمذي، وحسنه.

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے کے لئے کپڑے بدلے اور غسل فرمایا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا(ا)۔

(ا) نیز اس حدیث کو غریب کہا اور عقیلی نے اس کو ضعیف کہا۔ نیز اسے دار قطنی، بیہقی اور طبرانی نے بھی روایت کیا۔ اور حاکم اور بیہقی نے یعقوب بن عطاء سے، اپنے باپ سے، ابن عباس سے، کے طریق سے روایت کیا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا۔ پھر اپنے کپڑے پہنے۔ پھر جب ذوالحلیفہ آئے تو دو رکعتیں ادا کیں۔ پھر اپنے اونٹ پر بیٹھے اور جب بیداء کے سامنے آئے تو حج کا احرام باندھا"۔ اس کی سند میں یعقوب بن عطاء بن ابی رباح ضعیف ہے۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سنت یہ ہے کہ جب احرام کا ارادہ کرے اور جب مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو نہا لے۔ اور عائشہ کی حدیث کی رو سے احرام سے پہلے خوشبو لگانا مستحب ہے جو یوں ہے "مجھے جو اچھی سے اچھی خوشبو ملتی وہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لگایا کرتی تھی"۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام باندھنے سے پہلے جو مجھے اچھی خوشبو میسر آتی وہ میں آپ کو لگایا کرتی۔ اس کے بعد آپ احرام باندھتے"۔ متفق علیہ۔ اور اس بارے میں کلام آگے آرہا ہے۔

٦٨٢۔ وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، أن رسول الله سئل ما يلبس المحرم من الثياب؟ قال: **«لا يلبس القميص، ولا العمائم، ولا السراويلات، ولا البرانس، ولا الخفاف، إلا أحد لا يجد نعلين فليلبس الخفين، وليقطعهما أسفل من الكعبين، ولا تلبسوا شيئاً من الثياب مسه الزعفران، ولا الورس»**. متفق عليه، واللفظ لمسلم.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ احرام باندھنے والا کون سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کپڑے پہن سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ نہ قمیض پہنے' نہ پگڑی' نہ پاجامہ' نہ لمبی ٹوپی اور نہ موزے۔ ہاں اگر کسی کو جوتی نہ(ا) ملے تو وہ موزے پہن سکتا ہے مگر اسے چاہئے کہ وہ انہیں ٹخنوں سے نیچے تک کاٹ لے۔ اور کوئی ایسا کپڑا نہ پہنے جو زعفران یا ورس میں رنگا گیا ہو۔ متفق علیہ۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں(۲)۔

(ا) یعنی بازار سے قیمتاً" دستیاب نہ ہو یا اسے وہ چیز بکتی مل تو سکتی ہے مگر اس کے پاس اشیائے ضروریہ سے زائد پیسے نہ ہوں۔ جیسا کہ تمام عوض والی باقی چیزوں کی صورت ہے۔

(۲) نیز شیخین نے ابن عباس کی حدیث یوں روایت کی "میں نے عرفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا کہ جس کے پاس تہبند نہ ہو وہ پاجامہ پہن سکتا ہے اور جسے جوتے نہ ملیں وہ موزے پہن سکتا ہے"۔ اور احمد میں بھی ایسی ہی روایت ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حدیث ابن عمر کی حدیث کی ناسخ ہے۔ جس میں موزوں کے کاٹنے کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج کے دوران عرفات میں کہی اور ابن عمر کی حدیث مدینہ سے متعلق ہے۔ ابن تیمیہ نے منتقی میں یہی بات کہی ہے اور اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہاں تحریم سے مراد مردوں پر حرام ہونا ہے اور عورتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔

جاننا چاہئے کہ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ احرام باندھنے والے پر موزے پہننا بھی حرام ہے' قمیض' پگڑی' لمبی ٹوپی' پاجامہ اور ایسے کپڑے بھی جو زعفران یا ورس میں رنگے ہوئے ہوں' نیز موزے بھی اگر ان کا بدل نہ ملے تو موزوں کو پھاڑ کر پہن لے' اور خوشبو لگانا اور جماع کرنا بھی حرام ہے۔ قمیض سے مراد ہر ایسا کپڑا ہے جو قطع و برید کر کے سیا گیا ہو اور بدن کے گرد احاطہ کرے اور عمامہ وہ چیز ہے جو سر کا احاطہ کرے پھر اس میں ہر وہ چیز شامل ہو جاتی ہے جو سر کو ڈھانپ لے۔ خطابی نے کہا کہ اس حدیث میں عمامہ اور لمبی ٹوپی کا اکٹھا ذکر آیا ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ سر کو نہ تو عادت کے طور پر ڈھانپنا جائز ہے اور نہ کبھی کبھار جیسے برانس سے اور برانس سے مراد سر کا ہر وہ کپڑا ہے جس کے ساتھ جبہ یا زرہ یا اسی طرح کی کوئی چیز ملی ہوئی ہو۔

جاننا چاہئے کہ مصنف یہاں کوئی ایسی حدیث نہیں لایا جس سے یہ معلوم ہو کہ احرام باندھنے والی عورت پر کیا کچھ حرام ہے۔ اور احادیث میں جو کچھ عورت پر حرام ہے وہ نقاب پہننا ہے جیسے مرد پر قمیض اور موزے پہننا حرام ہے' عورت پر نقاب پہننا حرام ہے اور اسی طرح برقع پہننا بھی حرام ہے جو چہرہ سے الگ ہونے کے باوجود چہرہ کو ڈھانپ لیتا ہے کیونکہ اس کے متعلق بھی نص وارد ہے جیسے مردوں کے لئے قمیض سے نہی وارد ہے۔ حالانکہ قمیض کے علاوہ کسی دوسرے کپڑے سے مرد کا اپنے بدن کو ڈھانپنا بالاتفاق جائز ہے۔ اسی طرح محرم عورت بھی نقاب یا برقع کے علاوہ باقی چیزوں سے اپنا چہرہ چھپا سکتی ہے جیسے دوپٹہ یا کسی دوسرے کپڑے سے۔ اور جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ عورت کا چہرہ محرم مرد کے سر کی طرح ہے جو ڈھانپا نہیں جا سکتا تو اس کے پاس اس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ نیز احرام والی عورت پر دستانے پہننا اور زعفران اور ورس سے رنگے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کپڑے پہننا حرام ہے۔ البتہ جو زیور وہ پہننا پسند کرے اور خوشبو لگانا اس کے لئے مباح ہیں۔ رہا شکار کرنا اور سر منڈانا تو اس بارے میں وہ مردوں کی طرح ہیں۔ واللہ اعلم۔ رہا پانی میں غوطہ لگا کر یا ہودج کی آڑ میں سر چھپانا یا ہاتھ سے سر ڈھانکنا یا سوتے وقت چہرے پر یا سر پر تکیہ رکھ لینا تو ان کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہیں لباس یا پہننے والی چیز کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

اور خفاف' خف کی جمع ہے' اور یہ وہ چیز ہے جو نصف پنڈلی تک ہوتی ہے اور جراب کا بھی یہی حکم ہے اور جراب وہ ہے جو گھٹنوں سے اوپر تک ہو۔ اور اگر کسی کو جوتے نہ مل سکیں تو قطع کی شرط سے موزے اور جرابیں پہننا مباح ہیں۔ الا یہ کہ قطع کے نسخ کے متعلق ابن تیمیہ نے جو کچھ منتقی میں کہا ہے وہ آپ سن چکے ہیں۔ اور اس نے موزوں پر طویل بحث کے بعد شرح میں اسی چیز کو ترجیح دی ہے۔ پھر ساتھ ہی ذکر کیا کہ اگر کسی کو جوتے نہ ملیں تو موزے پہننے والے پر کوئی فدیہ نہیں۔ حنفیہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اس پر فدیہ واجب ہے۔ نیز جو شخص زعفران یا ورس میں رنگے کپڑے پہنے تو یہ حدیث اس کی تحریم پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ اس تحریم کی علت میں اختلاف ہے کہ آیا یہ نہی زینت کی وجہ سے ہے یا خوشبو کی وجہ سے؟ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ یہ نہی خوشبو کی وجہ سے ہے۔ للذا اگر ایسے کپڑے کو اگر پانی لگ جائے یا اسے دھو لیا جائے جس سے اس کی خوشبو جاتی رہے تو اس میں احرام جائز ہو گا۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے بھی ہیں "الا یہ کہ ایسا کپڑا دھو لیا گیا ہو"۔ اگرچہ اس روایت میں کلام ہوا ہے۔ اور زرد رنگ کے یا ورس میں رنگے ہوئے کپڑے پہننا مردوں پر حلال ہونے کی صورت میں بھی حرام ہیں جیسا کہ احرام میں حرام ہیں۔

۷۸۳۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كنت أطيب رسول الله ﷺ لإحرامه قبل أن يحرم، ولحله قبل أن يطوف بالبيت. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احرام باندھنے سے پہلے اور حلال ہونے کے بعد بیت اللہ کا طواف کرنے سے پہلے خوشبو لگا دیا کرتی تھی۔ متفق علیہ(۱)

(۱) اس حدیث میں احرام کے ارادہ کے وقت احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگانے کے استحباب پر دلیل ہے اور اگر احرام کے بعد بھی اس خوشبو کا رنگ یا خوشبو باقی رہ جائے تو اس کا کچھ نقصان نہیں۔ کیونکہ اس نے یہ خوشبو صرف ابتداء" لگائی تھی اور یہی صحابہ اور تابعین کے جمہور آئمہ کا مذہب ہے۔ اور ایک جماعت کا مذہب اس کے برعکس ہے۔ انہوں نے اس روایت اور اس دوسری روایات سے ایسا تکلف کیا جس سے ان کا مدعی پورا نہیں ہوتا۔ یہ کہتے ہیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشبو لگائی پھر اس کے بعد اسے دھو ڈالا اور خوشبو جاتی رہی"۔ نووی نے شرح میں مسلم میں یہ بات ذکر کرنے کے بعد کہا۔ درست بات وہی ہے جو جمہور کہتے ہیں کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احرام کے لئے خوشبو لگانا مستحب ہے کیونکہ حضرت عائشہ کے لفظ ہیں لاحرامه (اپنے احرام کے لئے) پھر ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ گمان کیا کہ یہ چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مختص تھی۔ جبکہ دلیل کے بغیر اس خاص ہونے کا ثبوت بھی پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ دلیل تو اس کے برعکس پر قائم ہے اور وہ دلیل حضرت عائشہ کی اس حدیث سے ثابت ہے کہ: ''ہم احرام باندھنے سے پہلے اپنے چہروں پر کستوری کی خوشبو چھڑکا کرتے۔ پھر جب ہمیں پسینہ آتا تو وہ ہمارے چہروں پر رواں ہو جاتی اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہوتے تھے اور آپ ہمیں اس سے منع نہیں فرماتے تھے''۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور احمد کے الفاظ یہ ہیں: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مکہ کو روانہ ہوتے تو احرام باندھنے کے وقت اپنی پیشانیوں پر کستوری کی خوشبو چھڑکتے۔ پھر جب کسی کو پسینہ آتا تو وہ اس کے چہرے پر بہنے لگتی۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے مگر اس سے منع نہیں کرتے تھے''۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیز عورتوں سے خاص تھی۔ کیونکہ خوشبو لگانے کے بارے میں مرد اور عورتیں سب بالاجماع برابر ہیں۔ کیونکہ خوشبو لگانا احرام باندھنے کے بعد حرام ہے پہلے نہیں۔ اگرچہ وہ کچھ عرصہ اسی حالت میں رہے اور یہ بھی جماع کی طرح ہے۔ اس لئے کہ یہ انسان کے داعیے ہیں۔ اور محرم کے لئے نکاح صرف اس وقت سے حرام ہوتا ہے جب وہ احرام باندھ لے۔ پہلے یا بعد میں نہیں یہی صورت خوشبو کی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ خوشبو صفائی کا جزء ہے اور اس سے مقصود بدبو کو دور کرنا ہوتا ہے کیونکہ صفائی کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ اس میل کچیل کو دور کیا جائے جو بالوں اور ناخنوں کے نیچے جمع ہو جاتی ہے۔ ایس لئے احرام سے قبل بالوں کو اور ناخنوں کو کاٹنا مستحب ہے۔ کیونکہ احرام کے بعد یہ باتیں ممنوع ہیں۔ اگرچہ ان کا اثر بعد میں بھی باقی رہے۔

رہی مسلم کی وہ حدیث جو ایسے شخص کے بارے میں ہے جس نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ اپنے عمرہ میں کیا کچھ کرے۔ اس نے احرام باندھا ہوا تھا اور وہ خوشبو میں لتھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے آکر پوچھا: یارسول اللہ! اس شخص کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے جس نے احرام اس وقت باندھا جب اس کی پیشانی خوشبو سے لتھڑی ہوئی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو خوشبو اب تجھ پر رہ گئی ہے اسے تین مرتبہ دھو ڈال''۔ الحدیث۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ سوال و جواب ۸ ہجری میں جعرانہ میں ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ۱۰ ہجری میں کیا اور خوشبو کے برقرار رہنے کی اجازت دی۔ اور قبول تو وہ چیز کی جائے گی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پچھلا حکم ہو۔ کیونکہ وہ پہلے حکم کا ناسخ ہوتا ہے۔

اور حضرت عائشہ کے الفاظ لحله قبل ان یطوف البیت سے مراد حلال ہونا ہے۔ ایک حلال ہونا تو وہ ہے جس سے سب پابندیاں اٹھ جاتی ہیں اور وہ طواف زیارت ہے۔ اور ایک حلال ہونا وہ ہے جس سے بعض پابندیاں ختم ہوتی ہیں اور وہ رمی الجمار ہے جس کے بعد خوشبو لگانا وغیرہ جائز ہو جاتا ہے اس کے بعد اپنی بیوی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے جماع کے علاوہ سب پابندیاں اٹھ جاتی ہیں اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ جب رمی اور سر منڈانے سے فارغ ہو جائے لیکن طواف زیارت ابھی باقی ہو۔

۶۸۴۔ وعن عثمان بن عفان رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: «لا ينكح المحرم، ولا ينكح، ولا يخطب». رواه مسلم.

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کوئی محرم نہ دوسرے کا نکاح کرے اور نہ اپنا کرے اور نہ منگنی کرے(۱)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) یعنی اپنی منگنی کرے نہ کسی دوسرے کی۔

یہ حدیث کسی محرم کے اپنا نکاح کرنے یا دوسرے کا نکاح کرنے اور اسی طرح منگنی کرنے کی تحریم پر دلیل ہے۔ رہا ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ قول کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میمونہ بنت حارث سے اس حال میں شادی کی کہ آپ محرم تھے تو یہ قول مردود ہے کیونکہ ابو رافع کی روایت یوں ہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت شادی کی جبکہ آپ حلال تھے"۔ یہ قول اس لحاظ سے راجح ہے کہ ابو رافع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میمونہ دونوں کے درمیان سفیر تھے۔ اور اس لئے بھی کہ اکثر صحابہ سے یہی روایت ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ "اکیلے ابن عباس کے سوا کسی نے یہ روایت نہیں کی کہ آپ نے محرم ہونے کی حالت میں شادی کی۔ حتیٰ کہ سعید بن مسیب نے کہا۔ ابن عباس کو بھول لگ گئی' اگرچہ میمونہ ابن عباس کی خالہ تھیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال ہونے کے بعد میمونہ سے شادی کی تھی۔ اسے بخاری نے ذکر کیا۔

پھر اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ نہی تین باتوں کی تحریم ہے۔ الا یہ کہ بعض کہتے ہیں منگنی کرنے میں اجماعاً" نہی تنزیہی ہے۔ اگر اجماع کی بات درست ہو تو خیر مگر مجھے اس کی صحت کا گمان نہیں ورنہ بظاہر تو تحریم ہی ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے ابن عقیل حنبلی کی تحریر دیکھی تو وہ بھی منگنی کو حرام کہتے ہیں۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی نہی سے ان سب باتوں سے منع فرمایا ہے اور ان میں کچھ فرق نہیں کیا۔ اور نہی تحریم کو واجب کرنے والی ہے۔ کوئی اثر بھی اس کا معارض نہیں۔ اور نظری لحاظ سے بھی ان میں کچھ معارضہ نہیں ہے۔

۶۸۵۔ وعن أبي قتادة الأنصاري رضي الله تعالى عنه - في قصة صيده الحمار الوحشي وهو غير محرم - قال: فقال رسول الله ﷺ لأصحابه - وكانوا محرمين - : «هل منكم أحد أمره، أو أشار إليه بشيء؟» قالوا: لا، قال: «فكلوا ما بقي من لحمه». متفق عليه.

ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جبکہ وہ غیر محرم تھے اور انہیں گورخر کے شکار کا قصہ(۱) پیش آیا تھا۔ کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے' جو سب احرام باندھے ہوئے تھے' پوچھا: کیا تم میں سے کسی نے ابو قتادہ کو شکار کا حکم دیا تھا یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو اس کا بچا ہوا گوشت تم کھا سکتے ہو۔ متفق علیہ

(ا) یہ قصہ غزوہ حدیبیہ میں پیش آیا تھا۔

ابو قتادہ کے محرم نہ ہونے میں اشکال واقع ہوا ہے اور وہ میقات سے آگے نکل گئے تھے اور اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں ایک یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے انہیں خود ساحل کی طرف بھیجا تھا تاکہ وہ دشمن کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ اور ایک یہ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہیں نکلے تھے بلکہ انہیں اہل مدینہ نے روانہ کیا تھا۔ اور ایک یہ کہ اس وقت جہاں سے وہ آرہے تھے وہ مقرر میقات نہیں تھا۔

اور یہ حدیث محرم کو خشکی کا شکار کھا لینے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی جب شکار کسی غیر محرم نے کیا ہو اور شکار کرنے میں اس کی کسی طرح سے مدد نہ کی گئی ہو۔ اور یہی جمہور کا مذہب ہے اور یہ حدیث اس پر نص ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اگر اعانت نہ بھی کی گئی ہو تب بھی اس کا کھانا جائز نہیں۔ اور یہ قول علی' ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی ہادویہ کا مذہب ہے جو بظاہر اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے وحرم علیکم صید البر مادمتم حرما (جب تک تم محرم ہو تم پر خشکی کا شکار حرام کیا گیا ہے) اور یہ بناء اس صورت میں ہے جب شکار سے مراد شکار کیا ہوا جانور لیا جائے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ آیت میں صید سے مراد شکار کرنا ہے اور صید کے معنی اگرچہ شکار بھی ہیں اور شکار کرنا بھی تاہم ابو قتادہ کی حدیث نے مراد کی وضاحت کر دی۔ اور جابر بن عبداللہ کی حدیث میں مزید وضاحت ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: خشکی کا شکار تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ نہ تو تم خود شکار کرو اور نہ تمہارے لئے شکار کیا جائے"۔ اسے اصحاب سنن' ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ الا یہ کہ اس کے بعض راویوں میں کلام ہوا ہے جس کی مصنف نے تلخیص میں وضاحت کر دی ہے اور اگر بالفرض آیت میں شکار کیا ہوا جانور مراد لیا جائے تو بھی دوسری آیات سے اور احادیث سے شکار کرنے کی تحریم ہی ثابت ہوتی ہے اور جابر کی حدیث میں یہ وضاحت آگئی ہے کہ وہ مراد میں واضح حکم ہے اور ایک حدیث میں کچھ زائد الفاظ ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے کہ: "کیا اس کے گوشت سے تمہارے پاس کچھ باقی ہے؟" اور ایک روایت میں ہے۔ "کیا تمہارے پاس اس سے کچھ ہے؟ صحابہ نے کہا ہمارے پاس اس کا پاؤں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لے لیا اور اسے کھایا"۔ البتہ شیخین نے اِس اضافے کو روایت نہیں کیا۔ اور جو لوگ محرم کے لئے شکار کا گوشت کھانا مطلقاً" جائز نہیں سمجھتے وہ درج ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۸۲- وعن الصعب بن جثامة الليثي رضي الله تعالى عنه، أنه أهدى لرسول الله ﷺ حماراً وحشياً، وهو بالأبواء أو بودان، فرده عليه، وقال: «إنا لم نرده عليك إلا أنا حرم». متفق عليه.

صعب بن جثامہ لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گورخر(۱) شکار کیا ہوا تحفہ کے طور پر بھیجا- اس وقت آپ ابواء یا ودان(۲) کے مقام پر تھے- آپ نے وہ تحفہ واپس کر دیا اور فرمایا کہ ہم تجھے یہ کبھی واپس(۳) نہ کرتے مگر بات یہ ہے کہ ہم احرام میں ہیں(۴)- متفق علیہ

(۱) اور ایک روایت میں ہے "جنگلی گدھا جس سے خون ٹپک رہا تھا" اور دوسری میں ہے "جنگلی گدھے کا گوشت" ایک اور روایت میں "جنگلی گدھے کی ران" اور ایک میں ہے "شکار کے گوشت کی دستی" اور یہ سب مسلم کی روایات ہیں-

(۲) حجۃ الوداع کے دوران یہ قصہ ہوا-

(۳) اصل میں لم نردہ کا لفظ استعمال ہوا ہے- جسے محدثین نے د کی فتحہ سے روایت کیا ہے مگر اسے عربی زبان کے محققین نے ناپسند کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ درست اس کا ضمہ ہے فتحہ نہیں- کیونکہ ساکن کو حرکت دینے کا قاعدہ یہی ہے جبکہ اس کے بعد ضمیر مذکر غائب ہو- اور نووی نے شرح مسلم میں کہا کہ جب ضمیر مذکر آئے تو اعراب کی تین صورتیں ہیں- سب سے واضح صورت ضمہ ہے' دوسری کسرہ ہے اور یہ ضعیف ہے اور تیسری فتحہ ہے جو اس سے بھی ضعیف ہے اس کے برعکس جب ساتھ والی ضمیر مونث ہو جیسے ردھا میں تو فتحہ درست ہو گا-

(۴) یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ محرم کو شکار کا گوشت کھانا مطلقاً" جائز نہیں- کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تحفہ واپس کرنے کی وجہ یہ بتلائی کہ وہ محرم ہیں اور یہ تفصیل نہ پوچھی کہ اس نے اسی غرض سے شکار کیا تھا یا نہیں گویا یہ مطلقاً" تحریم پر دلالت کرتی ہے اور جو لوگ محرم کو شکار کا گوشت کھانا جائز سمجھتے ہیں انہوں نے اس کا یہ جواب دیا کہ صعب نے یہ شکار ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ دینے کے لئے کیا تھا- اس طرح اس حدیث اور ابو قتادہ کی حدیث میں تطبیق ہو جاتی ہے- اور جب احادیث کو تطبیق دینا ممکن ہو تو کسی حدیث کو نظرانداز کرنے سے تطبیق دینا ہی بہتر ہوتا ہے اور اس بات پر ابو قتادہ کی گزشتہ حدیث کے وہ الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں جو احمد اور ابن ماجہ میں عمدہ سند سے مذکور ہیں کہ: "میں نے یہ شکار آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے کیا تھا- آپ نے صحابہ کو کھانے کا حکم دیا لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے شکار آپ کے لئے کیا تھا تو پھر اس سے نہیں کھایا"- ابوبکر نیشاپوری نے کہا کہ ان الفاظ "میں نے یہ شکار آپ کے لئے کیا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور آپ نے اس سے نہیں کھایا"۔ کے متعلق میں نہیں جانتا کہ اس حدیث میں معمر کے علاوہ کسی اور نے بھی کہے ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ معمر معتبر راوی ہے اور اس کا اکیلا ہونا کچھ نقصان نہیں دیتا۔ اور اس اضافہ کی شاہد جابر کی وہ حدیث ہے جسے ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ نیز اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ تحفہ قبول کرنا چاہئے اور اگر واپس کرنا ہو تو قبول نہ کرنے والے کو اس کی وجہ کی وضاحت کر دینا چاہیے۔

جاننا چاہئے کہ روایات کے الفاظ مختلف ہیں۔ شافعی نے کہا: اگر صعب رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ گدھا ہدیہ کرتے تو محرم کو یہ جائز نہیں کہ وہ جنگلی گدھے کو ذبح کرے اور اگر انہوں نے گدھے کا گوشت ہدیہ دیا تو اس میں یہ احتمال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا ہو کہ یہ گدھا آپ ہی کے لئے شکار کیا گیا ہو۔ رہی یہ روایت کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کھایا" جسے بیہقی نے روایت کیا ہے تو ابن قیم نے اسے ضعیف کہا ہے۔ پھر ابن قیم نے ان روایات میں سے گدھے کے گوشت والی روایت کو قوی کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس روایت میں صرف گدھے کا ذکر ہے بھی اس کے منافی نہیں کیونکہ اہل لغت میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ جزء پر کل کا نام لے لیتے ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ اکثر روایات میں یہی مذکور ہے کہ وہ گدھے کے گوشت ہی کا کوئی حصہ تھا۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ وہ کونسا حصہ تھا۔ لہٰذا ان میں تناقض نہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ جو گوشت آپ کو ہدیہ دیا گیا وہ ران کا گوشت ہو جس میں پاؤں شامل ہوتا ہے۔

۶۸۷۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، قالت: قال رسول الله ﷺ: **«خمس من الدواب كلهن فاسق، يقتلن في الحل والحرم: العقرب، والحدأة، والغراب، والفأرة، والكلب العقور»**. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'پانچ جانور ہیں جو سب کے سب فاسق (برے) ہیں۔ اور انہیں حلال مقامات کے علاوہ حرم میں بھی مارا جا سکتا ہے۔ بچھو(۱)' چیل' کوا' چوہیا اور کاٹنے والا کتا۔ متفق علیہ(۲)

(۱) اصل عبارت میں لفظ عقرب ہے جو مذکر و مونث دونوں کے لئے آتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی مونث کے لئے عقربۃ کا لفظ آتا ہے۔

(۲) اور بخاری ہی کی ایک روایت میں سانپ کا بھی ذکر ہے تو یہ چھ ہوئے۔ چنانچہ ابو عوانہ نے اسے چھ کے لفظ سے روایت کیا اور سانپ سمیت پانچ شمار کئے اور ابوداؤد میں بھی عادی درندوں کا بھی اضافہ ہے تو یہ سات ہوئے۔ اور ابن خزیمہ اور ابن المنذر میں بھیڑیئے اور چیتے کا بھی اضافہ ہے تو یہ نو ہوئے۔ الا یہ کہ اس نے ذیلی سے نقل کیا کہ وہ انہیں کاٹنے والے کتے کی تفسیر میں لایا ہے۔ اور بھیڑیئے کا ایک مرسل حدیث میں ذکر آیا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کے راوی معتبر ہیں۔ اور احمد نے جو مرفوعا" روایت کی اس میں امر کا صیغہ ہے یعنی محرم کو بھیڑیئے کو مار ڈالنا چاہئے اور اس میں ایک راوی ضعیف ہے۔

نیز ان اضافوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ سے مراد پانچ کا عدد نہیں۔ اور دواب' دابہ کی جمع ہے یعنی ہر وہ جاندار جو چلتا ہو اور اس کا اطلاق پرندوں پر بھی ہوتا ہے بمطابق ارشاد باری تعالیٰ وما من دابه فی الارض الا علی الله رزقها --- وکاین من دابه لا تحمل رزقها --- اور بعض کہتے ہیں کہ پرندے دابہ کے لفظ سے خارج ہیں۔ دلیل یہ آیت ہے وما من دابه فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه اور یہ کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ عام پر خاص کا عطف ہو۔ اور عرف میں دابہ کا لفظ چوپایوں کے لئے مختص ہو گیا ہے۔

اور ان چیزوں کو فواسق اس لئے کہا گیا کہ فسق کا لغوی معنی خروج یا نکلنا ہے جیسے فرمایا ففسق عن امر ربه یعنی شیطان اپنے رب کی اطاعت سے نکل گیا تو اسے عاصی اور فاسق کہا گیا۔ اور مذکورہ جانوروں کو فواسق اس لئے کہا گیا کہ یہ اس حکم سے نکل جاتے ہیں کہ محرم کو کوئی جانور مارنا حرام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ چونکہ یہ جانور خوردنی جانوروں سے نکل جاتے ہیں اس لئے انہیں فواسق کہا گیا جیسے ارشاد باری ہے۔ اوفسقا" اهل لغیر الله به گویا جو جانور خوردنی نہیں وہ فاسق کہلائے۔ ارشاد باری ہے۔ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم الله علیه و انه لفسق اور بعض کہتے ہیں(ا) کہ یہ جانور تکلیف پہنچانے' بگاڑ پیدا کرنے اور کسی کام نہ آنے کی وجہ سے دوسرے جانوروں سے خارج ہیں گویا یہ تین وجوہ ہیں جو ان پانچ چیزوں کو مارنے کے جواز میں علماء نے استنباط کی ہیں۔ پھر انہی تین وجوہ کی بنا پر اہل فتویٰ کا اختلاف ہوا۔ جو پہلی وجہ کے قائل ہیں انہوں نے ان پانچ میں ہر اس جانور کو شامل کر دیا جنہیں ایک حلال آدمی حرم میں مار سکتا ہے۔ اور جو دوسری وجہ کے قائل ہیں انہوں نے ان پانچ میں ہر اس جانور کو شامل کر دیا جو خوردنی نہیں۔ الا یہ کہ اس کو مارنے کی ممانعت آئی ہو۔ اور یہ وجہ بھی پہلی سے جا ملتی ہے۔ اور جو تیسری وجہ کے قائل ہیں۔ انہوں نے بالخصوص وہی جانور شامل کئے جو فساد کا سبب بنتے ہیں۔

مصنف نے فتح الباری میں کہا کہ یہ سب وجوہ ایسی ہیں جن پر کوئی دلیل نہیں اور جب نص نہ ہو تو الحاق سے دور رہنا چاہئے اور محتاط طریقہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کسی کو بھی شامل نہ کیا جائے اور حنفیہ اسی بات کے قائل ہیں۔ الا یہ کہ انہوں نے حدیث میں ثبوت کی بناء پر سانپ کو شامل کیا اور کتے اور بھیڑیئے میں کاٹنے کی مشترک صفت کی بنا پر بھیڑیئے کو شامل کیا۔ اور انہیں بھی جو ابتداء" سرکش اور دکھ دینے والے ہیں۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ توریہ یا عُدوان یہاں اذیت کے معنی میں ہر موذی کی جانب اہل قیاس کے نقطہ نظر سے مضبوط دلیل ہے کیونکہ اس کے فسق کی علت اشارہ کے پہلو سے واضح ہے اور یہ علت یا فسق کا معنی حد سے نکل جانا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

میں کہتا ہوں کہ فسق کی تفسیر میں تین مختلف اقوال ہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا لہٰذا کسی ایک وجہ کی تعین اشارہ سے مکمل نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس سے الحاق مکمل ہوتا ہے۔ اور جب محرم کو ان کا قتل کرنا جائز ہے تو پھر حلال آدمی کو انہیں مارنا بالاولیٰ جائز ہوا۔ چنانچہ مسلم کے لفظ بھی یہ ہیں یقتلن فی الحل والحرم اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں۔ "محرم کو انہیں مارنے پر کوئی گناہ نہیں"۔ جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ محرم جب انہیں حرم میں مار سکتا ہے اور حلال مقام پر تو بالاولیٰ مار سکتا ہے۔

اور حدیث کے لفظ یقتلن میں انہیں مار دینے کے جواز کی خبر ہے اور ایک روایت ہے امر کے صیغہ سے ہے اور ایک روایت میں مارنے والے پر گناہ نہ ہونے اور دوسری میں حرج نہ ہونے کے الفاظ ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں امر اباحت کے معنوں میں ہے نیز اس روایت میں مطلق کوے کا لفظ ہے جبکہ مسلم میں عائشہ کی روایت میں ابقع کے لفظ کی قید ہے یعنی ایسا کوا جس کی پشت یا بط میں سفیدی ہو۔ یعنی سفید داغوں والا۔ چنانچہ بعض ائمہ حدیث مطلق پر اس پابندی کی طرف گئے ہیں اور مقید پر مطلق کو محمول کرنے کا یہی قاعدہ ہے۔ اور جو اس اضافے پر شذوذ اور راوی کی تدلیس کی جرح ہوتی ہے وہ ناقابل قبول ہے کیونکہ راوی نے سماع سے صراحت کی لہٰذا تدلیس نہ رہی اور چونکہ یہ اضافہ عادل' ثقہ' حافظ راوی سے ہے لہٰذا شذوذ بھی نہ رہا۔ مصنف کہتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس سے چھوٹے کوے کو جو دانے کھاتا ہے اور جسے غراب الزرع کہتے ہیں خارج کر دینا چاہئے۔ انہوں نے اس کے کھانے کے جواز سے احتجاج کیا ہے۔ پھر جو باقی کوے ہیں وہ سب ابقع سے مل جائیں گے۔

اور کتے کے ساتھ کاٹنے والے کی قید مذکور ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو کتا کاٹنے والا نہ ہو وہ نہیں مارا جا سکتا اور ابوہریرہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کاٹنے والے کتے کی شیر سے تفسیر کی ہے اور زید بن اسلم اس کی تفسیر سانپ سے کرتے ہیں۔ اور سفیان بالخصوص بھیڑیئے سے کرتے ہیں اور مالک نے کہا کہ جو جانور بھی لوگوں کو کاٹے' انہیں ڈرائے' ان پر حملہ کرے جیسے شیر' چیتا' تیندوا اور بھیڑیا یہ سب کاٹنے والے کتے کے ضمن میں آتے ہیں۔ اور سفیان سے یہی منقول ہے اور یہی جمہور کا قول ہے اور انہوں نے اس بات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے استدلال کیا "اے اللہ! ان پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلط کر دے

---

[۱] یہی سب سے بہتر وجہ ہے۔ باقی سب کچھ تکلف ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو اسے شیر نے پھاڑ ڈالا"۔ اور یہ حدیث حسن ہے جسے حاکم نے روایت کیا ہے۔

٦٨٨۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ احتجم وهو محرم. متفق عليه.

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی(۱) حالت میں سینگی لگوائی۔ متفق علیہ(۲)۔

(۱) یعنی حجتہ الوداع کے دوران لحی الجمل کے مقام پر جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔
(۲) یہ حدیث محرم کے سینگی لگوانے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ وہ ضرورت کے تحت خواہ سر میں لگوائے یا کسی اور جگہ اور اس پر اجماع ہے۔ پھر اگر کوئی بال جڑ سے اکھڑ جائے تو اس پر سر منڈانے کا فدیہ ہے۔ اور اگر نہ اکھڑے تو کوئی فدیہ نہیں خواہ سینگی بلا عذر لگوائی جائے۔ اور اگر سر میں لگوائی جائے تو بال نہ کاٹے جائیں کیونکہ بال کاٹنا حرام ہے اور اگر ایسی جگہ لگوائی جائے جہاں بال نہیں ہوتے تو جمہور کے نزدیک جائز ہے اور اس پر کوئی فدیہ نہیں۔
اور کچھ لوگوں نے اسے مکروہ کہا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس پر فدیہ واجب ہے جبکہ حدیث نے اس قاعدہ شرعیہ سے متنبہ کر دیا ہے کہ احرام کے دوران حرام شدہ چیزیں جیسے سر منڈانا اور شکار کرنا مجبوری کے تحت مباح ہو جاتی ہیں اور اس پر فدیہ لازم ہے۔ لہذا جس شخص کو سر منڈانے کی ضرورت پیش آجائے یا گرمی اور سردی سے بچاؤ کے لئے اسے قمیض پہننا ضروری ہو تو یہ اس پر مباح اور فدیہ لازم ہو گا۔ اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔ فمن کان منکم مریضا اوبہ اذی من راسہ --- الایۃ - اور فدیہ کی مقدار کو درج ذیل حدیث واضح کر رہی ہے۔

٦٨٩۔ وعن كعب بن عجرة رضي الله تعالى عنه قال: حملت إلى رسول الله ﷺ والقمل يتناثر على وجهي، فقال: **«ما كنت أرى الوجع بلغ بك ما أرى، أتجد شاة؟»** قلت: لا، قال: **«فصم ثلاثة أيام، أو أطعم ستة مساكين، لكل مسكين نصف صاع»**. متفق عليه.

کعب بن عجرہ(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا جبکہ جوئیں میرے چہرے پر گری پڑتی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ تجھے جو تکلیف پہنچی ہے وہ میں دیکھ رہا ہوں۔ کیا تیرے پاس کوئی بکری ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: تو پھر تین روزے رکھ لے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے اور ہر مسکین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لئے نصف صاع ہونا چاہئے۔ متفق علیہ(۲)۔

(۱) کعب جلیل القدر صحابی ہیں انصار کے حلیف تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور مدینہ میں ۵۱ ہجری میں فوت ہوئے۔

(۲) اور بخاری کی روایت یوں ہے: حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے اور میرے سر سے جوئیں لگاتار گر رہی تھیں۔ آپ نے پوچھا: کیا تیرے یہ کیڑے تجھے دکھ پہنچا رہے ہیں؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے فرمایا: "تو اپنا سر منڈا ڈال"۔ الحدیث۔ اور اسی روایت میں ہے کہ کعب نے کہا کہ یہ آیت میرے حق میں نازل ہوئی۔ فمن کان منکم مریضًا اوبہ اذی من راسہ --- الایۃ۔ اور یہ حدیث متعدد الفاظ سے مروی ہے۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ وہ تین باتوں میں سے کسی ایک کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی لئے بخاری نے کفارات کے پہلے باب میں کہا: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ میں کعب کو اختیار دیا"۔ اور ابو داؤد نے شعبی سے، ابن ابی لیلی سے، کعب بن عجرہ کے طریق سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تو چاہے ایک قربانی کرے، اور اگر چاہے تو تین روزے رکھ لے اور اگر چاہے تو کھانا کھلا دے"۔ الحدیث۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تخییر ان سب چیزوں میں ہے اور حدیث کے لفظ نصف صاع سے وہی معنی لئے جو بظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ابو حنیفہ اور ثوری سے یہ مروی ہے کہ نصف صاع گندم سے اور باقی اجناس سے ایک صاع ہونا چاہئے۔

۷۹۰- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: لما فتح الله على رسوله مكة، قام رسول الله ﷺ في الناس، فحمد الله، وأثنى عليه، ثم قال: **«إن الله تعالى حبس عن مكة الفيل، وسلط عليها رسوله والمؤمنين، وإنها لم تحل لأحد كان قبلي، وإنما أحلت لي ساعة من نهار، وإنها لن تحل لأحد بعدي، فلا ينفر صيدها، ولا يختلى شوكها، ولا يحل ساقطتها إلا لمنشد. ومن قتل له قتيل فهو بخير النظرين»**، فقال العباس: إلا الإذخر، يا رسول الله! فإنا نجعله في قبورنا وبيوتنا، فقال: **«إلا الإذخر»**. متفق عليه.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالی نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مکہ فتح کرا دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان کھڑے(۱) ہوئے۔ پہلے اللہ تعالی کی حمد وثنا بیان کی پھر فرمایا: "اللہ تعالی نے اصحاب الفیل کو مکہ(۲) سے روک دیا تھا۔ اور اپنے رسول اور مومنوں کو مکہ پر غلبہ(۳) دے دیا۔ یہ مکہ مجھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے پہلے کسی پر حلال نہیں ہوا تھا اور میرے لئے بھی یہ صرف دن کی ایک ساعت(۴) کے لئے حلال ہوا اور میرے بعد بھی کسی کے لئے حلال نہیں۔ سو یہاں کے شکار کو بھگایا نہ(۵) جائے اور نہ کانٹے کاٹے جائیں اور کوئی گری پڑی(۶) چیز یہاں سے نہ اٹھائے۔ الا یہ کہ وہ مشہوری کرنے(۷) والا ہو اور جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار(۸) ہے"۔ اتنے میں عباسؓ کہنے لگے۔ یارسول اللہ! اذخر(۹) کاٹنے کی اجازت دیجئے اسے ہم اپنی قبروں اور گھروں میں بچھاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "اچھا اذخر کی اجازت ہے"۔ متفق علیہ(۱۰)

(۱) یعنی فتح مکہ سے دوسرے دن خطبہ دینے کے لئے

(۲) آپ نے یہ واقعہ اس لئے دہرایا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اللہ نے ان پر کس قدر احسان کیا تھا۔ اور یہ مشہور واقعہ قرآن میں مذکور ہے۔

(۳) یعنی انہوں نے بزور شمشیر فتح کیا۔

(۴) یہ وہ ساعت تھی جب آپ مکہ میں داخل ہوئے۔

(۵) یعنی چیخ چلا کر دھتکارا جائے اور نہ کسی طرف ہانک دیا جائے۔

(۶) اور ایک روایت میں ساقطة کے بجائے لقطة کا لفظ ہے۔

(۷) گم شدہ چیز کی تشہیر کرنے والا منشد ہے اور اسے ڈھونڈنے والا ناشد

(۸) یا دیت لے لے یا قاتل کو قتل کرے۔

(۹) ایک معروف خوشبودار گھاس ہے۔

(۱۰) اس حدیث میں لم تحل کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مکہ بزور شمشیر فتح ہوا تھا۔ نیز سلط علیہا اور لایحل کے الفاظ بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ جمہور کی یہی رائے ہے۔ اور شافعی اس طرف گئے ہیں کہ مکہ صلح سے فتح ہوا تھا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین پر کوئی چیز تقسیم نہیں کی جیسا کہ جنگ خیبر میں کی تھی۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ پر احسان فرمایا اور انہیں آزاد قرار دیا اور انہیں قتل سے اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بننے سے اور ان کے اموال کو اموال غنیمت بننے سے محفوظ کر دیا۔ اس لئے کہ وہ آپ کے قرابت دار اور کنبہ قبیلہ تھے۔

اور اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مکہ میں کسی کے لئے جنگ کرنا جائز نہیں۔ ماوردی نے کہا کہ یہ بات حرم کے خصائص سے ہے کہ اگر وہاں کے باشندے اہل عدل پر بغاوت بھی کریں تو ان سے جنگ نہ کی جائے۔ اور ایک گروہ اس کے جواز کا قائل ہے اور مسئلہ میں اختلاف ہے اور جنگ کی تحریم تو ظاہر ہے۔ قرطبی نے کہا کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جنگ کی تخصیص کی مقتضی ہے۔ اسی عذر کی بنا پر جنگ مباح کی گئی۔ حالانکہ اہل مکہ جنگ کے مستحق تھے کیونکہ انہوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکا تھا نیز مسلمانوں کو مکہ سے نکالا تھا اور خود کافر تھے اور اہل علم سے کئی لوگ اس بات کے قائل ہیں۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ مکہ کی تحریم موکد ہے۔ کیونکہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں جنگ کی اجازت دی گئی تھی جو اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اور اس کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ "اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ کو مثال سمجھ کر ایسی رخصت طلب کرے تو اسے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تو اجازت دی تھی جو تمہیں نہیں دی گئی"۔ جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مکہ میں جنگ کی جائز ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے تھا۔

نیز یہ حدیث حرم سے شکار کو بھگانے کی تحریم پر دلالت کرتی ہے تو شکار کو مارنا بدرجہ اولیٰ حرام ہوا۔ نیز کانٹے کاٹنے کی تحریم پر بھی دلالت کرتی ہے جس سے معلوم ہوا کہ جو چیز تکلیف نہ دے اسے کاٹنا بالاولیٰ حرام ہے اور عجب بات یہ ہے کہ شافعی درخت کی شاخوں کے کانٹے کاٹنے کے جواز کے قائل ہیں جیسا کہ ان سے ابو ثور نے نقل کیا۔ اس کے علاوہ بھی ایک جماعت نے اسے جائز سمجھا ہے اور ہادویہ انہی میں سے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ چیز تکلیف دیتی ہے اور فواسق سے مشابہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی چیز نص پر قیاس کی تقدیم ہے اور یہ باطل ہے۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ فواسق کو مار ڈالنے کی وجہ اذیت ہے۔ اور اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ جو درخت انسان عادتاً" لگاتے ہیں ان کو کاٹنا بھی حرام ہے اور اس کے علاوہ جو گھاس وغیرہ اگ آتی ہے اور جو بعد میں خشک ہو جاتی ہے اسے بھی کاٹنا حرام ہے۔ البتہ جو پودے آدمی لگائیں ان کے کاٹنے میں اختلاف ہے۔ قرطبی نے کہا کہ جمہور کے نزدیک یہ جائز ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حرم میں گری پڑی چیز وہی اٹھا سکتا ہے جو بعد میں ہمیشہ اس کی مشہوری کرتا رہے اور خود اس کا مالک نہ بنے اور یہ بات مکہ میں گری پڑی چیز سے خاص ہے۔ جبکہ دوسری جگہ سے گری پڑی چیز ایک سال مشہوری کرنے کے بعد مالک ہونے کی حیثیت سے اٹھائی جا سکتی ہے۔ اور اس مسئلہ میں اختلاف کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ باب اللقطہ میں آئے گا۔

اور "جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے"۔ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ اختیار ولی کو ہے۔ اور اس میں اختلاف کا ذکر باب الجنایات میں آئے گا۔

اور الفاظ نجعله فی قبورنا سے مراد ہے کہ لحد پر پتھر وغیرہ رکھنے کے بعد جو خلا رہ جاتے ہیں اسے ہم اذخر گھاس سے پر کر دیتے ہیں اور اسی طرح گھروں کی چھتوں پر لکڑیاں رکھنے کے بعد اس گھاس سے خلا پر کر لیتے ہیں۔ اور عباس کے کلام میں یہ احتمال ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اس اجازت کی سفارش کر رہے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان کا اجتہاد ہو کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کاٹنے کا عموم اسی عوامی ضرورت کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطالبہ کرتا ہے گویا وہ کہتے تھے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ جس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے اور عدم حرج شریعت کا دستور ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الا الا ذخر کہہ کر عباس کے کلام الا الا ذخر کو بحال رکھا اور یہ استثناء یا تو وحی کی بنا پر تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کی بناء پر۔

٧٩١- وعن عبد الله بن زيد بن عاصم رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ قال: **«إن إبراهيم حرم مكة، ودعا لأهلها، وإني حرمت المدينة، كما حرم إبراهيم مكة؛ وإني دعوت في صاعها ومدها، بمثلي ما دعا به إبراهيم لأهل مكة»**. متفق عليه.

عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا(۱) اور اس کے رہنے والوں کے لئے دعا(۲) کی تھی۔ اور میں مدینہ(۳) کو حرم قرار دیتا ہوں جس طرح ابراہیمؑ نے مکہ حرم قرار دیا تھا۔ اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مدینہ کے صاع(۴) اور مد میں برکت دے۔ جیسا کہ ابراہیمؑ نے اہل مکہ کے لئے دعا کی تھی۔ متفق علیہ(۵)۔

(۱) اور ایک روایت میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مکہ کو حرم بنایا"۔ اور اس میں کوئی منافات نہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت کا حکم دیا اور ابراہیم نے اس حکم کو بندوں پر لاگو کیا۔

(۲) جب یوں کہا: "اے اللہ اس شہر کو پر امن بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما"۔ اس کے علاوہ اور بھی آیات ہیں۔

(۳) المدینہ ۔ کثرت استعمال کی وجہ سے مدینہ علم بن گیا یعنی وہ شہر جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تھی۔ اور جب علی الاطلاق مدینہ کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد یہی شہر ہوتا ہے۔

(۴) یعنی جن میں اشیاء کیل کی جاتی ہیں۔ کیونکہ مدینہ میں یہی دو مشہور پیمانے تھے۔

(۵) مکہ کی تحریم سے مراد وہاں کے رہنے والوں کا جنگ و جدال سے پر امن رہنا ہے اور ان کا بھی جو مکہ میں آئیں بموجب ارشاد باری تعالیٰ من دخل کان امنا" نیز وہاں شکار کرنے، درخت کاٹنے اور کانٹے توڑنے کی ممانعت ہے۔ اور مدینہ کی تحریم سے مراد وہاں کے شکار کی اور درخت کاٹنے کی تحریم ہے۔ نیز وہاں کوئی خلاف سنت نیا کام جاری کرنا بھی حرام ہے اور حرم مدینہ کی حد بندی میں اختلاف ہے۔ اور یہ حد بندی بہت سے الفاظ میں آئی ہے ان میں سے راجح روایت یہ ہے مابین لابتیھا (جو دو پہاڑیوں کے درمیان ہے) کیونکہ اس کے راوی بکثرت ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٦٩٢- وعن علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «المدينة حرم ما بين عير إلى ثور». رواه مسلم.

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مدینہ عیر سے لے کر(۱) ثور تک ارض حرم ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) عیر اور ثور دونوں مدینہ کے پہاڑ ہیں صاحب قاموس نے کہا کہ اس بارے میں ایک صحیح حدیث بھی ہے اور یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد کہا۔ رہا ابو عبدالقاسم بن سلام' جو بڑے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں' کا قول کہ یہ تصحیف ہے اور درست یوں ہے کہ الی ثور کے بجائے الی احد ہونا چاہئے تھا کیونکہ ثور پہاڑ تو مکہ میں ہے تو یہ بات درست نہیں۔ چنانچہ مجھے شجاع تعلبی شیخ زاہد نے حافظ ابو محمد بن عبدالسلام(۱) بصری کے حوالے سے خبر دی کہ احد کے مقابل پچھلی جانب کو جھکا ہوا ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جسے ثور کہتے ہیں اور میں نے اپنا سوال اس خطہ کے واقف لوگوں سے کئی بار پوچھا تو ہر ایک نے مجھے یہی بتلایا کہ اس کا نام ثور ہے۔ علاوہ ازیں مجھے شیخ عفیف الدین عطری نے اپنے باپ کے حوالہ سے لکھا کہ احد کے پیچھے شمالی جانب ایک چھوٹا سا گول پہاڑ ہے جسے ثور کہتے ہیں اور مدینہ کے سب پہلے اور پچھلے لوگ اسے پہچانتے ہیں۔

اور یہ حدیث مابین لابتیھا والی حدیث کے منافی نہیں کیونکہ وہ پتھریلی زمین کے دو ٹیلے گھیرے ہوئے ہیں (قاموس) اور عیر اور ثور مدینہ کے ارد گرد ہیں۔ گویا عیر اور ثور والی حدیث لابتین کی تفسیر ہے۔

---

(۱) وفاء الوفاء میں یہ نام یوں ہے: ابو محمد عفیف الدین عبدالسلام بن مرزوع البصری۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حج کی کیفیت اور مکہ میں داخلہ

اس سے مراد حج کے مناسک کی وضاحت' انہیں بجا لانے کی ترتیب اور اس کی کیفیت ہے۔ مصنف نے اس بارے میں جابر کی حدیث پیش کی ہے جس میں ان سب باتوں کی بھرپور تفصیل موجود ہے۔

٧٥٣- عن جابر بن عبد الله رضي الله تعالى عنهما، أن رسول الله ﷺ حج، فخرجنا معه، حتى إذا أتينا ذا الحليفة فولدت أسماء بنت عميس، فقال: «**اغتسلي، واستثفري بثوب، وأحرمي**»، وصلى رسول الله ﷺ في المسجد، ثم ركب القصواء، حتى إذا استوت به على البيداء، أهلّ بالتوحيد: «**لبيك، اللهم لبيك، لبيك، لا شريك لك، لبيك، إن الحمد والنعمة لك والملك، لا شريك لك**»، حتى إذا أتينا البيت استلم الركن، فرمل ثلاثاً، ومشى أربعاً، ثم أتى مقام إبراهيم فصلى، ثم رجع إلى الركن، فاستلمه، ثم خرج من الباب إلى الصفا، فلما دنا من الصفا، قرأ ﴿**إن الصفا والمروة من شعائر الله**﴾ أبدأ بما بدأ الله به، فرقي الصفا، حتى رأى البيت، فاستقبل القبلة، فوحد الله، وكبره، وقال: «**لا إله إلا الله، وحده، لا شريك له، له الملك، وله الحمد، وهو على كل شيء قدير، لا إله إلا الله، أنجز وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده**»، ثم دعا بين ذلك ثلاث مرات، ثم نزل من الصفا إلى المروة، حتى إذا انصبت قدماه في بطن الوادي سعى، حتى إذا صعد مشى إلى المروة، ففعل على المروة كما فعل على الصفا، فذكر الحديث، وفيه: فلما كان يوم التروية توجهوا إلى منى، وركب النبي ﷺ، فصلى بها الظهر والعصر والمغرب والعشاء والفجر، ثم مكث قليلاً حتى طلعت الشمس، فأجاز حتى أتى عرفة، فوجد القبة قد ضربت له بنمرة، فنزل بها، حتى إذا زالت الشمس أمر بالقصواء فرحلت له، فأتى بطن الوادي، فخطب الناس، ثم أذن، ثم أقام، فصلى الظهر، ثم أقام فصلى العصر، ولم يصل بينهما شيئاً، ثم ركب حتى أتى الموقف، فجعل بطن ناقته القصواء إلى الصخرات، وجعل حبل المشاة بين يديه، واستقبل القبلة، فلم يزل واقفاً حتى غربت الشمس، وذهبت الصفرة قليلاً، حتى إذا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غاب القرص دفع، وقد شنق للقصواء الزمام، حتى إن رأسها ليصيب مورك رحله، ويقول بيده اليمنى: يا أيها الناس! السكينة، السكينة، وكلما أتى حبلاً أرخى لها قليلاً حتى تصعد، حتى أتى المزدلفة، فصلى بها المغرب والعشاء، بأذان واحد وإقامتين، ولم يسبح بينهما شيئاً، ثم اضطجع حتى طلع الفجر، فصلى الفجر حين تبين له الصبح، بأذان وإقامة، ثم ركب حتى أتى المشعر الحرام، فاستقبل القبلة، فدعا، وكبر، وهلل، فلم يزل واقفاً حتى أسفر جداً، فدفع قبل أن تطلع الشمس، حتى أتى بطن محسر، فحرك قليلاً، ثم سلك الطريق الوسطى التي تخرج على الجمرة الكبرى، حتى أتى الجمرة التي عند الشجرة، فرماها بسبع حصيات، يكبر مع كل حصاة منها مثل حصى الخذف، رمى من بطن الوادي، ثم انصرف إلى المنحر، فنحر، ثم ركب رسول الله ﷺ فأفاض إلى البيت، فصلى بمكة الظهر. رواه مسلم مطولاً.

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہم بھی حج(۱) کو مدینہ سے نکلے۔ جب ہم ذوالحلیفہ پہنچے تو اسماء بنت عمیس(۲) کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ غسل کر لے اور کپڑے سے لنگوٹ باندھ کر احرام باندھ لے(۳)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نماز (۴) ادا کی۔ پھر اپنی قصواء(۵) نامی اونٹنی پر سوار ہوئے اور جب بیداء(۶) میں پہنچے تو توحید سے یوں آواز بلند کی۔ ”اے اللہ! میں حاضر ہوں‘ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں(۷) تعریف تیرے ہی لئے ہے۔ ساری نعمتیں تیری ہیں اور بادشاہی بھی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں“۔ حتیٰ کہ ہم بیت اللہ پہنچ گئے۔ آپ نے حجر اسود کو بوسہ(۸) دیا۔ پھر آپ نے تین چکر دوڑ کر اور چار چکر عام چال سے بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر مقام ابراہیم آئے اور نماز(۹) ادا کی پھر حجر اسود کے پاس آکر اسے بوسہ دیا۔ پھر دروازہ(۱۰) سے نکل کر صفا کی طرف آئے۔ جب صفاء کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی: ”صفا اور مروۃ اللہ کے شعائر ہیں“۔ پھر فرمایا۔ میں بھی اسی سے شروع کرتا ہوں جہاں سے اللہ نے شروع کیا۔ پھر صفا پر چڑھے حتیٰ کہ بیت اللہ کو دیکھا پھر قبلہ رخ ہو کر اللہ کی توحید اور تکبیر بیان کی اور فرمایا: ”اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کو ہر طرح کی تعریف سزاوار ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے سوا کوئی الہ نہیں وہ اکیلا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ(۱۱) پورا کر دیا اور اپنے(۱۲) بندے کی مدد کی اور سب لشکروں(۱۳) کو اکیلے (۱۴) ہی شکست دی۔ پھر آپ نے صفا اور مروہ کے درمیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تین بار یہی دعا کی۔ پھر مروہ پر اترے حتیٰ کہ آپ کے قدم وادی کے درمیان ڈھلان(۱۵) پر پڑنے لگے تو دوڑنا شروع کیا یہاں تک کہ اوپر چڑھنے لگے تو عام چال چلنے لگے حتیٰ کہ آپ مروہ پر آئے تو وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا۔ اور ساری(۱۶) حدیث ذکر کی۔ اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب آٹھ(۱۷) ذی الحجہ کا دن آیا تو لوگوں نے منیٰ کی طرف کوچ کیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار ہوئے۔ آپ نے منیٰ میں ظہر' عصر' مغرب' عشاء اور فجر کی نمازیں ادا کیں۔ پھر تھوڑی دیر وہیں ٹھہرے رہے۔ جب سورج نکل آیا تو آگے چلے(۱۸) حتیٰ کہ عرفات(۱۹) پہنچ گئے۔ وہاں آپ نے ایک خیمہ دیکھا جو مقام نمرہ(۲۰) میں آپ کے لئے نصب کیا گیا تھا۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو آپ نے حکم دیا کہ قصواء پر کجاوہ کسا جائے۔ پھر آپ بطن وادی(۲۱) میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا۔ پھر اذان اور اقامت ہوئی تو آپ نے ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر اقامت کہہ کر عصر کی نماز پڑھی(۲۲) اور ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی سنت' نفل وغیرہ نہیں پڑھا۔ پھر آپ سوار ہو کر موقف (ٹھہرنے کی جگہ) پر آئے۔ اور اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کیا اور جبل(۲۳) المشاۃ کو اپنے سامنے رکھا۔ اور قبلہ رخ ہو گئے۔ اور سورج غروب ہونے تک اسی حالت میں کھڑے رہے۔ حتیٰ کہ شام کی سرخی غائب(۲۴) ہونے لگی تو آپ واپس لوٹے۔ اور قصواء کی مہار کو اتنا کھینچا کہ اس کا سر کجاوے کے اگلے حصہ سے جا لگا(۲۵)۔ اور آپ اپنے دائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے جاتے تھے کہ اے لوگو! حوصلے سے چلو' حوصلے سے چلو۔ اور جب بھی آپ کسی پہاڑی یا ریت کے ٹیلے پر چڑھتے تو اونٹنی کی مہار کو ذرا ڈھیلا چھوڑ دیتے تاکہ وہ اوپر چڑھ سکے۔ حتیٰ کہ آپ مزدلفہ پہنچ گئے وہاں آپ نے مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھی اور ان دونوں نمازوں کے درمیان کچھ بھی نہ پڑھا۔ پھر آپ لیٹ گئے۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے اذان اور اقامت کے ساتھ فجر کی نماز اس وقت پڑھی جب فجر واضح ہوئی۔ پھر آپ سوار ہو کر مشعر(۲۶) الحرام تک آئے۔ آپ قبلہ رخ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء کی اور تکبیر و تہلیل کی۔ آپ اسی حالت میں کھڑے رہے حتیٰ کہ خوب روشنی ہو گئی۔ تاہم آپ سورج طلوع ہونے سے پہلے چل پڑے تاآنکہ آپ بطن محسر(۲۷) پہنچے۔ یہاں آپ نے اونٹنی کو قدرے تیز چلایا۔ پھر درمیانی راستہ پر چل پڑے جو جمرہ کبریٰ(۲۸) پر آنکلتا ہے۔ جب اس جمرہ پر پہنچے اور یہ جمرہ درخت(۲۹) کے پاس ہے تو آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں۔ آپ ہر کنکری مارنے کے وقت تکبیر کہتے تھے اور یہ کنکریاں (۳۰) کوڑی کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں۔ آپ نے بطن(۳۱) وادی میں کھڑے ہو کر کنکریاں پھینکیں پھر آپ قربان گاہ کی طرف آئے اور قربانی کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور بیت اللہ شریف(۳۲) پہنچے اور مکہ میں ظہر کی نماز ادا کی۔ اس حدیث کو مسلم نے بڑی تفصیل(۳۳) سے روایت کیا ہے۔

(۱) اصل میں حج ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس لئے کہ یہ حج ہونے کے بعد روایت کیا گیا۔ جب ان سے محمد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بن علی بن حسین نے پوچھا تھا۔

(۲) عمیس ۔ تصغیر کا صیغہ ہے۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کی زوجہ ہیں اور اس وقت محمد بن ابی بکر کو جنم دیا۔

(۳) اس سے معلوم ہوا کہ نفاس احرام باندھنے کی صحت میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

(۴) یعنی فجر کی نماز جیسا کہ نوویؒ نے شرح مسلم میں ذکر کیا ہے۔ اور الھدی النبوی میں ہے کہ یہ ظہر کی نماز تھی۔ اور یہی درست ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ میں پانچ نمازیں پڑھیں اور پانچویں نماز ظہر کی تھی۔ اس کے بعد سفر شروع کیا۔

(۵) قصواء (ق پر فتحہ اور الف ممدودہ) بھی درست ہے اور قصواء (ق پر ضمہ اور الف مقصورہ) بھی۔ اور جو کہتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا لقب تھا۔ غلطی پر ہے۔

(۶) ایک مقام کا نام ہے۔

(۷) دور جاہلیت میں تلبیہ میں یہ زائد الفاظ بھی کہتے تھے الا شریکا ھو لک تملکہ وما ملک (مگر تیرا وہ شریک جس کا مالک تو ہی ہے وہ خود مالک نہیں)

(۸) اصل میں استلم ہے جس کا معنی ہاتھ سے چھونا بھی ہے اور رکن سے مراد حجر اسود ہے۔ اور اس لفظ کا اطلاق عموماً رکن یمانی پر ہوتا ہے۔

(۹) یعنی طواف کی دو رکعتیں۔

(۱۰) یعنی باب حرم سے۔

(۱۱) یعنی اپنے دین کو غالب کرنے کا۔

(۱۲) عبد سے آپ کی مراد آپ کی اپنی ذات ہے۔

(۱۳) یعنی خندق کی جنگ کے موقعہ پر۔

(۱۴) یعنی صحابہ کو جنگ لڑنی ہی نہ پڑی اور بظاہر کفار کی شکست کا کوئی سبب نہیں تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ فارسلنا علیھم ریحاً وجنوداً لم تروھا یا یہ مراد ہے کہ جس نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کے لئے لشکر اکٹھے کئے اللہ نے انہیں شکست دی۔

(۱۵) عیاض نے کہا کہ یہاں ایک لفظ حذف ہو گیا ہے اور یہ عبارت یوں ہونا چاہئے تھی۔ حتی انصبت قدماہ فی بطن الوادی گویا رمل کا لفظ ساقط ہوا ہے۔ اور یہ لفظ مسلم کی روایت میں موجود ہے۔ نیز حمیدی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے الجمع بین الصحیحین میں بھی ایسا ہی ذکر کیا ہے۔

(۱۶) یعنی جابر نے ساری حدیث بیان کی اور مصنف نے حسب ضرورت اس میں اختصار کر لیا ہے۔

(۱۷) اصل میں یوم الترویتہ ہے۔ یعنی آٹھویں ذی الحجہ اور اس کا یہ نام اس لئے پڑا کہ عرفات میں پانی نہیں ہوتا تھا اور لوگ یہیں سے پانی ساتھ لے جاتے تھے۔

(۱۸) یعنی مزدلفہ سے آگے نکل گئے اور وہاں ٹھہرے نہیں۔

(۱۹) عرفات کے قریب پہنچے۔ عرفات میں داخل نہیں ہوئے۔

(۲۰) نمرہ ایک مشہور مقام ہے اور یہ عرفات سے باہر ہے۔

(۲۱) وادی عرفہ

(۲۲) یعنی عصر کے لئے الگ اذان نہیں کہی

(۲۳) جبل میں دو لغت ہیں ج سے بھی اور ح سے بھی اور با مفتوح بھی درست ہے اور ساکن بھی۔ نہایہ میں ایسا ہی مذکور ہے۔ اور اس کی تفسیر اس راستے سے کرتے ہیں جس پر رمل میں دوڑتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی چال میں صفیں باندھے اور اکھٹے رہیں اور اسے حبل الرمل سے تشبیہ دی۔

(۲۴) اصل میں حتی غاب القرص کے لفظ ہیں شرح مسلم میں کہا کہ تمام نسخوں میں یہی الفاظ ہیں اور قاضی نے بھی تمام نسخوں سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حتیٰ کے بجائے حین غاب القرص درست ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ حتی غاب القرص' غربت الشمس اور ذھبت الصفرۃ کی وضاحت کے لئے آیا ہو۔ کیونکہ یہ لفظ سورج کی ٹکیہ پوری چھپ جانے مجازاً بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس احتمال کو حتی غاب القرص سے زائل کیا گیا۔

(۲۵) مورک بمعنی کجاوے کا اگلا حصہ۔ سوار جب کجاوے پر بیٹھے ہوئے تھک جاتا ہے۔ تو اس حصہ میں اپنے پاؤں ٹکا لیتا ہے اور سرین پر بیٹھ جاتا ہے۔

(۲۶) مزدلفہ میں ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے جسے قزح کہتے ہیں۔

(۲۷) محسر اس لئے نام پڑا کہ یہاں اصحاب الفیل درماندہ اور عاجز ہو گئے تھے۔

(۲۸) یہی جمرہ عقبہ ہے۔

(۲۹) یہ درخت منیٰ کی حد پر ہے۔ منیٰ میں شامل نہیں۔ اور جمرہ کنکریوں کے لئے اسم جمع ہے سب لوگوں کے کنکریاں مارنے کی وجہ سے یہ نام پڑا۔ کہتے ہیں اجمر بنو فلان یعنی بنو فلاں سب اکھٹے ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳۰) اور اس کی مقدار جیسے باقلاء کا دانہ

(۳۱) کنکریاں پھینکنے کے مقام کی وضاحت ہے۔

(۳۲) یہاں عبارت محذوف ہے۔ یعنی آپ نے بیت اللہ پہنچ کر طواف اضافہ کیا پھر ظہر کی نماز پڑھی اور یہ ابن عمر کی اس حدیث سے معارض ہے کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی"۔ اور ان میں تطبیق یوں ہے کہ آپ نے مکہ میں ظہر پڑھی پھر منیٰ جا کر صحابہ کو ظہر کی نماز جماعت سے پڑھائی تاکہ انہیں آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل ہو۔

(۳۳) مصنف نے اس سے بہت کچھ حذف کر کے یہاں اپنی ضرورت کے مطابق اختصار کر لیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ یہ عظیم حدیث کثیر الفوائد اور اہم قواعد شرعیہ پر مشتمل ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جو فقہی مسائل ہیں۔ لوگوں نے اس پر بہت لمبی چوڑی بحث کی ہے۔ اور ابوبکر بن المنذر نے ایک بڑا رسالہ تصنیف کیا ہے جس میں ڈیڑھ سو سے زائد فقہی مسائل ہیں اور اگر استقصاء کیا جائے تو اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اصل یہ ہے کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال حج کے بارے میں ثابت ہے وہ دو باتوں کا وجوب ہے۔ ایک یہ کہ آپ کے افعال حج اس حج کی وضاحت ہیں جس کا اللہ نے آپ کو حکم دیا تھا اور یہ سب اعمال وجوب پر محمول ہیں۔ دوسرا یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو"۔ اب جو شخص آپ کے افعال میں سے کسی چیز کے عدم وجوب کا دعویٰ کرتا ہے تو اس پر دلیل پیش کرنا اس کے ذمہ ہے۔ اب ہم مختصراً اس حدیث کے فوائد اور دلائل پیش کرتے ہیں۔

اس حدیث میں حیض اور نفاس والی عورتوں پر غسل احرام کے سنت ہونے پر دلیل ہے تو دوسروں کے لئے یہ بدرجہ اولیٰ سنت ہوا۔ اور اس بات پر کہ حیض اور نفاس والی عورت کس کر لنگوٹ باندھ لے' اور اس بات پر کہ ان کا حرام صحیح ہے' اور یہ کہ احرام فرضی یا نفلی نماز کے بعد باندھنا چاہئے۔ کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جن دو رکعتوں کے بعد آپ نے تلبیہ پکارا' وہ فجر کی فرض نماز تھی۔ اور یہ کہ تلبیہ بلند آواز سے پکارنا چاہئے۔

علماء کہتے ہیں کہ تلبیہ اتنا ہی کہنا مستحب ہے جتنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ اور اگر کچھ زیادہ کر لے تو کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ لفظ زیادہ کہے تھے۔ "میں حاضر ہوں اے نعمتیں عطا کرنے والے اور اچھے فضل والے۔ میں تجھ سے ڈرتے ہوئے اور تیری طرف رغبت کرتے ہوئے حاضر ہوتا ہوں"۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں تیرے احکام کی بجا آوری کے لئے بار بار حاضر ہوتا ہوں۔ بھلائی تیرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی ہاتھ میں ہے۔ میں تیری طرف رغبت رکھتے ہوئے عمل کر رہا ہوں"۔ اور انس رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں تہ دل اور خلوص نیت سے بندگی کا اقرار کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے حاضر ہوتا ہوں"۔

اور یہ کہ حاجی کو چاہئے کہ مکہ پہنچ کر سب سے پہلے طواف قدوم کرے اور طواف سے پہلے رکن کو ہاتھ لگائے۔ پھر پہلے تین چکر رمل سے لگائے۔ اور رمل تیز چال یا دکی چال کو کہتے ہیں پھر اس کے بعد چار چکر عام رفتار سے لگائے۔ اور طواف پورا ہونے پر مقام ابراہیم پر آئے اور یہ پڑھے۔ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلیٰ پھر اس مقام کو اپنے اور کعبہ کے درمیان رکھ کر دو رکعتیں پڑھے۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ واجب ہیں یا نہیں؟ بعض واجب کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اگر طواف واجب ہے تو واجب ہیں ورنہ سنت ہیں۔ نیز یہ کہ کیا یہ رکعتیں مقام ابراہیم ہی کے پیچھے پڑھنا واجب ہیں یا اور جگہ بھی پڑھی جا سکتی ہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ مقام کے پیچھے پڑھنا واجب ہیں اور بعض مستحب کہتے ہیں۔ اور اگر یہ رکعتیں حطیم میں یا مسجد حرام میں یا مکہ میں کسی بھی جگہ پڑھ لے تو جائز ہیں مگر فضیلت فوت ہو جائے گی۔ اور ان دو رکعتوں میں قرات کے متعلق وارد ہے کہ پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد کافرون اور دوسری میں فاتحہ کے بعد سورہ اخلاص پڑھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

نیز یہ کہ جب حاجی مسجد سے نکلے تو اسی طرح رکن کو چھوئے جیسے آنے کے وقت کیا تھا۔ اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا یا چھونا سنت ہے۔ اور یہ کہ طواف کے بعد سعی کرے اور صفا سے شروع کرے اور بلندی پر چڑھے پھر وہاں قبلہ رخ کھڑا ہو اور اس ذکر سے اللہ کا ذکر کرے اور تین بار دعا کرے۔ اور موطا میں ہے کہ حتی اذا انصبت قدماہ فی بطن الوادی سعی اور ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ مسلم کی روایت میں حذف ہے تو موطا کی روایت سے معلوم ہو گیا کہ وہ بطن وادی میں رمل کرے اور یہ وہی فاصلہ ہے جسے بین المیلین کہتے ہیں۔ اور یہ پورے سات چکروں میں مشروع ہے' طواف قدوم کی طرح صرف پہلے تین چکروں میں نہیں۔ نیز یہ کہ جیسے صفاء پر چڑھ کر ذکر اور دعا کی تھی مروہ پر بھی چڑھ کر ذکر اور دعاء کرے۔ یہ سات چکر پورے ہونے پر اس کا عمرہ پورا ہو گیا۔ اب وہ سر منڈائے یا بال کترائے تو حلال ہو جائے گا۔ ان صحابہ نے اسی طرح کیا تھا۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج کو عمرہ بنانے کا حکم دیا تھا۔ رہے قارن تو وہ نہ سر منڈائیں اور نہ بال کترائیں۔ وہ بدستور اپنے احرام پر رہیں گے۔ پھر جو شخص عمرہ کے بعد حلال ہوا تھا وہ حج کا ارادہ رکھا ہو تو ۸ ذی الحجہ کو پہلے پہر احرام باندھے۔ اور قارن حاجیوں کے ساتھ منیٰ کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روانہ ہو جائے جیسا کہ جابر نے کہا کہ: آٹھویں ذی الحجہ کو سب لوگ منیٰ کی طرف چل پڑے۔ یعنی وہ بھی جو قارن تھے اور حج پورا ہونے تک احرام پر باقی تھے اور وہ بھی جو عمرہ کر کے حلال ہو گئے تھے۔ انہوں نے احرام باندھا اور منیٰ کو روانہ ہوئے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہو کر گئے۔ منیٰ میں فروکش ہوئے۔ اور وہاں پانچ نمازیں پڑھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان مقامات پر پیدل جانے کی بجائے سوار ہو کر جانا افضل ہے۔ اور راستہ میں سوار رہنا چاہئے۔ اور اسی میں اختلاف ہے۔ جبکہ افضلیت کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل ہے۔

نیز سنت یہ ہے کہ منیٰ میں پانچ نمازیں پڑھے۔ اور یہ رات یعنی ذی الحجہ کی نویں رات منیٰ میں گزارے۔ نیز سنت یہ ہے کہ منیٰ سے عرفات کو طلوع آفتاب کے بعد ہی روانہ ہو پہلے نہیں اور عرفات میں زوال آفتاب کے بعد داخل ہو۔ نیز یہ کہ عرفات میں ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمرہ میں اترے اور یہ عرفات کا حصہ نہیں۔ اور موقف میں دونوں نمازیں پڑھنے کے بعد ہی داخل ہوئے۔ اور یہ کہ ان دونوں نمازوں کے درمیان کچھ نہ پڑھے۔ نیز سنت یہ ہے کہ ان دونوں نمازوں سے پہلے امام لوگوں کو خطبہ دے۔ اور یہ چار مسنون خطبوں میں سے ایک ہے۔ دوسرا مسنون خطبہ ساتویں ذی الحجہ کو ہے کہ امام ظہر کی نماز کے بعد کعبہ کے پاس خطبہ دے۔ تیسرا خطبہ قربانی کے دن کا خطبہ ہے۔ اور چوتھا منیٰ سے واپسی کے پہلے دن یعنی ایام تشریق کے دوسرے دن کا خطبہ ہے۔

نیز حدیث کے الفاظ ہیں: "پھر آپ سوار ہو کر موقف آئے .... تا آخر"۔ یہ افعال سنن اور آداب ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ نمازوں سے فراغت کے بعد موقف کی طرف جائے۔ اور ایک یہ کہ وہاں سوار ہو کر وقوف کرنا افضل ہے۔ اور ایک یہ کہ وہ صخرات کے پاس وقوف کرے۔ اور صخرات وہ چٹانیں یا پتھر ہیں جو جبل رحمت کے زیریں حصہ میں مفروش کئے گئے ہیں۔ اور جبل رحمت عرفات کے وسط میں واقع ہے۔ اور ایک یہ کہ وقوف کے وقت قبلہ رخ ہونا چاہئے۔ اور ایک یہ کہ سورج غائب ہونے تک موقف میں ہی رہے اور وقوف کے دوران دعائیں کرتا رہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر سوار رہ کر وقوف کیا اور اللہ عزوجل سے دعائیں کرتا رہے۔ اور آپ دعاء کے دوران سینہ تک اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے اور آپ نے صحابہ کو بتلایا کہ سب سے بہتر دعاء عرفہ کے دن کی دعا ہے۔ اور موقف میں آپ کی دعا سے متعلق یہ مذکور ہے کہ: "اے اللہ! ہر طرح کی تعریف تجھے ہی سزاوار ہے جیسی کہ ہم کہہ رہے ہیں اور اس سے بہتر تعریف جو کچھ ہم کہہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے ہیں۔ اے اللہ! میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت سب کچھ تیرے ہی لئے ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے قبر کے عذاب سے اور دل کے وسوسوں سے اور کام کے پریشان ہونے اور بکھرنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ! میں تجھ سے اس شر سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو ہوا لاتی ہے"۔ اسے ترمذی نے روایت کیا۔

اور ایک یہ کہ سورج ڈوبنے کی تحقیق ہو جانے کے بعد عرفات سے نہایت سکون کے ساتھ روانہ ہو اور لوگوں کو بھی ایسا ہی حکم دے اور اپنی سواری کی لگام کھینچے رکھے تاکہ وہ چلنے میں جلدی نہ کرے۔ الا یہ کہ جب وہ کسی بلندی یا ریت کے ٹیلہ پر پہنچے تو لگام کو ڈھیلا کر دے تاکہ سواری کو اوپر چڑھنا آسان ہو جائے۔ پھر جب مزدلفہ پہنچے تو وہاں اتر جائے اور وہاں مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ اکٹھی پڑھے۔ اور یہ جمع کرنا متفق علیہ ہے۔ البتہ اس کے سبب میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا سبب حج کا طریقہ ہے اور بعض اس کا سبب مسافر ہونا بتلاتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ نہ پڑھنا چاہئے۔

اور حدیث کے لفظ ہیں "پھر وہاں آپ طلوع فجر تک لیٹ گئے"۔ اس میں سنت نبوی یہ ہے کہ یہ رات مزدلفہ میں گزارے۔ اور یہ بات مجمع علیہ ہے کہ یہ نسک (حج کا طریق کار) ہے۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا یہ واجب ہے یا سنت ہے۔ اور اس بارے میں اصل یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج کے دوران جو افعال کئے وہ واجب ہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔ نیز سنت یہ ہے کہ صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھے۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر مشعرالحرام آکر ٹھہرے اور دعا کرے۔ اور یہاں ٹھہرنا بھی حج کے مناسک سے ہے پھر جب خوب روشنی پھیل جائے تو وہاں سے روانہ ہو کر بطن محسر آئے۔ لیکن یہاں سے جلدی سے آگے نکل جائے۔ کیونکہ یہاں اصحاب الفیل پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔ للذا وہاں نہ دیر کرنا چاہئے اور نہ ٹھہرنا چاہئے۔ پھر جب جمرہ عقبہ پر پہنچے تو بطن وادی میں اترے اور سات کنکریاں مارے جو باقلاء کے دانے کے لگ بھگ ہوں اور ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہے۔ پھر وہاں سے قربان گاہ کی طرف آئے اور قربانی کرے۔ اگر اس کے پاس قربانی کا جانور ہو اور وہ اسے ذبح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو تریسٹھ اونٹ وہاں ذبح کئے اور یہ کل سو اونٹ آپ کے ساتھ تھے۔ پھر آپ نے علی رضی اللہ عنہ کو باقی اونٹوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ پھر آپ سوار ہو کر مکہ آئے اور طواف افاضہ کیا۔ اسی طواف کو طواف زیارت بھی کہتے ہیں۔ اس طواف کے بعد محرم پر احرام کی وجہ سے جو چیزیں حرام ہوئی تھیں سب حلال ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ اپنی بیوی سے صحبت بھی۔ اور جس شخص نے جمرہ عقبہ کو کنکریاں تو مار لیں مگر ابھی طواف زیارت نہیں کیا۔ اس کے لئے عورت سے صحبت کے سوا باقی سب کچھ حلال ہو جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سو یہ ہیں وہ سنن و آداب جو اس جلیل القدر حدیث سے اجمالاً" معلوم ہوتے ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال سے حج کے اعمال کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور بہت سے ایسے امور ہیں جن پر یہ جلیل القدر حدیث دلالت کرتی ہے اور ہم نے ان کا ذکر کیا ہے۔ علماء میں ان کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں' اور ان میں کسی کو چھوڑنے سے قربانی لازم ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں' اور اگر کوئی چیز رہ جائے تو حج کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں بہت سے اختلافات ہیں جن کو شرح میں تفصیل سے ذکر کر دیا گیا ہے۔ اور ہم نے اسے اسی حد تک محدود رکھا ہے' جو اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اگلی حدیث اسی بات پر مشتمل ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو"۔ کے مطابق ہے کہ ان میں آپ کے افعال اور اقوال کی پیروی کی جائے۔

۶۹۴۔ وعن خزيمة بن ثابت رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ كان إذا فرغ من تلبيته في حج أو عمرة سأل الله رضوانه والجنة، واستعاذ برحمته من النار. رواه الشافعي بإسناد ضعيف.

خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب حج یا عمرہ کے تلبیہ سے فارغ ہوتے تو اللہ سے اس کی رضا مندی اور جنت کا سوال کرتے۔ اور اس کی رحمت کے ساتھ دوزخ سے پناہ مانگتے۔ اسے شافعی نے ضعیف سند سے روایت کیا(۱)۔

(۱) یہ حدیث شارح کے نسخہ سے محذوف ہے جو ہمیں معلوم ہوئی ہے۔ لہٰذا ان نے اس پر کلام نہیں کیا۔ اور اس کی سند کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں صالح بن محمد بن ابی زائدہ ابو واقد لیثی ہے۔ جسے محدثین نے ضعیف کہا ہے۔

اور یہ حدیث اس بات کے استحباب پر دلیل ہے۔ کہ محرم جب بھی تلبیہ پکارے تو اس سے فراغت کے بعد یہ دعا یا اس جیسی کوئی دعا پڑھے۔ اور فراغت سے مراد تلبیہ کا انتہائی مشروع وقت ہی ہو سکتا ہے یعنی جب وہ جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارنے سے فارغ ہو۔ لیکن واضح تر پہلی بات ہی ہے۔

۶۹۵۔ وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«نحرت ههنا، ومنى كلها منحر، فانحروا في رحالكم، ووقفت ههنا، وعرفة كلها موقف، ووقفت ههنا، وجمع كلها موقف»**. رواه مسلم.

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اس جگہ قربانی کی ہے جبکہ منیٰ سارے کا سارا قربان گاہ ہے۔ لہٰذا اپنی اپنی جگہ پر قربانی کر لو۔ اور میں اس جگہ ٹھہرا ہوں جبکہ عرفہ(۱) سارے کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سارا موقف ہے اور میں اس جگہ ٹھہرا ہوں جبکہ جمع (مزدلفہ) سارے کا سارا موقف(۲) ہے- اسے مسلم نے روایت کیا-

(۱) عرفہ بصیغہ واحد آیا ہے- جو وادی عرفہ سے اس سامنے کے پہاڑ تک چلا گیا ہے جس سے بنو عامر کے باغات ملتے ہیں-

(۲) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں قربانی کے لئے کوئی جگہ مقرر نہیں کی نہ ہی عرفات اور مزدلفہ میں قیام کے لئے مقرر کی ہے- بلکہ اس میں لوگوں کے لئے خاصی گنجائش ہے کہ منیٰ میں کسی بھی جگہ قربانی کریں تو وہ درست ہے اور عرفات یا مزدلفہ میں کسی بھی جگہ وقوف کریں تو وہ بھی درست ہے- اور یہ سب کچھ آپ نے لوگوں پر تخفیف کی وضاحت کے طور پر فرمایا- کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جن لوگوں نے حج کیا ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے نہ اس جگہ قربانی کی جہاں آپ نے کی تھی اور نہ اس جگہ وقوف کیا جہاں آپ نے کیا تھا- کیونکہ حج میں آپ کے ہمراہ اتنے زیادہ لوگ تھے جن کا شمار بھی نہ ہو سکتا تھا- اور قربانی یا وقوف کے مقامات میں اتنی وسعت نہیں تھی- اور قربانی جو منیٰ میں ہی ہو سکتی ہے وہ قران والے' تمتع کرنے والے' احصار والے اور کسی بگاڑ کی وجہ سے قربانی دینے والے اور نفلی قربانی دینے والوں کی قربانی ہے- رہی وہ قربانی جو عمرہ کرنے والے پر لازم ہے تو اس کا مقام مکہ ہے- باقی تمام دم جو کفارہ کی صورت میں لازم ہوتے ہیں ان کا مقام حرم ہی ہے- اور اس میں اختلاف مشہور ہے-

۷۹۶- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ لما جاء إلى مكة دخلها من أعلاها، وخرج من أسفلها. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں آئے تو اوپر کی جانب سے داخل ہوئے اور جب گئے تو اس کی نچلی جانب سے نکلے- متفق علیہ(۱)

(۱) یہ فتح مکہ کے سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں داخلہ سے متعلق خبر ہے کہ آپ اس جگہ سے داخل ہوئے جسے کداء کہتے ہیں اور یہ وہ گھاٹی ہے جہاں سے اہل مکہ کے قبرستان معلاہ کی طرف اترتے ہیں- اس پر چڑھنا مشکل تھا جسے معاویہ نے ہموار کر دیا پھر عبدالملک نے پھر مہدی نے' پھر سلطان مصر المؤید کے زمانہ میں ۸۲۰ کی حدود میں ہموار کیا گیا- اور مکہ کی نچلی جانب وہ گھاٹی ہے جسے کدی کہتے ہیں اور باب شبیکہ کے پاس ہے- اہل مکہ کہتے ہیں: کھول اور داخل ہو اور بند کر اور نکل جا- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوپر والی گھاٹی سے داخل ہونے سے متعلق یہ روایت کی گئی ہے کہ "ابو سفیان نے کہا تھا: میں اس وقت تک اسلام نہیں لاؤں گا جب تک کداء سے گھوڑوں کا لشکر آتا نہ دیکھ لوں۔ اسے عباس نے پوچھا: یہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگا: کوئی چیز میرے دل پر نمودار ہو رہی ہے لیکن اس مقام سے اللہ گھوڑوں کا لشکر کبھی نہیں چڑھائے گا۔ ابن عباس نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گھاٹی سے داخل ہوئے تو میں نے ابو سفیان کو یہ بات یاد کرائی"۔ اور بیہقی میں ابن عمر کی حدیث میں یوں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: "حسان کیسے کہتے ہو؟ تو حسان نے یہ شعر پڑھا۔

علمت بنتی ان لم تروھا تثیر النقع مطلعھا کداء

میں اپنے بیٹوں کو گم پاؤں اگر تم نے نہیں دیکھا جو غبار اڑاتے ہوئے کداء کے مقام سے نمودار ہوتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے اور فرمایا: "اسی جگہ سے داخل ہو جاؤ جہاں سے حسان نے کہا ہے"۔

اور اس بات میں اختلاف ہوا کہ آیا وہیں سے داخل ہونا اور نکلنا مستحب ہے۔ جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے اور نکلے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ مستحب ہے اور جو یہ راستہ اختیار نہ کرے وہ نافرمان ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اس لئے تھا کہ کداء آپ کے راستہ پر پڑتا تھا۔ لہذا جس کے راستہ میں نہ پڑتا ہو اس کے لئے مستحب نہیں۔ اور ابن تیمیہ نے کہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم کہ بلند گھاٹی وہ ہے جو کنکریوں والے میدان (ابطح) سے نظر آتی ہے اور جب قبرستان سے انسان داخل ہو تو وہ شہر اور کعبہ کی جانب سے آتا ہے اور بغیر کسی طرف مڑنے کے سیدھا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ بخلاف اس شخص کے جو نچلی جانب سے داخل ہوتا ہے۔ کیونکہ شہر اور کعبہ کی طرف اس کی پشت ہوتی ہے۔ لہذا مستحب ہے کہ بیت اللہ سے ملنے حصہ موخر ہو تاکہ اس کی طرف اس کی چہرہ کی پشت نہ ہو۔

٧٩٧- وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، أنه كان لا يقدم مكة إلا بات بذي طوى، حتى يصبح، ويغتسل، ويذكر ذلك عن النبي ﷺ. متفق عليه.

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے متعلق روایت ہے کہ وہ جب بھی مکہ آتے تو صبح تک ذی (١) طوی میں رات گزارتے(٢) اور غسل کرتے اور اس بات کا ذکر کرتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا۔ متفق علیہ(٣)

(١) مکہ کے قریب ایک جگہ ہے۔

(٢) یعنی مکہ میں داخل ہونے سے پہلے والی رات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) اس حدیث میں مکہ میں دن کے وقت داخل ہونے کے استحباب پر دلیل ہے اور اکثر کا یہی قول ہے۔ اور سلف کی ایک جماعت اور بعض دوسرے اس بات کے قائل ہیں کہ رات اور دن برابر ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ جعرانہ میں رات کو مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ نیز اس حدیث میں مکہ میں داخل ہونے سے پہلے نہانے کے استحباب پر دلیل ہے۔

۶۹۸- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أنه كان يقبل الحجر الأسود، ويسجد عليه. رواه الحاكم مرفوعاً، والبيهقي موقوفاً.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ حجر اسود کو بوسہ دیتے اور اس کے اوپر سجدہ، کرتے تھے۔ اسے حاکم نے "مرفوعا" اور بیہقی نے "موقوفا" روایت کیا ہے(ا)۔

(ا) اور احمد نے حسن کہا ہے۔ اور ازرقی نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن عباد ابن جعفر تک روایت کیا اور کہا "میں نے ابن عباس کو دیکھا وہ آٹھویں ذی الحجہ کو آئے اور ان کے سر پر نقش و نگار والا پٹکا تھا۔ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ کیا' پھر چوما پھر سجدہ کیا' تین بار ایسا کیا۔ اور ابو یعلی نے ابوداؤد طیالسی کی جعفر بن عثمان مخزومی کی حدیث کو اپنی سند سے روایت کیا: میں نے محمد بن عباد بن جعفر کو دیکھا کہ اس نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ کیا اور کہا۔ میں نے اپنے خالو ابن عباس کو دیکھا کہ وہ حجر اسود کو بوسہ دیتے اور اس پر سجدہ کرتے تھے"۔ اور کہا کہ: "میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو حجر اسود کو بوسہ دیتے اور اس پر سجدہ کرتے دیکھا ہے"۔ اور انہوں نے کہا کہ: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا ہے"۔ اور عمر کی صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ "انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس سے سینہ چمٹایا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ تجھے عزت و اکرام کے قابل سمجھتے تھے"۔ اس کی تائید کرتی ہے گویا اس حدیث میں حجر اسود کو بوسہ دینے اور اس پر سجدہ کرنے کی مشروعیت ہے۔

۶۹۹- وعنه رضي الله تعالى عنه قال: أمرهم النبي ﷺ أن يرملوا ثلاثة أشواط ويمشوا أربعاً، وأن يمشوا بين الركنين. متفق عليه.

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم(ا) دیا کہ پہلے تین چکروں

(ا) اس حدیث کو حاکم اور بیہقی نے جعفر بن عبداللہ حمیدی کی حدیث سے متصل سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ جعفر بن عبداللہ کی حدیث کے متعلق ذہبی نے عقیلی سے نقل کیا کہ یہ وہم اور اضطراب ہے۔ اور مالک سے مروی ہے کہ حجر اسود پر سجدہ کرنا بدعت ہے اور جو بات متفق علیہ ہے وہ حجر اسود کو بوسہ دینا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں دونوں رکنوں کے درمیان(۲) دوڑیں اور باقی چار چکروں میں عام چال سے چلیں۔ متفق علیہ

(۱) یعنی ان صحابہ کو جو عمرۂ قضاء کے لئے آپ کے ہمراہ مکہ آئے تھے۔

(۲) اصل میں لفظ یرملوا آیا ہے یعنی طواف کے دوران پہلے تین چکروں میں دوڑیں۔

۷۰۰ - وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا ، أَنَّهُ كَانَ إِذَا طَافَ بِالْبَيْتِ الطَّوَافَ الأَوَّلَ خَبَّ ثَلاثاً ، وَمَشَى أَرْبَعاً (۲)

۷۰۱- وعنه رضي الله تعالى عنه قال: لم أر رسول الله ﷺ يستلم من البيت غير الركنين اليمانيين. رواه مسلم.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب وہ بیت اللہ کا پہلا طواف کرتے تو پہلے دو چکروں میں دو گام چلتے اور باقی چار میں عام چال سے چلتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ جب حج کا یا عمرہ کا طواف کرتے تو پہلے تین چکروں میں تیز چال سے بیت اللہ کے گرد چلتے اور باقی چار میں عام چال سے۔ متفق علیہ(۱)

(۱) رمل کی اصل اور اس کی حکمت وہی ہے جو ابن عباس سے مروی ہے کہ: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مکہ آئے تو مشرک کہنے لگے کہ تمہارے پاس ایسے لوگ آرہے ہیں جنہیں یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ تین چکروں میں رمل کریں اور دونوں رکنوں کے درمیان عام چال سے چلیں اور باقی چکروں کے متعلق بھی آپ نے رمل کرنے سے منع نہیں کیا مگر انہیں ان پر باقی رکھا"۔ اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔ اور مسلم کے الفاظ یوں ہیں۔ "مشرکین اس طرف بیٹھے تھے جو حطیم کے سامنے ہے۔ لہٰذا مشرک جب بھی صحابہ کو دیکھتے تو وہ رمل کر رہے ہوتے۔ مشرک کہنے لگے: "کیا یہ لوگ ہیں جن کے متعلق تمہارا خیال تھا کہ بخار نے انہیں کمزور کر دیا ہے۔ یہ تو اچھے بھلے مضبوط ہیں"۔ اور ایک دوسری روایت کے یہ لفظ ہیں: "یہ لوگ تو ہرنوں کی طرح ہیں"۔ یہ تھی رمل کی اصل اور اس کا سبب مشرکوں کو غصہ دلانا اور ان کی بات کا جواب تھا۔ اور یہ عمرہ قضاء کا قصہ ہے پھر یہ رمل سنت بن گیا۔ چنانچہ آپ نے حجۃ الوداع میں اس سبب کے زائل ہونے اور مکہ میں اسلام پھیل جانے کے باوجود رمل کیا۔ اور صحابہ نے دو رکنوں کے درمیان صرف اس لئے رمل نہ کیا کہ مشرک حطیم کی جانب قعیقعان کے پاس تھے اور وہ دونوں رکنوں کے درمیان صورت حال کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔

اور اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ دشمنوں کو غصہ دلانے کے لئے عبادت میں بھی کوئی ایسا کام کر لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ عمل میں اخلاص کے منافی نہیں بلکہ یہ اطاعت میں مزید اضافہ ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور جو کچھ بھی وہ دشمن سے چھینتے ہیں تو اس کے عوض ان کے لئے عمل صالح لکھا جاتا ہے"۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور انہی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ماسوائے دو یمانی رکنوں کے اور کسی چیز کو ہاتھ لگاتے نہیں دیکھا۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) جاننا چاہئے کہ بیت اللہ کے چار ارکان ہیں۔ رکن اسود پھر یمانی اور ان دونوں کو یمانی کہا جاتا ہے۔ اور انہیں تعلیقاً" یمانیان کہا جاتا ہے جیسے ماں باپ کو ابوین اور شمس و قمر کو قمرین کہا جاتا ہے اور باقی دو رکن شامی کہلاتے ہیں۔ رکن اسود میں دو فضیلتیں ہیں۔ ایک تو وہ ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر ہے دوسرے اس میں حجر اسود ہے اور یمانی میں صرف ایک ہی فضیلت ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر ہے۔ رہے شامی ارکان تو ان میں ان دونوں میں سے کوئی بھی فضیلت نہیں۔ اسی لئے اسود دو فضیلتوں کی بنا پر دو سنتوں بوسہ اور چھونے سے مختص ہوا۔ رہا یمانی تو اسے طواف کرنے والا چھوتا تو ہے لیکن بوسہ نہیں دیتا۔ کیونکہ اس میں ایک ہی فضیلت ہے۔ اور دونوں یمانی رکنوں کو چھونے کے استحباب پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ اور جمہور اس بات پر متفق ہیں کہ طواف کرنے والا باقی دونوں رکنوں کو نہ چھوئے۔ قاضی نے کہا کہ پچھلے دونوں رکنوں کو چھونے کے بارے میں بعض صحابہ اور تابعین کا اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف ختم ہو گیا اور اب سب اس بات پر متفق ہیں کہ انہیں نہ چھوا جائے اور زیر بحث حدیث میں بھی یہی کچھ ہے۔

۷۰۲ ـ وعن عمر رضي الله تعالى عنه أنه قبل الحجر الأسود، وقال: إني أعلم أنك حجر، لا تضر ولا تنفع، ولولا أني رأيت رسول الله ﷺ يقبلك ما قبلتك. متفق عليه.

عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور کہا: میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ دے سکتا ہے۔ اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ متفق علیہ(۱)

(۱) اور مسلم نے سوید بن غفلہ کی حدیث روایت کی کہ: میں نے عمر کو حجر اسود کو بوسہ دیتے اور اس سے چمٹتے دیکھا اور کہا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ تیری عزت و تکریم کرتے تھے۔ اور بخاری نے روایت کیا کہ ایک آدمی نے ابن عمر سے حجر اسود کو چھونے کے متعلق پوچھا تو ابن عمر نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے چھوتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے"۔ وہ کہنے لگا: بھلا دیکھو اگر ہجوم زیادہ ہو' بھلا دیکھو میں مغلوب ہو جاؤں؟ آپ نے کہا: یہ بھلا دیکھو تو تم اپنے پاس رکھو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے چھوتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے"۔ اور ازرقی نے عمر کی حدیث اس اضافہ(۱) کے ساتھ روایت کی: "اور علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: کیوں نہیں امیرالمومنین حجر اسود نقصان بھی پہنچا سکتا ہے اور فائدہ بھی۔ عمر نے کہا: وہ کیسے؟ علی نے کہا: کتاب اللہ میں یہ بات موجود ہے۔ عمر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے پوچھا: کتاب اللہ عزوجل میں یہ بات کہاں ہے؟ علی نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں کی اولاد نکالی اور انہیں اپنی جانوں پر گواہ بنا کر پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم گواہ ہیں"۔ علی نے کہا: جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اس کی صلب سے اس کی تمام اولاد نکال لی اور ان سے اقرار کرایا کہ وہ رب ہے اور وہ سب اس کے عاجز بندے ہیں۔ پھر ایک ورق میں ان کا یہ عہد لکھا اور اس وقت حجر اسود کو اس مقام پر رکھ دیا اور فرمایا: جو شخص ایمان کے ساتھ تیرے ساتھ وفا کرے تو تجھے قیامت کے دن گواہی دینا ہو گی"۔ راوی کہتا ہے کہ تب عمرؓ نے فرمایا: میں اللہ سے ایسی قوم میں رہنے سے پناہ مانگتا ہوں جس میں اے ابوالحسن تم نہ ہو"۔

اور طبری نے کہا، عمرؓ نے یہ بات صرف اس لئے کہی تھی کہ بتوں کی عبادت کی یاد ابھی لوگوں میں تازہ تھی۔ حضرت عمر کو خدشہ تھا کہ حجر اسود کو بوسہ دینے سے یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ بھی بعض پتھروں کی تعظیم ہی کی قسم ہے۔ جیسا کہ عرب دور جاہلیت میں ایسا سمجھتے تھے۔ عمر کی مراد یہ تھی کہ لوگ جان لیں کہ ان کا حجر اسود کو چھونا محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اتباع کی بنا پر ہے۔ اس لئے نہیں کہ پتھر فی نفسہ نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے جیسا کہ دور جاہلیت میں لوگوں کا بتوں کے متعلق عقیدہ تھا۔

۷۰۳۔ وعن أبي الطفيل رضي الله تعالى عنه قال: رأيت رسول الله ﷺ يطوف بالبيت، ويستلم الركن بمحجن معه، ويقبّل المحجن. رواه مسلم.

ابوالطفیل سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا ہے۔ آپ اپنی چھڑی(۱) سے حجر اسود کو چھوتے پھر چھڑی کو بوسہ دے لیتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۲)۔

(۱) اصل عبارت میں لفظ محجن آیا ہے بمعنی ایسی چھڑی یا لاٹھی جس کا سرا اوپر سے مڑا ہوا ہو۔

(۲) اور ترمذی وغیرہ نے ابن عباس کی حدیث کو روایت کیا اور ترمذی نے اسے حسن کہا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن حجر اسود کو لایا جائے گا اس کو دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گا اور زبان ہو گی جس سے بولے گا اور جس نے اسے چھوا ہو گا اس کی ٹھیک شہادت دے گا"۔ اور ازرقی نے(۲) صحیح سند کے ساتھ ابن عباس کی حدیث یوں روایت کی کہ: یہ حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے جس سے وہ اپنی خلقت سے مصافحہ کرتا ہے اور اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ابن عباس کی جان ہے کوئی بھی مسلم اس کے پاس کھڑے ہو کر اللہ سے کوئی چیز مانگے تو اللہ اسے وہ ضرور عطا کرتا ہے"۔

اور ابوالطفیل کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حجر اسود کو ہاتھ سے چھونے کے بجائے کسی آلہ جیسے چھڑی یا عصا سے چھونا اور پھر اس چھڑی وغیرہ کو بوسہ دینا بھی کفایت کرتا ہے۔ اسی طرح اگر ہاتھ سے چھوئے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہاتھ کو بوسہ دے لے۔ چنانچہ شافعی نے روایت کیا کہ ابن جریج نے عطاء سے پوچھا: کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کو حجر اسود کو اپنے ہاتھ سے چھو کر ہاتھ کو بوسہ دیتے دیکھا ہے؟ عطاء نے کہا: ہاں میں نے جابر ابن عبداللہ' ابن عمر' ابو سعید اور ابوہریرہ کو دیکھا ہے کہ وہ اسے چھوتے پھر اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیے لیتے۔ اور اگر ہجوم کی وجہ سے حجر اسود کو چھو نہ سکے تو اس کے سامنے کھڑا ہو جائے' اپنے ہاتھ بلند کرے اور تکبیر کہے جیسا کہ مروی ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! تم مضبوط آدمی ہو حجر اسود کے پاس دھکم دھکا نہ کرنا جس سے کمزوروں کو دکھ پہنچے۔ اگر خلوت میسر ہو تو اسے چھو لے ورنہ اس کے سامنے ہو کر تہلیل و تکبیر کہہ لے۔ اسے احمد اور ازرقی نے روایت کیا۔ اور جب ہاتھ سے اشارہ کرے تو پھر ہاتھ کو بوسہ نہ دے۔ کیونکہ بوسہ تو صرف حجر اسود کو دینا چاہئے یا اس چیز کو جو اسے چھوئے۔

۷۰۴۔ وعن يعلى بن أمية رضي الله تعالى عنه قال: طاف رسول الله ﷺ مضطبعاً ببرد أخضر. رواه الخمسة إلا النسائي، وصححه الترمذي.

یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سبز چادر سے اضطباع(۱) کر کے طواف کیا۔ اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی نے اسے صحیح کہا۔

(۱) اضطباع' ضبع سے افتعال کا باب ہے۔ ضبع بمعنی بغل ہے اور اضطباع کی یہ صورت ہے کہ چادر کے وسط کو دائیں بغل کے نیچے کر کے اس کے باقی حصہ کو بائیں کندھے پر ڈالا جائے۔ نہایہ میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ اور ابو داؤد میں ابن عباس سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضطباع کیا پھر تکبیر کہی اور حجر اسود کو چھوا اور تکبیر کہی۔ پھر پہلے تین چکروں میں رمل کیا۔ جب رکن یمانی پر پہنچے اور قریش چھپ گئے تو عام چال چلے۔ پھر جب قریش نظر آنے لگے تو صحابہ رمل کرنے لگے اور قریش کہنے لگے کہ یہ لوگ تو ہرنوں کی طرح ہیں"۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ پھر یہ رمل سنت بن گیا۔ اور پہلی بار عمرہ قضاء میں اضطباع کیا گیا تاکہ رمل

---

(۱) یہ اضافہ بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا اور اسے ضعیف کہا ہے اور حاکم نے اسے ابو سعید کی حدیث سے روایت کیا اور اس کی سند میں ابو ہرون عبدی ہے جس کے متعلق ذہبی نے کہا: کہ ساقط الاعتبار ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے کہا: انتہائی ضعیف ہے اور احمد نے کہا: یہ کوئی چیز نہیں اور نسائی نے کہا: یہ قابل اعتبار نہیں اور جوزجانی نے کہا: جھوٹا دغا باز ہے۔

(۲) ازرقی نے ایک کتاب تاریخ مکہ لکھی ہے جو من گھڑت خرافات اور بہت سی جھوٹی سچی خبروں اور واقعات پر مشتمل ہے ہر شخص کو ایسی فضول کتابوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں مد ثابت ہو اور مشرک مسلمانوں کی قوت کو دیکھ سکیں۔ پھر یہ مستقل سنت بن گیا۔ اور چاہیئے کہ ساتوں چکروں میں اضطباع کرے پھر جب اس کا طواف پورا ہو جائے تو اپنا کپڑا درست کرے اور طواف کی رکعتوں میں اضطباع نہ کرے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صرف پہلے تین چکروں میں اضطباع کرے۔

۷۰۵- وعن أنس رضي الله تعالى عنه قال: كان يهل منا المهل فلا ينكر عليه، ويكبر منا المكبر فلا ينكر عليه. متفق عليه.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ تلبیہ پکارتے تھے اور بعض اللہ اکبر کہتے تھے۔ لیکن کوئی بھی دوسرے کو برا نہیں کہتا تھا۔ متفق علیہ(۱)

(۱) پہلے گزر چکا ہے کہ اھلال کا معنی بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور تلبیہ کا وقت احرام باندھنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور حلال ہونے تک رہتا ہے حج کی صورت میں اس کا آخری وقت جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک ہے اور عمرہ کی صورت میں طواف تک ہے۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص تلبیہ کے بجائے تکبیر کہے تو اس پر کوئی نکیر نہیں بلکہ یہ بھی سنت ہے کیونکہ انس کی مراد یہ ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایسا کیا کرتے تھے۔ لیکن آپ نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ حدیث اس صبح کے وقت کے بیان میں ہے جب منیٰ سے عرفات جاتے ہیں اور اس میں اس شخص کا رد بھی ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ یوم عرفہ کی صبح کے بعد تلبیہ ختم ہو جاتا ہے۔

۷۰۶- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: بعثني النبي ﷺ في الثقل، أو قال: في الضعفة، من جمع، بليل. متفق عليه.

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مسافروں کے سامان(۱) یا کمزور حاجیوں کے ساتھ رات کو ہی مزدلفہ(۲) سے منیٰ بھیج دیا تھا۔ متفق علیہ(۱)

(۱) یہ راوی کا شک ہے۔

(۲) اصل میں لفظ جمع آیا ہے جو مزدلفہ کے لئے اسم علم ہے۔ کیونکہ آدم اور حوا کو جب جنت سے نکالا گیا تو وہ یہیں(۱) جمع ہوئے تھے۔ جیسا کہ نہایہ میں ہے اور سنت سے یہ معلوم ہے کہ جمع میں رات گزارنا ضروری ہے۔ اور وہاں سے صبح کی نماز کے بعد واپس آنا چاہیئے۔ پھر مشعرالحرام میں آکر ٹھہرے اور جب صبح کی روشنی خوب پھیل جائے تب طلوع آفتاب سے پیشتر منیٰ کو روانہ ہو جبکہ جاہلیت میں مزدلفہ سے سورج نکل آنے کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واپس ہوتے اور کہتے: بشیر (پہاڑ) روشن ہو جاتا کہ ہم غات گری کریں- چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی- ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ابن عباس کی یہ اور اس جیسی دوسری احادیث کمزور لوگوں کے لئے رخصت پر دلالت کرتی ہیں جو وہاں پوری رات نہ گزار سکیں- اور کمزوروں میں اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے مطابق عورتیں بھی شامل ہیں کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظعن کو رخصت دی"- اور "ظعن" ظعینہ کی جمع ہے بمعنی وہ عورت جو ہودج میں سوار ہو- پھر اس لفظ کا اطلاق صرف عورت پر بھی ہونے لگا اور صرف ہودج پر بھی (نہایہ)

٧٠٧- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: استأذنت سودة رسول الله ﷺ ليلة المزدلفة أن تدفع قبله، وكانت ثبطة، يعني ثقيلة، فأذن لها. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مزدلفہ کی رات سودہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وقت سے پہلے مزدلفہ سے منیٰ آنے کی اجازت طلب کی اور وہ بھاری بھرکم عورت تھی تو آپؐ نے اسے اس کی اجازت دے دی- متفق علیہ

اس حدیث میں مزدلفہ سے منیٰ کو فجر سے پہلے روانہ ہونے پر دلیل ہے بشرطیکہ کوئی عذر موجود ہو جیسا کہ "وہ بھاری بھرکم تھیں" سے معلوم ہوتا ہے-

اور جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ مزدلفہ میں رات گزارنا واجب ہے' ورنہ دم لازم آتا ہے- اور دوسرے کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے اگر چھوڑے تو فضیلت فوت ہو جاتی ہے مگر اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ دم اور رات کا زیادہ حصہ وہاں گزارے- بعض کہتے ہیں کہ آدھی رات سے ایک ساعت زیادہ ہو تو کافی ہے اور دوسرے بھی اقوال ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہیں رات گزاری اور فجر کی نماز پڑھی- اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ: "مجھ سے مناسک حج سیکھ لو"-

٧٠٨- وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: قال لنا رسول الله ﷺ: «لا ترموا الجمرة حتى تطلع الشمس». رواه الخمسة إلا النسائي، وفيه انقطاع.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ سورج چڑھنے سے

---

(۱) یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں اور ظاہر یہ ہے کہ مزدلفہ کا نام جمع اس لئے ہوا کہ یہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھی جاتی ہیں-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے کنکریاں نہ مارو۔ اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا اور اس کی سند منقطع ہے(ا)۔

(ا) اس لئے کہ اس کی سند میں حسن عرنی بجلی کوفی ہے ثقہ ہے۔ مسلم نے اس سے احتجاج کیا ہے اور بخاری نے اس کا شاہد لیا ہے مگر ابن عباس سے اس کی یہ حدیث منقطع ہے۔ احمد نے کہا کہ حسن عرنی نے ابن عباس سے سماعت نہیں کی۔

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے کا وقت سورج نکلنے کے بعد ہے۔ اگرچہ رمی کرنے والے کو مزدلفہ میں رات نہ رہنے اور پہلے منیٰ کو چلے آنے کی اجازت دی گئی ہو۔ اور اس مسئلہ میں چار اقوال ہیں۔

پہلا یہ کہ قادر اور عاجز دونوں کے لئے آدھی رات کے بعد کنکریاں مارنا جائز ہے۔ احمد اور شافعی اسی کے قائل ہیں۔

دوسرا یہ کہ علی الاطلاق فجر کے بعد مارنا جائز ہے۔ یہ ابوحنیفہ کا قول ہے۔

تیسرا یہ کہ قادر کو طلوع فجر سے پہلے مارنا جائز نہیں اور جو عذر والا ہو وہ آدھی رات کے بعد مار سکتا ہے یہ ہادویہ کا قول ہے۔

چوتھا ثوری اور نخعی کا قول ہے کہ قادر طلوع آفتاب سے پہلے نہیں مار سکتا اور دلیل کے لحاظ سے یہی قول سب سے قوی اور اقوال میں راجح ہے۔

٧٠٠- وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: أرسل النبي ﷺ بأم سلمة ليلة النحر، فرمت الجمرة قبل الفجر، ثم مضت، فأفاضت. رواه أبو داود، وإسناده على شرط مسلم.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو قربانی کی رات کو ہی منیٰ بھیج دیا تھا۔ اس نے فجر سے پہلے کنکریاں ماریں پھر مکہ گئیں اور طواف افاضہ کیا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔

اس حدیث میں فجر سے پہلے کنکریاں مارنے کے جواز پر دلیل ہے۔ کیونکہ یہ تو واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات مخفی نہیں تھی مگر آپ نے سکوت اختیار کیا۔ اور اس سے ابن عباس کی حدیث معارض ہے اور ان میں تطبیق کی یہ صورت ہے کہ عذر والے کے لئے فجر سے پہلے کنکریاں مارنا جائز ہے اور ابن عباس کے لئے کوئی عذر نہ تھا۔ ہادویہ اسی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ قادر کے لئے فجر سے پہلے کنکریاں مارنا جائز نہیں اور دوسرے آدھی رات کے بعد مار سکتے ہیں۔ الا یہ کہ انہوں نے قادر کو طلوع آفتاب سے پہلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کنکریاں مارنے کی اجازت دی ہے۔ اور شافعی قادر و عاجز دونوں کے لئے آدھی رات کے بعد کنکریاں مارنے کے جواز کے قائل ہیں۔ اور ابن عباس کی گزشتہ حدیث بھی۔ اس حدیث میں اگرچہ انقطاع ہے تاہم آپؐ کا فعل بھی اس کی تائید کرتا ہے اور یہ قول بھی "مجھ سے اپنے مناسک حج سیکھ لو"۔ الحدیث۔ اور اس بارے میں علماء کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔

۷۰۔ وعن عروة بن مضرس رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«من شهد صلاتنا هذه، يعني بالمزدلفة، فوقف معنا حتى ندفع، وقد وقف بعرفة قبل ذلك ليلاً أو نهاراً، فقد تم حجه، وقضى تفثه»**. رواه الخمسة، وصححه الترمذي وابن خزيمة.

عروہ بن مضرس(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے مزدلفہ میں ہماری اس نماز(۲) میں شمولیت کر لی۔ اور آگے کوچ کرنے سے پہلے ہمارے ساتھ یہاں مزدلفہ میں وقف کیا۔ اور اس سے پہلے رات کو یا دن کو عرفات میں وقوف کیا اس کا حج پورا ہو گیا۔ اور اس کے ضروری کام پورے ہوئے۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا(۳)۔

(۱) آپ کوفی ہیں۔ حجتہ الوداع میں حاضر تھے۔ ان کی حدیث کا پہلا حصہ یوں ہے: "میں موقف یعنی مزدلفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! میں جبل طے سے آیا ہوں۔ اپنا اندوختہ کھا چکا اور خود تھک گیا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا جہاں وقوف نہ کیا ہو۔ کیا حج کا کوئی کام میرے ذمہ باقی ہے؟ پھر یہ حدیث ذکر کی۔

(۲) یعنی صبح کی نماز میں۔

(۳) اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ حج تب ہی پورا ہوتا ہے جب مزدلفہ میں وقوف کرے اور صبح کی نماز میں حاضر ہو تا آنکہ امام وہاں سے واپس ہو اور اس سے بیشتروہ رات یا دن کا کچھ حصہ عرفہ میں وقوف کر چکا ہو۔ نیز اس پر دلیل ہے کہ عرفہ کے دن زوال کے بعد یا قربانی والی رات کا عرفہ میں وقوف کفایت کرتا ہے اور جب اس نے یہ کام کر لئے تو اس کے حج کے مناسک پورے ہو گئے۔ اور بعض کہتے ہیں وقضى تفثه سے مراد بال اتروانا ہے اور اس شرط کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص یہ کام نہ کرے اس کا حج پورا نہیں ہوتا۔ عرفہ کا وقوف تو مجمع علیہ ہے رہا عرفہ کا وقوف تو جمہور کا مذہب یہ ہے کہ حج پورا ہو جاتا ہے اور جو نہ کر سکے اس پر دم لازم آتا ہے۔ اور ابن عباس اور سلف کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ مزدلفہ کا وقوف بھی عرفہ کی طرح رکن ہے۔ اور یہی اس کی دلیل کا مفہوم ہے۔ اور اس پر نسائی کی یہ روایت دلالت کرتی ہے۔ "جس نے مزدلفہ میں وقوف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کیا اس کا حج نہیں"۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل بھی اور یہ قول بھی "مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو"۔

اور جمہور نے اس کا یہ جواب دیا کہ عروہ کی حدیث سے مراد یہ ہے کہ جس شخص نے یہ تمام کام کر لئے تو اس کا حج پورا ہوا اور تکمیل کو پہنچ گیا اور اس پر وہ حدیث ولالت کرتی ہے جسے احمد' اہل سنن' ابن حبان' حاکم' دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرفات میں کھڑے تھے کہ نجد کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے "حج کی کیا کیفیت ہے؟" آپ نے فرمایا: حج عرفہ ہے۔ جو شخص مزولفہ کی رات کو صبح کی نماز سے پہلے یہاں پہنچ گیا اس کا حج پورا ہو گیا۔ اور ابو داؤد کی روایت میں ہے۔ "جو شخص طلوع فجر سے پہلے عرفہ پہنچ گیا' اس کا حج ہو گیا"۔ اور دار قطنی کی روایت میں ہے "حج عرفہ ہے' حج عرفہ ہے"۔ علماء کہتے ہیں کہ مراد کے لحاظ سے یہ صحیح ہے۔ اور اس اضافے کا "جو مزولفہ نہ پہنچا اس کا حج نہیں ہوا"۔ انہوں نے یہ جواب دیا کہ اس میں اس تاویل کا احتمال ہے کہ اس کا حج پوری فضیلت والا نہیں ہوتا۔ اور یہ جواب بھی کہ اس روایت کو ابو جعفر عقیلی نے منکر کہا ہے اور اس کے منکر ہونے پر ایک رسالہ تصنیف کیا ہے۔ اور آیت کا جواب یہ دیا کہ اس میں صرف مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرنے کا حکم ہے یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ یہ حج کا رکن ہے اور یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل واجب کی وضاحت ہے جس سے فضیلت کی تکمیل ہوتی ہے۔

۷۱۱۔ وعن عمر رضي الله تعالى عنه قال: إن المشركين كانوا لا يفيضون حتى تطلع الشمس، ويقولون: أشرق ثبير! وإن النبي ﷺ خالفهم، ثم أفاض قبل أن تطلع الشمس. رواه البخاري.

عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مشرکین سورج چڑھنے کے بعد واپس (۱) آیا کرتے تھے اور کہتے: اے ثبیر (۲) تو روشن ہو جا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور سورج چڑھنے سے پہلے واپس آ گئے۔ اسے بخاری نے روایت کیا (۳)۔

(۱) یعنی مزولفہ سے۔

(۲) ثبیر - مکہ کا بہت بڑا اور مشہور پہاڑ جو منیٰ کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پڑتا ہے۔

(۳) اور ایک روایت میں کیما نغیر کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اسے اسماعیلی اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔ اور نغیر اغارۃ سے ہے یعنی جلدی سے دشمن پر پل پڑنا۔ اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ سورج چڑھنے سے پہلے مزولفہ سے واپس منیٰ کو آنا مشروع ہے اور جابر کی حدیث میں یہ الفاظ پہلے گزر چکے ہیں۔ "حتیٰ کہ صبح کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روشنی خوب پھیل جاتی"۔

۱۲۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، وأسامة بن زيد قالا: لم يزل النبي ﷺ يلبي حتى رمى جمرة العقبة. رواه البخاري.

ابن عباس اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ پکارتے رہتے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

اس حدیث میں قربانی کے دن حتیٰ کہ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک لبیک پکارتے رہنے کی مشروعیت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا پہلی کنکری مارنے پر تلبیہ ختم کر دے یا فراغت کے بعد؟ جمہور پہلی بات کی طرف گئے ہیں اور احمد دوسری کی طرف۔ اور اس پر دلالت نسائی کی روایت میں ہے۔ "آپ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک لبیک کہتے رہے اور جب واپس لوٹے تب تلبیہ چھوڑا"۔ نیز ابن خزیمہ کی روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے اور کہا یہ صحیح حدیث ہے جو ابن عباس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ عرفات سے واپس لوٹا۔ آپ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ پکارتے ہی رہے۔ آپ ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہتے پھر آخری کنکری پر تلبیہ ختم کر دیا"۔ یہ روایت زیر بحث حدیث کے الفاظ "حتیٰ کہ جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماریں"۔ کی مراد کی وضاحت کرتی ہیں۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کب تلبیہ چھوڑے اور یہ احادیث اس وقت کی وضاحت کر رہی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کب تلبیہ چھوڑا تھا۔

۱۳۔ وعن عبد الله بن مسعود رضي الله تعالى عنه، أنه جعل البيت عن يساره، ومنى عن يمينه، ورمى الجمرة بسبع حصيات، وقال: هذا مقام الذي أنزلت عليه سورة البقرة. متفق عليه.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارتے وقت بیت اللہ کو اپنی بائیں جانب اور منیٰ کو دائیں جانب رکھا اور جمرہ عقبہ کو سات کنکریاں ماریں اور کہا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں سورۃ البقرہ نازل ہوئی تھی۔ متفق علیہ(۱)

(۱) اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ کنکریاں مارنے کی یہ کیفیت واجب نہیں بلکہ صرف مستحب ہے۔ اور ابن مسعود نے یہ بات اس شخص کے رد میں کہی تھی جو اوپر سے کنکریاں مار رہا تھا۔ اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ باقی جمروں کو اوپر سے کنکریاں ماری جائیں۔ اور سورہ بقرہ کا بالخصوص اس لئے ذکر کیا کہ حج کے بہت سے اعمال اس سورہ میں مذکور ہیں۔ اس لئے کہ یہ سورہ دینداری اور معاملات کے اکثر امور پر مشتمل ہے۔ اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیث میں یہ جواز ہے کہ سورہ بقرہ کہا جاسکتا ہے۔ خلاف اس شخص کے جو سورہ بقرہ کہنا مکروہ سمجھتا ہے حالانکہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

۷۱۴۔ وعن جابر رضي الله تعالى عنه قال: رمى رسول الله ﷺ الجمرة يوم النحر ضحى، وأما بعد ذلك، فإذا زالت الشمس. رواه مسلم.

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قربانی کے دن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کے وقت جمرہ کو کنکریاں ماریں مگر دوسرے اور تیسرے دن اس وقت ماریں جب سورج ڈھل چکا تھا۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے کے وقت پر کلام پہلے گزر چکا ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ تینوں جمروں کو کنکریاں مارنے کا وقت سورج ڈھل جانے کے بعد ہے اور جمہور علماء اسی بات کے قائل ہیں۔

۷۱۵۔ وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، أنه كان يرمي الجمرة الدنيا بسبع حصيات، يكبر على إثر كل حصاة، ثم يتقدم، ثم يسهل، فيقوم، فيستقبل القبلة، فيقوم طويلاً، ويدعو، فيرفع يديه، ثم يرمي الوسطى، ثم يأخذ ذات الشمال، فيسهل، ويقوم مستقبل القبلة، ثم يدعو، فيرفع يديه، ويقوم طويلاً، ثم يرمي جمرة ذات العقبة، من بطن الوادي، ولا يقف عندها، ثم ينصرف، فيقول: هكذا رأيت رسول الله ﷺ يفعله. رواه البخاري.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ قریبی(۱) جمرہ (جمرہ عقبہ) کو سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارنے پر تکبیر کہتے۔ پھر آگے بڑھتے اور میدان میں آکر کھڑے ہو جاتے اور قبلہ رخ ہو کر دعا کرتے اور اپنے ہاتھ اٹھاتے اور دیر تک کھڑے رہتے۔ پھر جمرہ وسطی کو کنکریاں مارتے پھر بائیں(۲) جانب چلے جاتے اور میدان میں جا کر قبلہ رخ کھڑے ہو جاتے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور تا دیر کھڑے رہتے۔ پھر جمرہ ذات عقبہ کو بطن وادی سے کنکریاں مارتے اور اس کے پاس کھڑے نہ ہوتے۔ پھر واپس چلے آتے اور کہتے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا(۳) ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

(۱) یعنی منیٰ میں مسجد خیف کے قریب۔ اور وہ پہلا جمرہ ہے جسے قربانی کے دوسرے دن کنکریاں مارتے ہیں۔

(۲) یعنی اپنی بائیں جانب چلتے تاکہ ایسے مقام پر کھڑے ہو کر دعا کر سکیں کہ کوئی کنکری آپ تک نہ پہنچے۔

(۳) اس میں بھی وہی بات ہے جس پر گزشتہ دلائل دلالت کرتے ہیں کہ سات کنکریاں ماری جائیں اور ہر جمرہ کو کنکری مارتے وقت تکبیر کہی جائے۔ البتہ اس میں زائد یہ ہے کہ دونوں جمروں کو کنکریاں مارنے کے بعد قبلہ رو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھڑا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے تادیر دعائیں کرے۔ اس دیر کی مقدار اس روایت سے معلوم ہوتی ہے جسے ابن ابی شیبہ نے صحیح سند سے روایت کیا کہ: ابن عمر جمروں کے پاس سورہ بقرہ پڑھنے کی مقدار کھڑے رہتے اور دعاء کے وقت اپنے ہاتھ اٹھاتے۔ ابن قدامہ نے کہا کہ ہم مالک کے سوا اس میں کسی کا اختلاف نہیں جانتے۔ مالک سے مروی ہے کہ "وہ دعاء کے وقت اپنے ہاتھ نہ اٹھائے"۔ جب کہ ابن عمر کی حدیث مالک کے قول کے خلاف ہے۔

۷۱۲۔ وعنه أن رسول الله ﷺ قال: «اللهم ارحم المحلقين»، قالوا: والمقصرين، يا رسول الله! قال في الثالثة: «والمقصرين». متفق عليه.

اور انہی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا اللہ! سر منڈانے(۱) والوں پر رحم فرما۔ صحابہ(۲) کہنے لگے: یارسول اللہ! اور بال کتروانے والوں(۳) پر بھی۔ اور آپ نے تیسری بار دعا کرتے وقت "اور بال کترانے والوں پر بھی" فرمایا۔ متفق علیہ(۴)۔

(۱) یعنی جنہوں نے حج یا عمرہ سے حلال ہونے کے وقت اپنے سر منڈائے۔

(۲) مصنف نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ کس شخص کے سوال کے جواب میں اور کیسی بحث کے بعد آپ نے یہ کہا تھا۔

(۳) یہ تلقین کا عطف ہے جیسے اس آیت میں قال ومن کفر دو وجہوں سے ایک وجہ کی بناء پر ہے گویا کہنے والے نے یوں کہا تھا: "اور بال کترانے والوں پر بھی رحم فرما"۔

(۴) اس کا ظاہر یہ ہے کہ آپ نے سر منڈانے والوں کے لئے تین بار دعا کی اور تیسری بار میں بال کترانے والوں کو بھی شامل کیا اور دوسری روایات میں ایسا ہی ہے۔ پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کب کی تھی؟ بعض کہتے ہیں کہ حدیبیہ کے عمرہ میں کی تھی اور امام الحرمین وثوق سے یہی بات کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں کی تھی اور نووی نے اسی کی تائید کی اور کہا۔ یہی قرین قیاس ہے اور ابن دقیق العید نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ مصنف نے کہا کہ روایات کی تائید سے یہی بات متعین ہوتی ہے۔

اور یہ حدیث سر منڈانے اور بال کترانے کی مشروعیت پر دلیل ہے اور اس بات پر بھی کہ سر منڈانا افضل ہے۔ اور ہادویہ' مالک اور احمد کے نزدیک پورا سر منڈانا واجب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ افضل تو یہی ہے مگر تھوڑا سر منڈانا بھی کفایت کرتا ہے۔ بعض چوتھا حصہ کہتے ہیں بعض نصف اور بعض کہتے ہیں کہ کم از کم تین بال منڈانا واجب ہے اور بعض ایک بال کہتے ہیں۔ اور بال کترانے کی تفصیل میں بھی ایسا ہی اختلاف ہے اس کترانے کی مقدار چیونٹی کے برابر بھی ہو سکتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے کم بھی کفایت کر سکتا ہے اور یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب کچھ مردوں کے حق میں ہے۔

علاوہ ازیں حاجی اور عمرہ کرنے والے کے حق میں بال کترانے کی نسبت سر منڈانے میں زیادہ فضیلت ہے۔ رہا حج تمتع کرنے والا تو اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں اختیار دیا ہے جیسا کہ بخاری کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: "پھر وہ سر منڈائیں یا بال کترائیں"۔ جس کا ظاہر یہ ہے کہ متمتع کے حق میں سر منڈانا اور بال کترانا دونوں برابر ہیں اور مصنف نے فتح میں ان دونوں فرق کرتے ہوئے کہا۔ اگر اس کے بال چھوٹے چھوٹے ہوں تو سر منڈائے ورنہ بال کترائے تاکہ حج کے موقعہ پر سر منڈا سکے اور فتح میں اس فرق کی وجہ تفصیل سے بیان کی ہے۔

رہا عورتوں کا مسئلہ تو بالاجماع ان کے حق میں صرف بال کترانا مشروع ہے۔ چنانچہ ابوداؤد نے ابن عباس کی حدیث روایت کی کہ "عورتیں سر نہ منڈائیں بلکہ وہ صرف بال کتروائیں"۔ اور ترمذی نے علی کی حدیث روایت کی کہ "آپ نے عورتوں کو سرمنڈانے سے منع کر دیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اگر عورت سر منڈالے تو اس کا حج ہو جائے گا؟ بعض شافعیہ کہتے ہیں کہ حج تو ہو جائے گا لیکن یہ اس کے لئے مکروہ ہے۔

٧٠- وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله تعالى عنهما، أن رسول الله ﷺ وقف في حجة الوداع، فجعلوا يسألونه، فقال رجل: لم أشعر، فحلقت قبل أن أذبح، قال: «**اذبح ولا حرج**»، وجاء آخر فقال: لم أشعر، فنحرت قبل أن أرمي، قال: «**ارم ولا حرج**»، فما سئل يومئذ عن شيء قدم ولا أخر إلا قال: «**افعل ولا حرج**». متفق عليه.

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجتہ الوداع (۱) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور لوگ آپ سے مسئلے پوچھنے لگے۔ ایک شخص(۲) نے کہا: مجھے معلوم نہ تھا اور میں نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈا لیا ہے۔ آپ نے فرمایا: جا قربانی(۳) ذبح کر کوئی حرج نہیں۔ پھر ایک اور آدمی آکر کہنے لگا: مجھے معلوم نہ تھا اور میں نے جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی ذبح کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا: جا کنکریاں مار لے، کوئی حرج نہیں۔ غرض اس دن جس نے بھی کسی چیز کی تقدیم و تاخیر کے متعلق آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: جا اب کر لے کوئی حرج نہیں۔ متفق علیہ(۴)۔

(۱) یعنی قربانی کے دن زوال کے بعد جب آپ جمرہ کے نزدیک اپنی ساری پر خطبہ دے رہے تھے۔
(۲) مصنف نے کہا کہ میں کوشش بسیار کے باوجود اس شخص کے نام سے واقف نہیں ہو سکا۔
(۳) یعنی قربانی کا جانور اور وہ دم جو سر منڈانے سے پڑتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۴) جاننا چاہئے کہ قربانی کے دن حاجی کے ذمہ چار کام ہوتے ہیں۔ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنا' قربانی کا جانور ذبح کرنا' سرمنڈانا یا بال کتروانا اور طواف افاضہ۔ ان کاموں میں یہی ترتیب مشروع ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ آئے تو جمرہ عقبہ کے پاس آکر اسے کنکریاں ماریں پھر منیٰ میں اپنی قیام گاہ پر آئے۔ پھر قربانی کی۔ پھر حجام سے سر مونڈنے کو کہا' حاجی کے کاموں کی اس ترتیب میں مطلقاً" کوئی نزاع نہیں۔ البتہ قارن کے بارے میں بعض فقہاء نے اختلاف کیا ہے کہ اسے طواف زیارت سے پہلے سر نہ منڈانا چاہئے۔ اور یہ حدیث ان کاموں میں تقدیم و تاخیر کے جواز پر دلیل ہے اور جس سے تقدیم و تاخیر ہو جائے اسے نہ کوئی گناہ ہے نہ اس پر کوئی تنگی ہے۔ جبکہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ شافعی' جمہور سلف' اصحاب الحدیث فقہاء اور علماء کا مذہب یہ ہے کہ تقدیم و تاخیر جائز ہے اور جس سے تقدیم و تاخیر ہو جائے اسے دم نہیں پڑتا۔ کیونکہ آپ نے سائل کو ولا حرج فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس میں گناہ اور فدیہ دونوں کی نفی ہے۔ کیونکہ حرج یا تنگی ان دونوں کو شامل ہے۔ طبری نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرج کو صرف اس لئے ختم کیا کہ کام کفایت کر سکتا ہے اگر کفایت نہ کرتا تو آپ اعادہ کا حکم دیتے۔ کیونکہ حج کے ضروری احکام حاجی سے جہل اور نسیان کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتے۔ جیسا کہ اگر وہ کنکریاں مارنا یا ایسا ہی کوئی دوسرا کام چھوڑ دے تو بھول یا لاعلمی کی بنا پر ترک سے وہ گنہگار تو نہ ہو گا لیکن اس پر اعادہ واجب ہو گا اور یہ تو واضح ہے کہ جاہل اور بھولنے والے سے تو فدیہ ساقط ہو جاتا ہے لیکن عالم سے نہیں ہوتا۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ عالم کو چھوڑ کر جاہل اور بھولنے والے سے فدیہ کے سقوط کا قول اس لحاظ سے قوی ہے کہ ارشاد نبوی "مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو"۔ کے مطابق حج کے مناسک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اتباع واجب ہے۔ اور تقدیم و تاخیر سے رخصت والے سوالات سے متعلق سائل نے ساتھ ہی یہ کہہ دیا تھا کہ "مجھے معلوم نہ تھا"۔ گویا حکم اس حالت سے مختص ہو گیا اور آپ کا قول "لا حرج" بھولنے والے اور جاہل سے گناہ یا دم کی نفی پر محمول ہو گا۔ اور عامد (دانستہ طور پر کرنے والا" کا حکم اصل پر باقی رہے گا جو حج کے افعال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا وجوب ہے اور جو عامد اور دوسروں میں تفرقہ کے قائل ہیں ان کی یہی اصل ہے۔ علاوہ ازیں یہ قاعدہ ہے کہ جو حکم جس ترتیب سے بیان ہوا ہے اسے اسی طرح کرنا معتبر ہو گا اور اسے نظر انداز کرنا جائز نہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ نہ جاننا ایسا وصف ہے جو عدم تکلیف اور مواخذہ نہ ہونے کو مناسب ہے اور حکم اسی سے متعلق ہے لہٰذا اسے نظر انداز کر کے عامد کو بھی اس سے ملا دینا ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ رہا راوی کا قول فما سئل عن شیء الی آخرہ جس سے یہی سمجھ آتی ہے کہ اس ترتیب کا لحاظ قطعاً" غیر ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے تو یہ راوی کا اس واقع سے متعلق خبر دینا ہے جس کا آپ سے سوال کیا گیا۔ اور یہ سائل کے حال کی مناسبت سے مطلق ہے۔ اور مطلق دو باتوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کسی ایک خاص بات پر دلالت نہیں کرتا۔ للذا دانستہ تقدیم و تاخیر کرنے میں کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔

۷۱۸۔ وعن المسور بن مخرمة رضي الله تعالى عنهما، أن رسول الله ﷺ نحر قبل أن يحلق، وأمر أصحابه بذلك. رواه البخاري.

مسور بن مخرمہ(۱) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرمنڈانے سے پہلے قربانی کی اور اپنے صحابہ کو بھی یہی حکم دیا(۲)۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔

(۱) آپ زہری قرشی ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اس وقت آپ آٹھ سال کے تھے۔ آپؐ سے سنا بھی اور حفظ بھی کیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ سے مکہ منتقل ہو گئے۔ اور یزید کے لشکر کے محاصرہ تک وہیں رہے۔ آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کو منجنیق کا ایک پتھر لگا جس سے آپ ۶۴ ہجری کی ابتداء میں شہید ہو گئے۔ آپ متدین اور اہل فضل سے تھے۔

(۲) اس حدیث سے سرمنڈانے سے پہلے قربانی کرنے پر دلیل ہے۔ اور تھوڑا پہلے گزر چکا ہے کہ ذبح سے پہلے سرمنڈانا مشروع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں مسور کی حدیث محض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی خبر کے طور پر ہے جب آپ عمرہ حدیبیہ میں گھیر لئے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذبح کر کے حلال ہو گئے۔ اور بخاری نے اس پر یہ باب باندھا ہے "حصر کی صورت میں حلق سے پہلے قربانی کا باب" اور بخاری نے یہ اشارہ کر دیا کہ یہ ترتیب محصر سے خاص اور اس کے لئے واجب ہے کیونکہ اس نے اسی معنی میں اسے روایت کیا ہے۔ نیز اسے کتاب الشروط میں بڑی تفصیل سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے کہ: "آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اٹھو' قربانی کرو' پھر سرمنڈاؤ"۔ نیز اس میں ام سلمہ کا قول ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ: آپ باہر نکلیں اور کسی سے کوئی بات نہ کریں۔ بس اپنی قربانی ذبح کر دیں۔ چنانچہ آپ نکلے اپنی قربانی ذبح کی پھر حجام کو بلایا جس نے آپ کا سر مونڈا۔ الحدیث۔ اور مصنف کے لئے بہتر تھا کہ وہ اس حدیث کو بعد میں باب الاحصار میں درج کرتا۔

۷۱۹۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: «إذا رميتم وحلقتم، فقد حل لكم الطيب، وكل شيء، إلا النساء». رواه أحمد وأبو داود، وفي إسناده ضعف.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کنکریاں مار چکو اور سر منڈا لو تو تمہارے لئے خوشبو اور عورتوں کے سوا باقی سب کچھ حلال ہے۔ اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی سند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضعیف ہے(۱)۔

(۱) کیونکہ یہ حجاج بن ارطاۃ کی روایت ہے اور اس مضمون کی ایک اور روایت بھی ہے لیکن اس کا بھی مدار اسی پر ہے۔

اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب کنکریاں پھینکنا اور سر منڈانا دونوں کام ہو جائیں تو محرم پر عورتوں سے صحبت کے سوا باقی سب کچھ حلال ہو جاتا ہے۔ اور عورتوں سے صحبت طواف افاضۃ کے بعد حلال ہوتی ہے۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ محرم پر کنکریاں مارنے کے بعد خوشبو اور عورتوں کے علاوہ باقی چیزیں حلال ہو جاتی ہیں اگرچہ اس نے ابھی سر نہ منڈایا ہو۔

۷۲۰۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ قال: «**ليس على النساء حلق، وإنما على النساء التقصير**». رواه أبو داود بإسناد حسن.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتیں اپنا سر نہ منڈائیں۔ بلکہ صرف اپنے بال کتروالیں۔ اسے ابوداؤد نے حسن سند سے روایت کیا(۱)۔

اس حکم کا ذکر پہلے شرح میں گزر چکا ہے کہ عورتیں سر نہ منڈائیں اور کوئی منڈا لے تو بھی اس کا حج ہو جاتا ہے۔

۷۲۱۔ وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما، أن العباس بن عبد المطلب استأذن رسول الله ﷺ أن يبيت بمكة ليالي منى، من أجل سقايته، فأذن له. متفق عليه.

اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عباس بن عبدالمطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ حاجیوں کو پانی (۱) پلانے کی خدمت کی وجہ سے انہیں منیٰ کی راتیں مکہ میں گزارنے کی اجازت دی جائے تو آپ نے انہیں اجازت دے دی(۲)۔ متفق علیہ۔

(۱) یہ زمزم کا پانی تھا۔ جسے لوگ رات کو تھوڑا تھوڑا چلوؤں سے نکالتے اور اسے حوضوں میں رکھ لیتے۔

(۲) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ منیٰ میں قربانی کے بعد دوسری اور تیسری رات گزارنا واجب ہے۔ الایہ کہ کسی کو کوئی عذر ہو۔ اور یہ احمد سے مروی ہے اور حنفیہ اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم عباسؓ سے خاص تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جو بھی پانی پلانے کی خدمت پر مامور ہو۔ اور یہی واضح بات ہے۔ کیونکہ پینے والوں کے لئے پانی مہیا کرنا کسی ایک آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ اجازت صرف پانی پلانے سے ہی مختص ہے یا اس میں دیگر ضروریات کھانا وغیرہ اور مال کی حفاظت یا مریض کا علاج وغیرہ بھی شامل ہو سکتی ہیں اور یہ الحاق شافعی کی رائے ہے۔ اور اس الحاق پر درج ذیل حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔

۷۲۲۔ وعن عاصم بن عدي رضي الله تعالى عنه، أن رسول الله ﷺ أرخص لرعاة الإبل في البيتوتة عن منى، يرمون يوم النحر، ثم يرمون الغد ومن بعد الغد ليومين، ثم يرمون يوم النفر. رواه الخمسة، وصححه الترمذي وابن حبان.

عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ(۱) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کے چرواہوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی رخصت دی اور فرمایا کہ وہ قربانی(۲) کے دن کنکریاں مار لیں پھر اس سے اگلے دن' دوسرے اور تیسرے دن کی اکھٹی کنکریاں(۳) مار لیں۔ پھر کوچ کے دن ماریں(۴)۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی اور ابن حبان نے صحیح کہا۔

(۱) آپ ابو عبداللہ یا ابو عمر یا ابو عمرو ہیں جو بنو عبید بن زید کے حلیف تھے۔ جو انصار کے قبیلہ بنی عمرو بن عوف سے تھے۔ بدر اور اس کے بعد دوسری جنگوں میں حاضر ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ بدر میں حاضر نہیں تھے۔ آپ بدر کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے ضرور تھے مگر آپؐ نے انہیں مسجد ضرار والوں (منافقین) کی طرف لوٹا دیا کیونکہ آپؐ کو ان کے متعلق کچھ خبر پہنچی تھی۔ اور آپؐ نے ان کا بھی حصہ نکالا۔ تو گویا وہ ایسے ہی تھے جیسے بدر میں حاضر ہوں۔ ۴۵ ہجری میں وفات پائی اور بعض کہتے ہیں کہ آپ جنگ یمامہ میں حاضر تھے اور ایک سو بیس سال عمر پائی۔

(۲) جمرہ عقبہ کو پھر چلے جائیں اور منیٰ میں رات نہ گزاریں۔

(۳) یعنی تیسرے دن' دوسرے دن اور تیسرے دن کی اکھٹی کنکریاں مار لیں۔

(۴) یعنی چوتھے دن اگر جلدی نہ کریں۔

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ عذر والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی رخصت ہے اور یہ رخصت عباسؓ سے خاص ہے اور نہ پانی پلانے سے۔ اور اگر کوئی شخص لوگوں کو پانی پلائے تو اسے بھی وہ کچھ جائز ہو گا جو زمزم کا پانی پلانے والوں کے لئے جائز ہے۔

۷۲۳۔ وعن أبي بكرة رضي الله تعالى عنه قال: خطبنا رسول الله ﷺ يوم النحر، الحديث. متفق عليه.

ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن ہمیں خطبہ دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس حدیث میں قربانی کے دن خطبہ دینے کی مشروعیت ہے اور یہ عید کا خطبہ نہیں تھا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں عید کی نماز ہی نہیں پڑھی اور نہ اس کا خطبہ دیا۔

جاننا چاہیئے کہ مالکیہ اور حنفیہ کے نزدیک حج میں تین خطبے مشروع ہیں۔ پہلا ساتویں ذی الحجہ کو' دوسرا عرفہ کے دن اور تیسرا قربانی کے دن سے دوسرے دن اور شافعی نے چوتھا خطبہ قربانی کے دن کا زیادہ کیا اور تیسرا خطبہ قربانی سے دوسرے دن نہیں بلکہ تیسرے دن قرار دیا۔ کیونکہ قربانی کے دن سے تیسرا دن لوگوں کے جانے کا دن ہے اور مالکیہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ عید کے دن کا خطبہ شمار نہیں ہو گا کیونکہ وہ عام وصیتیں تھیں جو آپ نے اس لئے نہیں کی تھیں کہ وہ حج میں مشروع ہیں۔ اور اس کا انہیں جواب یہ دیا گیا کہ صحابہ نے اسے خطبہ دیا اور اس لئے بھی کہ وہ خطبہ کے مقاصد پر مشتمل تھا جیسا کہ اس کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ہیں: "جانتے ہو آج کونسا دن ہے؟"۔ ہم نے کہا' اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ خاموش رہے اور ہمیں گمان ہونے لگا کہ آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ تب آپ نے کہا: "کیا یہ قربانی کا دن نہیں؟"۔ ہم نے کہا ہاں۔ پھر آپ نے پوچھا "یہ کون سا مہینہ ہے؟"۔ ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ خاموش رہے حتیٰ کہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ آپ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ تب آپ نے فرمایا: "کیا یہ ذی الحجہ نہیں؟"۔ ہم نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے پوچھا "یہ کون سا شہر ہے؟"۔ ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ تب آپ نے فرمایا: "کیا یہ شہر حرام نہیں؟"۔ ہم نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: تمہارے خون اور تمہارے مال ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں۔ جیسے آج کے دن کی حرمت' تمہارے اس حرام مہینے اور اس حرام شہر میں ہے۔ اور یہ حرمت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تم اپنے رب سے ملو گے۔ سنو! کیا میں نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ صحابہ نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے فرمایا۔ اے اللہ گواہ رہنا۔ یہاں موجود لوگوں کو چاہیئے کہ غائب لوگوں کو یہ احکام پہنچا دیں۔ بسا اوقات وہ شخص جسے پیغام پہنچایا جائے وہ سامع سے زیادہ قوی حافظہ والا ہوتا ہے۔ دیکھو! میرے بعد ایک دوسرے کو قتل کر کے کافر نہ بن جانا"۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔ گویا یہ حدیث شہر حرام' قربانی کے دن اور ذی الحجہ کے مہینہ کی تعظیم پر مشتمل ہے۔ ایک دوسرے کا خون بہانے اور ناجائز طریقہ سے مال لینے کی نہی پر بھی' اور ایک دوسرے سے جنگ کر کے اور مار کر کافر بن جانے کی نہی پر بھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات دوسروں تک پہنچانے پر بھی۔ اور یہ سب خطبہ کے مقاصد ہیں۔ نیز یہ قربانی کے دن دوسرا خطبہ دینے کی شرعیت پر دلیل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٧٢٤۔ وعن سراء بنت نبهان رضي الله تعالى عنها قالت: خطبنا رسول الله ﷺ يوم الرؤوس فقال: «أليس هذا أوسط أيام التشريق؟» الحديث. رواه أبو داود بإسناد حسن.

سراء بنت نبہان رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رؤس کے دن خطبہ دیا اور پوچھا: کیا یہ ایام تشریق کے درمیانی دن کا نام نہیں؟ الحدیث۔ اسے ابوداؤد نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا۔

اور یہی چوتھا خطبہ ہے اور یوم الرؤس بالاتفاق قربانی کے دن سے دوسرا دن ہے۔ اور آپ کے ارشاد "اوسط ایام التشریق سے اس کا افضل ہونا بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور دونوں طرفوں سے درمیان میں ہونا بھی۔ اور اس میں یہ دلیل ہے کہ قربانی کا دن بھی ایام تشریق سے ہے اور سراء کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ جانتے ہو یہ کونسا دن ہے؟ اور یہ وہی دن تھا جسے لوگ یوم الرؤس کہتے تھے صحابہ نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ ایام تشریق کا درمیانی دن ہے۔ پھر فرمایا۔ جانتے ہو یہ کونسا شہر ہے؟ صحابہ نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ مشعر الحرام ہے۔ آپ نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ اس سال کے بعد پھر تم سے مل سکوں۔ لہذا سن لو کہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت تم پر ایسے ہی حرام ہے جیسے تمہارے اس شہر کی حرمت ہے تا آنکہ تم اپنے رب سے جا ملو اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے۔ سن لو تم میں سے نزدیک والا دور والے کو پیغام پہنچا دے۔ سن لو! میں نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔ پھر جب آپ واپس مدینہ آئے تو تھوڑی ہی مدت زندہ رہے کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

٧٢٥۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أن النبي ﷺ قال لها: «طوافك بالبيت، وسعيك بين الصفا والمروة، يكفيك لحجك وعمرتك». رواه مسلم.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: تیرا بیت اللہ کا طواف کر لینا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کر لینا تیرے حج اور عمرہ کے لئے کافی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا(۱)۔

(۱) اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ قارن کو حج اور عمرہ دونوں کے لئے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت اور شافعی وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔ اور ہادویہ اور حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اسے دو طواف اور دو سعی ضروری ہیں۔ اور جو احادیث ابن عمر اور جابر وغیرہما سے مروی ہیں وہ عائشہ کی حدیث کی تائید کرتی ہیں۔ دو طوافوں کے قائل اس آیت سے استدلال کرتے ہیں واتموا الحج والعمرة لله حالانکہ اس میں ایسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی دلیل نہیں کیونکہ اتمام تو ایک طواف سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ایک ہی طواف اور سعی پر اکتفا کیا۔ اور آپ قارن تھے جیسا کہ یہی حقیقت ہے۔ اور دو طواف و سعی کے قائلین نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو زیاد بن مالک سے مروی ہے۔ میزان میں کہا۔ زیاد بن مالک عن ابن مسعود حجت نہیں۔ اور بخاری نے کہا۔ اس کا عبداللہ سے سماع معلوم نہیں ہو سکا۔ اور اس سے یہ حدیث مروی ہے کہ "قارن دو طواف کرے اور دو سعی کرے"۔

جاننا چاہئے کہ عائشہؓ نے عمرہ کا تلبیہ کہا تھا لیکن انہیں حیض آگیا تو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنا عمرہ چھوڑ دے"۔ نووی نے کہا کہ وقض سے مراد اس کے عمل کو چھوڑ دینا ہے اور عمرہ کے اعمال طواف۔ سعی اور بال کتروانے کو پورا کرنا ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم یہ دیا کہ عمرہ کے اعمال سے اعراض کر کے حج کا احرام باندھے رکھیں تو یہ قارن ہو جائیں گی۔ وہ صرف طواف کو پاک ہونے تک موخر کر لیں اور عرفات میں وقوف اور دوسرے سب اعمال بجا لائیں۔ اور ان کے قارن ہونے کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تیرا بیت اللہ کا طواف ..... الحدیث"۔ کیونکہ یہ اس بات میں صریح ہے کہ وہ حج اور عمرہ دونوں اکٹھا کر رہی تھیں۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "ارفضی عمرتک" کی تاویل بھی متعین ہو جاتی ہے جس کا نووی نے ذکر کیا ہے۔ گویا عمرہ کے اعمال چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے نکل جائے اور کلیتہ باطل کر دے۔ کیونکہ حج اور عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اس سے نکلنا صرف نکلنے کی نیت سے ہی درست ہو سکتا ہے اور یہ ان سے فراغت کے بعد حلال ہونے پر ہی درست ہوتا ہے۔

٧٢٦۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، أن النبي ﷺ لم يرمل في السبع الذي أفاض فيه. رواه الخمسة إلا الترمذي، وصححه الحاكم.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف افاضہ کے سات چکروں میں سے کسی بھی چکر میں رمل نہیں کیا۔ اسے ترمذی کے سوا پانچوں نے روایت کیا اور حاکم نے صحیح کہا۔

(ا) اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ طواف افاضہ میں وہ رمل مشروع نہیں جس کی مشروعیت طواف قدوم میں پہلے گزر چکی ہے۔ اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔

٧٢٧۔ وعن أنس رضي الله تعالى عنه، أن النبي ﷺ صلى الظهر والعصر والمغرب والعشاء، ثم رقد رقدة بالمحصب، ثم ركب إلى البيت، فطاف به. رواه البخاري.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں۔ پھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محصب (۱) میں تھوڑی دیر کے لئے سوئے۔ پھر سوار ہو کر بیت اللہ کو گئے اور اس کا طواف(۲) کیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا(۳)۔

(۱) وہ پہاڑی راستہ جو کنکریوں والی زمین (ابطح) کو جا ملتا ہے اور وہی خیف بنی کنانہ ہے۔

(۲) یعنی طواف الوداع

(۳) اور یہ واپسی کا دوسرا یا ایام تشریق کا تیسرا دن تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی کے دن ظہر کے بعد جمرہ کو کنکریاں ماریں اور ظہر کو موخر کیا۔ حتیٰ کہ محصب آئے۔ پھر وہاں مذکورہ نمازیں پڑھیں۔

اور سلف اور خلف نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ آیا محصب میں ٹھہرنا اور سونا سنت ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ سنت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں۔ وہ تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل تھی جہاں اپ اترے تھے۔ چنانچہ آپ کے بعد خلفاء آپ کی اقتداء میں وہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ اور ابن عباس کا یہ مذہب ہے کہ یہ حج کے مستحب مناسک سے نہیں۔ حضرت عائشہ بھی اسی طرف گئی ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے۔

۷۲۸۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها، أنها لم تكن تفعل ذلك ـ أي النزول بالأبطح ـ وتقول: إنما نزله رسول الله ﷺ لأنه كان منزلاً أسمح لخروجه. رواه مسلم.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق مروی ہے کہ وہ ابطح میں قیام نہیں کرتی تھیں اور کہتیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں صرف اس لئے اترے تھے کہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں سے نکلنے کی(۱) کافی گنجائش ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

(۱) یعنی مکہ سے مدینہ کو واپس جانا بہت آسان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں اترنے میں حکمت یہ ہے کہ اس سے اللہ کی نعمت کا' اس کے دین کے معزز ہونے کا' اس کے کلمہ کے غالب ہونے کا اور اسلام کے تمام ادیان پر غالب ہونے کا اظہار مقصود ہے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں قریش نے بنی ہاشم سے بائیکاٹ کی قسمیں کھائیں اور بائیکاٹ کی تحریر لکھی تھی جس کا قصہ مشہور ہے اور اگر یہی حکمت ہے تو یہ تمام امت پر احسان ہے۔ لہٰذا تا قیامت اس امت میں سے جو بھی حج کرے اسے یہاں اترنا چاہئے۔

۷۲۹۔ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: أمر الناس أن يكون آخر عهدهم بالبيت، إلا أنه خفف عن الحائض. متفق عليه.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ان کا آخری کام بیت اللہ کا طواف ہے۔ الا یہ کہ حائضہ عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ متفق علیہ(۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) لوگوں کو حکم دینے والے اور اسی طرح حائضہ سے تخفیف کرنے والے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور راوی نے نام اس لئے نہیں لیا کہ فاعل معلوم ہے۔ نیز اسے مسلم اور احمد نے ابن عباس سے ان الفاظ میں روایت کیا کہ لوگ ہر جگہ سے واپس چلے جاتے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کوئی شخص اس وقت تک واپس نہ جائے جب سب سے آخر بیت اللہ کا طواف نہ کرلے"۔ یہ حدیث طواف وداع کے وجوب پر دلیل ہے۔ اور جمہور سلف اور خلف اسی کے قائل ہیں البتہ مالک اور ناصر نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ واجب ہوتا تو آپ حائضہ کو رخصت نہ دیتے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہی تخفیف تو اس کے وجوب پر دلیل ہے۔ اگر یہ واجب نہ ہوتا تو اس پر تخفیف کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔ حائضہ سے تخفیف اس بات پر دلیل ہے کہ یہ اس پر واجب نہیں لہٰذا طہر کا انتظار نہ کرے اور نہ ہی اس کے چھوڑنے پر دم لازم آتا ہے۔ کیونکہ اپنی اصل سے اسے حائضہ سے ساقط کر دیا گیا ہے۔

اور طواف وداع کا وقت اجماعاً" قربانی کے دن سے تیسرے دن ہو سکتا ہے اور کیا پہلے بھی ہو سکتا ہے؟ تو ظاہر یہی ہے کہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ حج کا آخری کام ہے۔ اور اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر وہ طواف وداع کے بعد قیام کرے تو اس کا اعادہ کرے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ اگر اس کے بعد خوراک خریدنے یا جماعت سے نماز ادا کرنے کے لئے ٹھہرے تو اعادہ نہ کرے اور بعض کہتے ہیں کہ جب علاج معالجہ یا تیمارداری کے لئے ٹھہرے تو دوبارہ طواف کرے۔ اور ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ دوبارہ نہ کرے خواہ بعد میں دو ماہ ٹھہرا رہے۔ پھر کیا یہ عمرہ کرنے والے کے لئے بھی مشروع ہے؟ کہتے ہیں کہ اسے لازم نہیں کیونکہ یہ طواف حج کے بارے میں وارد ہے۔ اور ثوری نے کہا کہ عمرہ کرنے والے پر بھی واجب ہے ورنہ اس پر دم لازم آئے گا۔

٧٠٠- وعن ابن الزبير رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: **«صلاة في مسجدي هذا، أفضل من ألف صلاة فيما سواه، إلا المسجد الحرام، وصلاة في المسجد الحرام، أفضل من صلاة في مسجدي هذا بمائة صلاة»**. رواه أحمد وصححه ابن حبان.

ابن زبیر(۱) رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اس مسجد(۲) میں ایک نماز دوسری جگہوں کی نماز سے ہزار گنا افضل(۳) ہے۔ ماسوائے مسجد حرام کے۔ اور مسجد الحرام میں ایک نماز میری اس اس مسجد میں سو نمازوں سے افضل(۴) ہے۔ اسے احمد نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا(۵)۔

(۱) جب علی الاطلاق ابن زبیر کہا جائے تو اس سے مراد عبداللہ ہو گا۔

(۲) اس اشارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے یہ خطاب کیا اس وقت جتنی مسجد موجود تھی وہی مراد ہے۔ بعد کی توسیع اس میں شامل نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) اور ایک روایت میں افضل کی بجائے خیر کا لفظ ہے اور ایک دوسری روایت کے لفظ یہ ہیں "ہزار نماز کے برابر ہوتی ہے"۔

(۴) ابن ماجہ' ابن زنجویہ اور ابن عساکر کی انس کی حدیث میں یہ لفظ ہیں "میری مسجد میں نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے" اور اس کی سند ضعیف ہے اور احمد میں ابن عمر کی حدیث میں ہے "مسجد حرام میں نماز دوسری جگہوں میں لاکھ نمازوں سے افضل ہے"۔ اور جابر کی حدیث میں ہے۔ "دوسری جگھوں میں ہزار نمازوں سے افضل ہے"۔ اسے احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

(۵) اور طبرانی نے ابوداؤد سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسجد حرام میں نماز لاکھ نمازوں کے برابر' میری مسجد میں ہزار کے اور بیت المقدس میں پانچ سو نمازوں کے برابر ہے"۔ اور ابن عبدالبر نے بزار کے طریق سے اسے روایت کیا اور کہا کہ اس کی سند حسن ہے' گویا ابن زبیر کی حدیث میں "سو نماز کے برابر"۔ اسی پر محمول ہے یعنی میری مسجد میں نماز سے تو یہ لاکھ نماز ہوئی اور دونوں حدیثیں موافق ہو گئیں۔ ابو محمد بن حزم نے کہا کہ ابن الزبیر نے عمر بن خطاب سے روایت کیا جس کی سند صحت میں سورج کی مانند ہے صحابہ میں سے کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا تو گویا یہ اجماع کی طرح بن گیا۔ اور یہ حدیث صحابہ کی ایک جماعت سے مختلف الفاظ میں مروی ہے اور جو مجھے معلوم ہو سکا وہ یہ ہے کہ پندرہ صحابہ سے مروی ہے جن کے نام مندرج ہیں۔

اور یہ حدیث اور اسی جیسی دوسری احادیث ان دو مساجد کی باقی تمام روئے زمین کی مساجد پر افضلیت پر ولالت کرتی ہیں اور اس پر بھی کہ ان دونوں میں سے کونسی افضل ہے۔ البتہ فضیلت کے اعداد میں اختلاف ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا۔ اور زیادہ ایسی ہیں جو کم از کم مفہوم کے عدم اعتبار پر دلالت کرتی ہیں اور حکم اکثر کا ہے کیونکہ وہ صریح ہے اور یہ اشارہ پہلے گزر چکا ہے کہ افضلیت بالخصوص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مسجد کو ہے جو آپ کے زمانہ میں موجود تھی۔ نووی نے کہا کہ فی مسجدی میں اضافت عہد کے لئے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ارشاد نبوی کے اور نووی کے قول کے مطابق ہی مصنف نے ابن عقیل حنبلی سے یہ اختصاص نقل کیا ہے۔ اور دوسرے یہ کہتے ہیں کہ یہ اختصاص صرف اتنی مسجد سے مخصوص نہیں جو اس ارشاد نبوی کے وقت موجود تھی بلکہ جو بھی اس میں اضافہ یا وسعت ہو وہ اس فضیلت میں شامل ہے۔ اور اضافت صرف اس بات پر ولالت کرتی ہے کہ مدینہ کی دوسری مساجد اس فضیلت میں شامل نہیں یہ نہیں کہ اس فضیلت میں مسجد نبوی کی توسیع بھی شامل نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس اضافت کا فائدہ ایک ساتھ دونوں باتیں ہیں۔ جو مسجد میں توسیع کی بھی فضیلت کے عموم کا قائل ہے اس کی شاہد وہ روایت ہے جسے ابن ابی شیبہ اور دیلمی نے مسند الفردوس میں ابوہریرہ کی حدیث سے مرفوعا" روایت کیا کہ "اگر اس مسجد کو صنعاء تک وسیع کیا جائے تب بھی یہ میری ہی مسجد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے"۔ اور دیلمی نے مرفوعا" روایت کیا کہ: "میری یہ مسجد اور جو اس میں توسیع ہو تو وہ میری ہی مسجد ہے"۔ اور اس کی سند میں عبداللہ بن سعید مقبری ہے اور وہ کمزور ہے اور دیلمی نے ایک اور حدیث بھی اسی معنی میں روایت کی ہے مگر وہ حدیث معضل ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے ابن عمر سے روایت کیا کہ: "عمر نے شامیہ کی جان مسجد میں توسیع کی پھر کہا کہ اگر ہم اسے کھلے میدان تک وسیع کر دیں تو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہی رہے گی"۔ اور اس کی سند میں عبدالعزیز بن عمران مدنی متروک ہے۔ اور یہ جو صحابی کا کلام ہیں خواہ مرفوع ہیں یا مفصل ان کا صحیح حدیث کے مقابلہ پر ٹھہر نہ سکنا واضح بات ہے۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ آیا اجر میں یہ اضافہ فرض اور نفل دونوں کو عام ہے یا صرف فرض نماز سے مختص ہے؟ نووی نے کہا۔ یہ عام ہے اور طحاوی اور مالکیہ نے اس سے اختلاف کیا اور اس حدیث سے استدلال کیا کہ: "فرض نماز کے علاوہ افضل نماز وہ ہے جو انسان گھر میں پڑھے"۔ اور مصنف نے کہا کہ ممکن ہے کہ حدیث افضل صلوٰۃ المرء اپنے عموم پر باقی رہے۔ تو مکہ اور مدینہ میں اپنے گھر میں نفل نماز دوسری جگہوں میں گھر میں نفل نماز سے اسی نسبت سے زیادہ اجر والی ہو گی۔ اسی طرح مسجد میں نماز بھی اگرچہ وہ گھروں میں ادا کرنا علی الاطلاق افضل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات مخفی نہیں کہ بات تو مسجد میں زیادہ اجر کی ہو رہی ہے۔ مدینہ اور مکہ میں گھروں کی نہیں ہو رہی۔ کیونکہ زیادہ اجر ان دونوں مسجدوں کے متعلق وارد ہے۔ اور زرکشی وغیرہ نے کہا کہ مدینہ اور مکہ کی مسجد میں نفلی نمازوں کا بھی زیادہ ثواب ملتا ہے اور نفل نمازیں گھروں میں افضل ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ نفل نمازوں کی افضلیت مطلقاً" گھروں میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفلی نمازوں کی اپنے گھر میں ہی محافظت کی اور صرف فرض نمازوں کی ادائیگی کے لئے مسجد جاتے تھے حالانکہ آپ کا گھر آپ کی مسجد سے قریب تھا۔ پھر یہ زیادہ اجر کی تخصیص صرف نماز سے ہی مختص نہیں بلکہ غزالی نے کہا: "مدینہ میں ہر عمل کا اجر ہزار گنا ہے"۔ اور بیہقی نے جابر سے مرفوعا" روایت کیا: "میری اس مسجد میں نماز دوسری جگہوں کی ہزار نمازوں سے افضل ہے ماسوائے مسجد حرام کے۔ اور میری اس مسجد میں جمعہ دوسری جگہوں میں ہزار جمعوں سے افضل ہے ماسوائے مسجد حرام کے۔ اور میری اس مسجد میں ماہ رمضان دوسری جگہوں میں ہزار ماہ رمضان سے افضل ہے"۔ اور ابن عمر سے بھی اس سے ملتی جلتی روایت ہے اور طبرانی کی الکبیر میں بلال بن حارث سے اس معنی کے قریب روایت ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حج کے فوت ہونے اور اس سے روک دیئے جانے کا بیان

اکثر ائمہ لغت کہتے ہیں کہ حصر کا معنی منع یا روکنا ہے اور الاحصار سے مراد مرض یا درماندگی یا خوف یا کسی دوسری وجہ سے حج نہ کر سکنا ہے۔ اور جب دشمن سے رکاوٹ ہو تو اسے حصر کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔

٧٣١- عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: قد أحصر رسول الله ﷺ، فحلق رأسه، وجامع نساءه، ونحر هديه، حتى اعتمر عاماً قابلاً. رواه البخاري.

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حدیبیہ میں عمرہ سے روک دیا گیا تو آپ نے سر منڈا دیا۔ اپنی بیویوں سے صحبت کی اور اپنی قربانی کی۔ پھر آئندہ سال عمرہ کیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا(۱)۔

(۱) علماء نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ احصار کن چیزوں سے ہوتا ہے؟ اکثر نے کہا کہ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو حاجی کو حج کرنے سے روک دے جیسے دشمن اور مرض اور اس کے علاوہ دوسری اشیاء حتیٰ کہ ابن مسعود نے فتویٰ دیا کہ جس شخص کو سانپ یا بچھو نے ڈس لیا وہ محصر ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور ہادویہ اور حنفیہ بھی انہی میں سے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مرض بھی ہو سکتی ہے بڑھاپا بھی اور خوف بھی اور تینوں چیزیں نص سے ثابت ہیں۔ اور اسی پر باقی تمام روکنے والے عذروں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول فان احصرتم ---- الایہ کا عموم اس پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ اس آیت کا شان نزول یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمن نے عمرہ سے روک دیا تھا۔ تاہم یہ حکم عام ہے جو اپنے سبب تک محدود نہیں۔

اور اس بارے میں تین دوسرے اقوال بھی ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تھا اور آپ کے بعد حصر نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ یہ ایسے ہی واقعہ خاص ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا کہ آپ کو دشمن نے روک دیا تھا۔ لہٰذا اس میں دوسری باتوں کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اور تیسرا یہ احصار صرف دشمن سے ہی ہو سکتا ہے خواہ وہ دشمن ہو یا باغی ہو۔ ان سب اقوال سے قوی قول وہی ہے جو ابتداء میں ذکر کیا گیا۔ کیونکہ دوسرے اقوال میں آثار اور صحابہ کے فتاویٰ کے سوا کچھ نہیں۔

اور بخاری کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آپ نے قربانی سرمنڈانے سے پہلے کی تھی اور یہ واقعہ قصہ حدیبیہ میں پیش آیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ ابن عباس کی یہ حدیث ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی جیسا کہ آپ کو معلوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو چکا اور نہ ہی ابن عباس نے ترتیب کا قصد کیا تھا۔ انہوں نے ترتیب کا لحاظ رکھے بغیر جو کچھ واقع ہوا بیان کردیا۔ اور اس کے لفظ "اپنی قربانی کو ذبح کیا"۔ میں یہ خبر ہے کہ قربانی کا جانور آپ کے ہمراہ تھا جسے آپ نے اس مقام پر ذبح کیا اور نہ ابن عباس کا کلام اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ علماء نے محصر پر قربانی کے واجب ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر اس کے وجوب کی طرف گئے ہیں اور مالک نے اس سے اختلاف کیا اور کہا۔ واجب نہیں اور مالک ہی حق پر ہے۔ کیونکہ تمام رد کیئے گئے مسلمانوں کے ساتھ قربانی نہیں تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جو قربانی تھی اسے آپ مدینہ سے تطوعا" ساتھ لائے تھے وجوبا" نہیں لائے تھے۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ کے اس قول والهدى معكوفا" ان يبلغ محله ---- الایہ سے مراد ہے وہ ایجاب پر دلالت نہیں کرتا۔ میرا مطلب اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے "پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو جو قربانی سے میسر آئے"۔ اور اس کی تحقیق ہم نے ضوء النہار کے حاشیہ منحته الغفار میں پیش کردی ہے۔

اور حدیث کے الفاظ ہیں کہ "اگلے سال آپ نے عمرہ کیا"۔ کہتے ہیں کہ جو شخص روکا جائے یہ الفاظ اس پر قضاء کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور اس سے مراد وہ شخص لیتے ہیں جو نفلی عمرہ یا حج سے روکا گیا ہو۔ اب جو شخص واجب حج یا عمرہ سے روکا گیا ہو اس پر تو واجب ہونے میں کچھ کلام نہیں کہ اگر وہ واجب کی ادائیگی سے روکا گیا ہے تو اسے بجالانا واجب ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ابن عباس کے کلام میں قضاء کے واجب ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آئندہ سال عمرہ کرنے کی خبر دی ہے۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ فی الواقع آپ نے قضاء کے سال عمرہ کیا تھا لیکن یہ حدیبیہ کے عمرہ کی قضاء نہیں تھا بلکہ دوسرا عمرہ تھا۔ مالک نے واضح طور پر روایت کیا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب حدیبیہ میں حلال ہوئے چنانچہ انہوں نے قربانی کے جانور ذبح کیئے' اپنے سر منڈائے اور ہر چیز سے حلال ہو گئے' جبکہ ابھی نہ انہوں نے بیت اللہ کا طواف کیا تھا اور نہ ہی قربانی کے جانور اپنے ذبح کے مقام پر پہنچے تھے"۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے کسی کو حکم دیا ہو اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ جو اصحاب سفر حدیبیہ میں آپ کے ہمراہ تھے اسے قضاء کا یا کسی چیز کے اعادہ کا حکم دیا ہو۔ اور شافعی نے کہا کہ جہاں کوئی شخص روکا جائے وہ ذبح کرے اور حلال ہو جائے اور اس پر قضا نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قضاء کا ذکر نہیں کیا۔ پھر کہا کہ ہم اہل حدیبیہ کی احادیث کی موافقت سے جانتے ہیں حدیبیہ کے سال جانے پہچانے اشخاص تھے پھر انہوں نے عمرہ قضاء کیا تو ان سے کچھ لوگ کسی جانی یا مالی ضرورت کے بغیر مدینہ میں رہ گئے۔ اور اگر قضاء ان پر لازم ہوتی تو آپ انہیں حکم دیتے کہ پیچھے نہ رہیں۔ پھر کہا کہ اس کا نام عمرہ قضا صرف اس لئے پڑا کہ عمرہ کا قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان یوں طے پایا تھا (یعنی شرط یہ طے پائی تھی کہ اگلے سال آکر عمرہ کرلیں) اس لئے نہیں کہ اس عمرہ کی قضا واجب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔

اور ابن عباس کا قول ہے "اور آپ نے اپنا قربانی کا جانور ذبح کیا"۔ علماء نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ آیا آپ نے قربانی حرم مکہ میں کی تھی یا حرم سے باہر' اور اللہ تعالیٰ کے قول والھدی معکوفا" ان یبلغ محلہ ---- الایہ کا ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے حرم مکہ سے باہر کی تھی۔ اور محصر کے قربانی کے جانور کے ذبح ہونے کے مقام میں بھی کئی اقوال ہیں۔ پہلا جمہور کا قول یہ ہے کہ جہاں وہ حلال ہو وہیں اپنی قربانی ذبح کر دے خواہ یہ حرم سے باہر ہو یا حرم ہو۔ دوسرا قول ہادویہ اور حنفیہ کا ہے کہ وہ صرف حرم میں ہی اسے ذبح کر سکتا ہے۔ تیسرا قول ابن عباس اور ایک جماعت کا ہے اگر وہ حرم میں قربانی بھیجنے کی استطاعت رکھتا ہے تو یہ اس پر واجب ہے اور جب تک قربانی کا جانور اپنے محل پر یعنی حرم میں ذبح نہ ہو جائے وہ حلال نہیں ہو سکتا اور اگر وہ یہ استطاعت نہیں رکھتا تو جہاں وہ روکا گیا ہے وہیں ذبح کر دے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے حدیبیہ کی جس طرف قربانی ذبح کی تھی وہ حرم میں شامل ہے لیکن پہلی بات ہی زیادہ قوی ہے۔

۷۳۲۔ وعن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: دخل النبي ﷺ على ضباعة بنت الزبير بن عبد المطلب رضي الله تعالى عنها، فقالت: يا رسول الله! إني أريد الحج، وأنا شاكية، فقال النبي ﷺ: **«حجي واشترطي أن محلي حيث حبستني»**. متفق عليه.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضباعۃ بنت زبیر بن عبدالمطلب(۱) کے پاس آئے تو وہ کہنے لگیں: "یا رسول اللہ! میرا حج کا ارادہ ہے اور میں بیمار رہتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو حج پر چلی جا اور شرط کر لے کہ جہاں اے اللہ تو مجھے روکے گا میں حلال ہو جاؤں گی(۲)۔ متفق علیہ

(۱) ضباعۃ بنت زبیر بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی بیٹی ہیں۔ مقداد بن عمرو سے شادی ہوئی اور عبداللہ اور کریمہ پیدا ہوئے۔ ان سے ابن عباس' عائشہ وغیرھما نے روایت کی ہے یہ بات ابن اثیر نے جامع الکبیر میں کہی ہے۔

(۲) اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ اگر محرم احرام کے وقت شرط کر لے پھر وہ بیمار ہو جائے تو اسے حلال ہونا جائز ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت اور ائمہ مذاہب میں سے احمد اور اسحاق کا یہی مذہب ہے کہ شافعی کے مذہب سے یہی صحیح ہے۔ اور جو اس بات کا قائل ہے کہ احصار کے عذر میں مرض بھی شامل ہے وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ مریض محصر بن جاتا ہے اور اس کا حکم محصر کا حکم ہے۔ اور اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ وہ محصر نہیں بن جاتا بلکہ جہاں مرض اسے روک دے وہ حلال ہو جاتا ہے اور لازم نہیں ہوتا جو محصر پر لازم ہوتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یعنی نہ قربانی کا جانور اور نہ ہی کوئی اور چیز۔ اور فقہاء کی ایک جماعت نے کہا کہ: شرط کرنا صحیح نہیں اور نہ ہی اس کے لئے کوئی حکم ہے وہ کہتے ہیں کہ ضباعۃ کا معین قصہ موقوف ہے مرجوح ہے یا منسوخ ہے۔ یا یہ حدیث ضعیف ہے اور یہ سب باتیں مردود ہیں۔ جبکہ اصل یہ ہے کہ نہ یہ خاص قصہ ہے اور نہ یہ منسوخ ہے اور یہ حدیث صحیحین میں ثابت ہے نیز سنن ابی داوٗد' ترمذی' نسائی اور باقی تمام قابل اعتماد کتب حدیث میں متعدد طریقوں سے صحابہ کی جماعت سے کثیر سندوں سے مروی ہے۔

اور حدیث کا مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص بوقت احرام شرط نہ کرے اسے حلال ہونے کا حق نہیں اور وہ محصر ہو گا اور اس کے لئے حکم محصر کا ہو گا۔ کیونکہ درست بات یہی ہے کہ احصار دشمن کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔

۷۳۳۔ وعن عكرمة عن الحجاج بن عمرو الأنصاري رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **«من كسر أو عرج فقد حل، وعليه الحج من قابل»**، قال عكرمة: فسألت ابن عباس وأبا هريرة عن ذلك، فقالا: صدق. رواه الخمسة، وحسنه الترمذي.

عکرمہ(۱) نے حجاج بن عمرو(۲) انصاری رضی اللہ عنہ مازنی (۳) سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کی ہڈی ٹوٹ جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے تو وہ احرام کھول دے اور آئندہ سال حج کرلے(۴)۔ عکرمہ نے کہا کہ پھر میں نے یہ مسئلہ ابن عباس اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو دونوں نے کہا کہ تو سچ کہتا(۵) ہے۔ اسے پانچوں نے روایت کیا اور ترمذی نے حسن کہا(۶)۔

(۱) آپ ابوعبداللہ عکرمہ عبداللہ بن عباس کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ آپ بربر سے تعلق رکھتے ہیں ابن عباس' عائشہ' ابوہریرہ' ابوسعید وغیرہم سے سماعت کی۔ آپ کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ خوارج کی رائے رکھتے تھے مصنف نے فتح الباری کے مقدمہ میں تفصیل سے ان کا بیان لکھا ہے۔ اور ذہبی نے میزان میں۔ اکثر نے اسے نظر انداز کیا ہے اور اس کی روایت قبول نہیں کرتے۔

(۲) حجاج بن عمرو بن ابی غزیہ

(۳) آپ کا دادا مازن بن نجار تھا اسی نسبت سے مازنی ہیں بخاری نے کہا کہ ان سے دو حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ایک یہی ہے۔

(۴) یعنی جب وہ حج کا فریضہ ادا کرنے سے پہلے لنگڑا ہو جائے یا اس کی ہڈی ٹوٹ جائے۔

(۵) یعنی جو کچھ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر دے رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(٦) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اگر کسی شخص نے احرام باندھا ہو پھر اسے مذکورہ امراض یا ایسا ہی کوئی مرض لاحق ہو جائے جو رکاوٹ کا سبب بن جائے تو وہ محض اس رکاوٹ کی وجہ سے حلال ہو جائے گا۔

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوا کہ محرم تین باتوں میں سے کسی ایک کی بناء پر اپنے احرام سے نکل جاتا ہے۔ احصار سے خواہ کسی بھی قسم کی رکاوٹ ہو یا شرط کرنے سے یا اسے کوئی حادثہ پیش آجائے جس سے اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے اور یہ تو اس کے لئے ہے جو روک دیا جائے اور اس کا حج فوت ہو جائے۔ مگر جس کا حج بغیر احصار کے فوت ہو جائے تو اس کے حکم میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ ہادویہ اور پچھلوں کا مذہب یہ ہے کہ وہ اس احرام سے حلال ہو جاتا ہے جو اس نے حج یا عمرہ کے لئے باندھا تھا۔ اور اسود سے مروی ہے کہ میں نے عمر سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جس نے حج کا احرام باندھا ہو اور وہ حج نہ کر سکے تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ عمرہ کا تلبیہ پکارے اور آئندہ سال حج کر لے۔ پھر میں زید بن ثابت سے ملا اور اس سے یہی بات پوچھی تو اس نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔ ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عمرہ کا تلبیہ پکارے۔ پھر از سر نو حج کے لئے دوسرا احرام باندھے۔ اور ہادویہ کہتے ہیں کہ حج کے فوت ہو جانے کی بنا پر اس پر دم واجب ہے۔ اور شافعیہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اس پر دم واجب نہیں جبکہ اس کے لئے حلال ہونا مشروع ہے اور وہ عمرہ سے حلال ہو چکا۔ اور انہی کا قول قوی ہے کیونکہ دم کے وجوب پر کوئی دلیل نہیں۔ واللہ اعلم۔

سبل السلام شرح بلوغ المرام کا دوسرا حصہ ختم ہوا اور آگے تیسرا حصہ کتاب البیوع سے شروع ہو رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ